اشاعت خصوصی
سہ ماہی
حسن تدبیر
دہلی
بیاد
امام العصر
علامہ انور شاہ کشمیریؒ
مدیر
مولانا محمد اعجاز عرفی قاسمی

مُدیر
مولانا محمد اعجاز عرفی قاسمی

مدیر انتظامی
احسن مہتاب

معاون مدیر
اسعد مختار

جلد 2 شمارہ 3 فروری - 2010

Q/25 الصمد روڈ، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی - 25 ٹیلی فیکس: 011-26985943

Rs.200/-

مشمولات

ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے ایم آر پرنٹر گلی گڑھیا، دریا گنج، نئی دہلی-2 سے چھپوا کر
Q/25، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی-25 سے شائع کیا۔

پیغامات

بسم الله الرحمن الرحيم

المكتبة الإمدادية

شارع ابراهيم الخليل المسفلة مكة المكرمة

لصاحبها : عبد الحفيظ ملك عبد الحق

س.ت : ٤٧٩٥ ـ ٤٠٣١٠٠ ت : ٥٤٧٠٢٨٧ ص. ب : ١٧٢٩

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله وحده ، والصلاة والسلام على من لا نبي بعده ، وعلى آله وأصحابه أجمعين .

أما بعد فقد زارنا بدارنا في مكة المكرمة فضيلة الشيخ محمد إعجاز عرفي القاسمي الرئيس العام «لمنظمة علماء الحق لعموم الهند بدلهي» .

وأخبرني تحريرًا وشفويًا بأنهم سيصدرون عددًا عن إمام العصر أنور شاه الكشميري رحمه الله ، وذلك لمجلتهم الشهرية «حُسن تدبير» وطلب مني رسالة مختصرة عما يتعلق به .

ولا شك أن الإمام الحافظ الحجة العلامة الكبير والمحقق الجليل السيد محمد أنور شاه الكشميري له جهود متنوعة في خدمة السنة المطهرة وتحقيق المباحث الدقيقة فيها وفي العلوم الأخرى كما هي معلومة ومعترف بها لدى القاصي والداني .

وبجانب جهوده العلمية من التأليف والتدريس والتحقيق والإفادة له جهود مشكورة وهامة في مكافحة الفتنة القاديانية الكافرة ، فإنه أعد في هذا الميدان مكتبة قيمة ضخمة في الرد على شبه القاديانية وإثبات كفرهم وباطلهم بالحجة والبرهان .

وكذا أعد رجالا من تلاميذه النبلاء بذلوا جهودًا علمية في مكافحة هذه الفتنة الكافرة ، ولاسيما محدث العصر الإمام السيد محمد يوسف البنوري الحسيني الذي قاد حركة شعبية عارمة في جمهورية باكستان الإسلامية في عام ١٩٧٤م نتج عنها أن أصدر البرلمان الباكستاني بالإجماع قرارًا بكفر الطائفة القاديانية بفرعيها واعتبارهم أقلية غير مسلمة .

ومما يدل على إخلاص وتفاني إمام العصر في محبة خاتم النبيين وسيد المرسلين ﷺ مبايعته على مشهد من مئات العلماء لخطيب الأمة وزعيمها السيد عطاء الله شاه البخاري ، ونصبه أميرًا للشريعة ليقود الجهاد والكفاح ضد طائفة القاديانية الكافرة ، فجزاه الله خيرًا كثيرًا عن الإسلام والمسلمين .

وإني من طرفي خاصة ومن جميع منسوبي وأعضاء حركة ختم النبوة العالمية المنتشرين في شتى أنحاء العالم أتقدم بالشكر الجزيل والتقدير من أعماق القلب لفضيلة الشيخ محمد إعجاز عرفي القاسمي ولمجلة «حسن تدبير» وجميع المسئولين عنها لإصدار هذا العدد المبارك .

راجيًا من الباري الكريم أن يتقبله قبولاً حسنًا وينفع به عباده ويجعله سببًا لنشر الحق والرشد والهداية . آمين .

وصلى الله على سيد الرسل وخاتم النبيين سيدنا وحبيبنا وقرة أعيننا ونبينا ومولانا محمد وعلى آله وأصحابه وأزواجه وأتباعه أجمعين ، وبارك وسلم تسليمًا كثيرًا .

صاحب المكتبة الإمدادية

عبدالحفيظ ملك عبدالحق المكي

(رئيس حركة ختم النبوة العالمية)

في ١٨ / ١٢ / ١٤٣٠هـ مكة المكرمة

رایزنی فرهنگی سفارت جمهوری اسلامی ایران
دهلی نو

OFFICE OF CULTURAL COUNSELLOR
EMBASSY OF ISLAMIC REPUBLIC OF IRAN
NEW DELHI

شمارہ: 51/9/1775
تاریخ: 01/01/2010

پیغام

یہ جان کر مجھے بے پناہ مسرت ہوئی کہ آل انڈیا تنظیم علماء حق کا ترجمان سہ ماہی حسن تدبیر کا امام العصر مولانا انور شاہ کشمیری نمبر زیر ترتیب ہے۔ اپنی علمی دینی تبلیغی اور اسلامی خدمات کی بنیاد پر پوری دنیا میں متعارف ہے۔ مجھے خود دیوبند حاضر ہونے کا شرف حاصل ہو چکا ہے اور وہاں کی شخصیات سے ہماری ملاقاتیں بھی ہو چکی ہیں۔ دیوبند کے فضلاء اور ان کے فارغین سے آئے دن ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں اور وہ حضرات خانہ ایران کے پروگراموں میں بھی شریک ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے درمیان دیوبند کے اکابر یا دیوبند کے علماء کا جو تذکرہ آتا ہے اس تذکرہ میں ایک قابل اہم اور عبقری شخصیت مولانا انور شاہ کشمیری کی بھی ہے۔

تنظیم علماء حق کے صدر مولانا اعجاز عرفی قاسمی نے اس سے پہلے مختلف شخصیات پر دستاویزی خصوصی شمارے شائع کر کے اردو ادب کی تاریخ یک نمایاں اضافہ کیا ہے اور اب انہوں نے دیوبند کے مایہ ناز اور قابل فخر شخصیت مولانا انور شاہ کشمیری پر یہ ضخیم اور خصوصی شمارہ شائع کر کے انہوں ار العلوم دیوبند کے فاضل ہونے کا اپنا ایک ایسا حق ادا کیا ہے جس کیلئے اہل دیوبند کو تو ان کا ممنون ہونا ہی چاہئے میں بھی ان کا شکر گزار ہوں کہ اس پر انہوں نے مجھ کو علامہ انور شاہ کشمیری سے متعلق کچھ لکھنے کی دعوت دی۔

مولانا انور شاہ کشمیری کے متعلق میں علامہ اقبال کے ان الفاظ میں بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ دنیا اپنی ۵ سو سالہ تاریخ میں ایسا عالم پیش کرنے سے ہے۔ مولانا انور شاہ کشمیری مختلف علوم و فنون میں بے پناہ مہارت رکھتے تھے خصوصاً علم حدیث میں ان کی شہرت پوری دنیا میں تھی اور ان کی درسی اور علمی ت کی واضح دلیل یہ ہے کہ ہندو پاک میں جتنے بھی بڑے علماء اور اسلامی اسکالر ہیں یا ماضی قریب میں گذرے ہیں یا جتنی بھی حدیث و تفسیر پر کتابیں گئی ہیں یا جتنی بھی علمی دینی اصلاحی اور اسلامی خدمات انجام دی گئی ہیں ان کے مولف حضرات مولانا انور شاہ کشمیری کے دسترخوان علم پر حاضر باش ہیں اور ان سے ان کا شرف تلمذ حاصل رہا ہے۔ ایک ایسی اہم اور عبقری شخصیت پر یہ خصوصی نمبر شائع کرنے پر میں آل انڈیا تنظیم علماء حق کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اس خصوصی دستاویزی شمارے سے پوری ملت اسلامیہ و مسلمانوں کے درمیان علمی، دینی، اعتقادی نیز ہر طرح کے اتحاد کا ہو جائے گا۔

خداوند کریم سے آپ کی توفیقات میں اضافہ کی مزید دعاؤں کے ساتھ —— والسلام

داکتر کریم نجفی
کلچرل کاؤنسلر سفارت جمہوری اسلامی ایران
نئی دہلی

محترم عالی جناب مولانا اعجاز عرفی قاسمی صاحب
سہ ماہی مجلہ حسن تدبیر، نئی دہلی

सलमान खुर्शीद, सांसद
سلمان خورشید، ایم۔پی۔
Salman Khurshid, M.P.

D.O. No.372/MOS(I/C)MMA/09

अल्पसंख्यक कार्य राज्य मंत्री (स्वतंत्र प्रभार)
भारत सरकार
وزیر برائے اقلیتی امور (آزادانہ چارج)
حکومت ہند
Minister of State (Independent Charge)
Ministry of Minority Affairs
Government of India

MESSAGE

I am delighted to know that Husn-e-Tadbir, which is a quarterly journal published by Delhi based All India Tanzeem Ulama-e-Haq, is bringing out a special issue on the life and academic services of prominent scholar of Hadith, Allama Anwar Shah Kashmiri.

Allama Anwar Shah Kashmiri was a religious scholar with strong academic credentials. He was a true nationalist and his life and philosophy inspire all of us to lead a life of compassion, sacrifice and non-violence. His literary contributions brought about far reaching consequences and left a deep impression upon Muslims.

I hope that All India Tanzeem Ulama-e-Haq, New Delhi, which is highlighting such achievements in its special issue, spreads the message of importance of education amongst the Indian Muslims which is a real tribute for his vision to the religion as well as mankind.

(SALMAN KHURSHID)

Date :
Place: New Delhi

Office: 11th Floor, B-1 Wing, Paryavaran Bhawan, C.G.O. Complex, Lodhi Road, New Delhi 110003

Dy. No. 175/I M/FPI/RO
Date 14/11/2010

सुबोध कांत सहाय
SUBODH KANT SAHAI

मंत्री
खाद्य प्रसंस्करण उद्योग
भारत सरकार

MINISTER
FOOD PROCESSING INDUSTRIES
GOVERNMENT OF INDIA

MESSAGE

I am glad to know that Husn-e-Tadbir, the quarterly journal published by All India Tanzeem Ulama-e-Haq is dedicating its next issue on the life and academic services of prominent scholar of Hadith, Allama Anwar Shah Kashmiri.

I am sending my best wishes for the success of the forthcoming issue of Husn-e-Tadbir.

(SUBODH KANT SAHAI)

Maulana Mohd. Ajaz Urfi Qasmi
President,
All India Tanzeem Ulama-e-Haq
Q-25, Al-Samad Road, Batla House,
Jamia Nagar,
New Delhi – 110025

PANCHSHEEL BHAWAN, AUGUST KRANTI MARG, NEW DELHI-110 049
TEL : (011) 26493889, (011)-23018317 FAX : (011) 26493298, 23018152

SHEILA DIKSHIT
CHIEF MINISTER

GOVT. OF NATIONAL CAPITAL TERRITORY OF DELHI
DELHI SECRETARIAT, I.P. ESTATE, NEW DELHI-110002

D.O. NO.:
Dated:

MESSAGE

It gives me immense pleasure to know that All India Tanzeem Ulama-E-Haq has decided to bring out its quarterly journal Husn-e-Tadbir as a special issue on prominent scholar of Hadith, **Allama Anwar Shah Kashmiri,** a world renowned scholar of Hadith.

His views on Islam and religious tolerance are taken in high esteem. I am sure that the special issue would be able to disseminate all basic tenants of harmony and co-existence.

My best wishes for success of the entire endeavour.

Sheila Dikshit

(SHEILA DIKSHIT)

PHONE : OFF. 23392020, 23392030 • FAX : 23392111

SAIYID HAMID, *IAS (Retd.)*
Former Vice-Chancellor
Aligarh Muslim University
Chancellor, Jamia Hamdard
Secretary, Hamdard Education Society

Phones: Off. : 2604 8549, 2604 5063
2604 2064, 2604 2370
Res : 2604 2072, 2604 6836

TALIMABAD, SANGAM VIHAR
NEW DELHI - 110 062

پیغام

تنظیم علماء حق دہلی اپنے ماہی مجلہ ''حسن تدبیر'' کو اکابر علماء کے ذکر خیر کے لئے وقف کر دیا ہے۔ میں مولانا محمد اعجاز عرفی قاسمی صاحب قومی صدر کی خدمت میں اس گرانقدر کوشش کے لئے ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں۔

والسلام۔

خیر اندیش

سید حامد

مولانا محمد اعجاز عرفی قاسمی صاحب
قومی صدر آل انڈیا تنظیم علماء حق دہلی
الصمد روڈ ث الله ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۲۵

Fax: 91-11-2604 8843, 91-11-2604 2030, 91-11-2604 6365 E-mail: secretaryhes@bol.net.in hesdelhi@hotmail.com

MUFTI MUHAMMAD TAQI USMANI
Vice President Jamia Darul-Uloom Karachi - Pakistan

المفتي محمد تقي العثماني
نائب رئيس جامعة دار العلوم كراتشي-باكستان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ تعالیٰ ونصلی علی رسولہ الکریم

مولانا محمد اعجاز عرفی قاسمی صاحب زید مجدہم کی زبانی یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ ان کے زیر ادارت مجلہ "حسن تدبیر" امام العصر حضرت علامہ محمد انور شاہ صاحب کشمیری قدس سرہم پر ایک خصوصی اشاعت کا اہتمام کر رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کی شخصیت جیسی جامع العلوم تھی، اور اُن کی تحقیقات جتنی قابلِ قدر اور چشم کشا ہیں، ابھی تک اُن پر تحقیق کا کام تشنہ ہی رہا ہے اور ضرورت ہے کہ حضرت کے علمی افادات کی مزید تشریح و توضیح اور ان کے دکھائے ہوئے راستوں پر مزید تحقیق کا کام ہو۔ امید ہے کہ ان شاء اللہ "حسن تدبیر" کا یہ خصوصی شمارہ اس ضرورت کو پورا کرنے میں اہم کردار ادا کرے گا۔ دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنی بارگاہ میں شرفِ قبول عطا فرمائیں، اور یہ نافع خاص و عام ثابت ہو۔ آمین۔ وباللہ تعالیٰ التوفیق۔

بندہ

محمد تقی عثمانی عفی عنہ

۹ شعبان ۱۴۳۰ھ

Jamia Darul-Uloom Karachi
Korangi Industrial Area,

جامعة دار العلوم كراتشي

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

Jamiat-ul-Uloom-il-Islamiyyah

Allama Muhammad Yousuf Banuri Town

Karachi Pakistan.

جامعۃ العلوم الاسلامیۃ

علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن

کراچی ۷۴۸۰۰ پاکستان

Date. ______

Ref. No. ______

یہ سن کر بے حد خوشی اور مسرت ہوئی کہ "آل انڈیا تنظیم علمائے حق،، دہلی نے مسلمانوں کی راہ نمائی، ان کو اپنے اسلاف واکابر سے متعارف اور ان کی خدمات وکارناموں سے آگاہ کرنے کا مبارک سلسلہ شروع کیا ہے۔ چنانچہ اس کے لئے تنظیم کے جنرل سیکریٹری مولانا محمد اعجاز عرفی القاسمی کی ادارت میں دہلی سے ایک علمی وتحقیقی مجلہ سہ ماہی "حسن تدبیر،، بھی جاری کیا ہے، جس نے اپنی مختصر مدت اجراء میں تین خصوصی نمبرات شائع کر کے مسلمانوں کے قلوب میں اپنے لئے ایک جگہ بنالی ہے۔

اس مجلہ کی جانب سے اب تک جن تین شخصیات پر خصوصی نمبرات آئے ہیں، ان میں سے ایک حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ، مہتمم دارالعلوم دیوبند ہیں تو دوسرے مجدد ملت وحکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ اور تیسرے حضرت مولانا محمد انظر شاہ کشمیریؒ ہیں۔

سہ ماہی حسن تدبیر کا اگلا منصوبہ حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کی حیات وخدمات پر ایک خصوصی اشاعت ہے۔ بلاشبہ اخلاف کا فرض ہے کہ وہ اپنے اسلاف کی حیات وخدمات سے امت کو متعارف کرائیں اور امت کو ان کے نقش قدم پر چل کر کامیاب زندگی گزارنے کی ترغیب دیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ وسعت معلومات، علم حدیث کے لئے غیر معمولی حافظہ ذکاوت، قوت مطالعہ، متون وشروح حدیث کی اطلاع، رجال وتاریخ، جرح وتعدیل، طبقات رواۃ کی واقفیت، تقویٰ، زہد اور ورع ہر ایک میں قدرت نے آپ کو وافر حصہ عطا فرمایا تھا۔

ہماری جامعہ کے مؤسس حضرت بنوری نور اللہ مرقدہ کو حضرت محدث کشمیریؒ سے محبت ہی نہیں بلکہ والہانہ عشق تھا، حضرت بنوریؒ نے آپ کے علوم ومعارف کو اپنے قلب میں جذب کرلیا تھا اور زندگی بھر انہیں کا تذکرہ ورد زبان تھا، جس سے آپ اپنے شیخ کے علوم وعرفان کے مرجع اور ترجمان بن گئے تھے اور اپنے شیخ کے خصوصی اوصاف ومزایا کے اظہار کے لئے "نفحۃ العنبر فی حیاۃ الشیخ محمد انور،، تحریر فرمائی۔

اس کے ساتھ ہم سہ ماہی مجلہ "حسن تدبیر،، کے ذمہ داران اور خصوصاً مولانا محمد اعجاز عرفی القاسمی کو اس عزم وہمت اور حسن کارکردگی پر خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔

عبد الرزاق اسکندر

۹/۸/۱۴۳۰ھ

۱/۸/۲۰۰۹ء

P.O. Box: 3465 Karachi Code No. 74800, Phone: (0092-21) - 4913570 - 4912683 - 4915966 - 4123366 - 4121152

Fax: (0092-21) - 4919531, Karachi Pakistan. URL: www.banuri.edu.pk . E-mail: info@banuri.edu.pk

Mohamed Shamshad A. Factory
All Kinds for Oud & Oriental
Lic. No.: 1/88
C.R.: 4030137497

مصنع محمد شمشاد عبدالغفار
انتاج عطورات متنوعة ودهن العود
ترخيص صناعي رقم ١/٨٨
س.ت ٤٠٣٠١٣٧٤٩٧

Date ....   التاريخ ....

محترم مولانا محمد اعجاز عرفی قاسمی صدر آل انڈیا تنظیم علماء حق

السلام علیکم

ماہنامہ ''حسن تدبیر'' اردو صحافت میں ایک نمایاں مقام اپنے خصوصی نمبرات کی وجہ سے حاصل کر چکا ہے اس سے پہلے آپ نے حسن تدبیر کے جو خصوصی شمارے نکالے وہ میری نظروں سے گزر چکے ہیں اب علامہ انور شاہ کشمیری کی عبقری شخصیت پر آپ نے جو خصوصی شمارہ نکالنے کا ارادہ کیا ہے اس سے بے پناہ مسرت ہوئی اللہ تعالیٰ آپ کو اس اس عظیم مقصد میں ہر طرح کی کامیابی سے سرفراز کرے۔
تنظیم علماء حق قومی، ملی، دینی اور تعلیمی جہت سے جو نمایاں خدمات انجام دے رہا ہے اس کے لئے مبارک باد قبول فرمائیں میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ دارین کی ہر منزل پر آپ کو سرخروئی نصیب کرے۔ آمین!

(مولانا) محمد شمشاد قاسمی

Mohammad Rafi Usmani

Mufti & President Darul-Uloom Karachi,Pakistan
Ex-Member Council of Islamic Ideology Pakistan

رئیس الجامعۃ لدار العلوم کراتشی والمفتی بھا
عضو مجلس الفکر الاسلامی جمہوریۃ باکستان الاسلامیۃ سابقاً

التاریخ ۲۱ رشعبان ۱۴۳۰ھ مطابق ۱۳ راگست ۲۰۰۹ الرقم ______

محترم جناب مولانا محمد اعجاز عرفی قاسمی صاحب
قومی صدر آل انڈیا تنظیم علماء حق دہلی۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

گرامی نامہ مؤرخہ ۲۵/۷/۲۰۰۹ء ''سہ ماہی حسن تدبیر دہلی'' کے ساتھ نظر نواز ہوا، ''حسن تدبیر'' کا یہ تحفہ میرے لئے بہت باعث مسرت ہے، اللہ تعالی آپ کو اس کی جزائے خیر عطا فرمائے۔

امام العصر حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی عظیم شخصیت کے حوالے سے آپ نے خصوصی شمارہ نکالنے کا جو نیک عزم کیا ہے، اس سے بھی مسرت ہوئی، میری دعا ہے کہ اللہ تعالی اس عظیم مقصد میں آپ کو حسن تدبیر کے ساتھ بہترین کامیابی عطا فرمائے۔

حضرت علامہ۔ قدس اللہ سرہ۔ میرے والد ماجد مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب۔ رحمۃ اللہ علیہ۔ کے ایسے استاذ محترم تھے کہ جن سے انہوں نے بہت استفادہ کیا، ہم اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے بکثرت دوران درس بھی، دوران مجلس بھی، اور روز مرہ کی علمی گفتگو میں ان کی علمی عبقریت، اور قوت حافظہ کے حیرت انگیز واقعات، غیر معمولی علمی شغف، انتہائی سادگی اور بھول پن کے سبق آموز ملفوظات و واقعات کثرت سے سنتے رہے ہیں، اور میں بھی ان میں سے کئی واقعات و ملفوظات اپنے بیانات و مواعظ اور طلبہ سے خطاب کے دوران سناتا رہتا ہوں۔ حضرت علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے عقیدت و محبت کے جذبات کا شدید تقاضا تو یہی تھا کہ ''حسن تدبیر'' کے اس خاص شمارے کے لئے ضرور کچھ لکھتا، لیکن جسمانی قوۃ کا انحطاط، اور ہمہ وقتی مشاغل کا ہجوم اس کی مہلت نہیں دیتا۔

اس مبارک ارادہ پر مبارک باد قبول فرمائیے، میری دعا ہے کہ یہ شمارہ جلد از جلد نہایت حسن و خوبی اور جامعیت کے ساتھ جلوہ گر ہو، اور عامۃ المسلمین کے لئے عموماً اور علمی حلقوں کے لئے خصوصاً گراں قدر علمی دستاویز ثابت ہو۔

اللہ تعالی اس دعا کو قبول فرمائے، اور آپ کی ہر قدم پر دستگیری فرمائے۔ آمین۔

والسلام
[signature]
(محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ)
رئیس الجامعہ دار العلوم کراچی

Jamia Darul Uloom Karachi Pakistan P.C: 75180 جامعۃ دار العلوم کراتشی باکستان الرمز البریدی ۷۵۱۸۰
Ph: 0092-21-5049774 - 5031733 - Fax: 5032366 - 5041923
Email: jamiadarulolumkhi@hotmail.com Website: www.darululoomkhi.edu.pk

5394455

FAROOQ-E-AZAM

مرکزی جامع مسجد الفاروق

مدرسہ اسلامیہ فاروقِ اعظم

حوالہ نمبر ________ محمود آباد نمبر 6 گلی نمبر 2 کراچی - پوسٹ کوڈ نمبر 75460 تاریخ ________

مولانا محمد اعجاز عرفی قاسمی صاحب دامت برکاتہم کی زبانی یہ معلوم ہوا ان کی زیر ادارت مجلہ حسن تدبیر امام العصر حضرت مولانا علامہ محمد انور شاہ صاحب کشمیری پر ایک خصوصی اشاعت کا اہتمام کر رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی شخصیت جیسی جامع العلوم تھی اور ان کی تحقیقات جتنی قابل قدر اور چشم کشا ہے ابھی تک ان پر تحقیق کا کام تشنہ ہی رہا ہے حضرت شاہ صاحب کا وسعت معلومات علم حدیث کے لیے غیر معمولی حافظہ ذکاوت قوت مطالعہ متون وشرح حدیث کی اطلاع تقوی، زہد اور ورع ہر ایک میں قدرت نے آپکو وافر حصہ عطا فرمایا۔ اور خاص طور پر مسئلہ ختم نبوت پر حضرت انور شاہ کشمیری نے جس طرح کام کیا وہ قابل قدر اور لائق تحسین ہے اور مسئلہ ختم نبوت میں حضرت شاہ جس طرح سب علماء کو ایک ہی پلیٹ فارم پر لے کر چلے وہ حضرت کا ہی کمال اور انکی ہی محنت تھی اور مسئلہ ختم نبوت حضرت علامہ انور شاہ کی الف سے شروع ہوا اور حضرت علامہ محمد یوسف بنوری کی ی پر اختتام پذیر ہوا۔ اور حضرت بنوری حضرت کشمیری کے شاگرد خاص تھے۔ حضرت انور شاہ کو اللہ تعالی نے بے مثال حافظہ عطا فرمایا تھا۔ اور ایک مرتبہ جو کتاب پڑھ لیتے وہ انھیں حفظ ہو جایا کرتی تھی آپ دارالعلوم دیوبند کا کتب خانہ کہلاتے تھے۔ درحقیقت حضرت شاہ قرن اولی کے قافلے والوں میں سے تھے جو اس زمانے میں آئے۔

آس امیر یا تنظیم العلماء حق کے جنرل سیکریٹری مولانا محمد اعجاز عرفی قاسمی صاحب دامت برکاتہم جس طرح مجلہ حسن تدبیر میں اکابر علماء کا تذکرہ کرتے ہیں یہ درحقیقت بہت بڑا اور عظیم کام ہے اور مسلمانوں کو اپنے اسلاف اور اکابر کے کارناموں سے آگاہ کرتے رہتے ہیں اور مولانا اعجاز عرفی قاسمی کا یہ عمل ان کے لیے ذخیرہ آخرت ہوگا۔ اور حضرت قاسمی صاحب دامت برکاتہم جس طرح یہ عمدہ کام کر رہے ہیں اس کی مثال ایسی ہے جیسے دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہو۔ حضرت مولانا محمد اعجاز عرفی قاسمی نے ہمارے مدرسہ اسلامیہ فاروق اعظم میں تشریف لا کر حضرت نے مجھے حسن تدبیر بیاد حضرت انور شاہ کشمیری پیش کیا جس پر میں حضرت کا تہہ دل سے مشکور ہوں۔ اور حضرت کی ہمارے ادارے اور علاقہ پر آمد پر اہل محلہ اور انتظامیہ حضرت کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

اللہ پاک حضرت مولانا محمد اعجاز عرفی قاسمی کو اور انکی تنظیم کو ہمیشہ کے لیے وقف دین کے لیے قبول فرمائے (آمین)

فقط

مولانا قاری اللہ داد
جنرل سیکریٹری تنظیم العلماء، پاکستان
مدیر و بانی مدرسہ اسلامیہ فاروق اعظم
محمود آباد نمبر 6، کراچی پاکستان۔

Darus Salam Islamic Centre

دارالسلام اسلامی مرکز

DELHI GATE, MALERKOTLA
148023 PUNJAB INDIA

TEL, FAX-01675-251201

۲۳ شوال المکرم ۱۴۳۰ھ
۱۳ اکتوبر ۲۰۰۹ء

پیغام

بڑی خوشی ہوئی کہ آل انڈیا تنظیم علماء حق محدثِ عصر حضرت علامہ انورشاہ کشمیری علیہ الرحمہ پر خصوصی مضامین کا مجموعہ شائع کر رہی ہے۔

ان علماء کی خدمات کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اگر اس کو سمیٹنا چاہیں تو سمیٹنا مشکل ہے۔ محدث حضرت علامہ انورشاہ ایسی جامع شخصیت تھے کہ علم کے ہر موضوع پر انھوں نے ایک بڑا علمی ذخیرہ آنے والوں کے لئے چھوڑا ہے ان کی خدمات کے نقوش صدیوں تک تابندہ رہیں گے۔ علمی خدمات کے علاوہ ان کا تقویٰ، پرہیزگاری اور محتاط دینی زندگی آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ بنی رہے گی۔

مجھے امید ہے کہ یہ بابرکت تذکرہ لوگوں کے لئے بھی مفید ہوگا اور بارگاہِ حق میں بھی قبولیت حاصل کرے گا۔

(مفتی) فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی

Mohammed Tayyeb Qasmi
M.A.
Founder:
DARUL ULOOM FAIZ-E-MUHAMMADI
Undertaken by:
Iqra Educational & Technical Foundation
Ph.: (0091-5522) 244160

Ref.........

Date.........

گرامی محترم مولانا محمد اعجاز عرفی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مکتوب عالی نے مشرف فرمایا۔

خاتم المحدثین حضرت علامہ کشمیریؒ پر سہ ماہی مجلہ حسن تدبیر کی خصوصی اشاعت کے پروگرام سے بیحد مسرت ہوئی۔

آپ "آل انڈیا تنظیم علماء حق" کے پلیٹ فارم سے بڑی مدت قلیل میں موجود اعلیٰ شخصیات کی عمدہ کارگذاریوں پر ایوارڈوں کی نوازش سے اور گذشتہ عظیم شخصیات پر سہ ماہی "حسن تدبیر" کی خصوصی اشاعتوں کے تسلسل کی جو بساط بچھائی ہے وہ جہاں تنظیم علماء حق کے برتر "حسن تدبیر" کی علامت ہے وہیں آپ کے اکیڈمک فکر کی غماز بھی۔

اسلام کی عظیم شخصیات پر یہ تسلسل ہندوستان کے دیگر رسائل وجرائد کو منہ چڑھانے لگا ہے اس سے آل انڈیا تنظیم علماء حق کا قد تمام دیگر تنظیموں سے اونچا اٹھنے لگا ہے اس لئے تنظیم کی عظمتوں کو سلام

آپکا خیر اندیش
محمد طیب القاسمی گورکھپوری

ہتھیا گڑھ، لچھمی پور، ضلع مہراج گنج (گورکھپور) یوپی پن-273162
Hathiagarh, Lakshmipur, Distt.-Mahrajganj, (Gorakhpur) U.P.-27316..

Jamia Islamiyyah Talim ul Qur'an
Jamia Masjid Al-Falah, P.E.C.H.S.,
Karachi, Pakistan.
Ph 4547201

Ref ________ Date ________

باسمہ تعالیٰ

الحمد للہ وحدہٗ والصلوٰۃ والسلام علیٰ من لا نبی بعدہٗ!

احقر کو یہ جان کر بے حد مسرت ہوئی کہ ماہنامہ حسن تدبیر دہلی کے خصوصی نمبر تسلسل کے ساتھ منظر عام پر آ رہے ہیں۔ اور اکابر دیوبندؒ کی حیات اور انکی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرنے اور ایسی نابغۂ روزگار ہستیوں کے تعارف اور تجدید دین و احیائے سنت سے متعلق انکی لازوال کوششوں اور کاوشوں سے امت مسلمہ کو آگاہ کرنے کا مؤثر ذریعہ بن رہے ہیں۔ امید ہے کہ ان خصوصی نمبرات و مجموعات کا تسلسل ان شاء اللہ تعالیٰ جاری رہیگا۔ اس عظیم الشان کام کا سہرا آل انڈیا تنظیم علمائے حق کے جنرل سکریٹری اور دیگر محترم اراکین حضرات کے سر جاتا ہے جو درحقیقت اپنے اسلاف اکابر اہل حق علمائے دیوبندؒ سے رشتہ استوار کرنے کی ایک منفرد اور مؤثر سعی بلیغ ہے۔ لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِأُولِي الْأَلْبَابِ۔ ان خصوصی نمبروں کے لئے ٹھوس علمی و تحقیقی مواد مہیا کرنے اور ان اکابرین کے مختلف گوشہ ہائے حیات کو اجاگر کرنے کے لئے اہل علم حضرات کے جذبہ کو مہمیز کرنے میں مخدوم محترم حضرت مولانا محمد اعجاز عرفی قاسمی زید مجدہم مدیر حسن تدبیر کا بہت بڑا دخل ہے، جنکی جہد مسلسل، محنت اور لگن کے بغیر یہ گنج ہائے گراں مایہ ہمارے ہاتھ لگنا مشکل تھا۔ جزاہ اللہ عنا وعن المسلمین خیر الجزاء۔ حضرت مولانا قاسمی مدظلہ نے گذشتہ برس احقر کو بعد لطف و عنایت دو نمبر پیش فرمائے، جو حضرت حکیم الامت مجدد الملت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب قاسمیؒ کی حیات و خدمات سے متعلق مضامین پر مشتمل تھے۔ اس سال جب حضرت سے ملاقات ہوئی تو آپ نے مزید ایک خصوصی نمبر عطا فرمایا جو فخر دیوبند حضرت مولانا انظر شاہ کشمیریؒ کے ذکر خیر پر مشتمل تھا دراصل یہ حضرت مولانا قاسمی صاحب کی محبت اور خلوص ہے اور احقر پر انکی کرم نوازی ہے۔ جسکے لئے ناچیز ان کا بے حد ممنون احسان ہے۔ ساتھ ہی آپ نے ایک خط بھی دیا جس میں چوتھے خصوصی نمبر کا ذکر تھا جو ان شاء اللہ حضرت امام العصر حافظ الاثر علامہ محمد انور شاہ کشمیری قدس اللہ سرہٗ کے ذکر خیر پر مشتمل ہوگا۔ یہ خوشخبری پاکر بڑی روحانی مسرت ہوئی۔ ساتھ ہی آپ نے اس خصوصی نمبر کے لئے احقر کو بھی کچھ تاثرات لکھ کر دینے کا حکم فرمایا، جس کے لئے یہ ظلوم و جہول اپنے اندر استعداد نہیں پاتا بلکہ یہ تہی دامن ہے، چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ یقیناً دور حاضر کے بعض ارباب فضل و کمال و اہل دانش و بینش فرد اسی صفت کے حامل اور اس پائے کے عالم و فاضل ہونگے جو حضرت امام العصر کشمیریؒ کی حیات مبارکہ پر ہر پہلو سے کما حقہٗ روشنی ڈال سکیں گے۔ احقر کو تو صرف یہی اشتیاق ہوا کہ پہلی فرصت میں جلد از جلد یہ شاہکار بھی منظر عام پر آجائے تاکہ ہم اس سے مستفید ہو سکیں۔ ساتھ ہی تعمیل حکم کے لئے ذیل میں چند سطور تحریر کرکے اپنے آپ کو اس نمبر کے لکھنے والوں میں شامل کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

حضرت امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہٗ کے تعمق و تبحر علمی، دقت نظر، وسعت و رفعت مطالعہ، برجستگی، بے پناہ ذہانت و ذکاوت، حاضر جوابی اور ان جیسی لاتعداد علمی خوبیاں و کمالات ہیں جن سے متعلق تحریری مواد فراہم کرنے کی جسارت وہی خوش نصیب حضرات کر سکیں گے جو کانوا احق بہا و اھلہا کا مصداق ہوں۔ اپنے اساتذہ و مشائخ کے ذریعہ زمانہ طالب علمی سے یہ بات کانوں میں پڑتی رہی کہ اسلام کی آخری پانچ صدیاں ایسی ہمہ جہت علمی اور بے مثال شخصیت پیش کرنے سے عاجز ہیں۔

Jamia Islamiyyah Talim ul Quran
Jamia Masjid Al-Falah, P.E.C.H.S.,
Karachi, Pakistan
Ph : 4547201

جامعۂ اسلامیہ تعلیم القرآن
جامع مسجد الفلاح، پی ای سی ایچ ایس، کراچی، پاکستان

Ref ____________ Date ____________

باسمہ تعالیٰ

علمِ حدیث اور متعلقاتِ حدیث سے شغف رکھنے والے اور برس ہا برس اس دشت کی سیاحی کرنے والے یہ جانتے ہیں کہ حضرت شاہ صاحبؒ کی شان کیسی ارفع و اعلیٰ تھی، معدوم النظیر تھی۔ اب خواہ وہ متعارض احادیث میں تطبیق کے اعتبار سے ہو یا قرآن و حدیث میں مطابقت کے اعتبار سے ہو، احادیث کا صحیح محمل بیان کرنے کے اعتبار سے ہو یا احادیث سے اُن فتنوں کا سدِ باب کرنے سے متعلق ہو جو اسلامی تعلیمات پر حملہ آور ہیں۔ فقہ حنفی کے ترجیحی دلائل کے اعتبار سے ہو یا حدیث کے فصاحتی و بلاغتی گوشوں کے انکشاف سے متعلق ہو، معترضین کے بے بنیاد دلائل کا احادیث کی روشنی میں رد اور ان کا مکمل تعقب ہو یا رجالِ احناف کی برتری و نزاہت کا بیان ہو، جا بجا نحو و صرف کے رموز و نکات ہوں یا لغت و ادبِ عربی میں دستگاہ ہو، اصولِ حدیث و اصولِ فقہ کے مباحث ہوں یا حدیث کے اعجازی پہلو کی اجاگری، تردیدِ مرزائیت و فتنۂ قادیانیت کی سرکوبی کے لیے ذخیرۂ احادیث سے یاقوت و مرجان کی جستجو ہو یا دیگر معاصر فتنوں کی تردید، غرض یہ کہ کہاں تک عرض کیا جائے کہ ہر ہر پہلو سے لکھنے والے تشنگی
اور ہر گوشہ سے اجاگر کرنے کی کوشش کریں گے۔ اتنا ضرور ہے کہ ایسی عہد ساز جامع ہر جہت اور مجتہدانہ شان رکھنے والی ہستی کے کارہائے نمایاں کا صرف ایک خصوصی ایڈیشن کے ذریعے احاطہ ممکن نہ ہو سکے گا، بلکہ ایک تعارفی جھلک پیش کی جا سکے گی۔ جبکہ بزبانِ اردو "حیاتِ انور" اور "نقشِ دوام" اور بزبانِ عربی "نفحۃ العنبر" جیسے بھی اپنی مہک اور رعنائیاں بکھیر رہی ہیں۔

اہلِ علم و دانش اور اربابِ فضل و کمال بخوبی اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ محض حسنِ عقیدت کے جذبہ سے مغلوب ہو کر مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیا جا رہا ہے، بلکہ حضرت الامام کشمیریؒ سے شرفِ تلمذ حاصل کرنے والے برس ہا برس میں ان کی بلندی پرواز کو نہ پا سکے تو ہم و شما کس شمار میں ہیں۔ متنبی نے جس کے لیے بھی کہا مگر احقر حضرت امام العصرؒ کی عبقری شخصیت کو اس شعر کے ذریعہ محسوس کرنے کی ناکام کوشش کر رہا ہے ؎

مَضَتِ الدُّهُورُ وَمَا أَتَيْنَ بِمِثْلِهِ
وَلَقَدْ أَتَى فَعَجَزْنَ عَنْ نُظَرَائِهِ

خاکپائے علمائے دیوبندؒ
(دستخط)

MADRASA ARABIA TAHFEEZ-UL-QURAN
JAMIA MASJID RAHMANIA

Phone: 4914858-4919023, Fax: 4919523

Mujahidabad, Gali No 8, K.M.C. Sports Complex, Kashmir Road, Karachi.

مدرسہ عربیہ تحفیظ القرآن جامع مسجد رحمانیہ

Ref ______ تاریخ ______

Date ______ حوالہ نمبر ______

مدرسہ عربیہ تحفیظ القرآن الکریم کراچی میں مولانا محمد اعجاز عرفان القاسمی
کی آمد پر ان سے گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ آل انڈیا تنظیم علمائے حق دہلی
کا ترجمان ماہنامہ حسن تدبیر کا آئندہ شمارہ امام العصر علامہ انورشاہ کشمیری
رحمۃ اللہ علیہ کی علمی خدمات اور محدثانہ کارناموں پر مشتمل ہوگا۔
اس سے پہلے بھی اکابر واسلاف کی خدمات سے آگاہ کرنے کا جو مبارک سلسلہ
تنظیم نے شروع کیا ہے وہ پوری امت کیلئے ایک مستحسن اقدام ہے
اب مولانا انورشاہ کشمیریؒ کے علمی عملی کمالات سے نئی نسل کو واقف کرانے
کیلئے حسن تدبیر کا جو خصوصی شمارہ آرہا ہے اس کیلئے میں دل کی گہرائیوں سے
ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں اور حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق
یہ عرض کرتے اس خصوصی شمارے کا سراپا منتظر ہوں

ناز ہو جس پر بصیرت کو وہ فرزانہ تھے آپ
واقعہ ہے بے بہا زندہ کتب خانہ تھے آپ

والسلام
مولانا قاری عبدالمنان انور
کراچی پاکستان
۱۴ شعبان
۱۴۳۰ھ

Reg. No. 772

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

AL-JAMEATUL ISLAMIAH QASIM-UL-ULOOM
Qasba Zamania, Distt. Ghazipur, U.P. (INDIA) Pin. 232329
S. Ahmed Shaheed Road, Madani Nagar, (Darsha)
Ph : 05497-252280 (M) 09415888218

الجامعۃ الاسلامیہ قاسم العلوم
قصبہ زمانیہ ضلع غازیپور
(یوپی) الہند

Ref. No

Date 19/01/2010

لفظ تبریک

دینی وعلمی حلقوں کے لئے یہ بات باعث مسرت ہے کہ آل انڈیا تنظیم علما حق کا ترجمان سہ ماہی ''حسن تدبیر'' امام العصر حضرت مولانا انور شاہ کشمیری پر خصوصی شمارہ شائع کرنے جارہا ہے۔ مشاہیر پر خصوصی نمبرات شائع کرنے کی وجہ سے سہ ماہی ''حسن تدبیر'' کا موجودہ اردو صحافت میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ علامہ انور شاہ صاحب اپنی عبقریت۔ وسعت مطالعہ اور تعمق علمی جیسی خداداد صلاحیت کی وجہ نابغہ روزگار شخصیات میں سے ہیں میں ایسی اہم اور عبقری شخصیت پر خصوصی نمبر کی اشاعت پر آل انڈیا تنظیم علما حق کے صدر مولانا اعجاز عرفی قاسمی صاحب کو تمام فضلا دیوبند اور اپنی طرف سے دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آئندہ مشاہیر پر خصوصی اشاعتوں کے ذریعہ اپنی نوجوان نسلوں اسلاف کی سوانح سے شادکام کرتے رہے گے۔

فقط

محمد ازہر اسعدی

مولانا محمد ازہر اسعدی
الجامعۃ الاسلامیہ قاسم العلوم
قصبہ زمانیہ غازی پور

باب
امام العصر

زندہ کتب تھے آپ

مولانا محمد اعجاز عرفی قاسمی

سید انور شاہ فخر دینِ حق بحر العلوم — دور حاضر میں دلیل الصحابہ کالنجوم

درحقیقت دانش آگاہ احادیث رسول — منکشف تھے آپ پر سب قرنِ اوّل کے اصول

ترمذی، مسلم، بخاری کے مثیل بے مثال — فیض یابِ درس حکمت فخر اربابِ کمال

عمر بھر یوں خدمتِ اسلام فرماتے رہے — دین ابراہیم کے اسرار سمجھاتے رہے

روح پر عرفان ختم المرسلین طاری رہا — علم دین کی پروش کو ہر نفسی جاری رہا

ناز ہو جس پر بصیرت کو وہ فرزانہ تھے آپ — معدن علم و ہنر زندہ کتب خانہ تھے آ

ذہن میں روشن تھے کتنے جزئیات وکلیات — آپ کے دم سے ملی شانِ اکابر کو حیات

عہد ختم المرسلین کا سب کو شیدا کردیا — مسئلہ ختمِ نبوت کا ہویدا کردیا

عارضی پرنور تھا خورشید افلاکِ کمال — حق نے بخشا آپ کو ایسا عروج بے مثال

آئینہ خورشید انور کو دکھا سکتا نہیں

خامۂ عرفیؔ بھی اس رفعت کو پاسکتا نہیں

دیوبند کی علمی تاریخ نہایت زریں رہی ہے۔ دیوبند نے ایسے دانائے راز اور نابغہ روزگار شخصتیں پیدا کی ہیں کہ ہر شخصیت اپنی ذات میں آفتاب ومہتاب ہے۔ کوئی بھی شعبہ حیات ہو علمائے دیوبند کے تفوق اور عظمت کے نشانات بآسانی تلاش کیے جاسکتے ہیں خاص طور پر مذہبی علوم اور ادبیات کے باب میں علمائے دیوبند کی خدمات آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔

اسی سلسلہ علم وفضل کی ایک تابناک کڑی علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی شخصیت بھی تھی۔ جن کی موجودگی نے دیوبند کی علمی تابناکی میں نہ صرف اضافہ کیا بلکہ ان کی وجہ سے دیوبند کو ان علاقوں اور ان ذی علم شخصیتوں میں بھی عظمت وشہرت نصیب ہوئی جو دیوبند سے فکری اور لسانی اعتبار سے نہ صرف نامانوس اور اجنبی بلکہ کسی حد تک متنفر بھی تھے۔ دیوبند کی دانش گاہ کے علماء کو غریب عجمی سمجھ کر نظر انداز کرنے والے عرب علماء نے بھی علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی وسعت علمی اور کشادہ نظری کا برملا اعتراف کیا۔ علامہ علی یمنی مصری جو حنبلی تھے اور علماء دیوبند کو علمی اور لسانی اعتبار سے حقیر وفقیر سمجھتے تھے انہوں نے جب علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے درس میں شرکت کی اور حدیث کے نکات سنے تو یہ کہا:

> ''میں نے شام سے ہندوستان تک کا سفر کیا اکثر بلاد اسلامیہ کی سیاحت کر چکا ہوں خود مصر میں صحیحین کا درس دیا لیکن اس شان کا عالم میری نظر سے نہیں گذرا۔ میں نے انہیں خاموش کرنے کی بہت کوشش کی مگر ان کا ضبط واتقان تبحر وجامعیت بے نظیر ہے''۔

انہوں نے یہ بھی کہا کہ اگر میں یہ قسم کھا کے کہوں کہ وہ ابو حنیفہ سے بڑے عالم ہیں تو میں حانث نہیں ہوں گا

اور سچ یہ ہے کہ علامہ انور شاہ کشمیریؒ اپنے عہد کے امام زہری تھے حافظہ اتنا قوی تھا کہ جو عبارت ایک بار نظر سے گذر جاتی وہ حافظہ سے برسوں محو نہیں ہوتی تھی وہ چلتا پھرتا کتب خانہ تھے علامہ شبیر عثمانی جیسی شخصیت نے علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی علمی عظمت کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا تھا مصر اور شام کے لوگ اگر مجھ سے پوچھیں کہ کیا تم نے ابن حجر عسقلانیؒ شیخ تقی الدین ابن دقیق العید، شیخ عز الدین بن عبد السلام کو دیکھا ہے تو میں یہ کہتا کہ ہاں، کیوں کہ میں نے علامہ انور شاہ کشمیریؒ کو دیکھا ہے صرف زمانے کا فرق ہے باقی سب خوبیاں وہی ہیں جو ان بزرگوں کی ذات میں ہیں اور جب شاہ صاحب کی وفات ہوئی تو محسوس ہوا کہ آج ابن حجر عسقلانی ،شیخ تقی الدین، اور شیخ عز الدین انتقال فرما گئے۔

اور حقیقت یہی ہے کہ علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا علمی مقام اتنا بلند تھا کہ پرانے دور کے علماء کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ صحیح معنوں میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ اسلاف کی علمی وراثت کے سچے امین تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر مشرق علامہ اقبالؒ جیسی شخصیت نے جنہوں نے مغربی مفکرین اور مشرقی دانشوروں کے افکار کا نہایت گہرائی سے مطالعہ کیا تھا، قدیم و جدید علوم پر ان کی گہری نظر تھی، گوئٹے اور برگساں جیسے مفکرین کا مطالعہ کیا تھا انہوں نے بھی یہ اعتراف کیا کہ اسلامی تاریخ کے گذشتہ پانچ سو برسوں میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ جیسی شخصیت پیدا نہیں ہوئی۔ مولانا اشرف تھانویؒ جیسے عالم دین نے بھی یہ تسلیم کیا کہ علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے ایک ایک جملے میں جہان معنی آباد ہے ان کا ہر جملہ ایک کتاب ہے۔ علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی علمی عظمت اور رفعت کا یہ حال تھا کہ مشہور مصری عالم علامہ رشید رضا مصری نے یہ کہا کہ میں نے ان سے زیادہ ممتاز عالم نہیں دیکھا اور دیوبند سے عقیدت کی ایک وجہ علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی عظمت بھی تھی ایک شخصیت سے تاثر نے پورے دیوبند کے تعلق سے ان کے نظریے کو تبدیل کر دیا انہوں نے مصر پہنچنے کے بعد اپنے مشہور رسالہ 'المنار' میں یہ لکھا کہ اگر ہندوستان میں دار العلوم نہ دیکھتا تو یقیناً اس ملک سے مایوس واپس آتا۔

یہ اعترافات مبالغے پر مبنی نہیں ہیں اس میں سچائی ہے کہ علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی ذات وقعتاً ایسی تھی کہ ہر شخص کو ان کی ذات، علم و عمل کا مجسم پیکر نظر آتی۔ انہوں نے جہاں مشکلات القرآن جیسی کتاب لکھی، فیض الباری اور انوار الباری جیسی کتابیں ان کے علمی تبحر کا ثبوت ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ ہمہ وقت نئے نکتوں کی جستجو میں رہتے تھے اور ان کا مطالعہ اتنا وسیع اور ہمہ گیر تھا کہ اکثر مصری مطبوعات سے انہیں محرومی کا احساس ہوتا کہ ان میں کوئی نئی بات نہیں ملی

یہی وجہ ہے کہ انہوں نے حدیث اور قرآن اور ان کے متعلقات کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیشہ نئے نکتے نکالے اور اپنی تحقیقات انیقہ سے علمی دنیا کو متحیر کیا۔

علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا ظاہر بھی تاباں تھا اور باطن بھی منور، باطن کی رعنائی اور شادابی چہرے پر یوں نمایاں تھی کہ اکثر لوگوں کو اس چہرے میں اسلام کا روشن منور اور متبسم چہرہ نظر آتا بہت سے غیر مسلموں نے تو ان کے نورانی چہرے کو دیکھ کر اپنے دامن کو اسلامی نور سے بھر لیا تھا۔ ایک ایسا چہرہ جو قبول اسلام کی سند بن جائے اور جس کی کشش غیر مسلموں کو اپنا مرکز و محور تبدیل کرنے پر مجبور کر دے وہ شخصیت کتنی عظیم ہوگی۔ کمالات انوری میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ مولانا علامہ انور شاہ کشمیریؒ وزیر آباد ریلوے اسٹیشن پر ٹرین کا انتظار کر رہے تھے ان کے تلامذہ اور معتقدین انہیں گھیرے ہوئے تھے اسی دوران ایک غیر مسلم اسٹیشن ماسٹر کا ادھر سے گذر ہوا اس کے ہاتھوں میں ایک لیمپ تھا انور شاہ کشمیری کو دیکھتے ہی رکا اور ان کے چہرے کو بغور دیکھنے لگا اور پھر گویا ہوا کہ جس مذہب سے اس عالم کا تعلق ہے وہ مذہب غلط نہیں ہوسکتا اور تبھی اس نے اسلام قبول کرلیا۔ ان کے نورانی چہرے میں اسلام کی صداقت اور عظمت پنہاں تھی اسی لئے حکیم الامت نے ایک بار یہ فرمایا تھا کہ میرے نزدیک اسلام کی حقانیت کے دلائل میں سے موجودہ وقت میں مولانا انور شاہ کا مسلمان ہونا ہے، یہ اتنے بڑے عالم ہیں کہ اگر اسلام میں کہیں اور کسی جگہ بھی کجی ہوتی تو اسلام کو چھوڑ دیتے اور جب یہ اسلام پر ہیں تو یقیناً یہ اسلام کی صداقت کی ایک دلیل ہے‘‘

انور شاہ کشمیری کی شخصیت ایسی تھی جن پر صدیاں ناز کرسکتی ہیں اور ایسی شخصیتوں کے بارے میں گویا شاعر نے کہا تھا

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پے روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیداور پیدا

دیوبند کے اس دیدہ ور نے پوری علمی دنیا کو اپنی تحقیقات، تصنیفات اور اپنے تفردات سے متاثر کیا اور ان کی علمی عظمت دیوبند کی عالمی شناخت کا حوالہ بنی مگر المیہ یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند نے ایسی شخصیت کو بھی فراموش کر دیا اور ان کے مآثر علمی اور تحقیقی کی اشاعت تو دور کی بات رہی، ان کے تعلق سے کوئی ایسا کام نہیں کیا گیا کہ جس سے اندازہ ہو کہ دیوبند میں ایک ایسی شخصیت بھی تھی جن کا علم بقول حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب متقدمین کی یاد تازہ کرتا تھا تو ان کا عمل سلف صالحین کو زندہ کئے ہوئے تھا اور اسوہ سلف کے لیے نمونہ ساز تھا، علم حافظہ تقوی طہارت

اور زہد وقناعت مثالی تھی اور جن کے بارے میں مولانا حبیب الرحمٰن نے کہا تھا کہ شاہ صاحب کا دماغ تو ایک کتب خانہ ہے جس علم کی جس وقت کوئی کتاب اپنے دماغ کے کتب خانہ سے اٹھانا چاہتے ہیں اٹھا لیتے ہیں ایسے قوی الحافظہ افراد بہت کم ہیں جو کتاب کا سرسری مطالعہ کر کے پندرہ سال تک بقیدِ صفحات محفوظ رکھ پاتے ہوں۔

ان کی عظمت کا ایک ثبوت وہ تلامذہ بھی ہیں جو پوری دنیا میں علم وفضل کی روشنی پھیلا رہے ہیں اور جن میں ہر شخص روشن ستارے کی مانند ہیں، مفتی محمد شفیع، مولانا محمد ادریس کاندھلوی، مولانا بدر عالم میرٹھی، مولانا سید مناظر احسن گیلانی، مولانا یوسف بن بنوری، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، قاری محمد طیب اور مولانا محمد چراغ جن کے بارے میں مشہور ہے کہ مولانا مودودی کی اکثر نگارشات کا مسالہ مولانا ہی کے زنبیل علم کا اندوختہ ہے ان تمام مشاہیر نے علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی حکمت ودانش سے ہی فیض حاصل کیا ہے۔

علامہ انور شاہ کشمیریؒ ایک وسیع النظر عالم دین تھے جنہیں مختلف علوم پر گہرا ادراک تھا جنہوں نے اپنی تحقیق کے ذریعہ ثابت کیا کہ نیوٹن کا فلسفہ زمان ومکان عراقی کی تصنیف غایۃ الامکان فی درائیۃ الامکان سے ماخوذ ہے اس طرح کی اور بھی تحقیقات ہیں جو تفصیل طلب۔

مولانا انور شاہ کشمیری کی شخصیت ایسی ہے جو صدیوں میں پیدا ہوتی ہے۔ وہ دیوبند کی علمی عظمت کا ایک روشن حوالہ تھے اس لئے ان کی شخصیت پر ایک ضخیم شمارے کی ضرورت عرصہ سے محسوس کی جارہی تھی خدا کا شکر ہے کہ حسن تدبیر کو یہ سعادت نصیب ہوئی اور حسن تدبیر کا ایک شمارہ ان کی علمی خدمات کے حوالے سے مرتب کیا گیا جس میں اکابر علماء اور مشاہیر کے مقتدر مضامین شامل ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ان مضامین سے انور شناسی کی ایک نئی راہ روشن ہوگی اور وہ افراد جو علامہ کی علمی جلالت سے آگاہ نہیں ہیں انہیں بھی حسن تدبیر کے وسیلے سے علامہ کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں سے شناسائی ہوگی۔ یہ شمارہ اس اعتراف کے ساتھ قارئین کی خدمت میں پیش ہے کہ:

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

محمد اعجاز عرفی قاسمی
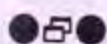
حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ

نسیم اختر شاہ قیصر - استاذ دارالعلوم وقف دیوبند

دارالعلوم اور عبقری شخصیات کا چولی دامن کا ساتھ ہے اس دینی وعلمی ادارے کو بارہ گاہ الٰہی میں قبول کا جو شرف حاصل ہوا وہ ہر ادارہ کی قسمت نہ بن سکا ابتداء ہی سے ایسی نابغۂ روزگار ہستیاں اس سے وابستہ رہیں کہ ایک زمانہ ان کا علم وفضل، استعداد وکمال، تقویٰ وطہارت، حزم واحتیاط، عزم واستقلال، ثبات واستقامت کا قائل رہا ہے۔ جو گوہر آبدار اس کی آغوش میں پل بڑھ کر اطراف عالم میں پھیلے ان کے نام کی اگر فہرست ہی ترتیب دی جائے تو کافی صفحات درکار ہیں۔ یہ سارا سلسلہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے شروع ہوتا ہے اور پھر حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، فقیہ وقت حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، ولی کامل حضرت مولانا یعقوب نانوتویؒ، عارف باللہ حضرت حاجی عابد حسینؒ، حضرت شاہ رفیع الدینؒ سے ہوتا ہوا حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ تک پہنچتا ہے اور یہاں سے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی، شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علیؒ، حضرت علامہ ابراہیم بلیاویؒ، عارف کامل حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ وغیرہ کے ایسے نام ہیں جو زمانہ ساز بھی ہیں اور شخصیت ساز بھی، انہی کے دامن علم سے لپٹ کر محدث کبیر حضرت مولانا بدر عالم میرٹھیؒ، حضرت مولانا یوسف بنوریؒ، حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، مفکر ملت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ، حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ، حضرت مولانا سید احمد رضا بجنوریؒ صاحب انوار الباری۔ حضرت مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی، حضرت مولانا حامد الانصاری غازیؒ، حضرت مولانا منظور نعمانیؒ، حضرت مولانا محمد میاں دیوبندیؒ، مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاریؒ، رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ، مفسر قرآن حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب دیوبندیؒ، حضرت مولانا ادریس کاندھلویؒ، جیسے رجال کار اور جبال علم منظر عام پر آئے۔

حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ علوم و معارف، فضل و کمال اور بے مثال قوت حفظ کے مالک ہیں اور اپنے معاصرین میں ان کا پایہ بے حد بلند ہے اپنی زندگی میں ہی انہیں اکابر و اساتذہ کا اعتماد حاصل ہوا جیسے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ اور حضرت مولانا حافظ احمد صاحبؒ نے قدم قدم پر علامہ کے علوم و کمالات کا اعتراف کیا۔ ۱۳۵۲ھ میں حضرت شاہ صاحبؒ کا انتقال ہوا اس وقت سے لے کر آج تک ان کی کافی سوانح منظر عام پر آچکی ہیں اور ان کی ذات و خدمات پر لاتعداد وقیع اور گراں قدر مقالات چھپ چکے اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ برادر مکرم مولانا اعجاز احمد عرفی قاسمی متحرک اور فعال انسان ہیں۔ تنظیم علمائے حق کے صدر اور بانی ہیں اور اس تنظیم نے تحریک مدارس کے ساتھ ساتھ فلاحی اور سماجی کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی قدم رکھا اور کافی کتابیں نامور اہل قلم کی یہ تنظیم شائع کر چکی ہے۔ شاہ صاحبؒ کے خانوادہ سے ان کا قلبی اور روحانی تعلق ہے جس کا عملی اظہار گاہے گاہے ہوتا رہتا ہے۔ تنظیم کا سہ ماہی پرچہ ''حسن تدبیر'' اس سے قبل حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ پر ضخیم نمبر نکال چکا ہے۔ جن کو مقبولیت عام حاصل ہوئی اور افادیت کو تسلیم کیا گیا سال گزشتہ حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیریؒ پر بھی وہ ایک ضخیم اور قیمتی پیشکش ''شاہ صاحب نمبر'' کی صورت میں منظر عام پر لا چکے ہیں۔ جو لگ بھگ پانچ سو صفحات پر مشتمل تھی۔ ''حسن تدبیر'' کا موجودہ نمبر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی بلند پایہ شخصیت کا احاطہ کرنے کی کوشش ہے۔ جس میں ہندو پاک کے موجودہ اور مرحوم نامور اہل قلم اور علمائے کرام کے مقالات و مضامین شامل ہیں۔ حضرت علامہؒ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اس نمبر میں بآسانی پڑھا اور سمجھا جا سکتا ہے اور نئی نسل تک ان کی عظیم اور ناقابل فراموش خدمات و شخصیت کو پہنچانے کا یہ بڑا کارآمد اور مفید سلسلہ ہے زر کثیر کے صرفہ کے بعد مولانا اعجاز صاحب قاسمی یہ نمبر لانے میں کامیاب ہوئے ہیں خدا ان کی محنت اور اخلاص کو قبول فرمائے۔ یوں تو حضرت شاہ صاحبؒ پر کافی کام ہوا ہے اور یہ بات بلا تامل کہی جا سکتی ہے کہ ان کی جتنی سوانح حیات لکھی گئیں اکابر دیوبند میں سے کسی اور پر اتنا کام نہ ہوا مگر یہ بھی ایک سچائی ہے کہ حضرت علامہ کے علوم و معارف افادات اور امالی پر کام کرنے کی ضرورت ہے اس لیے کہ ان کی تصانیف اور تالیفات پر زیادہ کام نہیں ہوسکا مثال کے طور پر علامہ کی وہ چند سوانح جن تک ہماری رسائی ہوسکی یا ہمارے علم میں آسکیں، ان میں سے چند یہ ہیں۔

نفحۃ العنبر از مولانا یوسف بنوریؒ، حیات انور از مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصرؒ، حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ، حیات اور علمی کارنامے از ڈاکٹر رضوان اللہ، انوار انوری از مولانا محمد انوری لائل پوری، نقش

دوام از محدث جلیل حضرت مولانا سید انظر شاہ مسعودی کشمیریؒ، تصویر انور از محدث جلیل حضرت مولانا سید انظر شاہ مسعودی کشمیریؒ، الانور از عبدالرحمٰن کوندو، تجلیات انور از اوقاف ٹرسٹ حکومت جموں و کشمیر، علامہ محمد انظر شاہ کشمیریؒ از ڈاکٹر سید فاروق سری نگر کشمیر، علامہ محمد انور شاہ کشمیری از مولانا عبدالقیوم حقانی پاکستان، سیرت انور از مولانا مسعود احمد قاسمی، حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ، ہشت پہلو شخصیت کے آئینے میں از مولانا عبدالرشید بستوی، استاذ اکبر از حضرت مولانا حامد الانصاری غازی (ایک طویل مقالہ جو کتابی صورت میں شائع ہوا) مولانا عتیق احمد دیوبندی، مدیر رسالہ دارالعلوم کی تحریر کردہ سوانح جو نایاب ہے۔ ان کے علاوہ انگریزی اور دیگر زبانوں میں بھی حضرت شاہ صاحب کی سوانح عمریاں شائع ہوئیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے، حضرت امام العصر کے سوانحی گوشوں پر کافی کام ہوا ہے اور ایک لمبے وقت کے بعد اب مولانا اعجاز احمد قاسمی کی ہمت مردانہ کا ثبوت ''حسن تدبیر'' کا یہ خوبصورت نمبر ہے۔ مولانا اعجاز صاحب صرف حلقۂ انوری کے ہی محسن نہیں بلکہ وہ خاندان انوری کے بھی کرم فرما ہیں کہ انہوں نے اس جانب توجہ کی ہم ان کے شکر گزار ہیں اور ان کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے دونوں صاحبزادوں کے اس دنیا سے گزرنے کے بعد گمان غالب یہ تھا کہ حضرت شاہ صاحبؒ پر کام کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا، مگر یہ علم کی قدر دانی اور حضرت شاہ صاحبؒ کی بلند مرتبہ شخصیت کا اظہار ہے کہ مولانا اعجاز احمد قاسمی نے اس سمت میں قدم بڑھایا اور شب و روز کی محنت شاقہ کے بعد یہ نمبر آپ تک پہنچ رہا ہے۔ آج جماعت دیوبند، حلقۂ دیوبند اور خاندان انوری کا ہر فرد ان کا ممنون کرم ہے۔ خدا ان کے کاموں کو قبول فرمائے اور مزید کام کی توفیق ارزانی فرمائے۔ آمین

موجودہ دور میں اہل قلم سے مضامین لکھوانا یا مقالات لکھنے پر انہیں آمادہ کر لینا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے ایک تو وقت کی تنگی دوسرے معاش اور روزگار کے مسائل نے سبھی کے قدموں میں بیڑیاں ڈال دی ہیں اور بہت سے حضرات کوشش کے باوجود کام نہیں کر پاتے ایسے عالم میں پانچ سو صفحات کا نمبر نکال لینا ایک کارنامہ ہے جس کو سراہنا چاہیے اور جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے وہ کم ہے مولانا اعجاز احمد قاسمی بڑے سلیقے اور ترتیب کے ساتھ اپنے کام انجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں خود صاحب اسلوب قلم کار ہیں اور ان کی شستہ اور رواں تحریریں علمی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں ان کی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت وہ تمام نمبر اور کتابیں ہیں جو تنظیم علمائے حق کی جانب سے منظر عام پر آ چکی ہیں، مجھے یقین ہے کہ جس کام کا انہوں نے آغاز کیا ہے وہ ابھی آغاز ہی ہے انشاء اللہ انتہا کی طرف بھی ان کا سفر جاری رہے گا۔

●□●

حُسن و جمال اور فضل و کمال کی سرزمین

کشمیر

حضرت مولانا انظر شاہ کشمیری

حضرت شاہ صاحب مرحوم کا آبائی وطن وہی کشمیر ہے جو اپنے حسن و جمال، رعنائی و کشش، جاذبیت و دلکشی، شبابی و شادابی میں عالمی شہرت رکھتا ہے۔ جس کی پرُحسن فضا، دوڑتے ہوئے دریا، اچھلتا ہوا پانی، چشموں کی فراوانی، نکہت گل کی کثرت، پھلوں کی بہتات، آب و ہوا کی خوشگواری، مناظر کا حسن، قدیم زمانہ سے سیاحوں کے دامن دل کو اپنی جانب کھینچتا رہا۔ بادشاہوں نے یہاں پر بارعیش کھولا اور خانقاہ بدوش صوفیا اس کے جمال دل افروز میں پا گرفتہ۔ یہ وہی کشمیر ہے جس کی مدح و ثناء میں فارسی شاعری کے طناز و نغز گو عرفی شیرازی نے یہ کہہ کر وادی کے صحت افزاء، خوشگوار ماحول کو مستند کردیا۔

ہر سوختہ جانیکہ بہ کشمیر در آید گر مرغ کباب بست بابل و پر آید

یہ وہی کشمیر ہے جس نے حضرت سید علی ہمدانی اور میر سید کرمانی کے قدم روک لیے، یہ وہی کشمیر ہے جس کے لالہ زاروں سے پنڈت جواہر لال نہرو کا خاندان، ڈاکٹر محمد اقبال، سر تیج بہادر سپرو، پنڈت ہردے ناتھ کنزرو، اور خدا جانے علم و فن اور دانش و بینش کے ترشے ہوئے کتنے نگینے انگشتری کمال پر اس طرح جمائے گئے جس سے کمال نے فروغ حاصل کیا۔ ہندوستان کا سپرو خاندان، کنزرو، کچلو، نہرو، اسی وادی کے وہ گل و لالہ ہیں، جو صدیوں سے ہندوستان کی زندگی کی بہار، اس کے پھولوں کا حسن اور برگ گل کی نظافت بنے ہوئے ہیں، اگر وطن کی خصوصیات ابنائے وطن پر مرتب ہوتی ہیں تو اہل کشمیر میں وہ خوبیاں اور رعنائیاں بہ قوت موجود ہوں گی جن سے اس حسین وادی کی فضائیں معمور ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ کشمیر کے اکثر و بیشتر خاندان دوسرے ممالک سے آکر یہاں مقیم ہوئے اور ہمیشہ یہیں کے ہو رہے۔ خود حضرت شاہ صاحب کے آباء بغداد سے اٹھے لاہور و ملتان ہوتے ہوئے وادی لولاب، مظفر

آباد اور ریاست کے طول وعرض میں پھیل گئے۔ پھر اس خانوادہ کی کچھ شاخیں ہندوستان میں دیو بند اور پاکستان میں لاہور، ملتان وغیرہ میں منتقل ہوئیں۔ مناسب ہے کہ اس سوانحی خاکہ میں مرحوم کے وطن مالوف کے متعلق کچھ تفصیلات تحریر کردی جائیں۔ ہندوستان کے شمالی سرحدی حصہ پر جہاں یہ وادی موجود ہے وہیں سوویت یونین (روس) تبت اور چین کی سرحدیں اس کے حسن کو چھونے کے لیے آگے بڑھ رہی ہیں۔ یہ وادی تیرہ اضلاع میں تقسیم ہے۔ اسلامی عہد عروج کے مشہور خلیفہ ولید کے زمانہ میں جب کابل اور ترکستان مقبوضات اسلامی میں شریک ہوئے تو مجاہدین کی نگاہوں نے دوسرے کشمیر کے حسن و جمال کو جھانک کر دیکھا اور نصر بن سیار سب سے پہلا وہ شخص ہے جس نے اپنے گھوڑوں کو گلگت اور کاشغر کے میدانوں تک پہنچادیا۔ لیکن حسینۂ کشمیر سے ہم آغوشی کی سعادت اس فاتح اول کی تقدیر میں نہیں تھی۔ ہندوستان میں اسلامی فتوحات کا معمار و مؤسس عرب کے ریگ زاروں سے ایک آندھی کی طرح اٹھا سندھ کو روندتے ہوئے پنجاب میں داخل ہوا۔ یہاں کے دریاؤں کی موجوں نے اسے ملتان میں پہونچا دیا۔ وہی ملتان جس کے متعلق کسی ظریف نے کہا ہے۔

چہار چیز است تحفۂ ملتاں　　　گردو گرما، گدا و گورستاں

ملتان کے خشک علاقے اور یہاں کی بادسموم نے محمد بن قاسم کے قلب و دماغ میں کسی شاداب مرغزار کی جستجو پیدا کی تو ہندوستان کے طول وعرض نے وادی کشمیر کو آرزوؤں کے مطابق اس کے سامنے پیش کیا۔ اس سپہ سالار نے اپنی ظفر موج فوجوں کو وادی کے دروازے پر لا کھڑا کیا لیکن تاریخ کی ستم رانیاں محمد بن قاسم جس نے سندھ سے لے کر ملتان فتح مندی کے پھریرے اڑائے تھے اپنی انفرادیت کا بار انقلاب زمانے سے چور چور کمر پر اٹھائے ہوئے جہاں سے آیا تھا وہیں لوٹ گیا۔ پھر حصار غزنی سے وہ جیالا انسان چلا جسے تاریخ محمود غزنوی کے نام سے جانتی ہے اور جس کے حادثۂ رحلت پر فرخی شاعر نے یہ کہہ کر تڑپا دیا تھا۔

شہر غزنی نہ ہمانست کہ دیدم پار

جس کے عہد میں فردوسی شاعر کا تخلیقی کارنامہ یعنی ''شاہنامہ'' کائنات شاعری میں ایک فاتح کی حیثیت سے علم وادب کی بہت سی آبادیوں کو آج تک اپنا باج گزار کیے ہوئے ہے لیکن محمود غزنوی کی ترک تازیاں بھی اس حسن و جمال کی وادی کو پوری طرح مسخر نہ کرسکیں تا کہ آنکہ تیرہویں صدی عیسویں میں شاہ میر نے وادئ کشمیر پر کامیاب حملہ کیا اور کوٹہ رانی کے خاندان کو نظر بند کر کے دوسو سال تک وادی کو اپنے زیر نگیں رکھا۔ پھر پندرہویں صدی عیسویں میں سکندر مرزا، زین العابدین، حیدر

شاہ، فتح شاہ، مرزا حیدر، قاضی خان اور بہت سے سلاطین اس وادی پر حکومت کرتے رہے۔ سترہویں صدی عیسوی میں احمد شاہ درانی کشمیر میں داخل ہوا اور وادی اس خاندان کے زیر سلطنت علاقوں میں شریک ہوگئی۔ اٹھارہ سوانیس عیسوی میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے آخری افغان گورنر جبار خان کو شکست دے کر کشمیر کو سکھوں کا مقبوضہ علاقہ بنالیا پھر عالمی سیاست کا شاطر یعنی فرنگی اقتدار کشمیر کی طرف متوجہ ہوا اور سبھر اؤں کے مقام پر سکھوں کی بچی کھچی طاقت کو توڑتا ہوا کشمیر تک جا پہنچا۔ انگریز کے لیے کشمیر پر اقتدار اس لیے ضروری تھا کہ یہی وادی دنیا کی دو بڑی حکومتوں کے لیے ایک بہترین دراوزہ ہے جس سے گزر کر یہ دونوں حکومتیں برطانوی زیر اقتدار علاقہ یعنی ہندوستان میں بہ آسانی پہنچ سکتی تھیں لیکن انگریز شہنشاہی مزاج سے زیادہ سیاسی شعبدہ بازیوں میں شمہور قوم ہے۔ وہ خرید و فروخت سے ریاستی حدود میں بھی باز نہ رہی اور کشمیر کو کل پچھتر لاکھ روپے کے عوض فروخت کرڈالا۔ حقیقی اقتداب انگریز کا تھا اور برائے نام راج گلاب سنگھ کا، ۱۸۴۶ء میں ایک معاہدہ کے تحت کشمیر پر مہاراجہ گلاب سنگھ کے زیر نگیں ڈوگرہ راج کا بھرپور تسلط قائم ہوگیا۔ یہ ریاست اپنی شدی فلاکت، جہالت اور عوام کی شعوری ناپختگی کی بناء پر غلامی کی طویل زندگی گزارتی رہی۔ کچھ نوجوان کشمیر سے باہر نکلے اور ہندوستان میں آزادی کی اس تڑپ کا براہ راست مطالعہ کیا جو عام ہندوستانیوں کے دلوں میں برطانوی ڈپلومیسی کے خلاف موج زن تھی۔ یہ حریت کے جذبات لے کر کشمیر پہنچے لیکن انہیں کام کرنے کی راہ اور کوئی واضح نصب العین نظر نہیں آتا تھا۔ خس و خاشاک جمع ہوجاتا ہے تو ایک چنگاری بھی اسے آتش فشاں بنانے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ طویل استبداد اور ڈوگرا شاہی کی غیر منصفانہ پالیسی نے جو متشددانہ آمریت کے روپ میں ابھر کر سامنے آئی تھی کشمیری عوام کے ذہنوں میں اتھل پتھل پیدا کردی تھی اتفاقاً ایک خاص موقع پر ایک نوجوان نے اپنے آتشیں جذبات کو اگل دیا۔ ڈوگرا شاہی اس خانساماں کے خلاف حرکت میں آگئی۔ دوسری جانب وہ تلاطم جو ابھی تک دماغوں میں بند تھا سیلاب بن کر کشمیر کے طول وعرض میں اچھلنے لگا۔ مولانا محمد سعید مسعودی، شیخ عبداللہ، بخشی غلام محمد، مرزا افضل بیگ محمد قاسم، محی الدین، میر صادق اور دوسرے پر جوش نوجوان ولولۂ قیادت کے ساتھ سامنے آئے اور راج شاہی سے کشمیر میں براہ راست تصادم کا آغاز ہوگیا۔ نیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی گئی، جس کے لیڈر شیخ عبداللہ موجودہ وزیر اعلی کشمیر، تحریک کا دماغ مولانا محمد سعید مسعودی اور دوسرے ارکان تحریک کے اعضاء تھے۔ بہ تدریج نیشنل کانفرنس کے تعلقات انڈین نیشنل کانگریس سے پیدا ہوئے اور آنجہانی جواہر لال نہرو نے اپنی وطنی تعلق کی بناء پر کشمیر کی تحریک آزادی کو استحکام دیا۔ وہ وقت بھی آیا کہ جواہر لال کے لیے کشمیر کے دروازے بند کردیئے

گئے اور وہ قانون شکنی کرتے ہوئے حدود کشمیر میں درانہ گھس گئے جب کہ ڈوگرا شاہی فوج کی سنگینوں سے جواہر لال کا چہرہ بھی لہولہان ہوگیا۔اس دوران نیشنل کانفرنس کو معطل کرنے کے لیے مسلم مجلس کا قیام عمل میں آیا۔شیخ اور ان کی پارٹی کے افراد بار بار قید و بند کی صعوبتوں سے دوچار ہوئے اور بالآخر ۱۹۴۷ء میں جب انڈین نیشنل کانگریس نے برطانیہ سے براہ راست ''ہندوستان چھوڑ دو'' کا مطالبہ کیا تو نیشنل کانفرنس نے بھی اسی لب ولہجہ میں ڈوگرا شاہی سے 'کشمیر چھوڑ دو'' کا مطالبہ کردیا۔ہندستان آزاد ہوا نقشۂ عالم پر دونئی سلطنتیں ہندو پاکستان کے نام سے ابھر آئیں۔حالات کی سنگینی نے ڈوگرہ راج کو بھی کشمیر آزاد کرنے کے لیے مجبور کیا۔عوامی حکومت بہ قیادت شیخ عبداللہ سامنے آئی اور پھر بخشی غلام محمد،میر قاسم،میر صادق وغیرہ کی وزارتیں بنتی اور ٹوٹتی رہیں اور اب جبکہ یہ سطور زیر قلم ہیں تو کشمیر میں شیخ عبداللہ کی وزارت اعلیٰ قائم ہے۔حضرت شاہ صاحب مرحوم کا تعلق کشمیر کی اس وادئ لولاب سے ہے جس کے قدرتی حسین مناظر کی تعریف میں حکیم مشرق اقبال نے ایک طویل نظم کہی ہے۔تحصیل ہندوارہ ضلع بارہ مولا کے ایک موضع ''ورنو'' میں ان کے والد مرحوم کا سکونتی مکان ہے اس قریہ تک پہنچنے کے لیے' کپواڑہ'' سے اب براہ بس سفر کرنا پڑتا ہے جب کہ عوامی وزارتوں سے پہلے گھوڑوں پر سفر کیا جاتا تھا۔ورنو کے قریب سوگام ہے جو چنار کے درختوں سے ڈھکی ہوئی ایک نہایت حسین بستی ہے۔کپواڑہ سے ایک مواج دریا ورنو کی طویل القامت پہاڑیوں سے گزرتا ہوا تا بحد نظر وسیع میدانوں کے سینہ پر موجزن ہے۔اسی دریا کے کنارے پر ''دو دواں'' ہے جہاں حضرت شاہ صاحب کی ننھیال ہے بلکہ انہی چند مکانوں پر مشتمل بستی میں ۱۲۹۸ھ میں حضرت شاہ صاحب کی پیدائش ہوئی۔

ورنو اخروٹ کے درختوں، بہتے ہوئے چشموں، سرسبز و شاداب پہاڑوں، اچھلتے ہوئے دریا سے گھری ہوئی ایسی بستی ہے جس طرح کہ صحن چمن میں کوئی خاص شجر قدرت پھولوں سے لدا ہوا ہو۔کشمیر کی عام آبادی بھیڑوں اور بکریوں کے گلہ کی مالک اور پہاڑوں پر آباد قوم ہے۔رات کے سہانے منظر میں زیر فلک کھڑے ہوئیے تو پہاڑی سلسلہ میں موجود مکانات میں جلتے ہوئے چراغ چاند اور تاروں کا منظر پیش کرتے ہیں۔یہاں اخروٹ،سیب،زردآلو،شفتالو،بادام،رس بھری،بگوگوشہ اور اسی قبیل کے خوش ذائقہ پھل موجود ہیں۔زعفران کے لہلہاتے ہوئے کھیت اور شالی (چاول) سے لبریز وادی،فردوس منظر پیش کرتی ہے اون سے تیار شدہ شالیں اونی قالین اور اس صنعت میں کشمیریوں کی چابک دستیاں مشہور عالم ہیں۔لیکن جہالت کی وجہ سے یہ وادی بدعات ومحدثات کی گرفت میں ہے۔مصنوعی پیروں کے غول ادھر سے اُدھر دوڑ کر متاع دین کی قزاقی کررہے ہیں۔دینی

درسگاہوں کا نام ونشان نہیں اور جہاں تہاں کوئی مکتب ہے اسے کشمیریوں کے شقاق ونفاق نے کام کرنے کی مہلت نہیں دی۔ مسجدیں نمازوں سے زیادہ لایعنی نعروں سے گونج رہی ہیں اکثر مساجد میں جناب رسول اکرم ﷺ کے مصنوعی موئے مبارک پر کشمیر کا سادہ لوح مسلمان پروانہ وار گر رہا ہے۔ حضرت بل کی خانقاہ میں ایک نیم سرکاری مدرسہ ہے جس نے اپنی طویل تاریخ میں دین کی کوئی معتدبہ ومفید خدمت انجام نہیں دی۔ ہر سال دارالعلوم دیوبند سے فضلاء کی ایک بڑی کھیپ نکل کر کشمیر پہنچتی ہے اور بجائے دین کے شعبوں میں کوئی بارآور خدمت انجام دینے کے اسکول کی تلاش میں نکل جاتی ہے۔ پونچھ، کشتواڑ اور اس وادی کے پورے علاقہ میں دینی تعلیمی صورت حال افسوس وحسرت انگیز ہے اور کشمیر کا ذرہ ذرہ اس طویل تمنا میں وقت گزار رہا ہے کہ مردے از غیب بروں آید وکارے بکند، حالانکہ یہ وادی اپنی قدیم تاریخ میں اہل کمال اور دانشوروں کا مرکز رہی ہے۔ یہاں جو پہنچا اس نے یہاں کے حسن میں اپنا دامن دل اس طرح الجھا ہوا پایا کہ مدتوں کے لیے پابرزنجیر ہوگیا۔ فیضی اکبر بادشاہ کے ساتھ پہنچا تو حسن کشمیر نے اسے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ عرفی کے چشم ہوش نے وادی کے مسحور کن حسن پر ایک لاثانی قصیدہ کہہ ڈالا۔ شاہجہانی عہد کا ملک الشعراء حکیم ہمدانی کشمیر میں آیا تو سالہاسال یہاں سے نکلنے کا نام نہ لیا اور اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ''بادشاہ نامہ'' کی یہیں تسوید کی۔ عہد جہانگیر میں حیدر ملک بن حسن نے کشمیر کی تاریخ لکھی۔ البرونی ہندوستان وارد ہوا تو اس کے قلم نے ہمیشہ کے لیے محفوظ کردیا کہ کشمیر میں سائنس وفلسفہ کی بڑی بڑی درسگاہیں رہی ہیں۔

یوں تو پوری وادی صناعی قدرت کا ایک دلآویز نمونہ اور دست خالق کا تیار کردہ گلدستہ ہے لیکن پھر بھی قدرتی مناظر میں ''گلمرگ، پہلگام، چشمۂ شاہی، جھیل، ڈال دریا، خاص سری نگر میں شالیمار، نسیم باغ، نشاط باغ اور بہت سے مناظر سیاحوں کو دعوت نظارہ دیتے ہیں۔ مقدس مقامات میں خانقاہ معلیٰ، خانقاہ شاہ ہمدان، مقبرۂ سلطان زین العابدین، مسجد مدنی، خانقاہ بابا شیخ مسعود نروری (مورث اعلیٰ حضرت شاہ صاحب مرحوم) مقبرۂ حضرت بڈشاہ، حضرت بل، زیارت مخدوم شاہ وغیرہ ہیں۔

مشہور شہروں میں سری نگر، اسلام آباد، قاضی کنڈ، بارہ مولا، ہندواڑہ، کپواڑہ، سوپور اور کشمیر کا حسین ترین حصہ وادی لولاب ہے جس کے سبز پوش سلسلۂ کوہسار پر اودے اودے بادل اکثر موجود اور اس کی زمین پر بہتے ہوئے دریا اور رواں دواں چشمے ہیں۔ وادی کا کچھ علاقہ پاکستان کے قبضہ میں ہے۔

●▣●

یہ ایک مختصر تفصیل ہے حضرت شاہ صاحبؒ کے وطنِ مالوف کشمیر کی۔

علم حدیث اور فقہ اسلامی میں

علامہ کشمیریؒ کی نمایاں خدمات

مولانا سید احمد خضر شاہ مسعودی کشمیری
مہتمم وشیخ الحدیث جامعہ امام انور شاہ کشمیریؒ

حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کا مولد و منشا یہی ہے اور اسی کی ایک سرسبز و شاداب وادی ''لولاب'' کا ایک خوب صورت گاؤں ''ورنو'' آبائی وطن، جب کہ دوسری نمایاں بستی ''وودوان'' جائے پیدائش ہے۔ آپ نے ۲۷/شوال ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۷/ اکتوبر ۱۸۷۵ء بہ روز شنبہ، وقت سحر اس دنیا میں آنکھیں کھولیں۔ حضرت علامہ کے ممتاز شاگرد اور برصغیر ہند و پاک کی نمایاں علمی شخصیت، حضرت مولانا سید محمد یوسف صاحب بنوریؒ کے بہ قول:

'' الراشد المسترشد، العابد الزاهد، ملجاالقوم فی النوائب، وملا ذهم فی المهمات الدينية والدنيوية(۱) صفت والد اور ''كانت يتمة دهر ها فی الورع والزهد والعبادة'' (۲) کی مصداق والدہ کے زیر سایہ تربیت پائی۔

۱۲۹۷ھ تقریباً ساڑھے چار سال کی عمر میں بسم اللہ ہوئی (۳) اور اپنے والد گرامی قدر سمیت کشمیر، ہزارہ اور دیوبند کے اساطین علم و فضل سے اکتساب علم کرتے ہوئے ۱۳۱۴ھ میں رسمی تعلیم کے مراحل مکمل کر لیے (۴) ۱۳۱۵ھ تا ۱۳۲۰ھ دہلی کے معروف ادارے ''مدرسہ امینیہ'' میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے (۵) اسی سال والدین کے اصرار پر کشمیر واپس گئے اور ابنائے وطن کی اصلاح میں حسبۃً للہ تقریباً تین سال ۱۳۲۳ھ تک ہمہ تن مشغول رہے (۶) اسی سال سفر حج کے لیے گئے اور حرمین شریفین کے ممتاز علماء سے اخذ و استفادے کے ساتھ ساتھ وہاں کی مشہور

لائبریریوں کی اہم و نایاب کتابوں اور قیمتی نوادر و مخطوطات کا مطالعہ بھی کیا(۷) سفر حج کے مخلص رفیق اور بارہ مولہ کے رئیس جناب عبدالصمد ککرو وغیرہ کے اصرار پر بارہمولہ میں ۱۳۲۴ھ میں ''مدرسہ فیض عام'' کی تاسیس فرمائی، اس مدرسہ میں تین سال تک تدریس و تعلیم میں مشغول رہے(۸) وہاں سے اٹھے تو ہجرت حجاز کے ارادے سے بہ غرض ملاقات اساتذہ دیوبند تشریف آوری ہوئی، جہاں اساتذہ کے حکم پر نہ صرف رشتہ ازدواج سے منسلک ہوگئے بلکہ کارِ تدریس کی انجام دہی بھی شروع کردی(۹) ۱۳۲۷ھ تا ۱۳۳۳ھ بہ طور مدرس، پھر ۱۳۳۳ھ تا ۱۳۴۶ھ بہ طور صدر مدرس و شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند مسند درس کو زینت بخشی(۱۰) زندگی کا آخری علمی پڑاؤ ڈابھیل ضلع سورت گجرات کے ''مدرسہ تعلیم الدین'' میں ڈالا، جہاں ۱۳۴۶ھ تا ۱۳۵۱ھ علم و تحقیق اور معروفت و عرفان کے جام لنڈھاتے ہوئے (۱۱) اسی سال اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔(۱۲)

شاہ ولی اللہ کا طریقہ درس:

حضرت علامہ کشمیریؒ کے درسِ حدیث کے انقلابی انداز اور امتیازات و خصوصیات پر تفصیل سے گفتگو کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ متقدمین اور متاخرین محدثین و اساتذۂ حدیث کے یہاں مروج درسی افادات سے طریقوں پر تحقیقی نظر ڈال لی جائے۔ اس ذیل میں معروف محقق عالم و مؤرخ حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی، مسندِ ہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے دور میں عالم اسلام نیز حرمین شریفین میں رائج اور خود ان کے درس حدیث کا طریقہ بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''طریقہ یہ تھا کہ حدیثوں کے معانی و مطالب، مشکلات وغیرہ کے متعلق جو کچھ پڑھانا ہوتا تھا وہ مشکوۃ شریف میں پڑھا دیا جاتا۔ شاہ ولی اللہ کا قاعدہ تھا کہ ایک دن مشکوۃ کی حدیثیں پڑھاتے اور دوسرے دن انہیں حدیثوں کے متعلق علامہ طیبی کی شرح کا درس طلبہ کو دیتے۔ اس طرح سے مشکوۃ شریف جب ختم ہو جاتی تب دوسرے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحاح ستہ کی حدیثوں کی سند کو متصل کرنے کے لیے مشکوۃ ہی کی حدیثوں کو جو اس میں سند کے بغیر پڑھائی گئی تھیں، اب سند کے ساتھ اس طور پر پڑھاتے کہ طالب علم حدیثوں کو

پڑھتا جاتا اور استاذ سنتا جاتا۔ بیچ بیچ میں خاص اہم بات کا ذکر ضروری معلوم ہوا تو ذکر کر دیا گیا۔ یوں روزانہ پانچ ورق چھ ورق ہو جاتے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے حدیث کے درس کے اس طریقہ کا نام "طریقہ سرد" رکھا ہے اور لکھا ہے کہ مدینہ منورہ کے عام اساتذۂ حدیث کا یہی دستور اُس زمانے میں تھا جب وہ حدیث کا علم حاصل کرنے کے لیے ہندوستان سے سفر کر کے مدینہ منورہ پہنچے تھے" (۱۳)

درسی افادات کے طریقے:

درسی افادات کے اس طریقہ سرد سے ہٹ کر درس کے بعض دوسرے طریقے بھی معروف تھے، جو بہ قول بالغ نظر عالمِ دین اور ریاست مالوہ کی مسند افتاء وقضاء پر چالیس سال تک فائز: حضرت مولانا مفتی محمود احمد صاحب نانوتویؒ تھے: انہی کے الفاظ میں ملاحظہ کیجئے:

"درسی افادات کے زیادہ تر دو طریقے جاری ہیں: ایک بہ ذریعہ مؤلفات جس کی صورت یہ ہے کہ کسی فن کے مسائل و مباحث ابواباً وفصولاً مناسب ترتیب کے ساتھ ایک جگہ جمع کر لیے گئے، اس مرتبہ کا کوئی نام تجویز ہو گیا۔ ایک ایک فن میں متعدد تالیفات وجود میں آگئیں...... اہل علم ان کتابوں دقیق اور نہایت مختصر متون سے، کثرت درس و مطالعہ سے ان متون وشروحات پر حاوی ہو کر مشہور محدثین میں ان کا شمار ہونے لگتا ہے۔ اب عرصۂ دراز سے طریقہ درس ایسا ہی جاری ہے۔

"دوسرا طریقہ یہ ہے کہ استاذ، حافظِ فن کی حیثیت میں طلبہ کے حلقے میں فنی مسائل اور ان کے متعلق تمام مالها و ما علیها پر طویل بیان دیتے ہوئے اپنا عندیہ بھی ظاہر کرتا ہے۔ فن کے تمام گوشے اور تحقیقات کے سب پہلو اس کے بیان میں آجاتے ہیں، جن کے ضبط میں حاضرین کے قلم چلتے رہتے ہیں، یہاں معلم ومتعلم دونوں کتاب کی پابندی سے آزاد ہیں۔ ایسے دروس سے کبھی مستفیدین میں سے ائمہ وقت پیدا ہوتے ہیں۔

"درسی افادے کی ایک تیسری شکل کا بھی کچھ ثبوت ملتا ہے۔ اس تیسری شکل

میں جامع العلوم فاضل بلا قید فن، مختلف علوم وفنون کے شائقین کی مجلس میں جو کچھ دھیان میں آجاتا اور جو کچھ چاہتا بتلاتا ہوا چلا جاتا۔ طلبہ کی بیاضوں میں ہر فن کے تحت اس کے مباحث اصولاً وفروعاً درج ہو جاتے تھے۔ یہ املائی تقریریں علوم وفنون کا کشکول بن جاتی تھیں (۱۴)۔

علامہ کشمیریؒ سے پہلے دیوبند میں درس حدیث:

اب آیئے اس بات کا بھی مختصر سا جائزہ لے لیا جائے کہ حضرت علامہ کشمیریؒ سے پہلے دیوبند میں، درس حدیث کا نہج وانداز کیا تھا؟ تاکہ حضرت علامہؒ کے انقلابی درس حدیث کی عظمت واہمیت مزید اجاگر ہو سکے۔ یہ روداد بھی مولانا گیلانی کے الفاظ میں سنئے: لکھتے ہیں:

''دارالعلوم دیوبند سے تعلیم پانے والے علماء تو ''دورہ'' کی اصطلاح سے واقف ہیں، لیکن عام ناظرین کی آگاہی کے لیے شاید عرض کرنا مفید ہوگا کہ حدیث کی تعلیم کے جس طریقہ کی تعبیر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی کتابوں میں ''طریقہ سرد'' سے فرمایا ہے جس کی تفصیل خاکسار نے ان کی کتابوں سے اخذ کر کے اپنی کتاب ''مسلمانانِ ہند کا نظام تعلیم وتربیت'' میں درج کی ہے، درحقیقت اسی طریقہ سرد کی تعبیر، دارلعلوم دیوبند کے تعلیمی حلقوں میں ''دورہ'' کے لفظ سے کی جاتی ہے۔ شاہ ولی اللہ کے درس کے اس طریقہ میں تھوڑی سی ترمیم یہ کر دی گئی کہ غیر مقلدین یا فرقہ اہل حدیث نے یہ چرچا جو پھیلا دیا تھا کہ حنفی مذہب کے مسائل صحیح حدیثوں کے مخالف ہیں، اس غلط اور بے بنیاد خیال کی تصحیح کے لیے اس تمام مسائل کے متعلق جن کو اپنے اعتراضات کا نشانہ غیر مقلدوں نے بنا رکھا تھا، سنبھل کر گفتگو کی جاتی ہے اور امام ابوحنیفہؒ کے اجتہاد کی صحیح بنیاد سے طلبہ کو واقف بنایا جاتا ہے اور گویا، ''خلافیات'' پر بحث بھی اب ''دورہ'' کے طریقہ درس کا یک گونہ لازمی جز بن گیا ہے''(۵)

علامہ کشمیریؒ کے درسِ حدیث کے امتیازی خطوط:

مذکورہ بالا تفصیل کو ذہن میں رکھتے ہوئے، ذیل کی سطور میں ان امتیازات وخصوصیات

پر شرح وبسط سے گفتگو کی جارہی ہے جو حضرت علامہ کشمیریؒ کے درس حدیث کے لازمی عناصر اور اجزائے ترکیبی تھے اور جن کے سبب ان کے درس حدیث کا غلغلہ پورے برصغیر میں بلند ہوا اور نہ صرف برصغیر کے گوشے گوشے، بلکہ کابل وخراسان اور کاشغر تک کے طلبہ حدیث نے کشاں کشاں دیوبند کا رخ کیا۔ یہ بحث بھی علامہ کشمیریؒ کے براہ راست تلامذہ اور اپنے دور کے یگانۂ روزگار علماء کی زبان سے سنتے ہیں۔ مفتی محمود احمد صاحب نانوتویؒ کے ذکر کردہ تین معروف درسی طریقوں کی تفصیل آپ نے سماعت کرلی، مفتی صاحبؒ مزید لکھتے ہیں:

''ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ کے درس کو تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ
تینوں قسم کے درس کا جامع کہا جاسکتا ہے''(۱۶)

حضرت علامہ کشمیری کے درس حدیث کے بنیادی اجزائے ترکیبی کو بارہ حصوں یا بارہ نکات وعناصر پر تقسیم کیا جاسکتا ہے جن سے درس کی وسعت، جامعیت، افادیت، قدروقیمت اور عظمت کا اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں۔

۱-عرضِ حدیث علی القرآن:

حضرت علامہ کشمیریؒ کے درس حدیث کا ایک نمایاں پہلو ''عرض الحدیث علی کتاب اللہ'' تھا۔ کیوں کہ حدیث نبوی، خود قرآن کی تصریح کے مطابق، قرآن کی تفصیل وتشریح ہے، چناں چہ علامہ کشمیریؒ دورانِ درس یہ وضاحت کرتے جاتے کہ زیر بحث حدیث، قرآن کی فلاں آیت کی تشریح اور توضیح ہے اور یہ کہ اس کا ماخذ ومصدر فلاں آیت ہے۔ مشکوۃ شریف کی عربی شرح ''التعلیق الصبیح'' اور دیگر متعدد تحقیقی کتابوں کے مؤلف بالغ نظر محدث اور علامہ کشمیریؒ کے خصوصی تلمیذ میں سے ایک: حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ لکھتے ہیں:

''حدیث نبوی کا ماخذ، قرآن کریم سے بیان فرماتے اور اسی مناسبت
سے بہت سی مشکلات کو حل فرمادیتے تھے''(۱۷)

۲-منشائے نبوی کی تشریح:

جن احادیث کو مذاہب اربعہ کے علماء اپنے مفید مطلب ثابت کرنے کے لیے کھینچ تان کرتے، علامہ کشمیریؒ فقہی تحزب اور مسلکی تعصب سے بالاتر ہوکر ان پر بحث کرتے۔ مولانا محمد

یوسف صاحب بنوریؒ مؤلف معارف السنن شرح عربی سنن ترمذی، حضرت علامہ کشمیریؒ کی اس درسی خصوصیت پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کوشش فرماتے کہ اصل منشائے نبوت معلوم ہو سکے، اس ذیل میں حدیث کے شان ورود کے پس منظر کی تعیین کرتے، وقتِ نظر کے ساتھ تحقیق فرماتے، پھر تحقیق مناط، تنقیح مناط اور تخریج مناط کے اصول پر ایک ایک جزیے کو اس طرح کھولتے کہ حدیث نبوی کا منشاء ومقصد بالکل واضح اور صاف ہو جاتا۔ اس میں وہ اس تحفظ کو در نہ آنے دیتے کہ آیات روایت، فقہ حنفی کے موافق ہو رہی ہے یا نہیں،، اور حدیث نبوی کی ایسی دل کش اور واقعی تشریح فرماتے کہ نہ صرف اصل مقصد ظاہر ہو جاتا بلکہ اس پر پڑی ہوئی تاویل بے جا کی گرد بھی خود بہ خود دور ہو جاتی (۱۸)

۳۔تشریح حدیث بالحدیث اور استنباطِ مسائل:

حضرت علامہ کشمیریؒ فقہی مسائل سے متعلقہ احادیث پر جس بالغ نظری اور دقیقہ رسی سے بحث کرتے اس سے محسوس ہوتا کہ فقہ حنفی کے مسائل خود بہ خود احادیث سے نکل رہے ہیں، وہ اس کے لیے کسی درجہ میں بھی تکلف اور آورد سے کام نہ لیتے، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری طیب صاحبؒ رقم طراز ہیں:

''متونِ حدیث کی معتمد کتابوں کا ڈھیر، آپ کے سامنے ہوتا تھا اور تفسیر حدیث بالحدیث کے اصول پر کسی حدیث کے مفہوم کے بارے میں جو دعویٰ کرتے اسے دوسری احادیث سے مؤید اور مضبوط کرنے کے لیے درس ہی میں کتب پر کتب کھول کر دکھاتے جاتے تھے اور جب ایک حدیث کا دوسری احادیث کی واضح تفسیر سے مفہوم متعین ہو جاتا تو نتیجتاً وہی فقہ حنفی کا مسئلہ نکلتا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ حدیث، فقہ حنفی کو پیدا کر رہی ہے'' (۱۹)

۴۔شرح حدیث از روئے عربیت وبلاغت:

علامہ کشمیریؒ شرح حدیث کرتے وقت متعینہ اصطلاحات کے بند دائروں میں زیادہ نہ الجھ

کر، ازروئے قواعد عربیت و بلاغت، حدیث کی مراد واضح کرنے پر اولین توجہ کرتے، تاکہ طلبہ کو ایک طرف تو فہم حدیث میں سہولت ہو اور دوسری طرف وہ بلاغت کے اصول وضوابط کی روشنی میں حدیث نبوی کے زورِ بیان اور اسلوب سے بھی بہ خوبی واقف ہو سکیں۔ مولانا کاندھلویؒ کی شہادت سنئے!

''درس حدیث میں سب سے اول اور زیادہ توجہ اس طرف کرتے تھے کہ حدیث نبوی کی مراد بہ اعتبار قواعد عربیت و بلاغت واضح ہو جائے، کوشش اس کی فرماتے کہ حدیث کی مراد کو اصطلاحات کے تابع نہ رکھا جائے کہ اصطلاحات بعد میں حادث ہوئیں اور حدیث نبوی زماناً ورتبۃً مقدم ہے...... نیز جس طرح حضرات مفسرین قرآن کریم کے اسرارِ بلاغت بیان کرتے ہیں، اسی طرح شاہ صاحب حدیث کے اہم بلاغی نکات پر متنبہ فرماتے'' (۲۰)

۵-متعارض احادیث میں تطبیق:

شراح واساتذۂ حدیث کو، شرح حدیث کے دوران جن نازک مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے، ان میں سے ایک نازک ترین چیز دو یا چند احادیث کا باہمی تعارض ہے، بعض اوقات ایک ہی مضمون سے متعلق دو یا زیادہ روایتیں منقول ہوتی ہیں اور ان میں بہ ظاہر کوئی مطابقت نظر نہیں آتی۔ پھر حدیث میں روایت بالمعنی بھی عام ہے، اسی لیے ایک ہی صحابی سے مروی، حدیث شریف کے الفاظ میں بعض اوقات اختلافِ رواۃ کے سبب، بڑا تعارض رونما ہو جاتا ہے۔ ایسے مواقع پر عام محدثین جرح و تعدیل کے اصول وضوابط کا سہارا لے کر ایک روایت کو ساقط اور دوسری کو راجح قرار دے کر رفع تعارض کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن حضرت علامہ کشمیریؒ کا نہج یہاں بھی عموماً سب سے منفرد اور جداگانہ ہوتا۔ مولانا بنوریؒ فرماتے ہیں:

''بناء بریں علامہ کشمیریؒ ایک روایت کے تمام طرق اور ان میں وارد مختلف الفاظ کو جمع کرتے اور روایت کی ایسی دلنشیں اور درس تشریح کرتے کہ دل باغ باغ ہو جاتے اور بول اٹھتے کہ یہی منشائے رسالت اور مرادِ نبوت ہے'' (۲۱)

مولانا بنوریؒ اس حوالے سے مزید لکھتے ہیں:

''آپ اس کی بھرپور کوشش کرتے کہ بہ ظاہر متعارض احادیث کی ایسی تشریح اور

ان کا ایسا محمل ومنشاء خود روایات ہی کی روشنی میں متعین کیا جائے جس سے یہ روایات نہ صرف یہ کہ باہم متعارض نظر نہ آئیں، بلکہ ایک دوسرے کے لیے معاون ومد ثابت ہو جائیں"(۲۲)

۶-جملہ علوم کا احاطہ:

اسلام کی زریں تاریخ میں ایسی متعدد جامع الصفات اور ہمہ جہت شخصیات پیدا ہوئیں جن سے ایک عالم نے استفادہ کیا اور جن کا حلقہ درس ہر علم وفن کے پیاسے کی پیاس بجھانے کے لیے ماءِ زلال کا کام کرتا تھا، حضرات صحابہ میں یہ شان، حبر الامۃ حضرت عبداللہ بن عباسؓ، تابعین میں حضرت حسن بصری، حضرت مجاہد وغیرہ کی تھی۔ بعد کی صدیاں بھی ایسی ہمہ جہت شخصیات سے محروم نہ رہیں، ہماری ماضی قریب کی تاریخ میں، اس حوالے سے نمایاں نام حضرت علامہ کشمیریؒ کا ہے۔علامہ کشمیری کی مجلسی گفتگو اور درسی تقریر: دونوں انفرادیت کے ساتھ جامعیت کی حامل ہوا کرتیں اور ہر علم وفن کا احاطہ کرتی تھیں، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ فرماتے ہیں:

"دوسری خصوصیت یہ تھی کہ حضرت ممدوح کے علمی تبحر اور علم کے بحرِ ذخار ہونے کی وجہ سے، درس حدیث صرف علوم حدیث ہی تک محدود نہ رہتا تھا، بلکہ اس میں استطرادا لطیف نسبتوں کے ساتھ ہر علم وفن کی بحث آتی تھی۔ اگر معانی و بلاغت کی بحث آجاتی تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا علم معانی کا یہ مسئلہ اسی حدیث کے لیے واضع نے وضع کیا تھا۔ معقولات کی بحثیں آجاتیں اور معقولیوں کے کسی مسئلہ کا رد فرماتے تو اندازہ ہوتا کہ یہ حدیث گویا معقولات کے مسئلہ ہی کی تردید کے لیے قلب نبوی پر وارد ہوئی تھی۔ ان مختلف الانواع تحقیقات کو دیکھ کر میں نے ایک املائی کاپی تیار کی، جس کے چوڑے اوراق میں چھ، سات کالم بنائے اور ہر کالم کے اوپر والے سرے پر فنون کے عنوان ڈال دیے، یعنی مباحث تفسیر، مباحث حدیث، مباحث عربیت: صرف ونحو، مباحثِ منطق و فلسفہ، مباحث ادبیات...... مباحثِ تارخ وغیرہ۔ پھر علوم عصریہ کے لیے ایک کالم رکھا، کیوں کہ موجودہ دور کے فنون، جیسے سائنس، فلسفہ جدیدہ اور ہیئت

جدیدہ وغیرہ کے مباحثِ بھی بہ ذیل حدیث، درس میں آتے تھے"(۲۳)

۷-فقہ الحدیث:

تمام تر فقہی مسائل کی اساس کتاب وسنت کی نصوص ہیں، البتہ چوں کہ طریقہ استنباط اور اصول استخراج، فقہاء ومجتہدین کے جدا جدا تھے، اس لیے متعلقہ مسائل میں بھی اختلاف رونما ہونا ناگزیر تھا۔ حضرت علامہ کشمیریؒ کا فقہ الحدیث کی بابت کیا طریقہ تھا اور وہ مذاہب اربعہ کے مسائل کی تبیین وتشریح کس طرح فرماتے تھے؟ اس پر علامہ کشمیریؒ کے شاگرد مولانا کاندھلویؒ نے روشنی ڈالی ہے، فرماتے ہیں:

> "فقہ الحدیث پر جب کلام کرتے تو اولاً ائمہ اربعہ کے مذاہب نقل فرماتے اور پھر ان کے وہ دلائل بیان فرماتے جو ان مذاہب کے فقہاء کے نزدیک سب سے زیادہ قوی ہوتے، پھر ان کا شافی جواب اور امام اعظمؒ کے مسلک کی ترجیح بیان فرماتے تھے۔ حنفیت کے لیے استدلال وترجیح میں کتاب وسنت کے تبادر اور سیاق وسباق کو پورا ملحوظ رکھتے اور اس بات کا خاص لحاظ رکھتے کہ شریعت کا منشاء ومقصد اس بارے میں کیا ہے اور یہ حکم خاص، شریعت کے احکام کلیہ کے خلاف تو نہیں؟(۲۴)

۸-توفیق بین اقوال الائمہ:

درس حدیث کے دوران علامہ کشمیری کا زور جن امور پر التزاماً رہتا ان میں سے ایک اہم چیز "**توفیق بین اقوال الائمة المختلفه**" ہے۔ علامہ کشمیریؒ ائمہ مجتہدین کے اقوال میں توفیق وجمع کی کوشش کرتے اور علی وجہ البصیرت یہ ثابت کرتے کہ ان میں اتفاق کے اجزاء، اختلافی نکات کی نسبت کم ہیں۔ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی لکھتے ہیں:

> "ایک موقع پر شاہ صاحبؒ نے فرمایا اکثر مسائل کے اندر فقہ حنفی میں کئی کئی اقوال ہیں اور مرجحین واصحابِ فتویٰ مختلف وجوہ واسباب کی بناء پر ان میں سے کسی ایک قول کو اختیار کرتے اور ترجیح دیتے ہیں۔ میں اس قول کو زیادہ وزنی اور قابلِ ترجیح سمجھتا ہوں جو از روئے دلائل زیادہ قوی ہو، یا جس کے اختیار

کرنے میں دوسرے ائمہ مجتہدین کا اتفاق زیادہ حاصل ہوجاتا ہو"۔(۲۵)

۹-استحکام حنفیت:

استحکام حنفیت اور یہ کہ فقہ حنفی کے تمام مسائل کتاب وسنت اور آثار واقوال صحابہ سے مستنبط و ماخوذ ہیں، اس حوالہ سے علامہ کشمیریؒ کی خدمات نہایت گراں قدر، وقیع اور نا قابل فراموش ہیں، مولانا محمد یوسف بنوریؒ لکھتے ہیں کہ علامہ کشمیریؒ نے آخری درس حدیث کے سال، ماہِ شعبان میں طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''ہم نے اپنی زندگی کے پورے تیس سال اس مقصد کے لیے صرف کئے کہ فقہ حنفی کے موافق حدیث ہونے کے بارے میں اطمینان حاصل ہوجائے، سوالحمد للہ اپنی اس تیس سالہ محنت اور تحقیق کے بعد میں اس بارے میں مطمئن ہوں کہ فقہ حنفی، حدیث کے مخالف نہیں ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جس مسئلہ میں مخالفین احناف جس درجہ کی حدیث سے استشہاد کرتے ہیں، کم ازکم اسی درجہ کی حدیث اس مسئلہ کے متعلق حنفی مسلک کی تائید میں ضرور موجود ہے اور جس مسئلہ میں حنفیہ کے پاس حدیث نہیں ہے اور اس لیے وہ اجتہاد پر اس کی بنیاد رکھتے ہیں، وہاں دوسرے کے پاس بھی حدیث نہیں ہے''(۲۶)

۱۰-مباحث پر محققانہ تبصرہ:

درس نظامی کا نصاب مغلق اور صعب الفہم کتب کا مجموعہ ہے، اس سے طلبہ میں موشگافی کا فن تو کسی درجہ میں آجاتا ہے لیکن فنی وسعت نظر پیدا نہیں ہوتی، علامہ کشمیریؒ کا درس فنی تحقیق و تفتیش کا اعلیٰ نمونہ اور بے سود قیل وقال سے یکسر پاک ہوا کرتا تھا، چناں چہ مولانا محمد میاں صاحب دیوبندی تحریر کرتے ہیں کہ

''حضرت شاہ صاحبؒ اس مرض سے بہت بیزار تھے، الفاظ کی ژولیدگی میں مشغول ہونا آپ کے نزدیک تضیع اوقات تھا۔ آپ کی تمام توجہ فن کی تحقیق پر مبذول رہتی تھی، اس کا مظاہر آپ کے درس میں ہوتا تھا، آپ کی تقریر شروح و حواشی کے اقتباسات کا مجموعہ نہیں ہوتی تھی، بلکہ مسئلہ پر محققانہ تبصرہ ہوتا تھا؛؛؛

حضرت شاہ صاحبؒ کی تقریر کا تعلق، عبارت سے زیادہ تحقیق و تنقیح مسئلہ سے ہوتا تھا۔ آپ الفاظ کی بندشوں سے بلند ہو کر، مسئلہ کے متعلق اپنی ذاتی تحقیق پیش فرماتے تھے"(۲۷)

۱۱- علم جرح و تعدیل اور علامہ کشمیریؒ:

رجال و رواتِ حدیث اور علم جرح و تعدیل کے اصول کے تحت حدیث پر صحت و ضعف کا حد حکم لگانے، پھر مفید مطلب روایت میں کسی راوی کو قابلِ قبول اور مخالفِ فریق کی تائید میں اسی روای کو ساقط الاعتبار قرار دینے کے رجحان سے آپ کو شدید نفرت تھی، اسے آپ مجادلہ و مکابرہ خیال فرماتے۔ چناں چہ اپنے رسالہ "نیل الفرقدین فی مسئلة رفع الیدین" میں لکھتے ہیں:

"لم اکثر من نقل کلامهم فی الرجال، ومافیه من کثرة القیل و القال، لانه لیس له عندی کبیر میزان فی الا عتدال، و بعضهم یسکت عند الوفاق و یجرح عند الخلاف...... و هذا صنیع لایشفی ولا یکفی و انما هو سبیل الجدال"(۲۸)

(ترجمہ: میں رجال کے سلسلے میں محدثین کے اقوال زیادہ نقل نہیں کرتا اور نہ ہی اس تعلق سے ہونے والے قیل و قال کو، کیوں کہ اس کی میرے نزدیک کوئی زیادہ قیمت نہیں ہے۔ کہ موافق ہونے کی صورت میں ایک راوی سے سکوت اختیار کیا جاتا ہے اور مخالف کی شکل میں اسی کی جرح کی جاتی ہے۔ اس انداز کا کوئی فائدہ نہیں، بلکہ یہ تو کٹ حجتی اور جدال و مجادلہ کی راہ ہے۔)

۱۲- متقدمین کا تعارف و تذکرہ:

اس حوالے سے مولانا گیلانی لکھتے ہیں:

"علاوہ موضوع درس کے چند خاص امور کا تذکرہ التزاماً اپنے درس میں ضرور فرماتے مثلاً جن مصنفین کی کتابوں کا حوالہ دیتے، ان کی ولادت و وفات سنین کے ساتھ ساتھ مختصر حالات، ان کی علمی خصوصیت، علم میں ان کا خاص مقام کیا ہے ان امور پر ضرور تنبہ کرتے چلے جاتے۔"

''یہ ان کا ایسا اچھا طریقہ تھا جس کی بدولت شوقین اور محنتی طلبہ ان کے حلقہ درس میں شریک ہو کر علم کے ذیلی ساز و سامان سے مسلح ہوتے تھے...... اشخاص و رجال جن کا وہ تذکرہ حلقہ درس میں کیا کرتے تھے ان میں زیادہ تر ایسی ہستیاں تھیں جو اب دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ زندہ علماء کا ذکر مشکل ہی سے ان کے درس میں ہوتا اور زندہ کیا سچ پوچھئے تو حافظ ابن حجر نویں صدی ہجری کے عالم و محدث کے بعد والوں کے نام بھی ان کی زبان مبارک پر اتفاقاً ہی کبھی آتے ہوں گے، ان کے حلقہ درس میں پہنچ کر کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ درمیان کی چند صدیاں گویا حذف ہو گئی ہوں اور ہم نویں، آٹھویں اور ان سے پہلے کی صدیوں میں گویا زندگی بسر کر رہے ہوں'' (۲۹)

علامہ کشمیری اور علم اصول حدیث:

یہ تو تھیں وہ امتیازی خصوصیات جو علامہ کشمیری کے درس حدیث کا لازمی حصہ ہوتی تھیں۔ اب آیئے علامہ کشمیری کی اس عظیم ترین خدمت پر روشنی ڈالی جائے جس کی وجہ سے وہ تمام امت کی طرف سے تحسین و تبریک کے بجا طور مستحق اور طلبہ حدیث کے لیے عظیم محسن کا درجہ پا چکے ہیں۔

معلوم ہے کہ احادیث نبوی کا جو ذخیرہ ہم تک پہنچا اس میں روات و ناقلین کی بڑی جماعت و تعداد شریک ہے۔ حدیث کی اس اسناد اور نقل کے لحاظ سے محدثین نے حدیث کی تین اقسام بیان کی ہیں۔ متواتر: مشہور، خبر واحد، واضح رہے کہ محدثین نے متواتر کے تحت صرف انہی احادیث کو لیا جو اسناد کے اعتبار سے متواتر تھیں یعنی ایسی حدیث جس کے بیان کرنے والے ہر زمانہ میں اتنے زیادہ لوگ رہیں جن کا کذب پر اتفاقا عقلا ناممکن ہو۔ ظاہر ہے کہ اس اصول کے تحت احادیث کا نہایت قلیل ذخرہ ہی متواتر بن سکا اور یقینیات کا درجہ حاصل کر سکا ہے۔ احادیث کا بیش تر حصہ ان احادیث پر مشتمل رہ جاتا ہے جن کو محدیثن کی تعریف کی رو سے ظن اور ظنیات کے درجہ میں رکھا جا سکتا ہے اور اس طرح یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ کیا شریعت کے زیادہ تر مسائل کا دار ظن پر ہے؟۔

علامہ کشمیریؒ کی قبر کو اللہ تعالی روشن کرے کہ وہ پہلے ایسے شخص ہیں جنہوں نے تواتر کو ایک ہی قسم میں منحصر نہ رکھا بلکہ اس کی چار اقسام بیان فرمائیں اور دلائل و شواہد سے ان کو مبرہن بھی

گیا: تواتر اسناد، تواتر طبقہ، تواتر قدر مشترک اور تواتر عمل حضرت علامہ کشمیری نے ان چار اقسام کی جو تشریح اور تفصیل بیان فرمائی اس سے حدیث کا بڑا ذخیرہ ظنیات سے نکل کر یقینیات میں داخل ہو گیا اور اس طرح ایمانیات و دینیات کے تعلق سے بعض تشکیکی طبیعتوں میں احادیث کے از قبیل ظنیات ہونے کا جو شبہ تھا وہ بھی دور ہو گیا۔

مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی کا ذاتی تاثر سنیے:

> ''اس وقت تک میرا تاثر تھا کہ قرآن کے سوا بہ جز چند گنی چنی روایتوں کے صاحب شریعت کی طرف سے قطعی، یقین اور کامل اطمینان کے ساتھ کسی امر کا انتظار نہیں کیا جا سکتا۔ گویا دین کا اکثر حصہ صرف ظنی اور یقین کی قوت سے محروم ہے لیکن یہ پہلا دن تھا جب میرے کانوں نے اسناد والے تواتر کے سوا، تواتر طبقہ، تواتر عمل اور تواتر قدر مشترک کی نئی قسموں کو سنا...... یہ پہلا دن تھا جس میں قرآن کے بعد دین کا سار بینائی نظام میرے لیے یقینی و قطعی ہو گیا اور جیسے جیسے تمیز و شعور کے سن کے لحاظ سے اضافہ ہوا، بجائے گھٹنے کے میرا یہ تاثر گہرا ہی ہوتا چلا گیا (۳۰)

یہ اسناد وہ کار آمد چیز ہے جس کے بارے میں رئیس المحدثین و امیر المومنین فی الحدیث عبداللہ بن مبارک کا ارشاد ہے کہ ''اگر اسناد نہ ہوتی جس کا جو جی چاہتا کہہ ڈالتا''

اس لیے محدثین بغیر سند والی حدیث کو بھی جائز نہ سمجھتے اور کہتے کہ کوٹھے پر بغیر زینہ کے کیسے چڑھا جا سکتا ہے۔ حضرت علامہ کشمیریؒ نے اپنے افادات میں سب سے پہلے اسی تواتر اسناد کو لیا جس کا حاصل انہی کے لفظوں میں یہ ہے:

تواترِ اسناد

> ''کسی حدیث کی روایت میں از ابتداء تا انتہا روات اتنی بڑی تعداد میں ہوں جن کی کذب بیانی عادۃً محال ہو اور ان کا اتفاق علی الکذب ممکن نہ ہو۔ حدیث: من کذب علی متعمدا فلیتبوا مقعدہ من النار۔ کے متعلق حافظ الدنیا و جبل العلم ابن حجر عسقلانی شارح بخاری نے لکھا ہے کہ یہ حدیث صحیح و حسن ہے جس کو تمیں صحابۂ کرام نے روایت کیا ہے اور وہ احادیث جو ختم نبوت سے تعلق رکھتی ہیں

ان کی تعداد ایک سو پچاس ہے۔جن میں سے تقریباً تیس صحاح ستہ میں موجود ہیں اور مسح علی الخفین کی احادیث اسی انداز کی ستر کے قریب ہیں۔اسی لیے امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ میں مسح علی الخفین کا اس وقت تک قائل نہ ہوا جب تک مسح علی الخفین کی حدیثیں دن کے اجالے کی طرح میرے سامنے نہیں آگئیں یہ سب احادیث اسنادی تواتر لیے ہوئے ہیں''(۳۱)

۲-تواتر طبقہ:

''اس کا مطلب یہ ہے کہ دین کی کوئی اہم چیز جو طبقہ بطبقہ ہم تک پہونچی اور اس میں رواۃ موجود نہیں جیسا کہ قرآن کریم کہ اس کا تواتر روئے زمین پر تلاوت، درس حفظ، قراءت کی شکل میں قائم ہے، اس میں اسناد کی کوئی ضرورت نہیں۔فقہاء اپنی اصطلاح میں تواتر سے یہی تواتر مراد لیتے ہیں۔اہل اسلام کے نزدیک قرآن کا تواتر ثابت ہے اور ہر مسلمان عالم ہو یا جاہل عامی ہو یا خواص میں سے لیکن یہ علم سب رکھتے ہیں کہ قرآن خدا تعالیٰ کا مقدس کلام ہے جسے اس نے اپنے آخری پیغمبر محمد رسو اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا جس طرح نازل ہوا تھا اسی شان کے ساتھ ہمارے پاس موجود ہے اور انشاء اللہ تا قیامت رہے گا۔قرآن کے ثبوت کے لیے اسناد کا مطالبہ قطعاً غلط ہے۔(۳۲)

۳-تواتر عمل وتوارث:

''کوئی شرعی حکم توارث وتعامل کے ذریعے ہم تک پہونچا ہو اور جس میں خطا بھی محال ہو مثلاً نماز کہ اس میں رفع یدین وعدم رفع یدین تعاملا وتوارثا چلے آرہے ہیں کہ یہ تواتر زمانۂ رسالت سے لے کر اس وقت تک ہر طبقہ میں موجود ہے اور اپنی قوت کی بنا پر تواتر طبقہ کے قریب تر ہے۔ ناواقف کو معلوم نہیں کہ تواتر عمل میں بیشتر تواتر اسنادنہیں ہوتا اور وہ محسوس کرے گا کہ ضروریات دین میں شروع ہی سے اختلاف چلا آتا ہے، حالاں کہ اس کی حقیقت شک ووہم سے زیادہ نہیں، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ معوذتین کو قرآن میں شمار نہ کرتے تھے اور اس نے اس خیال کے راوی ان کے وہ شاگرد ہیں جنہوں نے ان سے قرآن حکیم پڑھا اور چوں کہ عبداللہ بن مسعودؓ کے علاوہ ہر صحابی اور پورے عالم اسلام نے معوذتین کو قرآن ہی سے سمجھا اس لیے معوذتین کا قرآن مجید میں ہونے کا یقین صرف ابن مسعودؓ کے خیال کی وجہ سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا،

الحاصل تواتر طبقہ اور تواتر توارث وتعامل کے لیے اسناد کا متواتر ہونا ضروری نہیں اور نہ اس تواتر کو کسی خبر واحد کے سبب متواتر سے نکالا جاسکتا ہے۔ جب یہ تواتر قرائن قطعیہ سے ثابت ہے تو اس کے بعد مزید کدو کاوش کی احتیاج نہیں۔ (۳۳)

۴-تواتر قدر مشترک:

''اس کا حاصل یہ ہے کہ چند احادیث مختلف درجات کی مختلف طرق ہم تک پہونچیں لیکن ان میں جو حقیقت مذکور ہے وہ ان سب احادیث کا قدر مشترک ہے۔ یہ احادیث ابتداء میں خبر واحد تھیں مگر قدر مشترک واحد ہونے کی بنا پر تواتر متحقق ہو گیا۔ مثلاً معجزات کے متعلق مختلف درجات کی حدیثیں ہیں اور متعدد طریقوں سے مروی ہیں لیکن قدر مشترک ایک ہی ہونے کے بنا پر بیانِ معجزات متواتر ہو گیا''۔ (۳۴)

علامہ کشمیریؒ کی اس بیان کردہ تفصیل کو جس سے پورے دین کو آپ نے متواتر ثابت کیا۔ حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی مرحوم نے ''فتح الملہم شرح مسلم'' میں نقل کرنے کے بعد اعتراف کیا ہے کہ یہ حضرت شاہ صاحب کی نادر و مخصوص تحقیق ہے جسے اس تفصیل کے ساتھ اسلاف نے پیش نہیں کیا تھا۔

حفظ کل احد مالم یحفظه الآخر:

کتب احادیث میں بہ کثرت ایسی روایتیں ملتی ہیں جو کسی کتاب میں مختصر، کسی میں مفصل مذکور ہوتی ہیں، پھر ایسا بھی ہے کہ ایک ہی بحث میں ایک روایت کے الفاظ مختلف اور دوسری میں اسی بحث کے تحت الفاظ بالکل دوسرے، حالاں کہ مدارِ حدیث بھی ایک ہی ہوتا ہے اور مضمون بھی ایک ہی۔ ایسی احادیث کی شرح اور رفع تعارض میں عموماً سند کے قوت وضعف کی بنیاد پر فیصلہ کیا جاتا ہے۔ لیکن بعض اوقات ایک ہی بحث میں باہم مختلف و متعارض دونوں روایتیں سند کے اعتبار سے ایک ہی درجہ میں ہوتی ہیں، ایسے مواقع پر دور از کار تاویلات کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

حضرت علامہ کشمیریؒ نے اس قسم کی روایتوں کے تعلق سے ایک اصل اور ضابطہ یہ مستنبط کیا ''حفظ کل احد مالم یحفظه الآخر'' کہ حضور اکرم ﷺ سے تو دونوں ہی باتیں منقول تھیں، لیکن کسی راوی کو ایک جزو یاد رہ گیا، اس نے اس کو بیان کر دیا اور دوسرے کو دوسرا اجزاء یاد رہا،

اس نے اس کو بیان کر دیا۔ ورنہ در حقیقت حدیث میں دونوں ہی اجزاء تھے، اس طرح کی تاویل حافظ الدین ابن حجر عسقلانی نے بھی بعض مواقع پر کی ہے لیکن وہ اس اصل کی طرف متوجہ نہ ہوئے اور نہ بہ طور اصل اس سے مدد لی۔

مثلاً ترمذی شریف میں ''باب کراھیة مایستنجی به '' کے تحت امام ترمذی جو روایت لائے ہیں، اس میں آپؐ نے عظم یعنی جانور کی ہڈی سے استنجاء کرنے کی ممانعت فرمائی ہے، اور ہڈیوں کو جنات کی خوراک بتایا۔ ہڈیوں کے زاد الجن ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہڈیاں جنات کے لیے دوبارہ پر گوشت بنادی جاتی ہیں، لیکن اس موقع کی جو روایت مسلم شریف کی ہے اس میں اور ترمذی شریف کی روایت میں ایک تعارض ہے اور وہ یہ کہ مسلم کی روایت میں ہے'' لکم کل عظم، ذکر اسم الله علیه یقع فی ایدیکم اوفر ما یکون لحما '' (۳۰) اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مذبوح جانوروں کی ہڈیاں جنات کے لیے دوبارہ گوشت بنادی جاتی ہیں۔ جب کہ اس کے برعکس ترمذی کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں'' کل عظم لم یذکر اسم اللہ علیہ یقع فی ایدیکم اوفر ما کان لحماً '' (۳۱) اس میں تصریح ہے کہ مردار جانوروں کی ہڈیاں جنات کے لیے دوبارہ پُر گوشت کردی جاتی ہیں۔ اس کا کوئی شافی جواب حضرات محدثین سے منقول نہیں۔ امام حمیدی نے جو توجیہ کی ہے کہ مذبوح جانوروں کی ہڈیاں مومن جنات کے لیے پر گوشت کردی جاتی ہیں اور مردار جانوروں کی کافر جنات کے لیے، وہ اس لیے قابل قبول نہیں کہ اس کی تائید کسی اور طرح سے نہیں ہوتی۔

علامہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ یہاں رفع تعارض کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ مذکورۃ الصدر اصل '' حفظ کل احد مالم یحفظ الآخر '' کی رو سے توجیہ کی جائے اور دونوں روایتوں میں تطبیق دی جائے کہ آں حضورﷺ نے دونوں باتیں فرمائی تھیں کہ ہڈی پر اللہ کا نام لیا گیا ہو یا نہ لیا گیا ہو، دونوں ہی جنات کے لیے پر گوشت کردی جاتی ہیں، ایک راوی نے پہلی بات روایت کردی اور دوسرے نے دوسری۔ (۳۲)

یہ اور اس طرح کی بہت سی روایات کے رفع تعارض کے لیے یہ اصل نہایت کارآمد ہے، لیکن افسوس کہ حضرت علامہ کشمیریؒ سے پہلے کسی محدث نے اس اصل سے اعتناء نہ کیا۔

حضرت مولانا سید انور شاہؒ

ذاتی حالات، علمی اور دینی خدمات

مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصرؒ

حضرت علامہ جلیل رحمتہ اللہ علیہ ۲۷ شوال المکرّم ۱۲۹۲ھ بروز شنبہ بوقت صبح اپنے ننہال میں بمقام موضع دودھوان (علاقہ لولاب کشمیر میں پیدا ہوئے ساڑھے چار سال کی عمر میں اپنے والد ماجد حضرت مولانا سید محمد معظم شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ سے قرآن پاک شروع کیا اور چھ برس کی عمر تک قرآن پاک کے علاوہ فارسی کے متعدد رسائل بھی ختم کر لئے پھر مولینا غلام محمد صاب (صوفی پورہ) سے فارسی وعربی کی تعلیم حاصل کی اور ابھی آپ کی عمر ۱۳-۱۴ سال کی تھی کہ ۱۳۰۵ھ میں شوق تعلیم نے لولاب کے مرغ زاروں اور سبزہ زاروں پر غریب الوطنی کی عملی زندگی کو ترجیح دی۔

شیخ الهند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رحمه الله علیه جو آپ کے بهت زیاده شفیق استاد تهے. اور ساتهـ هی آپ کا بهت زیاده احترام بهی فرماتے تهے.وه اکثر دیوبند میں آپ کے مستقل قیام کی تجاویز سوچا کرتے تهے چنانچه سب سے پهلے آپ نے حضرت شاه صاحب کو اپنا جانشین مقرر فرمایا اور پهر اتباعا للسنة النبویه نکاح کی تاکید فرمائی. یه ۱۳۳٦ھ کا واقعه هے. جب آپ کی عمر شریف ٤٤ سال تهی.

یہ چند واقعات ان کے بچپن کی زندگی پر کچھ روشنی ڈالتے ہیں ان سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ جس شخص کو آگے چل کر وقت کا رازی وغزالی بننا تھا اس کی ابتدا کتنی شاندار اور حیرت ناک تھی۔

آپ کے والد معظم حضرت مولانا معظم شاہ نے بیان فرمایا کہ جب انہوں نے مختصر

القدوری مجھ سے شروع کی تو مجھ سے بعض ایسے مسائل دریافت کرتے تھے کہ مبسوط کتابوں کے مطالعہ کے بغیر ان کا جواب دینا ناممکن تھا۔ میں انہیں ان موشگافیوں سے بچنے پر منع کرنے پر مجبور ہوا، اخیر میں اس قوت ذکاوت و ذہانت سے پریشان ہو کر میں نے انہیں ایک دوسرے عالم کے سپرد کیا۔ مگر دوسرے استاد کو بھی ان سے یہی شکایت پیش آئی۔

آپ کے والد آپ کو اور آپ کے بڑے بھائی یسین شاہ مرحوم کو کشمیر کے پہاڑوں میں اعتکاف کرنے والے ایک عارف کے پاس حصول برکت کے لئے لے گئے۔ عارف نے جب اس ہونہار بچہ کو دیکھا تو والد سے پوچھا کہ کیا یہ تمہارا بچہ ہے؟ پھر کہا کہ یہ بڑا عظیم الشان عالم ہوگا اور مستقبل میں اس کی علمی عظمت مسلم ہوگی۔

ایک دفعہ منطق اور نحو کے چند مسائل کا مطالعہ کر رہے تھے۔ اتفاقاً ایک بڑے عالم اس وقت آپ کے پاس آ گئے۔ ان عالم نے ان کی کتابوں کو اٹھا کر دیکھا کتابوں پر خود حضرت مرحوم کے حواشی لکھے ہوئے تھے بچپن کے زمانہ کی اس ذکاوت تیزی طبع سرعت فہم اور طبیعت کی دوراسی کا اندازہ کر کے بے اختیار انہوں نے کہا کہ یہ بچہ اپنے وقت کا رازی اور اپنے زمانہ کا غزالی ہوگا۔

علمی مذاق اور ذکاوت و ذہانت کے ساتھ سلامتی طبع حسن اخلاق اور اعمال صالحہ کی دو لتیں بھی شروع سے آپ کو وافر مقدار میں ملی تھیں۔ آپ کے غیر معمولی احوال کو دیکھ کر کشمیر کے عوام عام طور پر شبہ کرتے تھے کہ کہیں آپ مہدی موعود ہوں۔ آپ کے والد محترم اور خاندان کے دوسرے بزرگوں کو عوام کی اس غلط فہمی کی تردید کرنی پڑتی تھی۔

آپ نے خود ایک موقعہ پر فرمایا کہ میں بارہ سال کی عمر میں فتاوی دینے لگا تھا۔ اور نو سال کی عمر میں فقہ نحو کی مطولات کا مطالعہ کر چکا تھا۔

ذالک فضل الله یو تیه من یشاء.

چنانچہ تین سال تک آپ ضلع ہزارہ (سرحد کے متعدد علماء صلحاء کی خدمت میں رہ کر علوم عربیہ کی تکمیل فرماتے رہے۔ پھر جب علوم وفنون کی پیاس وہاں بھی بجھتی نظر نہ آئی تو ہندوستان کے علوم دینیہ دار العلوم کی شہرت سن کر آپ بھی ۱۳۰۷ھ یا ۱۳۰۸ میں بعمر سولہ سترہ سال ہزارہ سے دیوبند آ گئے۔ دیوبند میں آپ نے چار سال رہ کر وہاں کے مشاہیر وقت و یکتائے روزگار علماء سے فیوض علمیہ و باطنیہ کا بدرجہ اتم استفادہ کیا بیس اور اکیس سال کی عمر میں نمایاں شہرت وعزت

کے ساتھ سند فراغ حاصل کی جن علماء سے آپ کو شرف تلمذ رہا ہے ان میں سے مندرجہ ذیل حضرات خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

قدوۃ العلماء حضرت مولانا الحاج محمود الحسن صاحب نور اللہ مرقدہ حضرت مولانا الحاج الحافظ خلیل احمد صاحب سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب امرتسری مہاجر مدنی، حضرت مولانا غلام رسول صاحب ہزاری الدیوبندی۔ دیوبند سے فارغ ہو کر قطب الارشاد حضرت مولانا الحاج احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ کی خدمت میں گنگوہ تشریف لے گئے اور وہاں سے سند حدیث کے علاوہ فیوض باطنی بھی حاصل کئے اس کے بعد آپ دہلی تشریف لے گئے۔ اور تین چار سال تک مدرسہ عالیہ امینیہ کے مدرس اول رہے۔

دہلی میں بارہ تیرہ سال قیام کے بعد بعض ضرورتوں اور مجبوریوں کے باعث آپ کشمیر تشریف لے گئے اور ۱۳۲۳ھ میں آپ بعض مشاہیر کشمیر کی رفاقت میں زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہوئے۔ سفر حجاز میں طرابلس۔ بصرہ اور مصر و شام کے جلیل القدر علماء نے آپ کی بہت عزت کی اور سب نے آپ کی خدا دادو بے نظیر لیاقت واستعداد دیکھ کر سندات حدیث عطا فرمائیں جن میں آپ کا نام "الفاضل الشیخ محمد انور بن مولانا محمد معظم شاہ الکشمیر ی" لکھا گیا ہے۔

سفر حجاز سے واپس آ کر خواجگان قصبہ بارہ مولا (کشمیر کا ایک مشہور مقام ہے) خصوصاً خواجہ عبد الصمد ککرو رئیس اعظم کے اصرار پر آپ نے اسی قصبہ میں مدرسہ فیض عام کی بنیاد ڈالی۔ اور تقریباً تین سال تک آپ وہاں خلق اللہ کو فیض یاب فرماتے رہے۔ اسی اثناء میں آپ کو دارالعلوم دیوبند کے مشہور جلسہ دستار بندی میں مدعو کیا گیا۔ آپ دیوبند تشریف لے گئے دارالعلوم میں آپ نے استفادہ علوم وفنون کیا تھا۔ اور وہیں سے سند فراغ حاصل کی تھی۔ اب اسی دارالعلوم میں مدرس مقرر ہو گئے سنن ابوداود شریف اور صحیح مسلم شریف کا درس سالہا سال تک آپ بغیر کسی تنخواہ کے دیتے رہے۔ چند سال کے بعد اپنی والدہ ماجدہ کے انتقال کی وجہ سے آپ کو کشمیر جانا پڑا۔ لیکن دارالعلوم کی طرف سے واپسی کا شدید تقاضا ہوا اس لئے جلد ہی واپس تشریف لے آئے۔

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رحمہ اللہ علیہ جو آپ کے بہت زیادہ شفیق استاد تھے۔ اور ساتھ ہی آپ کا بہت زیادہ احترام بھی فرماتے تھے۔ وہ اکثر دیوبند میں آپ کے

استیصال کے لئے قابل قدر سرگرمی کے ساتھ جہاد کیا اور اس کے ناپاک اثرات کو بہت حد تک ختم کر کے اسلام کی عظیم الشان خدمت انجام دی۔

ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ کو اپنی زندگی کے آخری ایام میں اسلام سے جو شغف پیدا ہو گیا تھا۔ واقفین حال اس حقیقت سے واقف ہیں کہ یہ حضرت علامہ سید محمد انور شاہؒ کی برکات تھیں۔ ڈاکٹر موصوف نے اسلامیات میں علامہ مرحوم سے بہت کچھ استفادہ کیا اور علامہ مرحوم کے فیض صحبت نے ان کی روح کو جلا بخشی۔ ڈاکٹر موصوف دل و جان سے علامہ مرحوم کا احترام کرتے تھے۔ اور عقیدت و محبت کے جذبات کے ساتھ علامہ کی رائے کے آگے سر تسلیم خم کر دیتے تھے۔

حضرت کے علمی و عملی کمالات میں سے جو چیز آپ کو اقران و اعیان عصر میں سب سے زیادہ ممتاز کرتی تھی وہ آپ کی جامعیت و تبحر علمی ہے۔ علوم عقلیہ و شرعیہ میں سے ایک بھی ایسا علم نہیں ہے جس میں آپ کو مہارت تامہ حاصل نہ ہو اور شاید یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ علماء متقدین میں بھی ہر حیثیت سے ایسی جامع علوم عقلیہ و نقلیہ ہستیاں شاذ و نادر ہی ملتی ہیں۔

آپ سیکڑوں علماء فضلا کے مجمع میں بیٹھ کر ہر ایک مسائل پر اس طرح تقریر فرمایا کرتے تھے کہ گویا آپ کو تمام مسائل فن متحضر اور کالنقش فی الحجر ہیں۔ حتیٰ کہ بعض دفعہ خیال ہوتا تھا کہ اپنے ارادہ سے کلام نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ الہامات و واردات کے زور پر کر رہے ہیں اور یہ تو بیشتر ہوتا تھا کہ اکابر علماء وقت سے جب بعض دقیق و لاینحل یا مختلف فیہ مسائل کے متعلق پوچھا جاتا تھا تو وہ حضرت سے استفسار کرنے کو فرمایا کرتے تھے۔ اور اکثر علماء عصر حاضر کو جب کسی علمی مسئلہ میں کوئی دقت پیش نہیں آتی تھی تو وہ خود بھی حضرت مرحوم سے مراجعت فرماتے تھے، ذیل میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علیؒ کے ایک مکتوب گرامی کا پہلا اور آخری حصہ مندرج ہے جو انہوں نے حضرت مرحوم کو ارسال فرمایا تھا، جس میں انہوں نے کسی مسئلہ پر حضرت مرحوم سے تحقیق چاہی ہے۔

نفحۃ العنبر حضرت مولانا انور شاہ صاحب کی ایک طویل اور جامع تاریخ حیات ہے عربی زبان میں حضرت مرحوم کے شاگرد مولانا محمد یوسف بنوری نے مرتب اور مجلس علمی نے ڈابھیل سے شائع کیا ہے۔ نفحۃ العنبر کا بیان ہے کہ حکیم الامتہ نے اکثر مسائل میں علامہ مرحوم سے استفادہ کیا ہے۔

از ناکارہ آوارہ اشرف علی عفی عنہ بخدمت بابرکت جامع الفضائل العلیمہ والعملیہ حضرت

اناللہ و انا الیہ راجعون.

حضرت شاہ صاحب موجودہ سیاسی خلفشار میں جمعیۃ علماء ہند کے ملک کے بہت بڑے حامی بہت بڑے حریت پسند برطانوی امپریلزم کے سخت دشمن اور ہندوستان میں دین قیم کو سربلند دیکھنے کے آرزومند تھے۔ شروع سے آخر تک آپ جمعیۃ علماء کی مجلس عاملہ کے اعلی رکن اور جمعیۃ کے مقاصد کے ہمدرد رہے۔ ہمیشہ آپ نے اپنے گراں قدر مشوروں سے جمعیۃ کی رہنمائی اور جمعیۃ کے حلقے کو وسیع کرنے کی کوشش فرمائی۔ ۱۳۴۶ھ میں حضرت مرحوم نے پشاور میں جمعیۃ کے آٹھویں عظیم الشان اور تاریخی سالانہ اجلاس کے صدر کی حیثیت سے ایک بصیرت افروز اور معرکہ آرا خطبہ میں بہت سے مذہبی اور سیاسی موضوعات پر اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار فرمایا تھا۔ جمعیۃ کے علاوہ مجلس احرار کے حال پر بھی حضرت مرحوم کا گوشہ چشم التفات مبذول رہا۔ اور اس کے قائدین کی بھی حضرت مرحوم نے اپنے علم و فضل اور روحانی قوت سے قیادت و رہنمائی فرمائی۔ تحریک کشمیر میں احرار کو حضرت مرحوم کی تمام ہمدردیاں حاصل تھیں۔ علامہ مرحوم کو دور حاضر کے مہلک ترین فتنۂ قادیانیت کی تردید سے غیر معمولی شغف تھا۔ سالہا سال تک علامہ مرحوم اس فتنہ کی ہلاکت سامانیوں سے ملت مرحومہ کو محفوظ فرمانے کے لئے تحریری و تقریری طور پر خدمات انجام دیتے رہے تردید قادیانیت کے سلسلہ میں آپ انتہائی پریشان کن علالت میں بھی مذہبی جلسوں میں شرکت کے لئے دور دور کا سفر فرماتے تھے۔ انتہا یہ کہ انتقال کے صرف چند دن پہلے آپ اپنی مشہور معرکہ آرا تصنیف ''خاتم النبین" سے فارغ ہوئے تھے جس میں آیت کریمہ۔ **ماعان محمد ابا احدمن رجالکم ولکن رسول اللہ خاتم النبین** کی آپ نے اپنے مخصوص محدثانہ اور محققانہ انداز میں تفسیر فرمائی ہے یہ تصنیف محض قادیانیوں کے دجل و تلبیس کے تار پود بکھیرنے کے لئے فرمائی گئی تھی اس سے فراغت پا کر حضرت مرحوم نے اپنے خدام سے ارشاد فرمایا۔

میں نے آخرت کے لئے کچھ نہیں کیا تھا۔ خاتم النبیین کے عنوان سے یہ چند سطریں لکھی ہیں۔ انشاءاللہ یہ مرزائے قادیان کے دجل و فریب کو اظھر من الشمس کردیں گی اور میرے لئے زادراہ آخرت ہوں گی۔"

مجلس احرار کو حضرت مرحوم نے رد قادیانیت پر متوجہ فرمایا۔۔احرار نے اس فتنہ کے

مولانا سید انور شاہ صاحب دامت انوراہم ۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ، تحقیق سابق کے متعلق بضرورت مکرر تکلیف دینا پڑی۔ امید ہے کہ معاف فرمائیں گے۔ ایک حادثہ خود مجھ کو پیش آیا ہے اس کے متعلق جداگانہ تکلیف دیتا ہوں۔ الخ وقال خاتمہ اس میں روایت دوروایت سے کچھ حکم فرمائیں۔

حضرت شاہ صاحب کا تبحر علمی و جامعیت فنون نہ صرف ہندوستان میں مسلم تھا بلکہ مصروشام بیروت حرمین شریفین و دیگر بلاد اسلامیہ کے بھی جو علماء ہندوستان میں بغرض سیاحت آتے تھے اور دارالعلوم میں پہونچ کر آپ سے مختلف مسائل پر گفتگو کرتے تھے وہ آپ کی بے نظیر علمی قابلیت کے معترف ہوکر جایا کرتے تھے اور اکثر نے کہا کہ ہمارے ملک میں کوئی ایسا جامع و محقق عالم نہیں۔

مصر کے مشہور عالم وادیب علامہ سید رشید رضا مدیر رسالہ المنار "جو مفتی محمد عبدہ کے شاگرد رشید تھے۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے سالانہ جلسہ میں ہندوستان شریف لائے۔ سید رشید رضا مرحوم دارالعلوم میں بھی آئے اور آپ نے وہاں کا معائنہ کیا۔ حضرت شاہ صاحب نے طلبا وارا کین مدرسہ واعیان شہر کے جلسہ عام میں اس موقع پر پرعربی زبان میں ایک مبسوط تقریر فرمائی جس میں آپ نے اولاً دارالعلوم کی اجمالی تاریخ بیان فرمائی۔ پھر درس حدیث شریف کا جو طریقہ دارالعلوم دیوبند میں رائج تھا اس کو واضح فرمایا۔ نیز حنفیہ کے مسلک کو مستحکم دلائل کے ساتھ پیش فرمایا۔ اور اس کے اصول اساسی پر کافی روشنی ڈالی جس سے رشید رضا مرحوم بہت زیادہ محظوظ ہوئے اور حضرت شاہ صاحب کی قوت بیان اور استدلال اور وسعت معلومات پر سخت متحیر۔ نیز علامہ رشید رضا مرحوم نے شافعی المذہب ہونے کی وجہ سے مذہب حنفی کے متعلق آپ سے بہت سے سوالات بھی کئے جن کا حضرت نے کافی وشافی جواب مرحمت فرمایا۔

سید رشید رضا علامہ محترم کی ملاقات سے اس قدر محظوظ ہوئے کہ آخرانہیں یہ کہنا پڑا کہ اگر میں اس دارالعلوم کو نہ دیکھتا تو ہندوستان سے نہایت مایوس ہوکر واپس جاتا۔ اس درالعلوم نے مجھ کو بتادیا ہے کہ:

> "ہندوستان میں ابھی علوم عربیہ اور تعلیمات مذہبی اعلی پیمانہ پر موجود ہیں۔ "میں علامہ موسے جائر اللہ روسی اسلامی دنیا کے زبردست عالم اور وسیع النظر فاضل ہیں۔ ان کی علمی شخصیت عالمگیر شہرت کی مالک

ہے۔ ۱۹۳۰، ۱۹۳۱ء میں علامہ موسی دیوبند تشریف لائے تھے، آپ
کئی دن تک علامہ مرحوم سے علمی مسائل پر تبادلہ خیالات کرتے
رہے اور اخیر میں آپ نے علامہ مرحوم کے تبحر علمی کا اعتراف فرمایا۔

حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کا حافظہ زبان زد خلائق ہے ایک کتاب کے اگر پانچ پانچ یا دس دس حواشی بھی تھے تو آپ کے یاد ہوتے تھے۔ حوالہ ہائے کتب صحیح بقید جلد وصفحات آپ کو ایک ہی دفعہ کے مطالعہ سے محفوظ ہو جاتے تھے۔ اور جس وقت کسی اہم علمی مسئلہ پر تقریر فرماتے تھے تو بے شمار کتابوں کے حوالے بلا تکلف دیتے چلے جاتے تھے۔ احادیث کا تمام ذخیرہ اوران کی صحت اور عدم صحت کے متعلق طویل وعریض بحثیں رواۃ کے مدارج ومراتب اس طرح محفوظ تھے کہ طلبہ حدیث اکثر آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر ایک مکمل لائبریری کا کام لیتے اور ایسے سوالات کا جواب منٹوں میں حاصل کر لیتے جن کی تحقیق وجستجو کے لئے ایک پوری عمر درکار ہے پھر ہر جواب میں جامعیت اس قدر ہوتی تھی کہ اس موضوع پر کسی کتاب کو خواہ وہ مطبوعہ ہو یا قلمی دیکھنے کی ضروت باقی نہ رہتی۔ مشہور ومعروف کتب خانوں کی اکثر مخطوطات (قلمی کتابیں) نظر سے گزر چکی تھیں اور اس طرح محفوظ تھیں کہ گویا آج ہی مطالعہ کیا ہے۔

آخر عمر میں بیماری کا بہت زیادہ غلبہ رہا جس سے ممکن تھا حافظ پر اثر پڑتا۔ مگر فضل ایزدی سے آپ کو یہ عارضہ لاحق نہیں ہوا۔ حالانکہ بہت سے کامل محدثین کے حافظہ میں آخر عمر میں اختلاط آ گیا تھا۔ اس اعتبار سے آپ آیة من آیات اللہ تھے۔

جزئیات فقہ نہ صرف فقہ حنفی کی بلکہ ائمہ اربعہ اور دوسرے ائمہ کی بھی بہت زیادہ آپ کو محفوظ تھیں۔ مگر حضرت باوجود اس کمال فقاہت وحفظ کے اکثر ارشاد فرمایا کرتے تھے، کہ میں ہر فن میں اپنی رائے رکھتا ہوں اور کسی کی تقلید نہیں کرتا۔ لیکن فقہ میں کوئی رائے نہیں رکھتا اور اس میں امام اعظم کا مقلد ہوں۔

علم حدیث میں جو کچھ آپ کا مرتبہ ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ اس فن مبارک میں اللہ تعالی نے وہ کمال آپ کو عطا فرمایا تھا کہ عرب وعجم میں اس کی نظیر مشکل بلکہ قریباً ناممکن ہے۔ کمال حافظہ کی وجہ سے علاوہ صحاح ستہ کے دیگر کتب مبسوطہ حدیث مطبوعہ وقلمی آپ کو ازبر تھیں۔

مرحوم کا یہ تبحر صرف علوم ونقلیہ میں محدود نہ تھا بلکہ آپ کو یہ کمال حاصل تھا کہ فن کی کوئی

کتاب ملی اور اس کو شروع سے آخر تک ضرور ایک بار مطالعہ فرمالیا۔ اور جب کبھی سالہا سال کے بعد اس کتاب کے متعلق کوئی بات چھڑی تو اس کتاب کے مندرجات کو اس طرح حوالوں کے ساتھ بیان فرمایا کہ سننے والے ششدر و حیران رہ گئے۔

ایک بار پنجاب سے ایک صاحب علم جفر کے متعلق چند مشکل ترین مسائل حل کرنے کے لئے حضرت کی خدمت میں دیوبند حاضر ہوئے۔ آپ نے ان کو تسلی بخش جواب عنایت فرما کر واپس فرمایا۔ فلسفہ جدید (جدید سائنس) اور جدید ہیئت کا بھی آپ نے گہرا مطالعہ فرمایا تھا اور اپنے بعض مخصوص تلامذہ کو سائنس جدید کی کتاب بھی پڑھائی تھی اور فرمایا کرتے تھے کہ اب علماء کو قدیم فلسفہ و ہیئت کے ساتھ جدید فلسفہ و ہئیت کو بھی حاصل کرنا چاہئے۔

حضرت نے علم طب کا بھی بتمام و کمال مطالعہ کیا تھا۔ اور جناب حکیم سید محفوظ علی صاحب کو علم طب کی کتابیں پڑھائیں جو اس وقت دیوبند میں ایک نہایت کامیاب مطب کر رہے ہیں۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی مدظلہ نے فرمایا کہ مجھ سے حضرت شاہ صاحب فرماتے تھے کہ جب میں کسی کتاب کا سرسری نظر سے مطالعہ کرتا ہوں اور اس کے مباحث کو محفوظ رکھنے کا ارادہ بھی نہیں ہوتا پھر بھی پندرہ سال تک اس کے مضامین مجھے محفوظ رہ جاتے ہیں۔

سرعت مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ مسند احمد (مطبوعہ مصر) کے روزانہ دو سو صفحات کا مطالعہ فرمایا۔ اس طرح کہ پوری دقت نظر اور کامل غور و فکر کے ساتھ اس کی اسانید اور مشکلات کو حل کرتے جاتے تھے۔

آپ کے سوانح نگار مولانا محمد یوسف نبوری نے "نفحۃ العنبر" میں لکھا ہیکہ حضرت شیخ درس میں فرماتے تھے کہ میں نے چند ہی روز میں مسند احمد سے احناف کے تمام دلائل اور وہ احادیث جو ان کی موئد ہیں منتخب اور محفوظ کر لیں۔ مسند احمد کا مطالعہ اگرچہ اتنی تیزی کے ساتھ فرمایا تھا مگر درس میں حسب موقعہ جب مسند کی احادیث نقل فرماتے تو کتاب سے مراجعت کئے بغیر احادیث کے رواۃ اور طبقات پر پوری بحث سامنے آجاتی تھی۔ اخیر عمر میں آپ نے پھر ایک دفعہ سیدنا عیسی علیہ اسلام سے متعلق احادیث کو جمع کرنے کے لئے مسند کا مطالعہ فرمایا تھا۔

مصنف نفحۃ العنبر ہی کا بیان ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے ۱۳۲۱ھ میں فتح القدیر لابن ہمام رحمہ اللہ کا مع تکملہ بیس دن کے اندر مطالعہ فرمایا اور اس طرح کہ کتاب الحج تک اس کی

تلخیص فرمائی اور ابن ہمام نے فتح القدیر میں صاحب ہدایہ پر جو اعتراضات کئے ہیں اپنے خلاصہ میں ان کے مکمل جوابات بھی قلمبند فرمائے۔ پھر مدت عمر میں مذاہب ومباحث کو نقل کرنے میں فتح القدیر کے مطالعہ کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ۱۳۴۷ھ میں درس کے دوران میں تحدیث نعمۃ اور طلبہ میں شغف مطالعہ پیدا کرنے کے لئے بیان فرمایا کہ اب ۲۶ سال ہوگئے فتح القدیر کی جانب مراجعت کی ضرورت نہیں پڑی۔ جو مضمون اِس کا بیان کروں گا۔ اگر مراجعت کرو گے تفاوت بہت کم پاؤ گے۔

آپ کے وسعت مطالعہ پر اس واقعہ سے روشنی پڑتی ہے کہ کشمیر میں ایک دفعہ علماء کے درمیان اختلاف ہوا اور ہر ایک کا جواب دوسرے کے مخالف رہا اس دوران میں حضرت شاہ صاحب کشمیر تشریف لائے۔ فریقین شاہ صاحب سے ملاقات کرنے کے لئے حاضر ہوئے اور دونوں نے مختلف فیہ مسئلہ کو آپ کے سامنے پیش کیا۔ حضرت شاہ صاحب نے مولانا محمد یوسف بنوری کو حکم دیا کہ اس کا جواب لکھو، اس فتوی پر ایک فریق نے فتاوی عمادیہ کے ایک قلمی نسخہ سے اپنے استدلال میں ایک عبارت پیش کی۔ حضرت شاہ صاحب نے مولانا محمد یوسف صاحب سے فرمایا کہ میں نے فتاوی عمادیہ کے مخطوطہ کا دار العلوم کے کتب خانہ میں مطالعہ کیا ہے اس میں یہ عبارت ہرگز موجود نہیں یہ لوگ تصحیف کررہے ہیں یا تدلیس۔ اس پر حاضرین متحیر ہوئے اور مستدلین مبہوت ہوکر رہ گئے۔

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی فرماتے تھے کہ فوائد القرآن لکھتے وقت مجھے حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق صحیح روایت حاصل نہ ہوسکیں۔ پندرہ روز تک اس چھان بین میں لگا رہا کہ کوئی ایسی حدیث ہاتھ آئے جو انبیاء کے شایان شان ہو۔ لیکن میری کوشش بیکار گئی۔ اس کے بعد میں حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ بیماری کی وجہ سے صاحب فراش تھے میں نے اس پیش آئی ہوئی الجھن اور دشواری کا اظہار کیا۔ حضرت نے بلا تامل فرمایا کہ حاکم نے مستدرک کے اندر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک اثر نقل کیا ہے اس کا مطالعہ کیجئے آپ کی تمام الجھن ختم ہوجائے گی۔ حضرت مولانا عثمانی نے فرمایا کہ میں نے حضرت شاہ صاحب کے ارشاد کے مطابق مطالعہ کیا تو میری تمام الجھنیں دور ہوگئیں۔ اور ضرورت کے مطابق حدیث مل گئی۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوری صاحب بذل المجہود اپنی اس معرکۃ

آراء کتاب کی تصنیف کے وقت روایت و درایت میں پیش آمدہ مشکلات کے لئے شاہ صاحب ہی سے رجوع فرماتے تھے اور آپ کے استاد شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی مشکلات میں آپ سے رجوع فرماتے اور مسائل میں آپ کی رائے کو ترجیح دیتے تھے۔ حضرت مولانا ظہیر الحسن صاحب شوق نیموی صاحب آثار السنن بھی اپنی کتاب کی تصنیف کے وقت خط و کتابت کے ذریعہ آپ سے استفادہ کرتے تھے۔

مولانا محمد یوسف صاحب بنوری کا بیان ہے کہ تیرہ دفعہ آپ نے صحیح بخاری شریف کے صرف متن کا مطالعہ فرمایا تھا۔ جب کہ اس کے حاشیہ اور بین السطور پر بالکل نظر نہ تھی۔ ہر دفعہ ایسے علوم و حقائق کا انکشاف ہوتا کہ اس سے پہلے قلب میں گزرے ہی نہ تھے۔

حضرت شاہ صاحب حافظ ابن حجر کے بے حد مداح تھے۔ ابن تیمیہ کو حافظ الدینا اور جبال علم کے معزز القاب کیساتھ یاد کرتے تھے۔ حافظ ابن حجر کے مقابلہ میں حافظ بدرالدین عینی شارح بخاری کے علوم اور ان کی تحقیقات کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ درس میں ایک دفعہ فرمایا کہ میں نے خواب میں حافظ بدرالدین عینی کو دیکھا اور ان سے بطور شکایت کے کہا کہ ابن حجر کے مقابلہ میں جو طرز آپ نے اختیار کیا ہے آپ کے اس طرز سے امت کو کوئی نفع نہیں پہونچا۔ حافظ عینی نے جواب دیا کہ حافظ ابن حجر سے دریافت کرو کہ انہوں نے یہ طرز کیوں اختیار کیا تھا؟ حافظ عینی کہنا چاہتے تھے کہ میں نے صرف مدافعت کی ہے ابتداء ابن حجر سے ہوئی ہے حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ میں عینی کے اس جواب پر خاموش ہوا۔ ان مقامات پر جہاں حافظ ابن حجر کے اعتراضات کا جواب عینی سے بن نہیں پڑا۔ حضرت شاہ صاحب اپنے درس میں ان کا شافی جواب عنایت فرماتے تھے۔

مولانا سراج احمد صاحب رشیدی مرحوم استاذ سنن ابی داؤد نے فرمایا۔ کہ حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے تھے کہ ایک شخص نے کعبۃ اللہ کے پردوں کو پکڑ کر دعا کی خداوند تعالی مجھے ابن حجر کا سا علم حدیث عطا فرما۔ اس کی دعا قبول کی گئی۔ مولانا رشیدی کہتے تھے کہ میں سمجھا کہ شاہ صاحب کسی دوسرے کا واقعہ بیان فرماتے ہیں۔ اس وقت یہ خیال نہ گزرا کہ یہ ان کی اپنی ہی حکایت ہے۔ کچھ دیر بعد سمجھا کہ یہ واقعہ حضرت شاہ صاحب ہی کا ہے۔

مولانا قاری محمد یامین صاحب استاذ ڈابھیل نے کہا کہ پنجاب کے ایک عارف دیوبند

تشریف لائے۔ حضرت شاہ صاحب سے ملاقات کے بعد انہوں نے کہا کہ شیخ کی نسبت نہایت ہی قوی اوران کی عظمت نا قابل مثال ہے۔ مولانا محمد یوسف صاحب نے کہا کہ حضرت شاہ صاحب نے مشائخ چشت کے طرز پر چھ ماہ تک کشمیر میں ریاضت ومجاہدہ فرمایا اور یہ تمام عرصہ خلوت میں گزرا۔

آپ کے استاد حضرت مولانا شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ نے آپ کو جو سند اجازت عنایت فرمائی تھی۔ اس میں تحریر فرمایا تھا کہ خداوند تعالے نے مولینا انور شاہ میں علم، عمل، سیرت، صورت، ورع، زہد، رائے صائب اور ذہن ثاقب جمع کردیا ہے اور مشہور ہے کہ حضرت شیخ الہند شاہ کو علامہ کے وقیع خطاب سے یاد فرماتے اور مسائل علمیہ میں جب کوئی الجھن پیش آتی تو حضرت شاہ صاحب سے دریافت فرماتے کہ کہو علامہ! اس مسئلہ میں سلف کا کوئی قول یاد ہے؟ شاہ صاحب جواب دیتے حضرت شیخ الہند اطمینان اور مسرت کا اظہار فرماتے۔

حضرت مولانا مدنی مدظلہ نے حضرت شاہ صاحب کے جلسہ تعزیت میں تقریر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ:

> "میں نے ہندوستان، حجاز عراق، شام وغیرہ کے علماء اور فضلاء سے ملاقات کی اور مسائل علمیہ میں ان سے گفتگو کی لیکن تجر علمی وسعت معلومات جامعیت اور علوم عقلیہ کے احاطہ میں شاہ صاحب کا کوئی نظیر نہیں پایا"۔

حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت شاہ صاحب کے انتقال پر اپنے ایک مضمون میں تحریر فرمایا تھا کہ۔

> "آہ قدرت کے زبردست ہاتھ نے حضرت مولانا العلامہ الفاضل الکامل، اکمل العلما، افضل الفضلا، النحریر المقدام، الجر الطمطام رحلتہ العصر قدوۃ الدھر، استاذ الاساتذہ، رئیس الجہابذہ، محدث وحید، مفسر فرید، فقیہ یگانہ، ماہر علوم نقلیہ وعقلیہ مولانا سید انور شاہ قدس سرہ کو آغوش رحمت میں کھینچ لیا اور ہم سے ظاہری طور پر ہمیشہ کے لئے جدا کردیا۔ حضرت شاہ صاحب کی وفات بلاشبہ وقت حاضر کے کامل

ترین عالم ربانی کی وفات ہے جن کا نظیر مستقبل میں متوقع نہیں علماء
میں حضرت شاہ صاحب کا تبحر، کمال فضل و ورع وتقوی و جامعیت
استغناء مسلم تھا موافق ومخالف ان کے سامنے تسلیم وانقیاد سے گردن
جھکا تا تھا۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی مہتمم دارالعلوم نے حضرت شاہ صاحب کی تصنیف ''اکفار الملحدین'' کو دیکھ کرفرمایا کہ:

"تکفیر الملحدین اور اہل قبلہ سے متعلق تحقیق میں شیخ الثقہ الورع متقی
الحافظ الحجتہ المفسر المحدث الفقیہ المتجر فی العلوم النقلیہ والعقلیہ رافع
لوائے تحقیق فی المسائل الغامضتہ المبہمہ مولانا الشاہ محمد انور صدر المدر
سین دارالعلوم دیوبند نے ایک رسالہ لکھا ہے اور اس مسئلہ سے متعلق
تمام حقوق کوکامل طور پرادا فرمایا ہے۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب ہمیشہ حضرت شاہ صاحب کو چلتا پھرتا کتب خانہ فرمایا کرتے تھے۔

حضرت مولانا اصغر حسین صاحب دیوبندی فرمایا کرتے تھے کہ:

مجھے جب مسئلہ فقہ میں کوئی دشواری پیش آتی ہے تو کتب خانہ دارالعلوم کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ اگر کوئی چیز مل گئی تو فبہا ورنہ پھر حضرت شاہ صاحب سے رجوع کرتا ہوں۔ شاہ صاحب جو جواب دیتے اسے آخری اور تحقیقی پاتا اور اگر حضرت شاہ صاحب نے کبھی یہ فرمایا کہ میں نے کتابوں میں یہ مسئلہ نہیں دیکھا تو مجھے یقین ہو جاتا ہے اب یہ مسئلہ کہیں نہیں ملے گا اور تحقیق کے بعد ایسا ہی ثابت ہوا۔

۱۹۲۷ء ۱۹۲۸ء میں جب سائمن کمیشن آرہا تھا تو اخبارات میں شائع ہوا تھا کہ سی آرداس آنجہانی کی روح کو حاضر کرکے اس سے سائمن کمیشن کے نتیجہ کے متعلق دریافت کیا گیا سی آرداس کی روح نے جواب دیا کہ سائمن کمیشن کو ہندوستانیوں کے مطالبہ کے سامنے جھکنا پڑے گا۔

احقر (محمد میاں) اس زمانہ میں مدرسہ حنفیہ کے شاہ آباد میں خود حضرت موصوف و حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب وحضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب کے حکم کے بموجب کام

کر رہا تھا۔ اس خبر سے احقر کو خلجان پیدا ہوا۔

اگر چہ مسلمان عامل بھی عملیات سے ارواح کو حاضر کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ خود میں نے اپنے خاندان کے حضرات کو دیکھا ہے کہ وہ ارواح خبیثہ کو حاضر کر کے ان سے گفتگو کیا کرتے ہیں۔ مگر اس کی نوعیت دوسری ہوتی ہے ایک مدبر اور لیڈر کی حیثیت سے سی آر داس کی روح کو حاضر کرنا اور اس سے استفادہ اور وہ بھی ان یورپ زدہ دماغوں کی طرف سے جو خود روح ہی کے منکر تھے ایک تعجب انگیز بات تھی۔

چنانچہ جب دیوبند حاضری کا اتفاق ہوا تو احقر نے حضرت قدس اللہ سرہ العزیز کی خدمت میں اپنے شبہات پیش کئے۔

حضرت موصوف قدس اللہ سرہ العزیز نے تقریباً ایک گھنٹہ تقریر فرما کر روح اور اس کے حالات کو شرح و بسط سے سمجھایا۔ یورپ روح کا منکر تھا۔ کسی طرح قائل ہوا۔ اسکی تحقیق اس مسئلہ میں کیا ہے۔ اور کسی طرح اپنی تحقیق میں اضافہ کر رہا ہے۔ امریکہ والوں کو اس مسئلہ سے کس قدر دلچسپی ہے۔ حقیقت کیا ہے اور اس مسئلہ میں اسلام کا نقطہ نظر کیا ہے۔ غرض روح کے متعلق تمام گوشوں پر محققانہ روشنی ڈالی۔ حضرت کی تقریر جاری تھی گویا سمندر امنڈ رہا تھا۔ میں محو حیرت تھا اور میرا دل اطمینان وانشراح کی کیفیت سے محظوظ ہو رہا تھا۔ سیکڑوں اوراق کے مطالعہ سے وہ بات نہ پیدا ہوتی جو حضرت کی اس تقریر سے پیدا ہوگئی۔ (۱)

حضرت شاہ صاحب قدس سرہ میں علمی تبحر و کمالات ظاہری و باطنی کے ساتھ زہد و تقوی کی یہ حالت تھی کہ جس طرح آپ علم و فضل میں تمام معاصرین سے ممتاز تھے اسی طرح آپ

ہندوستان جس طرح ہندوئوں کا وطن ہے اسی طرح مسلمانوں کا بھی وطن ہے۔ ان کے بزرگوں کو ہندوستان آئے ہوئے اور رہتے ہوئے صدیاں گزر گئیں۔ انہوں نے اس ملک پر صدیوں حکومت کی۔ آج بھی ہندوستان کے چپہ چپہ پر مسلمانوں کی شوکت و رفعت کے آثار موجود ہیں۔ موجودہ نسل کا خمیر ہندوستان کے آب و گل سے ہے۔

زہد وتقویٰ ورع و پرہیز گاری میں بھی بے مثل تھے۔

آپ کو ڈھاکہ یونیورسٹی اور مدرسہ عالیہ کلکتہ سے بار بار طلب کیا گیا۔ بڑی بڑی تنخواہیں پیش کی گئیں لیکن آپ نے کبھی بڑی تنخواہوں کو ترجیح نہیں دی اور ہمیشہ دیوبند و ڈابھیل کے خشک خطوں کو ہی پسند فرمایا۔

بچپن میں آپ کو لہو ولعب اور فضول و بیکار باتوں سے سخت نفرت رہی اور دور شباب بھی سراسر عصمت وعفت، متانت اور سنجیدگی کا دور تھا۔ منہیات شرع تو کیا مشتبہات سے بھی ہمیشہ اس طرح شدت سے اجتناب واحتراز فرمایا کرتے تھے کہ گویا ایک مجدد اسلام اپنے طریقہ عمل سے شریعت حقہ پر ثابت وقائم رہنے کی عملی تلقین کر رہا ہے۔

ابتدائے عمر ہی سے تجرد تفرد اور دنیاوی امور سے یکسوئی کو نہ صرف پسند فرمایا کرتے تھے بلکہ اپنے عمل سے بھی اس کا پورا پورا ثبوت [1] دیا۔ اس جبال علم وعمل کی اس مختصر تاریخ حیات کو ہی حکیم الامتہ حضرت قبلہ مولانا اشرف علی صاحب قدس سرہ اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کے ارشادات پر ختم کرتے ہیں۔

زعیم احرار حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا بیان ہے کہ حضرت حکیم الامت تھانوی نے فرمایا کہ میرے نزدیک حقانیت اسلام کی دلیلوں میں ایک۔

> "دلیل حضرت مولانا انور شاہ صاحب کا امت مسلمہ میں وجود بھی ہے۔
> اگر دین اسلام میں کسی قسم کی کچھ یا خرابی ہوتی تو آپ دین اسلام سے
> کنارہ کش ہو جاتے"۔

مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے حضرت کی وفات کے بعد ۲۹ مئی ۱۹۳۳ء کو جامعہ ڈابھیل کے ایک جلسہ میں فرمایا کہ۔

> "مجھ سے اگر مصر وشام کا کوئی آدمی پوچھتا کہ کیا تم نے حافظ ابن حجر
> عسقلانی"
> شیخ تقی الدین ابن دقیق العید اور سلطان العلماء حضرت شیخ
> عزالدین بن عبدالسلام کو دیکھا ہے تو میں استعارہ کر کے کہہ سکتا تھا
> کہ ہاں دیکھا ہے! کیونکہ صرف زمانہ کا تقدم و تاخر ہے ورنہ اگر

حضرت شاہ صاحب بھی چھٹی یا ساتویں صدی میں ہوتے تو اسی
طرح آپ کے مناقب و محامد بھی اوراق تاریخ کا گراں قدر سرمایہ
ہوتے، میں محسوس کررہا ہوں کہ حافظ ابن حجر شیخ تقی الدین اور
سلطان العلماء کا انتقال آج ہورہا ہے"۔

حضرت علامہ کشمیری قدس اللہ سرہ العزیز اجلاس قستم جمعیۃ علماء ہند منعقد ۲، ۳، ۴ ؍ اکتوبر ۱۹۲۷ء مطابق ۶، ۷، ۸ جمادی الاخری ۱۳۴۶ء بمقام پشاور کے صدر تھے۔ اس زمانہ میں شدھی سنگٹھن اور ہندو مسلم بلووں کے طویل سلسلہ نے ہندوستان کی فضا کو مکدر کررکھا تھا۔ اور نہر و رپورٹ نے جمعیۃ علماء ہند اور کانگریس کے درمیان میں کشیدگی پیدا کردی تھی۔ تفرقہ بندی کے اس پرآشوب دور میں حضرت محترم کے سیاسی خیالات کے اظہار کے لئے خطبہ صدارت کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں۔

حب وطن کی شرعی حیثیت:

ہندوستان جس طرح ہندوؤں کا وطن ہے اسی طرح مسلمانوں کا بھی وطن ہے۔ ان کے بزرگوں کو ہندوستان آئے ہوئے اور رہتے ہوئے صدیاں گزر گئیں۔ انہوں نے اس ملک پر صدیوں حکومت کی۔ آج بھی ہندوستان کے چپہ چپہ پر مسلمانوں کی شوکت و رفعت کے آثار موجود ہیں۔ موجودہ نسل کا خمیر ہندوستان کے آب و گل سے ہے۔ ہندوستان میں ان کی عظیم الشان مذہبی اور تمدنی یادگاریں ہیں۔ کروڑوں روپے کی جائیدادیں ہیں۔ عالی شان تعمیروں اور وسیع قطعات زمین کے مالک ہیں۔ ان کو ہندوستان سے ایسی ہی محبت ہے جیسے ایک سچے محب وطن کو ہونی چاہئے اور کیوں نہ ہو جب ان کے سامنے اپنے سید و مولا اپنے محبوب آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا حب وطن میں اسوہ حسنہ موجود ہے وہ یہ کہ حضور علیہ ﷺ نے کفار کے جور و ستم سے مجبور ہوکر حکم خداوندی کے ماتحت اپنے پیارے وطن مکہ معظمہ سے ہجرت کے وقت وطن عزیز کو خطاب کرکے فرمایا:

"خدا کی قسم خدا کی تمام زمین میں تو مجھے سب سے زیادہ پیارا شہر ہے اور اگر میری قوم
تیرے اندر سے مجھے نہ نکالتی تو میں تجھے کبھی نہ چھوڑتا"۔

اس کے بعد حکم الٰہی سے آپ نے مدینہ طیبہ میں سکونت فرمائی اور ہجرت کے بعد دار الہجرت سے منتقل ہونا محبوب و مستحسن نہ تھا۔ اس لئے گویا مدینہ طیبہ آپ کا وطن ہوگیا۔ اور اس

میں بحیثیت وطن رہنا تھا تو اس کے لئے دعا فرمائی:

اللهم حبب الينا المدينة كحبنا مكة او اشد. اللهم بارک لنافی صاعنا وفی مدنا وفی تمرنا ضعفی ما جعلت بمكة من البركة. اللهم ان ابراهيم عبدک و خليلک دعاک لا مكة للبركة و انا محمد عبدو رسولک ادعوک لاهل المدينة ن تبارک لهم فی مدهم و صاعهم مثلے ما بارکت لاهل مكة مع البركة

بارخدایا مدینہ کو ہمارے قلوب میں ایسا محبوب بنا دے جیسا ہم مکہ سے محبت کرتے ہیں یا اس سے بھی زیادہ محبت دے۔ اے اللہ ہمارے صاع (۱) ہمارے مد اور ہماری کھجور میں مکہ کی برکت سے دو چند برکت عطا فرما۔ خداوند آپ کے بندے آپ کے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آپ سے مکہ والوں کے لئے برکت کی دعا کی تھی۔ میں تیرا بندہ تیرا رسول "محمد" ہوں اہل مدینہ کے لئے تیری بارگاہ میں دعا کرتا ہوں کہ ان کے مد اور صاع میں اس برکت سے جو برکت اہل مکہ کو عطا فرمائی دو چند برکتیں عطا فرما۔ ایک برکت کے ساتھ دو برکتیں نازل فرما۔

سید الکونین ﷺ کے جذبات حب وطن یہ ہیں اور ان کے ہوتے ہوئے کیا ممکن ہے کہ مسلمان سچا مسلمان ہو کر اس جذبہ حب وطن سے خالی ہو اور چونکہ ہندوستان میں دوسری قومیں بھی آباد ہیں ان کو طبعی طور اپنے وطن ہندوستان سے محبت ہونی چاہئے۔ اس لئے تمام ہندوستانیوں کے قلوب میں ہندوستان کی آزادی کی خواہش ایک ہی مرتبہ اور ایک ہی درجہ پر ہونی لازم ہے۔

افغانی خطرہ کا حل:

یہ خطرہ کہ آزادی کے وقت اگر کسی مسلمان حکومت نے ہندوستان پر حملہ کیا تو مسلمانوں کا رویہ کیا ہوگا۔ نہایت پست خیال ہے اور اس کا نہایت سیدھا اور صاف جواب یہ ہے کہ مسلمان اپنے ہمسایوں کی طرف سے کسی معاہدہ کی وجہ سے مطمئن ہوں گے۔ اور ہمسایہ کی تعدی کا شکار نہ ہوں گے تو ان کا رویہ اس وقت وہی ہوگا جو کسی شخص کا اس کے گھر پر حملہ ہونے کی حالت میں ہوتا ہے اگرچہ حملہ اس کا ہم قوم اور ہم مذہب ہو۔ اس سے زیادہ ایک اور بات بھی قابل لحاظ ہے کہ جب مسلمان ہندوستان اپنے معاہدہ کی وجہ سے پابند ہوں اور غیر مسلم اقوام سے

انکا معاہدانہ برتاؤ واجب ہوتو ایسی حالت میں کسی مسلمانان بادشاہ کو مذہباً اس کی اجازت نہیں کہ مسلمانان ہند کے معاہدے کو توڑے اور ہندوستان پر حملہ آور ہو بلکہ اس پر واجب ہوگا کہ وہ مسلمان ہند کے اس معاہدے کا پورا پورا احترام کرے۔ رسول خدا ﷺ کا ارشاد ہے:

ذمة المسلمين واحدة يسعى بها ادناهم — مسلمانوں کا عہد اور ذمہ داری ایک ہے ادنی درجہ کا مسلمان بھی کوئی عہد کرے تو دوسروں پر اس کا احترام لازم ہے۔

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسرا ارشاد ہے۔

كل صلح جائز الاصلحا احل حراماً احرم حلالا — یعنی سوائے اس صلح کے جو کسی حرام کو حلال یا حلال کو حرام کردے ہر قسم کی صلح جائز اور درست ہے۔

میں نہایت بلند آہنگی کے ساتھ برادران وطن کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر وہ مسلمانوں کیساتھ منصفانہ معاہدہ کرلیں اور اس معاہدہ کو دیانت داری اور خلوص کے ساتھ پورا کریں۔ سیاسی چالوں اور نمائشی پالیسی سے کام نہ لیں تو مسلمانوں کو پورا وفادار مخلص ہمسایہ پائیں گے۔ کیونکہ مسلمان حکم قرآنی کے بموجب معاہدہ پورا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ ارشاد خداوندی ہے۔

الا الذين هدتم من المشركين ثم لم ينقضو كم شيئا و لم يظاهر و اعليكم احدا فاتموا اليهم عهدهم الى مدتهم ان الله يحب المتقين و قال ايضاً فما استقامو الكم فاستقيموا لهم ان الله يحب المتقين — جن غیر مسلموں سے تم نے معاہدہ کیا اور انہوں نے ایفائے عہد میں تمہارے ساتھ کمی نہیں کی اور تمہارے خلاف کسی کو مدد نہیں دی تو تم بھی معاہدہ کی مدت تک معاہدہ پورا کرو بیشک اللہ تعالی پرہیز گاروں سے محبت کرتا ہے اور فرمایا جب تک غیر مسلم تمہارے ساتھ سیدھے رہیں تم بھی سیدھے رہو۔ بیشک اللہ پرہیز گاروں کو دوست رکھتا ہے۔

(۳) دارالاسلام دارالحرب دارالامان:

اس موقع پر ایک اور بات بھی قابل غور ہے جس کے پیش نظر نہ رکھنے سے بسا اوقات شدید غلطیاں واقع ہو جاتی ہیں۔ وہ بات یہ ہے کہ مسائل شرعیہ تین قسم کے ہیں۔ اول جو اسلامی

حکومت اور اس کی شوکت کے ساتھ متعلق ہیں دوسرے جو دارالامان کے ساتھ مخصوص ہیں۔ تیسرے وہ جو "دارالحرب" میں جاری ہوتے ہیں۔ ہندوستان کو زیادہ سے زیادہ دارالامان کا حکم دیا جاسکتا ہے۔ دارالاسلام کے احکام جاری ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

ہمارے شیخ المشائخ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہ العزیز کا فتوی اس وقت کا ہے جب موجودہ زمانہ کے لحاظ سے ہندوستان میں؟؟؟؟ کا رنگ بہت گہرا تھا۔

ایسی صورت میں ہمارا فرض ہے کہ دارالامان کے احکام کتب مذہب میں تلاش کریں (اہل علم تفصیل کے لئے درمنتقے کے اس باب کو ملاخطہ فرمائیں جس میں اختلاف دار کے احکام بیان کئے گئے ہیں۔

متحدہ قومیت:

اس کے بعد حضرت شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں۔ اگر چہ میں اس مختصر خطبہ میں دارالامان کے تمام احکام پر روشنی نہیں ڈال سکتا۔ تاہم یہ بھی ضروری ہے کہ کچھ نہ کچھ ارشادات ضرور کروں۔ اس کے لئے بہتر یہ ہے کہ میں آپ کو سید الاولین والآخرین احمد مجتبیٰ محمد ﷺ کے اس معاہدہ کی بعض دفعات کی طرف توجہ دلاوں۔ جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداء زمانہ ہجرت میں باہم مسلمانوں اور یہود مدینہ کے ساتھ کیا تھا۔ ان واقعات کے مطالعہ سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ مسلمان دارالامان یا دارالحرب میں غیر مسلم اقوام کے ساتھ کس قسم کا معاہدہ کر سکتے ہیں۔ چونکہ معاہدہ کی عبارت بہت طویل ہے اور عربی عبارت کے نقل کی چنداں حاجت نہیں ہے اس لئے میں صرف قابل ذکر دفعات کا ترجمہ پیش کرتا ہوں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم — یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایک معاہدہ ہے جو مسلمانان قریش اور مسلمانان مدینہ اوران لوگوں کے درمیان نافذ ہوگا جو مذکورہ جماعتوں کے ساتھ متفق وحلیف بن گئے ہیں اوران کے ساتھ محارابات میں شریک رہے ہیں۔

(۱) یہ تمام معاہد جماعتیں (قریش مہاجرین انصار، یہود مدینہ) دوسری غیر مسلم غیر معاہد جماعتوں کے مقابلے میں ایک جماعت (۱) اور ایک قوم شمار ہوں گی اس کے بعد مسلمانوں کی مختلف جماعتوں قریش، انصار اور قبائل انصار کے متعلق چند دفعات نقل کرنے کے بعد مندرجہ ذیل دفعات نقل کی ہیں) محمد میاں

(۲/۴) مسلمانوں پر فرض ہوگا کہ وہ ہر ایسے شخص کی علی الاعلان مخالفت کریں جو کہ فتنہ وفساد برپا کرتا ہو اور خلق خدا کو ستاتا ہو۔ (۲) تمام مسلمانوں کو متفق ہو کر اس کے خلاف کام کرنا لازم ہے اگر چہ وہ ان میں سے کسی کا فرزند ہی کیوں نہ ہو۔

(۳/۵) کسی مسلمان کو یہ حق نہ ہوگا کہ وہ مسلمان کے خلاف غیر مسلم (۱) محارب کو مدد دے اور اس کی اعانت کرے۔

(۴/۶) خدا تعالی کی پناہ اور ذمہ داری اور عہد ایک ہے۔ یعنی اگر کسی ایماندار بندے نے کسی کو خدا کی پناہ دے دی تو دوسرے مسلمان کو بھی اس کا پورا کرنا لازم ہے خواہ وہ پناہ دینے والا ادنی درجہ کا مسلمان ہی کیوں نہ ہو۔

(۵/۷) اگر کوئی قوم مسلمانوں کی کسی جماعت کے خلاف برسر پیکار ہو تو مسلمانوں کو مسلمان کی اعانت واجب ہے۔

(۶/۸) جن یہود نے ہمارے ساتھ معاہدہ کرلیا ہے ان کے متعلق مسلمانوں پر واجب ہے کہ ان کی مدد اور ان کے ساتھ مواسات (ہمدردی) کا برتاؤ کریں اور ان پر کسی قسم کا ظلم نہ کیا جائے اور نہ ان کے کسی ظلم کی مدد کی جائے۔

(۷/۱۱) مسلمانوں کو پابندی عہد میں اعلی مقام پر رہنا اور ارفع ترین مکارم اخلاق کا ثبوت دینا اسلامی فرض ہے۔

(۸/۵) یہودی نبی عوف مسلمانوں کے حلیف اور معاہد ہیں یہود اپنے مذہب کے پابند رہیں گے اور مسلمان اپنے مذہب کے سوا باقی امور میں مسلمان اور یہود نبی عوف ایک جماعت شمار ہوں گے ہاں جور وظلم اور عہد شکنی یا کوئی جرم کرے گا وہ اس کی سزا کا مستحق ہوگا۔

(۹-۱۱۶) اگر مسلمان یا یہود معاہدین کے برخلاف کوئی تیسری قوم جنگ کرے تو ان تمام معاہدین کو متفق ہو کر لڑنا ہوگا۔ اور مسلمان لشکر اپنے مصارف اور یہود لشکر اپنے مصارف کا ذمہ دار ہوگا۔

(۱۰/۱۸) اپنے پڑوسیوں کو اپنی جان کی برابر سمجھو بشرطیکہ وہ پڑوسی بھی مضرت رسانی اور جرائم کا ارتکاب نہ کریں۔ اس معاہدے کے بعد حضرت شاہ صاحب نے ایک عالمانہ بحث فرمائی ہے جس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

علمائے احناف نے اس معاہدے کو سامنے رکھ کر دارالحرب اور دارالامان کے بہت سے احکام و مسائل اخذ کئے ہیں۔ فقہائے احناف نے دارالحرب میں عقود فاسدہ کے جواز کا حکم دے کر یہ ظاہر کردیا ہے کہ دارالحرب اور دارالاسلام کے احکام میں بہت فرق ہے۔ مثلاً عصمت (تحفظ) کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) عصمت موثمہ یعنی ایسی عصمت جس کے توڑنے والے کو گناہ ہوتا ہے مگر کوئی بدل واجب نہیں ہوتا۔

(۲) عصمت مقومہ یعنی اس کے توڑنے والے پر اس نفس معصومہ کا بدل بھی واجب ہوتا ہے اب عصمت موثمہ تو صرف اسلام لے آنے سے حاصل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اگر کسی مسلمان کو ناحق قتل کیا جائے تو قاتل کے لئے جزائے جہنم کی وعید تو بہر حال لازم ہے خواہ دارالحرب میں قتل ہوا ہو یا دارالاسلام میں البتہ دیت یا قصاص وغیرہ کے احکام اسلامی شریعت کے بموجب جب ہی عائد ہوں گے جبکہ دارالاسلام میں ہو۔

مختصر یہ کہ عصمت موثمہ تو صرف اسلام لے آنے سے حاصل ہو جاتی ہے مگر عصمت مقومہ کے لئے دارالاسلام اور حکومت و شوکت اسلامیہ کا ہونا شرط ہے۔

اس بحث کے خاتمہ پر حضرت شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں میرا مقصود اس بحث کے ذکر کرنے سے یہ ہے کہ دارالاسلام اور دارالحرب کے احکام کا فرق واضح ہو جائے اور مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ وہ اپنے ہم وطن غیر مسلموں اور ہمسایہ قوموں سے کس طرح اور کتنی مذہبی رواداری اور تمدنی و معاشرتی شرائط پر صلح و معاہدہ کر سکتے ہیں (صفحہ ۲۷ خطبہ صدارت)

یہ علمی بیش بہا خطبہ صدارت ۸۲

صفحات پر ہے جس میں اس زمانہ کے سیاسیات پر بصیرت افروز مباحث کے بعد صوبہ سرحد کے مراسم قبیحہ کی اصلاح کے متعلق بھی مفید مباحث ہیں آخر میں عربی قصیدہ ہے جس کے آخری دو شعروں پر ہم حضرت شاہ صاحب قدس اللہ سرہ کی سیرت کو ختم کرتے ہیں۔

و اٰخر دعوانا ان الحمد للذی	ھدانا لھذا و رشدای مرشد
صلوٰۃ و تسلیم علیٰ خیر خلقہٖ	ختام جمیع الانبیاء محمدٗ

●◘●

حضرت شاہ صاحب کی زندگی کا

مولانا عبدالسبحان صاحب
پرنسپل جامعہ مدینۃ العلوم حضرت بل سرینگر

حضرت علامہ محمد انور شاہ صاحب الکشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا وطن مالوف وادیٔ کشمیر کا ایک پُر فضاء دلکش مقام لولاب ہے۔ لولاب تو سرزمین کشمیر پر قدرت کی کاریگری اور صناعی کا ایک دل آویز شاہکار ہے۔ صاف وشفاف قدرتی چشموں، آبشاروں اور رکوہساروں میں آباد۔ اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

آپ کشمیر کے مشہور ومعروف خاندان مسعودیہ کے چشم وچراغ تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت شیخ مسعود نروری رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے۔ یہی آپ کے خاندان کے مورثِ اعلی ہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے اسلاف بغداد شریف سے ہندوستان آئے تھے اور اولاً ملتان میں ساکن ہوئے تھے۔ بعد میں لاہور کی طرف کوچ کر گئے اور وہاں سے وارد کشمیر ہوئے جہاں مستقل طور سکونت پذیر ہو گئے۔ زیادہ تر اس خاندان کا حصہ سوپور سے آگے کامراج اور لولاب میں مجتمع ہے۔

حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ صدر المدرسین دار العلوم دیوبند تھے اور آپ حضرت شیخ الہند محمود الحسن صاحب نوّر اللہ مرقدہٗ کے مخصوص شاگردوں میں سے تھے۔

آپ علم کا چلتا پھرتا کتب خانہ تھے اور تمام علوم وفنون میں کامل دستگاہ رکھتے تھے آپ بیک وقت مفسّر، محدّث، فقیہہ بھی تھے اور سالک وعارف بھی۔ اقصائے عالم میں ایسی ہستیاں

شاذ ہی پائی جاتی ہیں۔غرض آپ ہر فن میں امام اور مجتہد تھے۔آپ روایتِ کتب کے حافظ تھے اور اعلیٰ درجہ کے محقق۔آپ کا درس حدیث اپنے دور کا مشہور درس تھا اور ایک امتیازی طرز کا حامل تھا۔آپ کے تبحر علمی نے درس حدیث کو جامع علوم وفنون بنا دیا تھا۔آپ کے درس نے نقل ودرایت کی راہ سے آنے والے فتنوں کے لئے آنے کی گنجائش نہیں رکھی۔آج بھی علماء اور صاحب طرز فضلاء زیادہ تر آپ ہی کے تلامذہ ہیں اور ہند و پاک میں علمی سندوں کو آراستہ کئے ہوئے ہیں۔تقریباً ۱۳۲۰ھ میں آپ نے دارالعلوم میں درس کا آغاز فرمایا اور ۱۳۲۲ھ سے ۱۳۴۵ھ تک آپ دارالعلوم کے صدر مدرس رہے۔

حضرت اقدس مولانا قاری محمد طیب صاحب مدّظلہ العالی نے حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ العزیز کی تدریسی خصوصیات نہایت بلیغ انداز میں یوں بیان فرمائی ہیں کہ:

"آپ کا غیر معمولی حافظہ، تبحُّر علمی، حفظ کتب وسفائن اور وعاء علوم وفنون گویا ایک اعجازی شان رکھتا تھا۔عقل ونقل کا ہر علم وفن اور اس کے تفصیلی اصول وفروع آپ کو اس طرح مستحضرت تھے کہ آپ کو اپنے معاصر علماء وفضلاء میں وقت کا چلتا پھرتا کتب خانہ کہا جانے لگا۔اس لئے آپ کا انداز درس حدیث حافظانہ، داعیانہ، محدثانہ اور متبحرانہ تھا۔"

حضرت شاہ صاحبؒ کی مناقب عالیہ میں یہ بات ہے کہ آپ کے شیخ واستاذ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن

"حضرت شاہ صاحب کی وفات بلاشبہ وقت حاضر کے کامل ترین عالم ربانی کی وفات ہے جن کا نظیر مستقبل میں نہیں۔طبقہ علماء میں حضرت شاہ صاحب کا تبحر، کمال فضل، ورع، تقویٰ جامعیت واستغنا مسلم تھا۔موافق ومخالف ان کے سامنے تسلیم وانقیاد سے گردن جھکاتا تھا۔"

صاحب قدس سرہ العزیز نے ہجرت حرمین شریفین کے وقت آپ ہی کو اپنا قائم مقام اور شیخ الحدیث مقرر فرمایا۔ اکثر و بیشتر وہ آپ سے مسائل کی تحقیق فرماتے اور اس تحقیق کو پسند کرتے اور آپ کو ''علامہ'' کے وقیع خطاب سے یاد فرماتے اور مسائل علمیہ میں جب کوئی الجھن پیش آتی تو حضرت شاہ صاحب سے دریافت فرماتے کہ کہو علامہ! اس مسئلہ میں سلف کا کوئی قول یاد ہے؟ شاہ صاحب جواب دیتے اور حضرت شیخ الہند اطمینان اور مسرت کا اظہار فرماتے۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوری صاحب بذل المجہود اپنی اس معرکتہ الآراء کتاب کی تصنیف کے وقت روایت و درایت میں پیش آمدہ مشکلات کے لئے شاہ صاحب سے ہی رجوع فرماتے تھے۔ حضرت مولانا ظہیر الحسن صاحب شوق نیموی صاحبِ آثار السنن بھی اپنی کتاب کی تصنیف کے وقت خط و کتابت کے ذریعہ آپ سے استفادہ کرتے تھے۔

حضرت مولانا مدنی علیہ الرحمہ نے حضرت شاہ صاحب کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ میں نے ہندوستان، حجاز، عراق، شام وغیرہ کے علماء و فضلاء سے ملاقات کی اور مسائل علمیہ میں ان سے گفتگو کی۔ لیکن تبحر علمی، وسعت معلومات، جامعیت اور علوم عقلیہ و نقلیہ کے احاطے میں شاہ صاحب کا کوئی نظیر نہیں پایا۔

حضرت مولانا کفایت اللہ صاحب علیہ الرحمہ نے حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات پر یوں فرمایا کہ:

> ''حضرت شاہ صاحب کی وفات بلاشبہ وقت حاضر کے کامل ترین عالم ربانی کی وفات ہے جن کا نظیر مستقبل میں نہیں۔ طبقہ علماء میں حضرت شاہ صاحب کا تبحر، کمال فضل، ورع، تقویٰ جامعیت و استغنا مسلم تھا۔ موافق و مخالف ان کے سامنے تسلیم و انقیاد سے گردن جھکاتا تھا۔''

حضرت حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ فرماتے کہ:

> ''جب مولوی انور شاہ میرے پاس آکر بیٹھتے ہیں تو میرا قلب ان کی علمی عظمت کا دباؤ محسوس کرتا ہے۔''

حضرت شاہ صاحبؒ کا حافظہ زبان زد خلائق ہے۔ ایک ہی کتاب کے پانچ پانچ دس دس حواشی زبانی یاد ہوتے۔ آخری عمر میں اگرچہ آپ جسمانی طور پر کمزور ہو گئے تھے مگر آپ کے حافظہ

میں ذرہ برابر بھی فرق نہ آیا تھا۔اس اعتبار سے آپ آیۃ من آیات اللہ تھے۔علماء سلف کی کتب نادرہ سے بخوبی واقف تھے اور ان پر پوری قدرت رکھتے تھے اور سائل کو اپنی تحقیق سے مستفید فرماتے تھے۔آپ کے جوابات تسلی بخش ہوتے اور سائل پوری طرح مطمئن ہو کر چلا جاتا۔

مطالعہ اور کمال حافظہ کی وجہ سے صحاح ستہ اور دیگر کتب احادیث آپ کو از بر یاد تھیں۔ جز ئیات فقہ پر آپ کو پورا عبور تھا۔حفظ روایت کے علاوہ مادۂ درایت اس قدر تھا کہ بلا تکلف اپنی قوت استنباط کے زور سے دو مختلف و معارض اقوال میں ایک کو ترجیح دیتے تھے۔فقہ میں ماہر ہونے کے علاوہ باقی ائمہ ثلاثہ کی کتب اور ان کے مذاہب کی روایت کے حافظ بھی تھے۔

علم تصوف میں بھی آپ کو کافی دسترس حاصل تھی۔اس فن کی تمام کتب قدیمہ و جدیدہ میں آپ مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔خاص طور پر شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ کی تصانیف فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم آپ کے حافظہ میں تھیں۔ان کے کلام کے حقائق و معارف کو ظاہر شریعت پر خوب منطبق کرتے تھے۔فرماتے کہ ہمارے اسلاف کا مسلک ہے کہ ہمارے ایک ہاتھ میں حافظ ابن تیمیہ کی کتابیں ہوں اور دوسرے ہاتھ میں شیخ اکبر کی۔حافظ ابن تیمیہ کی تصانیف سے جلال و جبروت الٰہی ٹپکتا ہے اور شیخ اکبر کی کتب سے رجاء و انبساط/ بقول حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ العالی آپ وقت کے شیخ اکبر تھے۔

آپ کی تقریروں اور تحریروں میں جہاں مفسرین، محدثین، فقہاء اور متکلمین کے اقوال و آراء نظر آتے ہیں وہیں شیخ اکبر کے افادات بھی۔

درس و تدریس کے ساتھ ارشاد و تلقین کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔بیعت بھی فرما لیتے تھے۔دیو بند کے بھی بعض اصحاب بیعت تھے۔الا دین دیو بندی جو حضرت نانوتوی کے دیکھنے والوں میں تھے شاہ صاحبؒ ہی سے بیعت تھے، اس جوتی کی کیا قدر و قیمت ہے؟ اللہ اکبر! اس فناء ذات و تحقیر کا کیا ٹھکانہ؟

غیبت، کینہ، انتقام، بخل، حسد، تکبر، ریا، کذب، طمع، حرص، حبِ دنیا حب جاہ جیسی بری عادتوں اور بری خصلتوں سے آپ بالکل پاک و صاف تھے سلف صالحین کا طریقہ ہمیشہ سے یہی رہا ہے کہ وہ اپنے قلب سے ان رذائل اخلاق کو دور کرتے تھے۔حتیٰ کہ ان کے قلوب پر ان رذائل کا مطلق اثر نہیں رہتا تھا اور ان کے دل بالکل صاف و شفاف ہو جاتے تھے۔اسی لئے یہ حضرات

انعامات الہیہ سے مالا مال ہوکر مقبول بارگاہ الٰہی ہوجاتے تھے اور انوار الہیہ اور تجلیات ربانی کا مورد بن جاتے تھے برعکس اس کے آپ کی ہرادا سے سادگی، شرافت اور بے تکلفی جلوہ گرتھی۔آپ کی مجلس میں کبھی آپ کے ہنسنے کی معمولی آواز بھی نہیں سنی گئی۔قہقہہ تو درکنار۔آپ کی مجالس میں دنیوی کلام بہت قلیل بلکہ مفقود تھا اور اس کے مقابلے میں بعض دفعہ خوف وخشیت الٰہی کا اس قدر ظہور ہوتا تھا کہ آب دیدہ معلوم ہوتے تھے۔اور بعض دفعہ خود دورۂ حدیث میں کسی واقعہ حدیث سے اس قدر متاثر ہوتے تھے کہ گریہ وزاری کرنے لگتے تھے حتی کہ بعض سامعین بھی بے اختیار رونے لگتے۔

حضرت شاہ صاحب قدس سرہ العزیز متبع سنت تھے۔اس کا آپ بڑا اہتمام کرتے تھے۔آپ کے ہر قول وفعل میں سنت نبوی ﷺ کی نمایاں جھلک نظر آتی تھی۔دشمن تک بھی اس کے معترف تھے۔آپ سچے معنے میں **علماء امتی کا بنیاء بنی اسرائیل اور العلماء ورثة الابنیاء** کے مصداق تھے۔حضرت مولانا کریم بخش صاحب مرحوم نے احقر سے فرمایا کہ ایک دفعہ حضرت شاہ صاحب ہمارے ضلع مظفر گڑھ میں تشریف لے گئے۔وہاں جھک کر تعظیم کرنے کی بڑی بیماری ہے بلکہ بعض اہل علم بھی اس کو اچھا سمجھ کر کرتے ہیں تو کسی شخص نے جھک کر آپ کے قدم مبارک پر ہاتھ رکھنا چاہا۔آپ نے منع کیا اور فرمایا تم نے سنت کا خون کیا اور مصافحہ کی برکت سے محروم رہ گئے۔اسی طرح ایک اور متوسلین نے اول ملاقات کے وقت مصافحہ سے ہاتھ چومنا چاہا مگر آپ نے فرمایا کہ یہ زائد از سنت ہے، مصافحہ پر اکتفاء کرنا ہی افضل ہے۔تذکرہ ہوا۔اخیر میں طے پایا کہ حضرت شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوکر جہاد کی تفصیل دریافت کریں۔چنانچہ سب حضرات حاضر خدمت ہوئے۔سلام وعلیک کے بعد ابھی بیٹھے ہی تھے کہ حضرت شاہ صاحب نے خود بخود اس واقعہ کا ذکر فرمایا جس سے تمام شکوک وشبہات زائل ہوئے۔

حضرت شاہ صاحبؒ پر روحانیت ونورانیت کا بہت غلبہ تھا۔جو بھی آپ کے چہرۂ انور پر نگاہ ڈالتا تو وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور دیر تک متعجبانہ کھڑے ہوکر دیکھتے رہتا۔

عام طور پر یہی دیکھا جاتا ہے کہ جس بزرگ میں علمی نسبت زیادہ ہوتی ہے اس کی روحانی نسبت کا ظہور کم ہوتا ہے مگر شاہ صاحب میں علمی اور روحانی نسبتیں ہر دو جلوہ گر تھیں۔

حضرت شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ بڑے مجاہد بھی تھے۔ آپ نے اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ تمام باطل عقائد رکھنے والوں کی پرزور تردید کی۔ بانگ دہل اور بلاخوف لومتہ لائم ہمت اور مستعدی سے عقائد حقہ سے عوام وخواص کو روشناس کیا۔ صحت کی خرابی کے باوجود آپ نے اس کے لئے طویل سفر اختیار کئے۔ خلاصہ یہ کہ آپ نے خلاف شرع امر پر کبھی سکوت نہیں کیا بلکہ مجاہد بن کر اس کے خلاف اپنے خیالات کا اظہار فرمایا اور کبھی اس بارے میں تہاون، تکاسل اور غفلت شعاری سے کام نہیں لیا۔

حضرت شاہ صاحب قدس سرہ العزیز بااخلاق۔ صاحب فضائل، خوددار، حلیم الطبع اور کم گو تھے۔ آپ کی طبیعت میں انکساری اور تواضع کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی جس خلوص وتواضع سے آپ اپنے احباب، تلامذہ، خدام اور عوم المسلمین سے برتاؤ کرتے تھے ان کی نظیر مشکل ہے۔ انکساری کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ فرمایا کہ لوگ تو مجھ خاکسار کے متعلق بہت حسن اعتقاد رکھتے ہیں۔ مگر میں خوب جانتا ہوں کہ اللہ کے ہاں اس خوبی کی کیا قدر و قیمت ہے؟ اللہ اکبر! اس فناء ذات وتحقیر کا کیا ٹھکانہ ؟ نانوتوی رحمہ اللہ کے دیکھنے والوں میں تھے شاہ صاحبؒ ہی سے بیعت تھے۔

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مفتی اعظم پاکستان نے بھی بعد وصال حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ حضرت ممدوح کی طرف رجوع کیا۔ ان دونوں حضرات کو طریق چشتیہ کے مطابق اذکار تلقین فرمائے جس میں انہوں نے کھلی تاثیر محسوس کی۔

مولانا کریم بخش پروفیسر لاہور کالج نے بھی احقر سے کہا ہے کہ میں نے حضرت شاہ صاحب کو لاہور میں بعض لوگوں کو بیعت کرنے اور اوراد و اذکار اور درود شریف پڑھنے کا ارشاد فرماتے دیکھا ہے۔

قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ العزیز شریعت وطریقت کے جامع اور مرجع علماء حقانی تھے۔ حضرت شاہ صاحبؒ ان ہی کے خلیفۂ مجاز تھے۔ حضرت ممدوح نے شاہ صاحبؒ کو طریق چشتیہ کے مطابق ہی اذکار و اوراد تلقین فرمائے آپ ان ہی اشعال واذکار پر بندر ہے، ویسے سلسلۂ سہروردیہ، کرمانیہ کے اذکار و اوراد آپ نے اپنے والد بزرگوار سے ہی حاصل کئے تھے۔

کشمیر کے قیام کے دوران آپ نے تقریباً چھ ماہ خلوت نشینی اختیار فرمائی اور آپ نے یہیں سلوک میں محنت و ریاضت کر کے بہت سی منازل طے کیں۔ یہاں تک اعمال باطنی میں اور زہد و تقویٰ میں آپ کے قدم راسخ ہوئے اور بے ارادہ کرامات کا ظہور بھی ہونے لگا تاہم آپ نے علوم و معارف کے غلبہ کی وجہ سے اور ان کے نشر و ترویج میں منہمک رہنے کے باعث اپنے روحانی کمالات کو ہر وقت پوشیدہ رکھنے کی کوشش فرمائی۔ البتہ صاحب بصیرت و فراست کو بعض دفعہ ان امور کا پتہ لگ جاتا تھا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مولانا کریم بخش صاحب اور دوسرے بعض علماء کے درمیان شیخ الکل حضرت حاجی امداداللہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ مہاجر مکی کے قصہ جہاد کے بارے میں۔

حضرت شاہ صاحبؒ آخر عمر شریف میں بوجہ مرض بواسیر بہت نڈھال اور لاغر ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود آپ برابر پانچ وقتی نماز نہایت اہتمام سے ادا کرتے تھے۔ رکوع، سجود اور قیام نہایت اطمینان کے ساتھ کرتے تھے۔ اسی مرض کی حالت میں بعض دفعہ آپ نے طویل سفر اختیار کئے اور بعض جگہ تقاریر بھی کئے۔ ۱۱محرم الحرام ۱۳۵۲ھ کو لاہور تشریف لے گئے اور پانچ دن تک ڈاکٹر عزیز احمد جلال الدین کے ہاں قیام فرمایا۔ ان ایام خمسہ میں آپکے دہان مبارک سے صرف روحانیت کے مضامین ہی نکلتے تھے اور اس دوران جو تقریر آپ نے فرمائی۔ اس میں بھی روح کے لطائف و حقائق و خواص اور کیفیات ہی بیان فرمائے۔ ایسا لگتا تھا کہ حضرت شاہ صاحبؒ آخری عمر شریف میں مجسم روح ہی بن چکے تھے۔ پانچ دن گزار کر حضرتؒ دیوبند وارد ہوئے اور ۱۶، ۱۷ یوم کے بعد ہی حضرت شاہ صاحبؒ ۲ صفر المظفر ۱۳۵۲ھ کو شب کے آخری حصہ میں دیوبند میں اپنی قیام گاہ میں واصل بحق ہوئے۔

انا للہ و انا الیہ راجعون.

حضرت اقدسؒ کا مرقد مبارک دیوبند میں آپ ہی کی قیام گاہ کے قریب عیدگاہ کے متصل واقع ہے جو آج تک برابر مرجع و زیارت گاہ خلائق ہے۔

وصلی اللہ تعالی علی خیر خلقه محمد و اله و اصحابه اجمعین و اخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین.

امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ

دارالعلوم اور عبقری شخصیات کا چولی دامن کا ساتھ ہے اس دینی و علمی ادارے کو بارہ گاہ الٰہی میں قبول کا جو شرف حاصل ہوا وہ ہر ادارہ کی قسمت نہ بن سکا ابتداء ہی سے ایسی نابغۂ روزگار ہستیاں اس سے وابستہ رہیں کہ ایک زمانہ ان کا علم و فضل، استعداد و کمال، تقویٰ و طہارت، حزم و احتیاط، عزم و استقلال، ثبات و استقامت کا قائل رہا ہے۔ جو گوہر آبدار اس کی آغوش میں پل بڑھ کر اطراف عالم میں پھیلے ان کے نام کی اگر فہرست ہی ترتیب دی جائے تو کافی صفحات درکار ہیں۔ یہ سارا سلسلہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے شروع ہوتا ہے اور پھر حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، فقیہ وقت حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، ولی کامل حضرت مولانا یعقوب نانوتویؒ، عارف باللہ حضرت حاجی عابد حسینؒ، حضرت شاہ رفیع الدینؒ سے ہوتا ہوا حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ تک پہنچتا ہے اور یہاں سے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی، شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علیؒ، حضرت علامہ ابراہیم بلیاویؒ، عارف کامل حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ وغیرہ کے ایسے نام ہیں جو زمانہ ساز بھی ہیں اور شخصیت ساز بھی، انہی کے دامن علم سے لپٹ کر محدث کبیر حضرت مولانا بدر عالم میرٹھیؒ، حضرت مولانا یوسف بنوریؒ، حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، مفکر ملت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ، حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ، حضرت مولانا سید احمد رضا بجنوریؒ صاحب انوار الباری۔ حضرت مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی، حضرت مولانا حامد الانصاری غازیؒ، حضرت مولانا منظور نعمانیؒ، حضرت مولانا محمد میاں دیوبندیؒ، مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن

سیوہارویؒ، رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ، مفسر قرآن حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب دیوبندیؒ، حضرت مولانا ادریس کاندھلویؒ، جیسے رجال کار اور جبال علم منظر عام پر آئے۔

حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ علوم و معارف، فضل و کمال اور بے مثال قوت حفظ کے مالک ہیں اور اپنے معاصرین میں ان کا پایہ بے حد بلند ہے اپنی زندگی میں ہی انہیں اکابر و اساتذہ کا اعتماد حاصل ہوا جیسے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ اور حضرت مولانا حافظ احمد صاحبؒ نے قدم قدم پر علامہ کے علوم و کمالات کا اعتراف کیا۔ ۱۳۵۲ھ میں حضرت شاہ صاحبؒ کا انتقال ہوا اس وقت سے لے کر آج تک ان کی کافی سوانح منظر عام پر آچکی ہیں اور ان کی ذات و خدمات پر لاتعداد و قیع اور گراں قدر مقالات چھپ چکے اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ برادر مکرم مولانا اعجاز احمد عرفی قاسمی متحرک اور فعال انسان ہیں۔ تنظیم علمائے حق کے صدر اور بانی ہیں اور اس تنظیم نے تحریک مدارس کے ساتھ ساتھ فلاحی اور سماجی کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی قدم رکھا اور کافی کتابیں نامور اہل قلم کی یہ تنظیم شائع کر چکی ہے۔ شاہ صاحبؒ کے خانوادہ سے ان کا قلبی اور روحانی تعلق ہے جس کا عملی اظہار گاہے گاہے ہوتا رہتا ہے۔ تنظیم کا سہ ماہی پرچہ ''حسن تدبیر'' اس سے قبل حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ پر ضخیم نمبر نکال چکا ہے۔ جن کو مقبولیت عام حاصل ہوئی اور افادیت کو تسلیم کیا گیا سال گزشتہ حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیریؒ پر بھی وہ ایک ضخیم اور قیمتی پیشکش ''شاہ صاحب نمبر'' کی صورت میں منظر عام پر لا چکے ہیں۔ جو لگ بھگ پانچ سو صفحات پر مشتمل تھی۔ ''حسن تدبیر'' کا موجودہ نمبر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی بلند پایہ شخصیت کا احاطہ کرنے کی کوشش ہے۔ جس میں ہندو پاک کے موجودہ اور مرحوم نامور اہل قلم اور علمائے کرام کے مقالات و مضامین شامل ہیں۔

حضرت علامہؒ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اس نمبر میں بآسانی پڑھا اور سمجھا جا سکتا ہے اور نئی نسل تک ان کی عظیم اور ناقابل فراموش خدمات و شخصیت کو پہنچانے کا یہ بڑا کارآمد اور مفید سلسلہ ہے زر کثیر کے صرفہ کے بعد مولانا اعجاز صاحب قاسمی یہ نمبر لانے میں کامیاب ہوئے ہیں خدا ان کی محنت اور اخلاص کو قبول فرمائے۔ یوں تو حضرت شاہ صاحبؒ پر کافی کام ہوا ہے اور یہ بات بلا تامل کہی جا سکتی ہے کہ ان کی جتنی سوانح حیات لکھی گئیں اکابر دیوبند میں سے کسی اور پر اتنا کام نہ ہوا مگر یہ بھی ایک سچائی ہے کہ حضرت علامہ کے علوم و معارف افادات اور امالی پر کام کرنے کی ضرورت ہے اس لیے کہ ان کی تصانیف اور تالیفات پر زیادہ کام نہیں ہو سکا مثال کے طور پر علامہ کی وہ چند سوانح جن تک ہماری رسائی ہو سکی یا ہمارے علم میں آسکیں ان میں سے چند یہ ہیں۔

نفحۃ العنبر از مولانا یوسف بنوریؒ، حیات انور از مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصرؒ، حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ، حیات اور علمی کارنامے از ڈاکٹر رضوان اللہ، انوار انوری از مولانا محمد انوری لائل پوری، نقش دوام از محدث جلیل حضرت مولانا سید انظر شاہ مسعودی کشمیریؒ، تصویر انور از محدث جلیل حضرت مولانا سید انظر شاہ مسعودی کشمیریؒ، الانور از عبدالرحمٰن کوندو، تجلیات انور از اوقاف ٹرسٹ حکومت جموں و کشمیر، علامہ محمد انظر شاہ کشمیریؒ از ڈاکٹر سید فاروق سری نگر کشمیر، علامہ محمد انور شاہ کشمیری از مولانا عبدالقیوم حقانی پاکستان، سیرت انور از مولانا مسعود احمد قاسمی، حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ، ہشت پہلو شخصیت کے آئینے میں از مولانا عبدالرشید بستوی، استاذ اکبر از حضرت مولانا حامد الانصاری غازی (ایک طویل مقالہ جو کتابی صورت میں شائع ہوا) مولانا عتیق احمد دیوبندی، مدیر رسالہ دار العلوم کی تحریر کردہ سوانح جو نایاب ہے۔ ان کے علاوہ انگریزی اور دیگر زبانوں میں بھی حضرت شاہ صاحب کی سوانح عمریاں شائع ہوئیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے، حضرت امام العصر کے سوانحی گوشوں پر کافی کام ہوا ہے اور ایک لمبے وقت کے بعد اب مولانا اعجاز احمد قاسمی کی ہمت مردانہ کا ثبوت ''حسن تدبیر'' کا یہ خوبصورت نمبر ہے۔ مولانا اعجاز صاحب صرف حلقۂ انوری کے ہی محسن نہیں بلکہ وہ خاندان انوری کے بھی کرم فرما ہیں کہ انہوں نے اس جانب توجہ کی ہم ان کے شکر گزار ہیں اور ان کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے دونوں صاحبزادوں کے اس دنیا سے گزرنے کے بعد گمان غالب یہ تھا کہ حضرت شاہ صاحبؒ پر کام کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا، مگر یہ علم کی قدر دانی اور حضرت شاہ صاحبؒ کی بلند مرتبہ شخصیت کا اظہار ہے کہ مولانا اعجاز احمد قاسمی نے اس سمت میں قدم بڑھایا اور شب و روز کی محنت شاقہ کے بعد یہ نمبر آپ تک پہنچ رہا ہے۔ آج جماعت دیوبند، حلقۂ دیوبند اور خاندان انوری کا ہر فرد ان کا ممنون کرم ہے۔ خدا ان کے کاموں کو قبول فرمائے اور مزید کام کی توفیق ارزانی فرمائے۔ آمین

موجودہ دور میں اہل قلم سے مضامین لکھوانا یا مقالات لکھنے پر انہیں آمادہ کر لینا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے ایک تو وقت کی تنگی دوسرے معاش اور روزگار کے مسائل نے سبھی کے قدموں میں بیڑیاں ڈال دی ہیں اور بہت سے حضرات کوشش کے باوجود کام نہیں کر پاتے ایسے عالم میں پانچ سو صفحات کا نمبر نکال لینا ایک کارنامہ ہے جس کو سراہنا چاہیے اور جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے وہ کم ہے مولانا اعجاز احمد قاسمی بڑے سلیقے اور ترتیب کے ساتھ اپنے کام انجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں خود صاحب اسلوب قلم کار ہیں اور ان کی شستہ اور رواں تحریریں علمی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں ان کی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت وہ تمام نمبر اور کتابیں ہیں جو تنظیم علمائے حق کی جانب سے منظر عام پر آ چکی ہیں، مجھے یقین ہے کہ جس کام کا انہوں نے آغاز کیا ہے وہ ابھی آغاز ہی ہے انشاء اللہ انتہا کی طرف بھی ان کا سفر جاری رہے گا۔

علامہ انور شاہ کشمیری

حقانی القاسمی

وژن

مطالعاتی ادراک اور بین علومی آگہی سے ہی شخصیتوں کی عظمتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ اور وجدان، تفوق اور تفرد کا معیار ہیں۔

علامہ کشمیریؒ کا وژن بھی وسیع تھا اور وجدان میں بھی وہ لکیریں تھیں جو فرد کی داخلی شخصیت کا خارجی شناس نامہ بن جاتی ہیں۔ انور شاہ کشمیریؒ کا رشتہ روشنی سے بہت گہرا تھا اور روشنی کے احترام کی وجہ سے ہی ان کا علمی وجود بھی تاباں اور درخشندہ تھا۔ جسے حرف حرف روشنی اور لفظ لفظ نور کی عظمتوں کا احساس ہو اس کے وجود میں ظلمتیں کبھی نہ صرف پناہ نہیں لے سکتیں بلکہ اس کے باطن کی روشنی سے حال ہی نہیں، مستقبل بھی فیضیاب ہوتا ہے۔

علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی تحقیقات اور تصنیفات میں روشنیوں کا وہ لامتناہی سلسلہ ہے جس کی سمتوں کا تعین مشکل ہے۔ جدھر نگاہ اٹھتی ہے شجر علم کی شاخوں میں نور ہی نور نظر آتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اگر علم وعرفاں کی تجسیم کی جائے تو اس کی شکل وہیئت بالکل علامہ انور شاہ کشمیریؒ جیسی ہی ہوگی، ان کا پورا پیکر ہی علم وفضل سے عبارت ہے یہی وجہ ہے کہ ہر نگاہِ بصیرت میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا وجود ایک روشن علمی مینار نظر آتا تھا۔ علامہ اقبال جیسے چشم جہاں بیں رکھنے والے دانشور مفکر اور شاعر مشرق کو علامہ کے وجود میں ایسا ہی روشنی کا مینار نظر آیا تھا اور اسی لیے انہوں نے یہ فرمایا تھا کہ اسلامی تاریخ کے گزشتہ پانچ سو برسوں میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ جیسی شخصیت پیدا نہیں ہوئی۔ اسی لیے ایک بار انہوں نے علامہ انور شاہ کشمیریؒ کو لاہور میں قیام کی دعوت دی تھی اور یہ عندیہ ظاہر کیا تھا کہ اگر علامہ انور شاہ کشمیریؒ آجاتے ہیں تو دنیا کے موجودہ قومی بین الاقوامی سیاسی معاشی، سماجی احوال وظروف نے جو حالات پیدا کردیئے ہیں اس کا حل علامہ انور

شاہ کشمیری تلاش کر سکتے ہیں انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اس وقت عالم اسلام میں دوسرا کوئی شخص نظر نہیں آتا جو اس عظیم الشان ذمہ داری کا حامل ہو، ہم دونوں کے اشتراک سے ہی فقہ جدید کی تدوین عمل میں آسکتی ہے۔ علامہ اقبال، علامہ انور شاہ کشمیری کی عبقریت سے بے حد متاثر تھے اپنی نظم ان 'وادی لولاب' کا محور ومکز بھی علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی ذات ہے اور اپنے خطبات میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی جلالت علمی کا برملا اعتراف بھی کیا ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے ایک صدارتی خطبہ میں ارشاد فرمایا تھا کہ "جدید ریاضیات کے اہم ترین تصورات میں سے ایک تصور کا مختصر حوالہ میرے ذہن کو عراقی کی تصنیف غاية الامكان فى دراية المكان کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ مشہور حدیث لاتسبو الدهر ان الدهر هو الله میں دھر (بمعنی Time) کا جو لفظ آیا ہے اس کے متعلق مولوی سید انور شاہ صاحب سے جو دنیائے اسلام کے جید ترین محدثین وقت میں سے ہیں، میری خط و کتابت ہوئی۔ اس مراسلت کے دوران میں مولانا موصوف نے مجھے اس مخطوطے کی طرف رجوع کرایا اور بعد ازاں میری درخواست پر از راہ عنایت مجھے اس کی ایک نقل ارسال کی"۔

نیوٹن کے مشہور تصور کو علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے عراقی کی نقل بتایا اور اس طرح علامہ اقبال نے فلسفۂ زمان و مکان کی حقیقت کا انکشاف کیا اور اہل یورپ کو بھی اس حقیقت سے واقف کرایا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ انور شاہ کشمیری کے مطالعات کا دائرہ قرآنیات، متعلقات حدیث یا فقہیات تک محدود نہیں تھا بلکہ جدید عصری اور سائنسی علوم تک ان کی رسائی تھی۔ انہوں نے جدید سائنس کا بھی اس طرح گہرائی سے مطالعہ کیا تھا کہ سائنس کے پروفیسر کے سامنے ایتھر کے مسئلہ پر اتنے نکات بیان کیے کہ وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ آگہی کی کوئی حد نہیں ہوتی اور نہ کوئی سرحد اور علامہ انور شاہ کشمیری نے مطالعاتی باب میں علوم کی ساری امتیازی حدیں مٹادی تھیں اور وہ تمام علوم ان کے مطالعے میں شامل تھے جن سے انسانی تہذیب و ارتقاء کا تعلق ہے۔ علامہ اقبال جنہوں نے برگساں، نطشے اور گوئٹے کا مطالعہ کیا تھا ان کا علامہ انور شاہ کشمیریؒ سے علمی طور پر متاثر ہونا اک بہت بڑی بات ہے اور اس کا اعتراف علامہ انور شاہ کشمیری نے بھی کیا کہ ان کے نظم کو علامہ اقبال نے ہی سمجھا۔ انور شاہ کشمیری اقبال کے ممدوح علماء میں تھے اور علامہ اقبال مختلف مسائل میں ان سے رجوع فرماتے رہتے تھے۔ اس سے علامہ اقبال کی عظمت بھی روشن ہوتی ہے اور پتہ چلتا ہے کہ علامہ اقبال اپنی علمی تشنگی بجھانے کے لیے ہر طرح کے ماخذ استعمال کرتے تھے۔ ان دونوں کے درمیان مراسلت بھی رہی ہے اور ان خطوط کے مطالعے سے

اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کے دل میں انور شاہ کشمیریؒ کے لیے کتنی عقیدت تھی۔

علامہ انور شاہ کشمیریؒ اور اقبال دونوں ہی کشمیر کے گوہر تابدار تھے جن کی علم وفضل کی روشنی ابھی بھی ماند نہیں پڑی ہے بلکہ وقت کے ساتھ اور بڑھتی ہی رہی ہے ان دونوں شخصیات نے نہ صرف علوم وفنون کی ثروت میں گراں قدر اضافے کیے بلکہ اردو زبان کو بھی مالا مال کیا ہے۔ اردو زبان کو علامہ اقبال کی عطا تو جگ ظاہر ہے کہ انہوں نے اردو زبان میں شاعری کی اور اردو کو نئے رنگ وآہنگ عطا کیے۔ اظہار وافکار کی کائنات کو وسعت عطا کی۔ اردو زبان کی تجمیل وتجدید میں علامہ اقبال کا کردار اہم رہا ہے مگر علامہ انور شاہ کشمیری نے بھی اردو زبان کی یوں خدمت کی ہے کہ پہلے وہ اردو زبان سے نفور کی حد تک بیزار تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ یہ زبان علمی سرمایہ سے خالی ہے مگر بعد میں جب اس زبان کے گرویدہ ہوئے تو یوں کہ اپنے ایک شاگرد کو جنہوں نے عربی میں مقالہ لکھا تھا یہ کہتے ہوئے مقالہ لوٹا دیا کہ مولوی صاحب اگر ہندوستان میں دین کی خدمت کا جذبہ ہے تو اردو میں لکھئے اور یہ تبدیلی یوں رونما ہوئی کہ مولانا اشرف علی تھانوی کی تفسیر بیان القرآن نظر سے گزری اور اگلے دن اردو کے تعلق سے ان کی بہت ساری بدگمانی دور ہوگئی انہوں نے اپنے درس میں یہ فرمایا کہ میں اب تک اردو سے بدگمان اور اس زبان میں مطالعہ کرنے سے پرہیز کرتا تھا لیکن مولانا تھانوی کی تفسیر دیکھنے سے میری رائے بدل گئی اور معلوم ہوا کہ اردو میں بھی علمی سرمایہ موجود ہے پھر تو اردو زبان کی شیرینی سے اتنے مسحور ہوئے کہ اس زبان میں شاعری بھی کی ۔مولانا انظر شاہ کشمیریؒ نے نقش دوام میں ان کے اردو اشعار درج کیے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں عروض اور آہنگ سے بھی آگہی تھی۔

خار میرا ہے گل اگر وہ ہے	اس کے بن لعل مثل خارا ہے
میرے نہیں وہ تو کچھ نہیں میرا	وہ اگر ہے تو میرا سارا ہے
وصف تیرا زبان کی زینت ہے	بزم کو اس نے کیا سنوارا ہے

علامہ انور شاہ کشمیریؒ اپنے عہد کے نابغہ تھے اور ان کی عبقریت کا اعتراف آج کا عہد بھی کرتا ہے اور آنے والا کل بھی کرے گا کہ ایسی شخصیتیں روز روز پیدا نہیں ہوتیں۔ پھرتا ہے فلک برسوں......تب انور شاہ کشمیری جیسا عبقری پیدا ہوتا ہے۔

E-mail :h_qasmi@rediffmail.com
cell:9873747593

حضرت علامہ
محمد انور شاہ محدث
کشمیریؒ

عبدالرشید ارشد، لاہور

ولادت سلسلۂ نسب و تعلیم:

حضرت علامہ انور شاہ صاحب محدث کشمیریؒ کا سلسلۂ نسب حضرت شیخ مسعود نوریؒ کشمیری سے ملتا ہے جن کے بزرگوں کا اصل وطن بغداد تھا۔ وہاں سے ملتان آئے/ لاہور منتقل ہوئے۔ پھر کشمیر میں سکونت اختیار کی۔ آپ نے خود اپنا سلسلۂ نسب اپنی تصانیف نیل الفرقدین و کشف الستر کے آخر میں اس طرح تحریر فرمایا ہے۔ محمد انور شاہ بن مولانا محمد معظم شاہ بن شاہ عبد الکبیر بن شاہ عبدالخالق بن شاہ محمد اکبر بن شاہ حیدر بن شاہ محمد عارف بن شاہ علی بن شیخ عبداللہ بن شیخ مسعود نوریؒ اور شیخ مسعود نوریؒ کا سلسلہ نسب یہ ہے۔ ابن شاہ جنید بن اکمل الدین ابن میمون شاہ بن ہومان شاہ ہرمز۔ اس طرح حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلۂ نسب حضرت امام اعظمؒ کے خاندان سے ملحق ہو جاتا ہے۔ آپ کے والد ماجد حضرت مولانا محمد معظم شاہ بڑے عالم ربانی، زاہد و عابد اور کشمیر کے نہایت مشہور خاندانی پیرومرشد تھے۔

آپ کے والد مولانا محمد معظم شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ جب انہوں نے مجھ سے مختصر القدوری شروع کی تو مجھ سے بعض ایسے مسائل دریافت کرتے تھے کہ مبسوط کتابوں کا مطالعہ

کیے بغیر ان کا جواب دینا مشکل ہوتا تھا۔ میں انہیں ان موشگافیوں سے اکثر منع کیا کرتا تھا۔ اخیر میں اس قوت و ذہانت سے پریشان ہوکر میں نے انہیں ایک دوسرے عالم کے سپرد کیا۔ مگر دوسرے استاذ کو بھی یہی شکایت پیش آئی۔

آپ کے والد آپ کو اور آپ کے بڑے بھائی یٰسین شاہ مرحوم کو کشمیر کے پہاڑوں میں اعتکاف کرنے والے ایک عارف کے پاس حصول برکت کے لیے لے گئے۔ عارف نے جب اس ہونہار بچے کو دیکھا تو والد سے پوچھا کہ یہ تمہارا بچہ ہے؟ پھر کہا کہ یہ بڑا عظیم الشان عالم ہوگا اور مستقبل میں اس کی علمی عظمت مسلم ہوگی۔

ایک دفعہ منطق اور نحو کے چند رسائل کا مطالعہ کررہے تھے۔ اتفاقاً ایک بڑے عالم اس وقت آپ کے پاس آگئے۔ ان عالم نے ان کی کتابوں کو اُٹھا کر دیکھا۔ کتابوں پر خود حضرت مرحوم کے حواشی لکھے ہوئے تھے۔ بچپن کے زمانہ کی اس ذکاوت، تیزی طبع، جودت فہم اور طبیعت کی دور رسی کا اندازہ کرکے بے اختیار انہوں نے کہا کہ یہ بچہ اپنے وقت کا رازی اور اپنے زمانہ کا غزالی ہوگا۔

علمی مذاق اور ذکاوت و ذہانت کے ساتھ سلامتی طبع، حسن اخلاق اور اعمال صالحہ کے دولتیں بھی شروع سے آپ کو وافر مقدار میں ملی تھیں۔ آپ کے غیر معمولی احوال کو دیکھ کر کشمیر کے عوام عام طور پر یہ شبہ کرتے تھے کہ کہیں آپ مہدی موعود نہ ہوں۔ آپ کے والد محترم اور خاندان کے دوسرے بزرگوں کو عوام کی اس غلط فہمی کی تردید کرنا پڑتی تھی۔

آپ نے خود ایک دفعہ فرمایا کہ میں بارہ سال کی عمر میں فتاوی دینے لگا تھا اور نو سال کی عمر میں فقہ و نحو کی مطولات کا مطالعہ کر چکا تھا۔ "ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء"۔

تین سال تک آپ ہزارہ (سرحد) کے متعدد علماء و صلحاء کی خدمت میں رہ کر علوم عربیہ کی تکمیل فرماتے رہے پھر جب علوم و فنون کی پیاس وہاں بھی بجھتی نہ نظر آئی تو ہندوستان کے مرکز علوم دینیہ دارالعلوم کی شہرت سن کر آپ ۱۳۰۷ھ یا ۱۳۰۸ھ میں بعمر سولہ سترہ سال ہزارہ سے دیوبند آگئے۔ دیوبند میں آپ نے چار سال رہ کر وہاں کے مشاہیر وقت و یکتائے روزگار علماء سے فیوض علمیہ و باطنیہ کا بدرجہ اتم استفادہ کیا اور ۲۰، ۲۱ سال کی عمر میں نمایاں شہرت و عزت کے ساتھ سند فراغ ۱۳۱۲ھ میں حاصل کی۔ جن علماء سے آپ کو شرف تلمذ رہا ہے۔ ان میں سے مندرجہ ذیل حضرات خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

مرشد عالم حضرت مولانا محمود حسنؒ شیخ الہند، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ، حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب امرتسری مہاجر مدنیؒ حضرت مولانا غلام رسول صاحب ہزارویؒ۔

دیوبند سے فارغ ہوکر قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کی خدمت میں گنگوہ تشریف لے گئے اور وہاں سے سند حدیث کے علاوہ فیض باطنی بھی حاصل کیے۔

اس کے بعد آپ دہلی تشریف لے گئے اور تین چار سال تک مدرسہ امینیہ کے مدرس اول رہے۔

دہلی میں کئی سال قیام کے بعد بعض ضرورتوں اور مجبوریوں کے باعث آپ کشمیر تشریف لے گئے اور ۱۳۲۳ھ میں آپ بعض مشاہیر کشمیر کی رفاقت میں زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہوئے۔ سفر حجاز میں طرابلس، بصرہ اور مصر وشام کے جلیل القدر علماء نے آپ کی بہت عزت کی اور سب نے آپ کی خداداد و بے نظیر لیاقت و استعداد دیکھ کر سندات حدیث عطا فرمائیں، جن میں آپ "کالعالم الفاضل الشیخ محمد انور بن مولانا محمد معظم شاہ الکشمیریؒ" لکھا گیا ہے۔

سفر حجاز سے واپس آکر خواجگان قصبہ بارہ مولانا (کشمیر کا ایک مشہور مقام) خصوصاً خواجہ عبدالصمد ککرو رئیس اعظم کے اصرار پر آپ نے اسی قصبہ میں مدرسہ فیض عام کی بنیاد ڈالی اور تقریباً تین سال تک آپ وہاں خلق اللہ کو فیض یاب فرماتے رہے۔ اسی اثناء میں آپ کو دارالعلوم دیوبند کے مشہور جلسہ دستار بندی میں مدعو کیا گیا اور آپ دیوبند تشریف لے گئے۔ دارالعلوم میں آپ نے استفادۂ علوم وفنون کیا تھا اور وہیں سے سند فراغ حاصل کی تھی۔ اب اسی دارالعلوم میں مدرس مقرر ہوگئے۔ سنن ابوداؤد شریف اور صحیح مسلم شریف کا درس سالہا سال تک بغیر کسی تنخواہ کے دیتے رہے۔ چند سال کے بعد آپ کو اپنی والدہ ماجدہ کے انتقال کی وجہ سے پھر کشمیر جانا پڑا۔ لیکن دارالعلوم کی طرف سے شدید تقاضا ہوا۔ اس لیے آپ جلد ہی واپس تشریف لے آئے۔

حضرت شاہ صاحب کا نکاح:

حضرت مولانا انور شاہ صاحب پر شان یحیوی کا کچھ عکس اور پرتو پڑا تھا۔ عالم شباب گزار کر عالم کہولت میں داخل ہو چکے تھے۔ مگر نکاح نہیں فرمایا تھا۔ تجرد اور عزلت کو اپنے لیے پسند فرماتے تھے اور بار بار ارض حرم کی طرف ہجرت کا ارادہ فرماتے تھے تا کہ ازدواجی تعلق اس راہ میں حائل نہ ہو۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو اس وقت دارالعلوم دیوبند کے مہتمم ثانی تھے۔ وہ اس ارادے سے پریشان تھے کہ مبادا اگر یہ آفتاب علم دیوبند سے ہجرت کر جائے تو فقط

دیوبند ہی نہیں سارا ہندوستان ظلمت میں رہ جائے گا۔ اس لیے شاہ صاحب کے روکنے کے لیے انہوں نے وہ تدبیر اختیار فرمائی جو اہل یمن نے حضرت معمرؒ کے روکنے کے لیے کی تھی۔ معمرؒ بصرہ کے رہنے والے تبع تابعین میں سے ہیں۔ بڑے جلیل القدر عالم اور حافظ حدیث ہیں۔ سفیان ثوریؒ، سفیان عیینہؒ، شعبہ اور عبداللہ بن مبارکؒ جیسے اکابر معمرؒ کے تلامذہ میں سے ہیں۔

لما دخل معمر اليمن كرهوا ان يخرج من بينهم فقال رجل قيد وه فزوجوه

[شرح الامام النواوی علی البخاری، ص ۶۲، ج ا

معمر (بصرہ کے رہنے والے تھے) جب یمن میں داخل ہوئے تو اہل یمن نے یہ گوارا نہ کیا معمر کہ یہاں سے چلے جائیں۔ ایک شخص نے کہا کہ اگر ان کو روکنا چاہتے ہو تو معمر کو یہاں قید کرلو (یعنی ان کا نکاح کردو) پس ان کا نکاح کردیا۔

حضرت شاہ صاحب کے ساتھ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے یہی کیا کہ حسن تدبیر سے گنگوہ کے سادات میں شاہ صاحب کا نکاح کرادیا تاکہ معمر کی طرح شاہ صاحب دیوبند میں مقید ہوجائیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے شاہ صاحب کے وجود مسعود کو اس طرح محفوظ فرمایا۔ نکاح کے ایک دو سال بعد ایک بچی پیدا ہوئی۔ اس کے بعد دوسرے بچے پیدا ہوئے تو ذمہ داریاں بڑھتی گئیں اور ہجرت کا ارادہ سست پڑتا گیا جو بالآخر ترک کردینا پڑا اور حضرت علامہ باطمینان خاطر دارالعلوم میں مسند نشین درس ہوکر علمی افادات میں مشغول ہوگئے۔ تجرد کی زندگی میں دارالعلوم سے انہیں معاوضہ لینے سے انکار رہا۔ حضرتؒ مولانا محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ والد ماجد حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ نے باصرار اس بات پر راضی کیا کہ وہ ان کے ساتھ کھانا کھایا کریں اور یہ صورت دس برس تک قائم رہی۔ اسی دوران میں مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو حضرت شیخ الہندؒ نے دیوبند بلوالیا تھا اور وہ بھی حضرت مولانا محمد احمدؒ کے مہمان کی حیثیت سے رہے۔ حضرت مہتمم صاحب مولانا محمد احمدؒ، حضرت علامہ کشمیری، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ، حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ حضرت سندھیؒ یہ تمام حضرات مل کر کھانا کھاتے اور عجیب علمی اور تحقیقی باتیں ہوتی رہتیں۔

نکاح اور اولاد کے بعد منتظمین مدرسہ کو موقع ملا کہ وہ حضرت شاہ صاحب کو دارالعلوم کی طرف سے کچھ مشاہرہ دلوائیں چنانچہ باصرار حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس پر راضی ہوئے۔

اسی دوران میں حضرت شیخ الہندؒ نے حجاز مقدس کا قصد فرمایا تو ان کے تشریف لے جانے کے بعد حضرت شاہ صاحب نے قائم مقام صدر مدرس کی حیثیت سے بخاری شریف اور ترمذی شریف کا درس سنبھال لیا اور طلباء علوم کو یہ محسوس تک نہ ہوا کہ وہ علم کے ایک بحر ذخار (حضرت شیخ الہند) سے محروم ہو گئے ہیں۔ بلکہ حضرت شاہ صاحبؒ کے درس میں بعض ایسی امتیازی خصوصیا تھیں جو عام طور پر دوسرے حلقوں میں نہیں تھیں اور حضرت علامہ کا انداز درس درحقیقت دنیائے درس وتدریس ہی ایک انقلاب کا باعث ہوا، درس کی یہ امتیازی خصوصیات اور انداز پھر انشاء اللہ اپنی جگہ پر ذکر ہوگا۔

۱۳۴۵ھ تک آپ دار العلوم میں بحیثیت صدر مدرس و جانشین شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ درس حدیث دیتے رہے۔اس کے بعد جب منتظمین دار العلوم سے بعض اصلاحات کے سلسلہ میں اختلاف ہوا تو آپ نے ۱۳۴۵ھ میں دار العلوم سے قطع تعلق فرمالیا اور آپ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ حضرت مولانا سراج احمد رشیدیؒ، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہارویؒ، مولانا سید محمد بدر عالم میرٹھی اور دیگر کئی علماء اور بہت سے طلبہ کی ایک جماعت کے ساتھ ڈابھیل جامعہ اسلامیہ تشریف لے گئے اور ۱۳۵۱ھ تک آپ نے جامعہ میں درس حدیث دیا —— ۲ صفر المظفر ۱۳۵۲ھ کو شب کے آخری حصہ میں تقریباً ساٹھ سال کی عمر میں دیوبند میں داعی اجل کو لبیک کہا "انا للّٰہ و انا الیہ راجعون"۔

تبحر علمی:

حضرت علامہؒ کے علمی وعملی کمالات میں سے جو چیز آپ کو اقران واعیان میں سب سے زیادہ ممتاز کرتی تھی۔وہ آپ کی جامعیت وتبحر علمی ہے علوم عقلیہ وشرعیہ میں سے ایک بھی ایسا علم نہیں ہے۔جس میں آپ کو مہارت تامہ حاصل نہ ہو اور شاید یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ علماء متقدمین میں بھی ہر حیثیت سے ایسی جامع علوم عقلیہ ونقلیہ ہستیاں شاذ و نادر ہی ملتی ہیں۔

آپ سینکڑوں علماء وفضلاء کے مجمع میں بیٹھ کر ہر ایک علم وفن کے مسائل پر اس طرح تقریر فرمایا کرتے تھے کہ گویا آپ کو تمام مسائل فن مستحضر اور کالنقش فی الحجر ہیں حتی کہ بعض دفعہ خیال ہوتا تھا کہ اپنے ارادہ سے کلام نہیں کر رہے ہیں بلکہ الہامات وواردات سے ارشاد فرما رہے ہیں اور یہ تو بیشتر ہوتا تھا کہ اکابر علماء وقت سے جب بعض دقیق ولاینحل یا مختلف فیہ مسائل کے

متعلق پوچھا جاتا تھا تو وہ حضرت سے استفسار کرنے کو فرمایا کرتے تھے اور اکثر علماء عصر حاضر کو جب کسی علمی مسئلہ میں کوئی دقت پیش آتی تھی تو وہ خود بھی حضرت علامہؒ سے مراجعت فرماتے تھے۔ ذیل میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ایک مکتوب گرامی کا پہلا اور آخری حصہ مندرج ہے جو انہوں نے حضرت علامہ مرحوم کو ارسال فرمایا تھا۔ جس میں انہوں نے ان سے کسی مسئلہ پر تحقیق چاہی ہے۔

نفحۃ العنبر حضرت علامہ محمد انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی ایک طویل اور جامع تاریخ حیات ہے جسے عربی زبان میں حضرتؒ کے شاگرد مولانا محمد یوسف بنوری نے مرتب اور مجلس علمی نے ڈابھیل سے شائع کیا ہے۔ نفحۃ العنبر کا بیان ہے کہ حکیم الامتؒ نے اکثر مسائل میں علامہ مرحوم سے استفادہ فرمایا ہے:

"از ناکارہ آوارہ اشرف علی بخدمت بابرکت جامع الفضائل العلمیہ والعملیہ حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب دامت انوارہم السلام علیکم ورحمۃ اللہ: تحقیق سابق کے متعلق بضرورت مکرر تکلیف دینا پڑی۔ امید ہے کہ معاف فرمائیں گے۔ ایک حادثہ خود مجھ کو پیش آیا۔ اس کے متعلق جداگانہ تکلیف دینا چاہتا ہوں۔ الخ وقال خاتمہ اس میں روایت و درایت سے کچھ حکم فرمائیں۔ (حیات انور)

اور بروایت زعیم احرار مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاریؒ حضرت حکیم الامت تھانوی نے فرمایا کہ:

> "میرے نزدیک حقانیت اسلام کی دلیلوں میں ایک دلیل حضرت مولانا انور شاہ صاحب کا امت مسلمہ میں وجود ہے اگر دین اسلام میں کسی قسم کی کجی یا خرابی ہوتی تو آپ دین اسلام سے کنارہ کش ہو جاتے"۔ حیات انور)

میں نے یہ روایت استاذی حضرت مولانا خیر محمد صاحب مدظلہ مہتمم مدرسہ خیر المدارس سے بھی سنی ہے کیونکہ اس وقت حضرت ممدوح بھی مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاریؒ کے ساتھ تھے۔

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے حضرت کی وفات پر جامعہ ڈابھیل کے ایک جلسہ میں فرمایا:

> "مجھ سے اگر مصر و شام کا کوئی آدمی پوچھتا کہ کیا تم نے حافظ ابن حجر عسقلانیؒ، شیخ تقی الدین ابن دقیق العیدؒ اور سلطان العلماء حضرت شیخ عزالدین بن عبدالسلام

کو دیکھا ہے؟ تو میں استعارہ کر کے کہہ سکتا تھا کہ ہاں دیکھا ہے۔ کیونکہ صرف زمانہ کا تقدم وتاخر ہے۔ ورنہ اگر حضرت علامہ انور شاہ بھی چھٹی یا ساتویں صدی میں ہوتے تو اسی طرح آپ کے مناقب ومحامد بھی اوراق تاریخ کا گراں قدر سرمایہ ہوتے۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ حافظ ابن حجر، شیخ تقی الدین اور سلطان العلماء کا انتقال آج ہوا ہے"۔ (حیات انور)

حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری قدس سرۂ فرمایا کرتے تھے:

"واقعی حضرت شاہ صاحب 'آیۃ من آیات اللہ' تھے"۔

زعیم احرار مولانا سید عطا اللہ شاہ صاحب بخاریؒ ایک دفعہ ڈابھیل تشریف لے گئے تو جامعہ اسلامیہ کے طلبہ نے تقریر کی درخواست کی اور یہ بھی چاہا کہ حضرت علامہ کے حالات پر تبصرہ کریں تو بخاری صاحب نے فرمایا کہ:

"میرے جیسا کم علم ان کے حالات کیا بیان کر سکتا ہے۔ البتہ صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ صحابہؓ کا قافلہ جا رہا تھا یہ پیچھے رہ گئے تھے"۔

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے حضرت علامہؒ کے جلسہ تعزیت میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ میں نے ہندوستان، حجاز، عراق، شام وغیرہ کے علماء فضلا سے ملاقات کی اور مسائل علمیہ میں ان سے گفتگو کی لیکن تبحر علمی، وسعت معلومات، جامعیت اور علوم نقلیہ وعقلیہ کے احاطہ میں شاہ صاحب کا کوئی نظیر نہیں پایا۔ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہؒ نے حضرت علامہؒ کے انتقال پر ایک مضمون میں تحریر فرمایا کہ:

"آہ قدرت کے زبردست ہاتھ نے حضرت مولانا العلامۃ الفاضل الکامل، اکمل العلماء، افضل الفضلا، التحریر المقدام، البحر الطمطام رحلۃ العصر، قدوۃ الدھر، استاذ الاساتذہ، رئیس الجہابذہ، محدث وحید، مفسر فرید، فقیہ یگانہ، ماہر علوم النقلیہ والعقلیہ مولانا سید انور شاہ قدس سرہٗ کو آغوش رحمت میں کھینچ لیا اور ہم سے ظاہری طور پر ہمیشہ کے لیے جدا کر دیا۔ حضرت شاہ صاحب کی وفات بلاشبہ وقت حاضر کے کامل ترین عالم ربانی کی وفات ہے۔ جن کا نظیر مستقبل میں متوقع نہیں۔ طبقۂ علماء میں حضرت شاہ صاحب کا تبحر، کمال فضل ورع وتقوی و

جامعیت، استغنا مسلم تھا۔ موافق و مخالف ان کے سامنے تسلیم و انقیاد سے سر جھکاتا تھا۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے شاہ صاحب مرحوم کے سانحہ ارتحال پر معارف میں کس قدر بلیغ بات کہی تھی:

"مرحوم کی مثال اس سمندر جیسی ہے۔ جس کی اوپر کی سطح ساکن ہو لیکن گہرائی موتیوں سے لبریز ہو"۔

ہم نے ایجاز و اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے "بیس بڑے مسلمان" کتاب کے ۷ بڑے انسانوں کے تاثرات قلم بند کیے ہیں۔ ورنہ ان حضرات کے علاوہ ہند و بیرون ہند کے تمام جید علماء نے حضرت علامہ کے متعلق جس عقیدت و تاثر کا اظہار کیا ہے۔ اگر اس کو نقل کیا جائے تو اس کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ اب یہاں دنیائے اسلام کے چند نامور مفکروں کے خیالات پیش کیے جاتے ہیں۔ جن کی علمی قابلیت و استعداد پر دیوبندی مکتب فکر کے علاوہ تمام مسلمان مبصرین و مفکرین کا اتفاق ہے جس سے معلوم ہوگا کہ مندرجہ بالا تاثرات میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس میں مکتب فکر کی جانبداری نہیں ہے دوسروں کا بھی یہی حال ہے۔

علامہ سید رشید رضا جو مصر کی ایک معروف شخصیت اور علمی حلقوں میں ایک نادرہ روزگار انسان سمجھے جاتے تھے۔ جب دیوبند تشریف لائے ہیں تو انہوں نے حضرت علامہ سید انور شاہ رحمۃ اللہ کی ایک تقریر سنی جو عربی میں ان کی آمد پر ارتجالاً کی گئی تھی اور حنفیت کے بعض ایسے گوشے زیر بحث آگئے جن پر علماء محققین کی نظر تک نہ تھی تو بقول مولانا مناظر احسن گیلانی (بحوالہ نظام تعلیم و تربیت) سید رشید رضا بار بار اپنی کرسی سے اٹھتے تھے اور فرماتے تھے:

"و اللّٰہ مارأیت مثل ھذا الرجل قط" خدا کی قسم! میں نے ان جیسا آدمی ہرگز نہیں دیکھا

آپ کے استاد حضرت شیخ الہندؒ نے آپ کو سند اجازت عنایت فرمائی تھی۔ اس میں تحریر فرمایا تھا کہ خداوند تعالیٰ نے مولانا انور شاہؒ میں۔

علم، عمل، سیرت، صورت، ورع، زہد، رائے صائب اور ذہن ثاقب جمع کر دیا ہے اور شیخ الہندؒ حضرت شاہ صاحب کو علامہ جیسے وقیع لفظ سے یاد فرماتے اور مسائل علمیہ میں جب کوئی دقیقہ سامنے آتا تو حضرت شاہ صاحب سے دریافت فرماتے۔ کہو علامہ! اس مسئلہ میں سلف کا کوئی

قول یاد ہے، علامہ صاحب جواب دیتے اور حضرت شیخ الہندؒ مسرت واطمینان کا اظہار فرماتے''
استاد کا شاگرد کو علامہ سے یاد کرنا حضرت علامہ کے کمال علمی پر دلالت کرتا ہے۔

علامہ علی مصری حنبلیؒ حافظ حدیث مصر سے سوات آئے وہاں سے دہلی اور دہلی سے دیو بند آئے اور حضرت شاہ صاحب کے درس بخاری شریف میں حاضر ہوئے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے علامہ کی رعایت کرتے ہوئے بلیغ عربی میں تقریر فرمائی۔ علامہ نے سوالات کیے۔ ادھر سے جوابات دیئے گئے۔ درس ختم ہوا تو علامہ نے سیکڑوں طلبہ کے ہجوم میں فرمایا:

"میں نے عرب ممالک کا سفر کیا اور علماء واکابر سے ملاقات کی ہے۔ خود مصر میں سالہا سال درس حدیث دے آیا ہوں۔ میں نے شام سے لے کر ہند تک اس شان کا کوئی محدث اور عالم نہیں پایا۔ میں نے ان کو ساکت کرنے کی ہر طرح کوشش کی۔ لیکن ان کے استحضار، تیقظ حفظ و اتقان، ذکاوت و ذہانت اور وسعت نظر سے میں حیران رہ گیا اور آخر میں کہا۔ تو "حلفت انه اعلم بابی حنیفة لما خشت "یعنی اگر میں قسم کھاؤں کہ یہ ابوحنیفہ کو سب سے زیادہ جاننے والے ہیں تو میں اس دعوے میں جھوٹا نہ ہوں گا"۔

ہندوستانی علماء کو اعجام قرار دینے والے علامہ علی مصری کا یہ اعتراف اور تاثر حضرت شاہ صاحبؒ کی شان علمی، جامعیت اور تبحر کی ایک مضبوط شہادت ہے اور علامہ علی مصری کا یہ اقرار اس بات کی بھی تصدیق کرتا ہے کہ علم کسی کی میراث نہیں، علم اپنے عمل کے اعتبار سے عربی و عجمی کی قید سے بے نیاز ہے۔

علامہ زاہد الکوثری کی محیر العقول شخصیت سے اہل علم میں سے کون ناواقف ہوگا۔ علامہ ٹرکی کی ایک زبردست علمی شخصیت اور اس قحط الرجال کے زمانہ میں ایک نادر حیثیت کے مالک تھے۔ قاہرہ میں جلاوطنی کے ایام گزار رہے تھے۔ وہیں حضرت شاہ صاحب مرحوم کی بعض تصانیف وتالیفات کا مطالعہ کیا تو فرمایا کہ "احادیث سے دقیق مسائل کے استنباط میں شیخ ابن ہمام صاحب فتح القدیر کے بعد ایسا محدث وعالم امت میں نہیں گزرا اور یہ کوئی کم زمانہ نہیں ہے۔

ترکی کے ایک دوسرے عالم سابق شیخ الاسلام جو قاہرہ میں جلاوطنی کے بعد مقیم تھے اور مادیین ودھریین کے رد میں بہت کچھ لکھ چکے تھے۔ انہوں نے حضرت شاہ صاحب کے رسالہ

''مرقات الطارم'' کا مطالعہ کیا تو فرمایا:

"میں نہیں سمجھتا تھا کہ فلسفہ وکلام کے دقائق کا اس انداز سے سمجھنے والا اب بھی کوئی دنیا میں موجود ہے"۔

علامہ اقبال مرحوم نے لاہور کے اس تعزیتی جلسے میں جو حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد ہوا تھا۔ تقریر کرتے ہوئے کہا کہ:

''اسلام کی ادھر کی پانچ سو سالہ تاریخ شاہ صاحب کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔"

ابھی اوپر گزرا کہ علامہ کوثری نے شاہ صاحب کو ابن ہمامؒ کا نظیر ٹھہرایا، اور علامہ اقبالؒ کا یہ کہنا ہے کہ اسلام کی ادھر کی پانچ سو سالہ تاریخ شاہ صاحب کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے اور ابن ہمام پانچ صد سال قبل کے محققین سے ہیں۔ علامہ اقبال اور علامہ کوثری کے رائے کا یہ توافق یا توارد کس قدر حیرت انگیز ہے۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایم اے مدیر برہان نے اپنے ایک مضمون میں ڈاکٹر اقبال اور علامہ کشمیری کے مابین چند واقعات کا ذکر کیا ہے۔ جو اُن کے علم میں ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔

علامہ کشمیریؒ اور علامہ اقبالؒ:

علامہ اقبال ایک نامور مفکر اور مشہور شاعر ہونے کے علاوہ فلسفہ کے دقیق النظر عالم تھے۔ فلسفہ یونانی۔ فلسفہ عہد حاضر ومغرب پر ان کی خوب نظر تھی۔ اس کے علاوہ ان کا اسلامیات کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ان کی شاعری خطبات اور تصانیف سے اس کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنے انگریزی زبان کے چھ لکچروں (Reconstruction of Relijous Thought) کی تیاری میں حضرت علامہ کشمیریؒ سے کافی مدد لی ہے۔ حضرت علامہ کشمیریؒ کا حدوث عالم پر منظوم رسالہ اگرچہ بہت مختصر ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اس مسئلہ (حدوث عالم) پر سارے قدیم وجدید فلسفہ کا عطر اور اس پر تنقید ہے۔ یہ رسالہ جب چھپا تو اس کا ایک نسخہ حضرت کشمیریؒ نے ڈاکٹر اقبالؒ کے پاس تحفۃً ارسال فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب جس ذوق اور جس استعداد کے بزرگ تھے۔ اس کے اعتبار سے ان کے لیے کوئی تحفہ اس چند ورقی رسالہ سے زیادہ قیمتی نہیں ہوسکتا تھا۔ بڑے خوش ہوئے اور پورا رسالہ بڑی توجہ اور غور وفکر سے پڑھا۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی اس پوری عبارت کے ناقل وراوی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں ان دنوں بسلسلۂ طالب علمی لاہور میں مقیم تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو معلوم تھا کہ مجھ کو حضرت شاہ صاحب کے ادنی درجہ کے تلامذہ میں سے ہی ہونے کا شرف حاصل نہیں ہے۔ بلکہ اس بارگاہ علم وعقل میں شخصی تقرب واختصاص کا مرتبہ بھی میسر ہے۔ اس بناء پر ایک دفعہ مجھ سے فرمایا کہ میں تو مولانا انور شاہ کا رسالہ پڑھ کر دنگ رہ گیا ہوں کہ رات دن قال اللہ وقال الرسول سے واسطہ رکھنے کے باوجود فلسفہ میں بھی ان کو اس درجہ درک وبصیرت اور اس کے مسائل پر اس قدر گہری نگاہ ہے کہ حدوث عالم پر اس رسالہ میں انہوں نے جو کچھ لکھ دیا ہے۔ حق یہ ہے کہ آج یورپ کا بڑے سے بڑا فلسفی بھی اس مسئلہ پر اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتا۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے وہ رسالہ میرے حوالے کیا اور فرمایا کہ اس میں چار شعر ایسے ہیں۔ جن کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے ان پر نشان لگا دیا ہے۔ آپ دیوبند جائیں تو یہ نسخہ ساتھ لیتے جائیں اور شاہ صاحب سے ان اشعار کا مطلب دریافت کرتے آئیں/ میں نے دیوبند آ کر وہ رسالہ حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں پیش کر کے ڈاکٹر صاحب کا پیام پہنچایا۔ لیکن حضرت الاستاد نے مجھ کو ان اشعار کا مطلب سمجھانے کے بجائے یہی مناسب خیال فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب کو فارسی میں ایک طویل خط لکھیں اور اس میں ان اشعار کا مطلب بھی تحریر فرمادیں۔ یہ خط میں ہی دستی لے کر لاہور آیا اور ڈاکٹر صاحب کو پہنچا دیا۔

یہ حکیم الامت ڈاکٹر اقبال وہ ہیں جنہوں نے خود اپنے متعلق کہا تھا۔

اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی

ان کے دل میں حضرت الاستاد کی کس قدر درجہ عظمت تھی۔ اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند میں اختلافات کے باعث جب حضرت الاستاد نے اپنے عہدہ صدر الاساتذہ سے استعفی دے دیا اور یہ خبر اخبارات میں چھپی تو اس کے چند روز بعد میں ایک دن ڈاکٹر صاحب کے پاس گیا۔ فرمانے لگے کہ آپ کا یا دوسرے مسلمانوں کا جو بھی تاثر ہو۔ میں بہر حال شاہ صاحب کے استعفی کی خبر پڑھ کر بہت خوش ہوا ہوں۔ میں نے بڑے تعجب سے عرض کیا کہ "آپ کو دارالعلوم دیوبند کے نقصان کا کچھ ملال نہیں ہے؟ فرمایا کیوں نہیں؟ مگر دارالعلوم کو

صدر المدرسین اور بھی مل جائیں گے اور جگہ خالی نہ رہے گی۔ لیکن اسلام کے لیے اب جو کام میں شاہ صاحب سے لینا چاہتا ہوں اس کو سوائے شاہ صاحب کے کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔

اس کے بعد انہوں نے اس اجمال کی تفصیل یہ بیان کی کہ آج اسلام کی سب سے بڑی ضرورت فقہ کی جدید تدوین ہے جس میں زندگی کے ان سینکڑوں مسائل کا صحیح اسلامی حل پیش کیا گیا ہو۔ جن کو دنیا کے موجودہ قومی اور بین الاقوامی، سیاسی، معاشی اور سماجی احوال وظروف نے پیدا کر دیا ہے۔ مجھ کو پورا یقین ہے کہ اس کام کو میں اور شاہ صاحب دونوں مل کر ہی کر سکتے ہیں۔ ہم دونوں کے علاوہ اور کوئی شخص اس وقت عالم اسلام میں ایسا نظر نہیں آتا جو اس عظیم الشان ذمہ داری کا حامل ہو سکے۔ پھر فرمایا یہ مسائل کیا ہیں؟ اور ان کا سرچشمہ کہاں ہے۔ میں ایک عرصے سے ان کا بڑے غور سے مطالعہ کر رہا ہوں۔ یہ سب مسائل میں شاہ صاحبؒ کے سامنے پیش کروں گا اور ان کا صحیح اسلامی حل کیا ہے؟ یہ شاہ صاحب بتائیں گے۔ اس طرح ہم دونوں کے اشتراک و تعاون سے فقہ جدید کی تدوین عمل میں آ جائے گی۔ چنانچہ باخبر اصحاب کو معلوم ہے کہ اسی جذبہ کے تحت ڈاکٹر صاحب مرحوم نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح شاہ صاحب دیوبند کی خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد لاہور تشریف لے آئیں اور وہیں مقیم ہو جائیں۔ لیکن افسوس! حالات کچھ اس قسم کے تھے کہ ایسا نہ ہو سکا اور حضرت شاہ صاحبؒ لاہور کی بجائے ڈابھیل تشریف لے گئے جس کا ڈاکٹر صاحب کو بڑا املال اور صدمہ ہوا۔[۱]

باخبر حضرات جانتے ہیں کہ پنجاب کے خصوصاً اور ہندوستان کے عموماً انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ میں قادیانی فتنہ کی شرانگیزی اور اسلام کشی کا جو احساس پایا جاتا ہے۔ اس میں بڑا دخل ڈاکٹر اقبال مرحوم کے اس لکچر کا ہے جو ختم نبوت پر ہے اور ساتھ ہی اس مقالہ کا ہے جو انگریزی میں قادیانی تحریک کے خلاف شائع ہوا تھا لیکن یہ شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ دونوں تحریروں کا اصل باعث حضرت الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہؒ ہی تھے۔[۲]

ایک مرتبہ حضرت شاہ صاحب انجمن خدام الدین کے کسی سالانہ اجتماع میں شرکت کی غرض سے لاہور تشریف لائے تو ڈاکٹر صاحب خود ملاقات کے لیے حضرت موصوف کی قیام گاہ پر آئے اور پھر ایک دن اپنے ہاں رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ دعوت کا صرف بہانہ تھا ورنہ اصل مقصد علمی استفادہ تھا۔ چنانچہ کھانے سے فراغت کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ختم نبوت اور قتل مرتد

کا مسئلہ چھیڑ دیا۔ جس میں کامل ڈھائی گھنٹہ تک گفتگو ہوتی رہی۔ ڈاکٹر صاحب کی عادت یہ تھی کہ جب وہ کسی اسلامی مسئلہ پر کسی بڑے عالم سے گفتگو کرتے تھے تو بالکل ایک طالب علمانہ انداز سے کرتے تھے۔ مسئلہ کے ایک ایک پہلو کو سامنے لاتے اور اس پر اپنے شکوک وشبہات کو بے تکلفانہ بیان کرتے تھے۔ چنانچہ اب اس وقت بھی انہوں نے ایسا ہی کیا/ حضرت شاہ صاحبؒ نے ڈاکٹر صاحب کے شکوک وشبہات اور ایرادات واعتراضات کو بڑے صبر وسکون کے ساتھ سنا اور اس کے بعد ایک ایسی جامع اور مدلل تقریر کی کہ ڈاکٹر صاحب کو ان دو مسئلوں پر کلی اطمینان ہو گیا اور کچھ خلش ان کے دل میں جو تھی وہ جاتی رہی اور اس کے بعد انہوں نے ختم نبوت پر وہ لکچر تیار کیا کہ جو ان کے چھ لکچروں کے مجموعہ میں شامل ہے اور قادیانی تحریک پر وہ ہنگامہ آفریں مقالہ سپرد قلم فرمایا جس نے انگریزی اخبارات میں شائع ہو کر پنجاب کی فضا میں تلاطم برپا کر دیا تھا۔[۳]

بہر حال یہ دو تین واقعات صرف اس غرض سے لکھے گئے ہیں کہ جن لوگوں کو براہ راست یا تصنیفات وتالیفات کے ذریعہ حضرت الاستاد کے بحر ناپیدا کنار علم سے جرعہ نوشی کا موقعہ نہیں ملا وہ ایک جوہر گرانمایہ کی قدر وقیمت کا اندازہ اسی سے کر سکیں کہ دنیا کے جوہریوں کی رائے اس کے متعلق کیا تھی

ا- مرتب نے مولانا عبدالحنان صاحب ہزاروی سابق ناظم جمعیۃ علمائے ہند سے خود سنا۔ وہ فرماتے تھے کہ جب علامہ شاہ صاحب نے دارالعلوم سے استعفیٰ دیا۔ میں ان دنوں لاہور آسٹریلیا جامع مسجد میں خطیب تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے دیوبند ایک تفصیلی تار دیا۔ جس میں شاہ صاحب سے درخواست کی گئی تھی کہ اب آپ لاہور تشریف لے آئیں اور یہیں قیام فرمائیں۔ جوابی تار تھا جس کا کوئی جواب نہ آیا۔ جس پر ڈاکٹر صاحب نے مجھ کو (مولانا ہزارویؒ کو) دیو بند بھیجا کہ تم جا کر زبانی عرض کرو۔ میں گیا تو معلوم ہوا کہ شاہ صاحب کو وہ تار اس وقت دیا گیا۔ جب ڈابھیل والوں نے اصرار کر کے وہاں تشریف لے جانے پر رضامند کر لیا تھا۔ میں ملا تو فرمایا: افسوس! کہ آپ کا پیغام بعد میں ملا اور میں ڈابھیل والوں سے وعدہ کر چکا۔ اس سلسلہ کی ایک کڑی یہ ہے کہ جو بعض ثقہ حضرات نے بیان کی کہ ڈاکٹر صاحب نے شاہ صاحب کی متوقع آمد کے پیش نظر متمول دوستوں سے پچاس ساٹھ ہزار روپیہ کے وعدے لے لیے تھے کہ حضرت علامہؒ کے لیے شاہانہ شان کوٹھی تعمیر کی جائے جہاں وہ قیام فرما ہوں۔ (مرتب)

۲- ڈاکٹر اقبال مرحوم قادیانی تحریک کے بعض یونہی افادی قسم کے پہلوؤں سے کچھ متاثر تھے۔ حضرت صاہ صاحبؒ نے ڈاکٹر صاحب کو تحریک قادیانی کے مضمرات سے آگاہ کرنے کے لیے دو تین دفعہ لاہور کا سفر فرمایا جس کے بعد وہ کام کیا جس کا ذکر اوپر ہوا ہے (مرتب) جس وقت یہ سطور تحریر کی گئیں۔ مولانا ہزاروی بقید حیات تھے مگر آج ہم میں موجود نہیں ہیں۔ بہت مخلص انسان تھے۔ غفرلہٗ

۳- ماخود تذکرہ انور

حافظہ ٗ ذکاوت ٗ ذہن:

حضرت علامہؒ کو قدرت نے بے نظیر حافظہ عطا فرمایا تھا۔ کسی فن کی کسی کتاب کو شروع سے آخر تک ایک دفعہ مطالعہ کرلیا اور جب کبھی سالہا سال کے بعد اس کے متعلق کوئی بات چھڑی تو اس کتاب کے مندرجات کو اس طرح حوالوں کے ساتھ بیان فرمادیا کہ سننے والے ششدر و حیران رہ گئے۔ ایک کتاب کے اگر پانچ پانچ یا دس دس حواشی بھی تھے تو وہ آپ کو یاد ہوتے تھے/ حوالۂ ہائے کتب صحیحہ بقید جلد وصفحات آپ کو ایک ہی دفعہ مطالعہ سے محفوظ ہوجاتے تھے اور جس وقت کسی اہم علمی مسئلہ پر تقریر فرماتے تھے تو بے شمار کتابوں کے حوالے بلا تکلف دیتے چلے جاتے تھے آپ کی قوت حافظہ ان منکرین حدیث کا گویا جواب تھا جو محدثین کے حافظہ پر اعتماد نہ کرتے ہوئے ذخیرہ حدیث کو مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہیں۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ نے فرمایا کہ مجھ سے حضرت شاہ صاحب فرماتے تھے کہ:

> "جب میں کسی کتاب کا سرسری نظر سے مطالعہ کرتا ہوں اور اس کے مباحث کو محفوظ رکھنے کا ارادہ بھی نہیں ہوتا۔ تب بھی پندرہ سال تک اس کے مضامین مجھے محفوظ ہوجاتے ہیں"۔

سرعت مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ سعد احمد (مطبوعہ مصر) کے روزانہ دو سو صفحات کا مطالعہ فرمایا اور وہ بھی اس شان سے کہ اس عظیم الشان ذخیرہ میں سے احناف کی تائید میں جس قدر احادیث ہوسکتی تھیں۔ وہ بھی منتخب اور محفوظ کرلیں اور پھر جب کبھی درس میں مسند احمد کی احادیث کا حوالہ دینا ہوتا تھا تو بغیر مراجعت دے دیتے تھے اور رواۃ وطبقات پر بھی بے تکلف بحث فرماتے تھے۔ صرف آخر عمر میں ایک مرتبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات سے متعلق احادیث کو جمع

کرنے کے لیے مسند کا مطالعہ دوبارہ فرمایا تھا۔

شیخ ابن ہمامؒ کی فتح القدیر مع تکملہ (۸ جلد) کا مطالعہ بیس روز میں کیا تھا۔ اس طرح کہ کتاب الحج تک اس کی تخلیص بھی فرمائی اور ابن ہمام نے صاحب ہدایہ پر جو اعتراضات کیے ہیں۔ اپنے خلاصہ میں ان کے مکمل جوابات بھی تحریر فرمائے اور پھر مدت العمر فتح القدیر سے مذاہب ومباحث نقل کرنے میں مراجعت کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ایک دفعہ خود بھی درس میں بطور تحدیث نعمت فرمایا کہ ۲۶ سال قبل فتح القدیر دیکھی تھی۔ الحمدللہ اب تک مراجعت کی ضرورت نہیں ہوئی جو مضمون اس کا بیان کروں گا۔ اگر مراجعت کرو گے تو تفاوت بہت کم پاؤ گے۔

سنن بیہقی قلمی کا مطالعہ حضرت گنگوہی قدس سرہ کے یہاں کیا تھا۔ تیس سال بعد ڈابھیل میں ایک روز فرمایا کہ حافظ ابن حجر نے ایک جگہ کچھ دلائل حنفیہ کے خلافیات بیہقی سے جمع کیے ہیں۔ میں نے جو نسخہ بیہقی کا گنگوہ میں دیکھا تھا۔ اس میں وہ چیزیں نہ تھیں۔ پھر جب سنن بیہقی حیدر آباد سے چھپ کر آئی تو اس میں وُہ چیزیں موجود تھیں۔ لیکن اب میں اس نظریہ پر پہنچا ہوں کہ حضرت گنگوہیؒ والا قلمی نسخہ زیادہ صحیح تھا اور اس کے شواہد و دلائل میں اپنی یادداشت میں جمع کر رہا ہوں۔

حضرت شاہ صاحب کی قوت حافظہ کے سلسلہ میں مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی یہ تحقیق بھی قابل ذکر ہے کہ مجموعی طور سے حضرت شاہ صاحب کو کم سے کم چالیس پچاس ہزار عربی کے ایسے اشعار یاد تھے کہ جس وقت چاہتے ان میں سے سنا سکتے تھے۔ فارسی اشعار بھی بکثرت یاد تھے۔ بلکہ اردو کے بھی اُونچے شعرا کا کلام یاد تھا ایک دفعہ غالب کے بہت سے اشعار سنائے۔

آپ کے وسعت مطالعہ پر اس واقعہ سے روشنی پڑتی ہے کہ کشمیر میں ایک دفعہ علماء کے درمیان اختلاف ہوا اور ہر ایک کا جواب دوسرے کے مخالف رہا۔ اس دوران میں حضرت شاہ صاحب بھی کشمیر تشریف لائے۔ فریقین شاہ صاحب سے ملاقات کرنے کے لیے حاضر ہوئے اور دونوں نے مختلف فیہ مسئلہ کو آپ کے سامنے پیش کیا۔ حضرت شاہ صاحب نے مولانا محمد یوسف صاحب سے فرمایا کہ میں نے فتاوی عماریہ کے ''مخطوطہ'' کا دارالعلوم کے کتب خانہ میں مطالعہ کیا ہے۔ اس میں یہ عبارت ہرگز موجود نہیں۔ یہ لوگ تصحیف کر رہے ہیں یا تدلیس۔ اس پر حاضرین متحیر ہوئے اور مستدلین مبہوت ہو کر رہ گئے۔

حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے تھے کہ فوائد التنزیل العزیز لکھتے وقت مجھے حضرت داؤد

علیہ السلام کے متعلق صحیح روایات حاصل نہ ہوسکیں۔ پندرہ روز تک اس چھان بین میں لگا رہا کہ کوئی ایسی حدیث ہاتھ آئے جو انبیاء کے شایان شان ہو۔ لیکن میری کوشش بیکار گئی۔ اس کے بعد میں حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ بیماری کی وجہ سے صاحب فراش تھے۔ میں نے اس پیش آئی ہوئی الجھن اور دشواری کا اظہار کیا۔ حضرت نے بلا تامل فرمایا کہ حاکم نے مستدرک کے اندر حضرت ابن عباسؓ سے ایک اثر نقل کیا ہے۔ اس کا مطالعہ کیجئے۔ آپ کی تمام الجھن ختم ہو جائے گی۔ حضرت مولانا عثمانی نے فرمایا کہ میں نے حضرت شاہ صاحب کے ارشاد کے مطابق مطالعہ کیا تو میری تمام الجھنیں دور ہوگئیں۔ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری کا بیان ہے کہ تیرہ دفعہ آپ نے صحیح بخاری شریف کے صرف متن کا مطالعہ فرمایا تھا۔ جب کہ اس کے حاشیہ اور بین السطور پر بالکل نظر نہ تھی۔ ہر دفعہ ایسے علوم وحقائق کا انکشاف ہوتا کہ اس سے پہلے قلب میں گزرے ہی نہ تھے۔

حضرت شاہ صاحب حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کے بے حد مداح تھے، ابن تیمیہؒ کو حافظ الدنیا اور جبال علم کے معزز القاب سے یاد کرتے تھے۔ حافظ ابن حجرؒ کے مقابلہ میں حافظ بدرالدین عینیؒ شارح بخاری کے علوم اور ان کی تحقیقات کو زیادہ دقیق سمجھتے تھے درس میں ایک دفعہ فرمایا کہ میں نے خواب میں حافظ بدرالدینؒ عینی کو دیکھا اور ان سے بطور شکایت کے کہا کہ ابن حجر کے مقابلہ میں جو طرز آپ نے اختیار کیا ہے اس سے علماء کو بہت دقت ہوتی ہے/ حافظ عینی نے جواب دیا کہ حافظ ابن حجر سے دریافت کرو کہ انہوں نے یہ طرز کیوں اختیار کیا تھا؟ حافظ عینی کہنا چاہتے تھے کہ میں نے صرف مدافعت کی ہے ابتداء ابن حجر سے ہوئی ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ میں عینی کے اس جواب پر خاموش ہوا۔ ان مقامات پر عینی کے جوابات سے شاہ صاحب مطمئن نہ تھے۔ آپ تفسیر حدیث شرح الفاظ اور نقول کبار میں زیادہ مکمل سمجھنے کے باوجود نظم وترتیب میں پسند نہ کرتے تھے۔

کئی ایک بزرگوں سے سنا کہ حضرت شاہ صاحب بعض دفعہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک شخص کعبۃ اللہ کے پردوں کو پکڑ کر دعا کر رہا تھا کہ خداوند تعالیٰ مجھے ابن حجر کا حافظہ عطا فرما۔ اس کی دعا قبول کی گئی۔ حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب شیخ الحدیث جامعہ رشیدیہ منٹگمری نے فرمایا کہ یہ شخص خود شاہ صاحب تھے۔ یہ بات بطور تحدیث نعمت ان کی زبان پر آجاتی تھی مگر اپنے نام کا اخفا

کر جاتے تھے۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن مہتمم دارالعلوم دیوبند ہمیشہ حضرت شاہ صاحب کو چلتا پھرتا۔ کتب خانہ فرمایا کرتے تھے۔ حضرت مولانا میاں اصغر حسین دیوبندیؒ فرمایا کرتے تھے:

"مجھے جب مسئلہ فقہ میں کوئی دشواری پیش آتی ہے تو کتب خانہ دارالعلوم کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ اگر کوئی چیز مل گئی تو فبہا ورنہ پھر حضرت شاہ صاحب سے رجوع کرتا ہوں۔ شاہ صاحب جو جواب دیتے اسے آخری اور تحقیقی پاتا اور اگر حضرت شاہ صاحب نے کبھی یہ فرمایا کہ میں نے کتابوں میں یہ مسئلہ نہیں دیکھا تو مجھے یقین ہو جاتا کہ اب یہ مسئلہ کہیں نہیں ملے گا اور تحقیق کے بعد ایسا ہی ثابت ہوتا"۔

مولانا محمد ادریس کاندھلوی فرماتے ہیں کہ حضرت شاہ صاحب کے حافظہ کا یہ عالم تھا کہ جو ایک مرتبہ دیکھ لیا اور جو ایک مرتبہ سن لیا وہ ضائع ہونے سے محفوظ اور مامون ہو گیا گویا کہ اپنے زمانہ کے زہریؒ تھے۔ امام زہریؒ جب مدینہ منورہ کے بازار سے گزرتے تو کانوں میں انگلیاں دے لیتے کسی نے پوچھا کہ آپ کیا کرتے ہیں/فرمایا کہ میرے کانوں میں جو داخل ہو جاتا ہے۔ وہ نکلتا نہیں۔ اس لیے بازار سے گزرتے وقت کانوں میں انگلیاں دے لیتا ہوں تا کہ بازار کی یہ خرافات میرے کانوں میں داخل نہ ہو سکیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد ایک دفعہ دیوبند کے قبرستان میں پھر رہے تھے۔ فرمایا کہ میں علم کی قبر کے پاس پھر رہا ہوں۔ یہ قبر حضرت شاہ صاحب کی تھی۔ مطالعہ کے سلسلہ میں فنون عصریہ، فلسفۂ جدید، ہیئت جدید حتی کہ فن رمل اور جفر کی کتابوں کو بھی بغیر مطالعہ کے نہ چھوڑا۔

حضرت شاہ صاحب کے درس کی خصوصیات:

حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے تحریر فرمایا ہے کہ حضرت کے درس کی شان عجیب تھی جسے اب دکھلانا تو ممکن نہیں۔ البتہ بتلانا ممکن ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

۱- درس حدیث میں سب سے اول اور زیادہ توجہ اس طرف فرماتے تھے کہ حدیث نبوی کی مراد باعتبار قواعد عربیت و بلاغت واضح ہو جائے۔ حدیث کی مراد کو علمی اصلاحات کے تابع بنانے کو بھی پسند نہ فرماتے تھے۔ کیونکہ اصطلاحات بعد میں پیدا ہوئیں اور حدیث نبوی زمانا

در تبۂ مقدم ہے۔ حدیث کو اصطلاح کے تابع کرنا خلاف ادب ہے۔

۲۔ خاص خاص مواضع میں حدیث نبوی کا ماخذ قرآن کریم سے بیان فرماتے اور اسی مناسبت سے بہت سی مشکلات قرآنیہ کا حل فرما دیتے تھے۔

۳۔ حسب ضرورت اسماء الرجال پر کلام فرماتے خصوصاً جن رواۃ کے بارے میں محدثین کا اختلاف ہوتا تو اس جرح وتعدیل کے اختلاف کو نقل کر کے اپنی طرف سے ایک قول فیصل بتلا دیتے کہ یہ راوی کس درجہ میں قابل قبول ہے۔ اس کی روایت حسن کے درجہ میں ہے یا صحیح کے، قابل رد ہے، یا قابل اغماض یا لائق مسامحت؟ اور اغماض و مسامحت میں جو فرق ہے وہ اہل علم سے مخفی نہیں۔ زیادہ تر فیصلہ کا طریقہ یہ بھی رکھتے کہ جب کسی راوی کی جرح و تعدیل میں اختلاف ہوتا تو یہ بتلا دیتے کہ یہ راوی ترمذی کی فلاں سند میں واقع ہے اور امام ترمذی نے اس روایت کی تحسین یا تصحیح فرمائی ہے۔

۴۔ فقہ الحدیث پر جب کلام فرماتے تو اولاً ائمہ اربعہ کے مذاہب نقل فرماتے اور پھر ان کے وہ دلائل بیان فرماتے جو ان مذاہب کے فقہاء کے نزدیک سب سے قوی ہوتے پھر ان کا جواب اور امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کی ترجیح بیان فرماتے تھے۔ حنفیت کے لیے استدلال و ترجیح میں کتاب وسنت کے تبادر اور سیاق وسباق کو پورا ملحوظ رکھتے اور اس بات کا خاص لحاظ رکھتے کہ شریعت کا منشا و مقصد اس بارے میں کیا ہے اور یہ حکم خاص شریعت کے احکام کلیہ کے تو خلاف نہیں۔ شریعت کے مقاصد کلیہ کو مقدم رکھتے اور احکام جزئیہ میں اگر بے تکلف توجیہ ممکن ہوتی تو کرتے ورنہ قواعد کلیہ کو ترجیح دیتے جو طریقہ فقہائے کرام کا ہے۔

۵۔ نقل مذاہب میں قدماء کی نقل پیش فرماتے اور ان کو متاخرین کی نقول پر مقدم رکھتے ائمہ و اجتہاد کے اصل اقوال پہلے نقل فرماتے پھر مشائخ کے اقوال ذکر فرماتے تھے۔

۶۔ مسائل خلافیہ میں تفصیل کے بعد یہ بھی بتلا دیتے کہ اس مسئلہ میں میری رائے یہ ہے گویا وہ ایک قسم کا فیصلہ ہوتا جو طلبہ کے لیے موجب طمانیت ہوتا۔

۷۔ درس بخاری میں تراجم کے حل کی طرف خاص توجہ فرماتے۔ اولاً بخاری کی غرض و مراد واضح فرماتے۔ بہت سے مواقع میں حل تراجم میں شارحین کے خلاف مراد منقح فرماتے تھے۔ ثانیاً

یہ بھی بتلاتے کہ اس ترجمۃ الباب میں امام بخاریؒ نے ائمہ اربعہ میں سے کس امام کا مذہب اختیار کیا ہے اور پوری بخاری شریف آپ سے پڑھنے کے بعد یہ واضح ہوتا کہ سوا مسائل مشہورہ کے اکثر جگہ امام بخاریؒ نے امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کی موافقت کی ہے۔

۸- حافظ ابن حجر عسقلانیؒ چونکہ امام شافعیؒ کے مقلد ہیں۔ اس لیے امام شافعیؒ کی تائید میں جا بجا امام طحاویؒ کے اقوال اور استدلال نقل کر کے اس امر کی پوری سعی کرتے ہیں کہ امام طحاویؒ کا جواب ضرور ہو جائے جیسے امام طحاوی کا جواب دیے بغیر حافظ عسقلانیؒ سمجھتے ہیں کہ میں نے حق شافعیت ادا نہیں کیا۔ درس میں حضرت شاہ صاحب کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ مسائل فقہیہ میں حافظ کا جواب دیئے بغیر نہ گزریں۔

۹- اسرار شریعت میں شیخ محی الدین بن عربی اور شیخ عبدالوہاب شعرانی کا کلام زیادہ نقل فرماتے تھے۔

۱۰- درس کی تقریر موجز و مختصر مگر نہایت جامع ہوتی تھی (جس سے ذی علم مستفید ہو سکتے تھے) ہر کس و ناکس کی سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ دیوبند تشریف لائے۔ بڑے مہتمم صاحب یعنی حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کے یہاں تھے۔ بڑے مہتمم صاحب نے فرمایا: مولانا آپ مدرسہ کے سرپرست ہیں۔ آپ ہمارے صدر مدرس کا درس تو سنیں۔ فرمایا! بہت اچھا۔ درس میں تشریف لے گئے۔ فراغت کے بعد حضرت حکیم الامت نے فرمایا کہ درس کا ہر ہر جملہ اس قدر موجز اور مختصر تھا کہ ہر جملہ کی شرح میں ایک مستقل رسالہ لکھا جا سکتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ درس کو دیکھ کر محدثین کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ جب متون حدیث پر کلام فرماتے تو یہ معلوم ہوتا کہ بخاریؒ و مسلمؒ بول رہے ہیں اور جب فقہ الحدیث پر کلام فرماتے تو محمد بن حسن شیبانیؒ معلوم ہوتے اور جب حدیث کی بلاغت پر آتے تو تفتازانیؒ اور جرجانی معلوم ہوتے اور جب شریعت کے اسرار بیان کرتے تو ابن عربیؒ اور شعرانیؒ معلوم ہوتے تھے۔

(بروایت مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم) صاحب زادہ آفتاب احمد خاں جو کسی زمانہ میں علی گڑھ کالج کی روح رواں اور غیر معمولی عنصر سمجھے جاتے تھے جن دنوں علی گڑھ اور دیوبند کے درمیان خلیج کی وسعت کم ہو رہی تھی تو صاحبزادہ مرحوم کبھی کبھی دیوبند تشریف لایا کرتے تھے۔

ایک دفعہ صحیح مسلم کے درس میں آ کر وہ بھی شریک ہوئے واپس ہو کر میں نے خود ان سے سنا کہ آج تو آکسفورڈ اور کیمبرج کے لکچر ہال کا منظر میرے سامنے آ گیا تھا۔ یورپ کی ان یونیورسٹیوں میں پروفیسروں کو جیسے پڑھاتے ہوئے میں نے دیکھا۔ آج ہندوستان میں میری آنکھوں نے اسی تماشے کو دیکھا۔

علامہ سید رشید رضا مرحوم مدیر المنار جانشین مفتی محمد عبدہ ومصر، کا شاہ صاحب کے متعلق مختصر تاثر پیچھے گزر چکا ہے ان کی دیوبند آمد۔ دارالعلوم کا معائنہ اور حضرت شاہ صاحب کی تقریر کا مفصل واقعہ حضرت مولانا محمد صاحب انوری خلیفہ حضرت رائے پوری قدس سرہ کی زبانی سنئے وہ تحریر فرماتے ہیں۔

۱۳۳۰ء میں علامہ رشید رضا مصری مدیر المنار و صاحب تفسیر مشہور بتقریب صدارت اجلاس دارالعلوم ندوۃ لکھنؤ ہندوستان تشریف لائے تو دارالعلوم دیوبند کی دعوت پر یہاں بھی تشریف لائے۔ ان کے لیے خیر مقدم کا ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا۔ اس وقت حضرت شیخ الہندؒ بھی موجود تھے۔ اتفاقاً علامہ رشید نے جلسہ سے قبل کسی استاذ دارالعلوم سے دریافت کیا کہ یہاں درس حدیث کا طرز کیا ہے؟ تو بتلایا کہ پہلے قاری حدیث پڑھتا ہے اور استاد اس حدیث سے متعلق تمام مباحث علمیہ اور حقائق و نکات بیان کرتا ہے۔ پھر اگر حدیث احکام سے متعلق ہوتی ہے تو استاد متبوعین کے دلائل بھی بیان کرتا ہے اور امام اعظمؒ کا مذہب بظاہر حدیث کے مخالف ہوتا ہے تو استاد توفیق، تطبیق یا ترجیح راجح کے اصول پر تقریر کرتا ہے۔ (یعنی امام اعظمؒ کا مسلک جن دوسری احادیث سے مستند ہوتا ہے، ان احادیث کو بطور دلائل پیش کرتا ہے) اور حنفی مسلک کو موید و مدلل کرتا ہے۔ یہ بات علامہ کو بہت عجیب معلوم ہوئی۔ کہنے لگے کہ کیا ہر حدیث میں ایسا ہوتا ہے؟ کہا۔ ہاں، اس پر علامہ نے کہا: کیا حدیث حنفی ہے؟

یہ بات تو اسی طرح یہاں ختم ہو گئی اور جلسہ کی شرکت کے لیے حضرت شاہ صاحب تشریف لا رہے تھے کہ راستہ ہی میں علامہ کی اس گفتگو کا حال سنا، حضرت شاہ صاحب کا ارادہ علامہ کو خوش آمدید کہنے اور دارالعلوم کی تاریخ و دیگر عام امور پر تقریر فرمانے کا تھا۔ مگر اس گفتگو کا حال سن کر ارادہ بدل گیا اور اتنے ہی قلیل وقفہ میں کہ جلسے میں پہنچے اور کچھ دیر بیٹھے۔ دارالعلوم کے اسی مذکورہ بالا طرز درس حدیث پر مضمون ذہن میں مرتب فرما لیا اور پھر وہ مشہور و معروف خالص

محققانہ محدثانہ تقریر نہایت فصیح وبلیغ عربی میں فرمائی کہ اس کو سن کر علامہ اور تمام شرکاء اجلاس علماء و طلباء حیران رہ گئے۔

اس تقریر میں آپ نے فقہاء محدثین کے اصول استنباط تحقیق مناط، تنقیح مناط، تخریج مناط کی وضاحت وتشریح احادیث واحکام سے فرما کر حضرت شاہ ولی اللہؒ سے لے کر اپنے اساتذہ دارالعلوم تک کے مناقب اور طرز وطریق خدمت علم ودین پر روشنی ڈالی۔ علامہ آپ کی فصاحت تقریر اور سلاست بیان وقوت دلائل سے نہایت متاثر تھے۔ ایک دفعہ سوال کیا کہ اے حضرت الاستاد! آپ حدیث قلتین کے بارے میں کیا فرماتے ہیں۔ ایک بار کہا۔ حضرت الاستاد آپ مسئلہ قرآۃ خلف الامام میں کیا فرماتے ہیں؟ اسی طرح بہت سے مسائل کو بے تکلف سوال میں لائے اور حضرت شاہ صاحب بھی نہایت انبساط وشرح صدر کے ساتھ کافی وشافی جواب دیتے رہے۔ مولانا مناظر حسن گیلانی کی روایت سے پیچھے گزر چکا ہے کہ علامہ بار بار کرسی سے اٹھتے تھے اور کہتے تھے۔

واللہ ما رأیت مثل ھذا الرجل قط۔ خدا کی قسم! میں نے اس جیسا آدمی ہرگز نہیں دیکھا

حضرت شاہ صاحب کی تقریر مذکور کے بعد علامہ موصوف نے تقریر فرمائی اور اس میں حضرت شاہ صاحب کے غیر معمولی علم وفضل تبحر، وسعت مطالعہ اور بے نظیر استحضار وحافظہ کی داد دی۔ نیز اعتراف کیا کہ جو طریقہ آپ کے یہاں درس حدیث کا ہے۔ یہی سب سے اعلیٰ وافضل و انفع طریقہ ہے اور فرمایا کہ اگر میں ہندوستان آکر اس جامعہ علمیہ کو نہ دیکھتا اور اس کے اساتذہ و علمائے اعلام سے نہ ملتا تو یہاں سے غمگین واپس جاتا۔ پھر مصر جا کر یہ سب حالات اپنے ''رسالہ'' المنار'' میں شائع کیے اور اس میں یہ بھی اضافہ کیا کہ "میں نے ازہرالہند دیوبند میں وہ نہضت دینیہ علمیہ جدیدہ دیکھی ہے جس سے نفع عظیم کی توقع ہے۔ مدرسہ دیوبند دیکھ کر جس قدر میرے دل کو مسرت بے پایاں حاصل ہوئی وہ کسی اور چیز سے نہیں ہوئی۔''

مجھ سے بہت سے لوگوں نے دارالعلوم دیوبند کے فضائل و مآثر بیان کیے تھے اور کچھ لوگوں نے علماء دیوبند پر جمود وتعصب کا بھی نقد کیا تھا۔ مگر میں نے ان کو اس ثناء نقد سے بہت بلند پایا اور میں نے حضرت شاہ صاحب جیسا جلیل القدر کوئی عالم نہیں دیکھا"۔ وللہ الحمد

حضرت شاہ صاحب کی تقریر اور علامہ سید رشید رضا کی تقریر و بیانات دارالعلوم میں

موجود ہیں۔ فاضل محترم حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری دام فیضہم نے کافی حصہ "نفحة العنبر من هدی الشیخ الانور" میں نقل فرمادیا ہے کہ یہاں اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں۔

فقہ حنفی اور حضرت شاہ صاحبؒ:

حضرت مولانا منظور نعمانی کا بیان ہے کہ جس سال ہم نے حضرت شاہ صاحب سے دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث پڑھا تھا یہ سال حضرت کا دارالعلوم میں آخری سال تھا ایک روز بعد عصر طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ہم نے اپنی زندگی کے پورے تیس سال اس مقصد کے لئے صرف کئے کہ فقہ حنفی کے موافق حدیث ہونے کے بارے میں اطمینان حاصل کیا جائے الحمد اللہ اپنی اس تیس سالہ محنت اور تحقیق کے بعد اس بارے میں مطمئن ہوں کہ فقہ حنفی حدیث کے مخالف نہیں ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جس مسئلہ میں مخالفین احناف جس درجہ کی حدیث سے استناد کرتے ہیں کم از کم اسی درجہ کی حدیث اس مسئلہ کے متعلق حنفی مسلک کی تائید میں ضرور موجود ہے اور جس مسئلہ میں حنفیہ کے پاس حدیث نہیں ہے اور اس لئے اجتہاد پر اس کی بنیاد رکھتے ہیں۔ وہاں دوسروں کے پاس بھی حدیث نہیں ہے۔

فقہ میں آپ کا ایک خاص اصول:

مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہٗ ہی رقمطراز ہیں کہ ایک موقع پر فرمایا۔ اکثر مسائل میں فقہ حنفی میں کئی کئی اقوال ہیں اور مرجحین واصحاب فتاوی مختلف وجوہ واسباب کی بناء پر ان میں سے کسی ایک قول کو اختیار کرتے اور ترجیح دیتے ہیں میں اس قول کو زیادہ وزنی اور قابل ترجیح سمجھتا ہوں جو ازروئے دلائل زیادہ قوی ہو یا جس کے اختیار کرنے میں دوسرے مجتہدین کا اتفاق زیادہ حاصل ہو جاتا ہو/ پھر فرمایا کہ ''میرا اپنا پسندیدہ اصول تو یہی ہے لیکن دوسرے اہل فتاوی جو اپنے اصول پر فتوی دیتے ہیں ان کی بھی تصدیق اس لحاظ سے کردیتا ہوں کہ ازروئے فقہ حنفی وہ جواب بھی صحیح ہیں۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک خاص ذہن یہ تھا کہ اگر کسی مسئلہ میں فقہاء کی مختلف آرا ہوں تو اس پہلو یا مسئلہ کو ترجیح دی جائے جس میں امت کو آسانی اور سہولت ہو اور اس ذہن کی تائید قرآن پاک واحادیث نبوی سے ہوتی ہو/ یہ بات مولانا منظور نعمانی نے ۱۹۶۲ء میں سفر حج کے موقعہ پر منیٰ میں احقر کے ایک مسئلہ کے پوچھنے کے دوران بتائی۔

بقول حضرت مولانا قاری طیب صاحب حضرت شاہ صاحب کے درس حدیث میں

محدثانہ رنگ غالب ہوتا تھا اور حدیث کو فقہ حنفی کے مؤید کی حیثیت سے نہیں بلکہ اس کے منشاء کی حیثیت سے پیش کیا جاتا تھا اور ہاتھ در ہاتھ اس کے دلائل وشواہد سے اس دعویٰ کو مضبوط کیا جاتا تھا/ متون حدیث کی معتمد کتابوں کا ڈھیر آپ کے سامنے ہوتا تھا اور تفسیر الحدیث بالحدیث کے اصول پر کسی حدیث کے مفہوم کے بارہ میں آپ جو دعویٰ کرتے اسے دوسری حدیث سے موید اور مضبوط کرنے کے لئے درس ہی میں کتب پر کتب کھول کر دکھاتے جاتے تھے اور جب ایک حدیث کا دوسری احادیث کی واضح تفسیر سے مفہوم متعین ہو جاتا تھا تو نتیجتاً وہی فقہ حنفی کا مسئلہ نکلتا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ حدیث فقہ حنفی کو پیدا کر رہی ہے/ یہ نہیں تھا کہ فقہ حنفی کی تائید میں خواہ مخواہ احادیث کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جا رہا ہے یعنی گویا اصل تو مذہب حنفی ہو جسے مویدات کے طور پر روایات حدیث سے مضبوط بنانے کی کوشش کی جا رہی ہو/ نہیں بلکہ یہ کہ اصل حدیث ہے لیکن جب بھی اس کے مفہوم کو اس کے فحوی اور سیاق وسباق نیز دوسری احادیث باب کی تائید و مدد سے اسے مشخص کر دیا جائے تو اس میں سے فقہ حنفی نکلتا ہوا محسوس ہونے لگتا ہے، اس لئے طلبائے حدیث حضرت ممدوح کے درس سے یہ ذوق لے کر اٹھتے تھے کہ ہم فقہ حنفی پر عمل کرتے ہوئے حقیقتاً حدیث پر عمل کر رہے ہیں اور حدیث کا جو مفہوم ابوحنیفہ نے سمجھا ہے وہی درحقیقت شارع علیہ السلام کا منشاء ہے جس کو روایت حدیث ادا کر رہی ہے بلکہ یہ سمجھ میں آتا تھا کہ اس روایت حدیث سے امام ابوحنیفہؒ اپنا کوئی مفہوم پیش نہیں کرتے بلکہ صرف پیغمبر علیہ السلام کا مفہوم پیش کر رہے ہیں اور خود اس حدیث میں محض ایک جویا اور ناقل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک لطیفہ یاد آیا جو اس مقام کے مناسب حال ہے اور وہ یہ کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ ایک بار ایک مناظرہ میں جو حضرت ممدوح اور ایک اہل حدیث کے مابین ہوا، اہل حدیث عالم نے پوچھا۔ کیا آپ ابوحنیفہ کے مقلد ہیں؟ فرمایا نہیں۔ میں خود مجتہد ہوں اور اپنی تحقیق پر عمل کرتا ہوں اس نے کہا کہ آپ تو ہر مسئلہ میں فقہ حنفی کی ہی تائید کر رہے ہیں پھر مجتہد کیسے؟ فرمایا یہ حسن اتفاق ہے کہ میرا ہر اجتہاد کلیۃً ابوحنیفہ کے اجتہاد کے مطابق پڑتا ہے/ اس طرز جواب سے سمجھانا یہی منظور تھا کہ ہم فقہ حنفی کو خواہ مخواہ بنانے کے لئے حدیث کا استعمال نہیں کرتے بلکہ حدیث میں سے فقہ حنفی کو نکلتا ہوا دیکھ کر اس کا استخراج سمجھا دیتے ہیں/ اور طریق استخراج پر مطلع کر دیتے ہیں/ بہرحال اکابر دیوبند کے مذاق کے مطابق حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مقلد بھی

تھے مگر تقلید میں محقق بھی تھے وہ مسائل میں پابند فقہ حنفی بھی تھے مگر اس پابندی کو مبصرانہ تحقیق سے اختیار کئے ہوئے تھے/ جیسے مسئلہ تقدیر میں اہل سنت کا مذہب بندہ کے جبر واختیار کو جمع کر کے یہ کہنا ہے کہ وہ مختار ضرور ہے مگر مجبور فی الاختیار ہے/ اسی طرح مسائل فقہیہ میں حضرت شاہ صاحب کا رنگ یہ تھا کہ وہ مقلد ضرور ہیں مگر محقق فی التقلید نہیں اور تمام اجتہادی مسائل میں جہاں تقلید کرتے ہیں وہاں مسائل کو تمام حدیثی اور قرآنی بنیادوں کے ساتھ بھی ذہن میں رکھتے ہیں۔

ایک امریکن مصنف نے اپنی معروف کتاب ''ماڈرن ان انڈیا'' میں زیر عنوان دیوبند یوں کا اسلام اہل دیوبند کا یہی جامع اضداد طریقہ اپنے مختصر عنوان میں اسطرح ادا کیا ہے۔

حیرت ناک بات یہ ہے کہ یہ لوگ (اہل دیوبند) اپنے کو مقلد کہتے ہیں مگر ساتھ ہی ہر مسئلہ کو پورے محققانہ انداز سے کہتے ہیں اور مسائل کا تجربہ کرتے ہوئے ایسی تنقیح و تحقیق کرتے ہیں کہ اس دعوائے تقلید کے ساتھ وہ بے ساختہ مجتہد بھی نظر آنے لگتے ہیں۔ (انتہی بمعناہ)

حاصل اسکا بھی وہی ہے کہ حضرات مجتہد فی التقلید اور محقق فی الاتباع ہیں/ کورانہ تقلید یا جامد اتباع کے جال میں پھنسے ہوئے نہیں اور **لم یخر علیھا صما و عمیانا** کے سچے مصداق ہیں۔

حضرت قاری محمد طیب صاحب مدظلہ مزید تحریر فرماتے ہیں کہ:

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے درس کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ حضرت ممدوح کے علمی تبحر اور علم کے بحر ذخار ہونے کی وجہ سے درس حدیث صرف علوم حدیث ہی تک محدود نہ رہتا تھا اس میں استطر ادالطیف نسبتوں کے ساتھ ہر علم وفن کی بحث آتی تھی اگر معانی و بلاغت کی بحث آجاتی تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا علم و معانی کا یہ مسئلہ اسی حدیث کے لئے واضع نے وضع کیا تھا/ معقولات کی بحثیں آجاتیں اور معقولیوں کے کسی مسئلہ کا رد فرماتے تو اندازہ ہوتا کہ یہ حدیث گویا معقولات کے مسئلہ ہی کی تردید کے لئے قلب نبوی پر وارد ہوتی تھی۔

غرض اس نقلی اور روایتی فن (حدیث) میں نقل و عقل دونوں کی بحثیں آتیں اور ہر فن کے متعلقہ مقصد پر ایسی سیر حاصل اور محققانہ بحث ہوتی کہ علاوہ بحث حدیث کے وہ فنی مسئلہ ہی فی نفسہ اپنی پوری تحقیق کے ساتھ منقح ہو کر سامنے آجاتا تھا۔

بہر حال حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا درس حدیث محض حدیث تک محدود نہ تھا بلکہ فقہ/ تاریخ/ ادب/ کلام فلسفہ، منطق، ہیئت/ ریاضی اور سائنس وغیرہ تمام علوم جدیدہ وقدیمہ پر

مشتمل ہوتا تھااوراس لئے جامع درس کا طالب علم اس درس سے ہر علم وفن کا مذاق لے کر اٹھتا تھااو راس میں یہ استعداد پیدا ہو جاتی تھی۔ کہ وہ بضمن کلام خدا اور رسول ہر فن میں محققانہ انداز سے کلام کر جاتے اور یہ درحقیقت درس کی لائن کا ایک انقلاب تھا جو زمانہ کی رفتار دیکھ کر الاستاد الامام الکشمیری نے اختیار فرمایا، چنانچہ کبھی کبھی تحدیث بالنعمۃ کے طور پر فرمایا کرتے تھے کہ ''بھائی اس زمانے کے علمی فتنوں کے مقابلہ میں جس قدر ہو سکا ہم نے سامان جمع کر دیا ہے بالخصوص فقہ حنفی کے ماخذ ومناشی کے سلسلہ میں حدیثی ذخیرہ کافی ہی نہیں، کافی سے زائد جمع فرمادیا''۔

تائید مذہب حنفی کے اس غیر معمولی اہتمام کی توجیہہ کرتے ہوئے گاہ بہ گاہ فرماتے کہ عمر بھر ابو حنیفہ کی نمک حرامی کی ہے اب مرتے وقت جی نہیں چاہتا کہ اس پر قائم رہوں/ چنانچہ کھل کر ترجیح مذہب کے سلسلہ میں اچھوتے اور نادر روزگار علوم ومعارف اور نکات ولطائف ارشاد فرمائے/ جس سے یوں محسوس ہوتا تھا کہ من جانب اللہ آپ پر مذہب حنفی کی بنیادیں منکشف ہو گئیں تھیں اوران میں شرح صدر کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی جس کے اظہار پر گویا آپ مامور ومجبور تھے ان علوم ومعارف کے ذخیرہ کو حضرت ممدوح کے دو رشید شاگردوں مولانا محمد یوسف بنوری او رمولانا محمد بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنی کے الواح واوراق میں جمع کر کے اہل علم پر ایک نا قابل مکافاۃ احسان فرمایا ہے/ حق تعالی ان دونوں محقق فاضلوں کو جزاء خیر عطا فرمائے اور حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی روحانیت سے ان سب کی نسبت کواور زیادہ قوی فرمائے۔

عظامی مرحوم جو فارسی کے گرامی شاعر-گرامی کے شاگرد تھے انہوں نے حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اسی منقبت کے متعلق مندرجہ ذیل اشعار کہے ہیں۔

خامہ جو ید رہ باوج مہر و ماہ — شیخ ما آں مہر شد عالیمقام
ور مدیح شیخ انور مرد راہ — شیخ ما آں نائب خیر الا نام

آسماں معرفت را آفتاب — خاک دیو بند از و پر نور گشت
شیخ انور شاہ آں عالیجناب — بلکہ از نورش جہاں معمور گشت

نور چشم شیخ محمود الحسن — آسماں چست را بدر منیر

واقف اسرار ہر نو و کہن　　　مرشد ما شیخ ما روشن ضمیر

یک جہاں از حلقہ در گوشان او　　　از تصر فہائی آں عالی گہر
جان پا کاں بستہ دامان او　　　شد عزیز الدین عظامی با خبر

مولانا عظامی

حضرت ممدوح کا یہ جملہ کہ عمر بھر ابوحنیفہ کی نمک حرامی کی شاید اسطرف مشیر ہے کہ حضرت ممدوح جہاں روایات حدیث میں تطبیق وتوفیق روایات کا اصول اختیار فرمائے ہوئے تھے وہیں روایات فقیہہ میں بھی آپ کا اصول تقریباً تطبیق وتوفیق کا ہی تھا یعنی مذاہب فقہا کے اختلاف کی صورت میں حنیفہ کا وہ قول اختیار فرماتے جس سے خروج عن الخلاف ہو جائے اور دو نوں فقہا باہم جڑ جائیں۔ اگر چہ یہ قول مفتی بہ نہ ہو اور مسلک معروف کے مطابق بھی نہ ہو نظر صرف اس پر تھی کہ دو فقہی مذہبوں میں اختلاف جتنا کم سے کم رہ جائے وہی بہتر ہے/ ظاہر ہے کہ اس میں بعض مواقع پر خود امام کا قول بھی چھوٹ جاتا اور صاحبین کا قول زیر اختیار آ جاتا تھا/ یعنی فقہ حنفی کے دائرے سے تو کبھی باہر نہ جاتے تھے مگر ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بلا واسطہ قول سے کبھی کبھی باہر نکل جاتے تھے خواہ وہ بواسطہ صاحبین ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہی کا قول ہو شاید اس کو حضرت نے ابوحنیفہ کی نمک حرامی کرنے سے تعبیر فرمایا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آخر عمر میں اس توسع سے رجوع کر کے کھلے طور پر مذہب کے معروف و مفتی بہ حصے بلکہ اقوال ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اختیار و ترجیح کی طرف طبیعت آ چکی تھی اور اس کی دلیل یہ ہے کہ امام اعظم سیدنا ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی خصوصیات کے بارے میں حق تعالی نے انھیں شرح صدر عطا فرمادیا تھا اور وہ بالآخر اسی راہ پر جم کر چلنے لگے تھے جس پر ان کے شیوخ سرگرم رفتار رہ چکے تھے۔

میں نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ سنا ہے فرماتے تھے کہ جس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ متفرد ہوتے ہیں اور ائمہ ثلثہ میں سے کوئی ان کی موافقت نہیں کرتا اس میں میں ضرور بالضرور پوری قوت سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا اتباع کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ اس مسئلہ میں ضرور کوئی ایسا دقیقہ ہے جس تک امام ہی کی نظر پہنچ سکی ہے اور پھر حق تعالی اس دقیقہ کو منکشف فرمادیتا ہے یہ مقولہ امام ابوحنیفہ کے اس مسلک کے ذیل میں فرمایا کہ قضاء قاضی ظاہراً و باطناً نافذ ہو جاتی

ہے/فرمایا کہ اس مسئلہ میں میں ضرور بالضرور ابوحنیفہ کی پیروی کرونگا/ کیوں کہ اس میں صرف امام ہی متفرد ہیں اور یہ تفرد اس کی دلیل ہے کہ اس مسئلہ میں کوئی ایسی دقیق بنیاد ان پر منکشف ہوئی ہے جہاں تک دوسروں کی نگاہیں نہیں پہنچ سکی ہیں۔

اس قسم کا مضمون حضرت نانوتوی قدس سرہ کے بارے میں میں نے حاجی امیر شاہ خان صاحب سے سنا کہ حضرت مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی (اہلحدیث) سے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ میں ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مقلد ہوں/ صاحب ہدایہ اور در مختار کا مقلد نہیں ہوں/ اس لئے میرے مقابلے میں بطور معارضہ جو قول بھی آپ پیش کریں وہ ابوحنیفہ کا ہونا چاہئے دوسروں کے اقوال کا میں جواب دہ نہیں ہوں گا/ اس سے بھی یہی نکتہ نکلتا ہے کہ فقہ حنفی میں اصل بنیادی قول ان حضرات کے نزدیک خود امام کا ہوتا تھا اور وہی درحقیقت فقہ حنفی کی اساس ہونے کا حق بھی رکھتا تھا۔

پس ممکن ہے کہ حضرت شاہ صاحب قدس سرہ پر آخری عمر میں یہی نکتہ منکشف ہوا تھا اور اس کے خلاف توسیع کو وہ ابوحنیفہ سے نمک حرامی کرنے کی تعبیر سے اس مقصد کو ظاہر فرمارہے ہیں۔

اس کے ساتھ درس حدیث کے سلسلہ میں مذاہب اربعہ کے خلاف بیان کرتے ہوئے کبھی کبھی مناظرانہ صورت حال پیدا ہو جاتی تھی ان مناظرانہ مباحث اور فروعیاتی اختلافات سے کتاب وسنت کے ہزارہا پوشیدہ علوم واشگاف ہوتے تھے جو اس اختلاف کے بغیر حاصل ہونا ممکن نہ تھے اور پھر ان فرعیات کا تزاحم اور تزاحم کے بعد قول فیصل حضرت ممدوح کے قلب ولسان سے ظاہر ہوتا تو ظرف کی خصوصیات لگ جانے سے عجیب وغریب اور نئے نئے علوم پیدا ہوتے پھر ان تزاحمات میں محاکمہ اور ترجیح کے سلسلہ میں جو تنقیحات بیان ہوئیں وہ خود مستقل علوم ومعارف کا ذخیرہ ہوتی تھیں۔

بعض مواقع پر مثلاً حافظ ابن تیمیہ اور ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کے تفردات کا ذکر آتا تو پہلے ان کے علم وفضل اور تفقہ تبحر کو سراہتے ان کی عظمت وشان بیان فرماتے اور پھر انکے کلام پر بحث ونظر سے تنقید فرماتے جس میں عجیب رنگ برنگ کیفیات جمع ہوتی تھیں/ ایک طرف ادب وعظمت اور دوسری طرف رد وقدح یعنی بے ادبی اور جسارت کے ادنی سے ادنی اشائبہ سے بھی بچتے اور راجح اور صواب میں کتمان صواب سے بھی دور رہتے کبھی کبھی علمی جوش میں آکر برنگ

مزاح بھی ردوقدح فرماتے تھے جو بجائے خود ہی ایک مستقل علمی لطیفہ ہوتا تھا۔ (ماخوذ از الانور قلدی محمد طیب صاحب)

زہدوتقوی اور تصوف وسلوک:

علمی اشغال میں غیر معمولی انہاک اور شغف کے باوجود عمل بالکتاب والسنۃ اور اتباع سلف کے اہتمام میں ذرہ بھر کمی اور کوتاہی نہیں ہوتی تھی ملنے والے بہت سی سنتوں کو حضرت شاہ صاحب کے عمل کو دیکھ کر معلوم کرلیا کرتے تھے/ سنت نبوی علیہ التحیۃ والسلام کے مطابق کھانا اکڑ وں بیٹھ کر کھاتے تھے اور کھانے میں ہمیشہ تین انگلیاں استعمال کرتے تھے اور دونوں ہاتھ مشغول رکھتے تھے بائیں ہاتھ میں روٹی اور داہنے ہاتھ سے اسے توڑتوڑ کر استعمال کرتے تھے۔ لقمے ہمیشہ چھوٹے چھوٹے استعمال کرتے تھے زہدوتقوی حضرت ممدوح کے روشن اور کھلے ہوئے چہرے پر برستا تھا، ایک غیر مسلم شخص نے کسی موقع پر حضرت ممدوح کا سرخ وسفید رنگ کشادہ پیشانی اور ہنس مکھ چہرہ نیز چہرہ کی مجموعی وجاہت وعظمت دیکھ کر کہا تھا کہ اسلام کے حق ہونے کی ایک مستقل دلیل یہ چہرہ بھی ہے جمعہ کے لئے جاتے تو فا سعو الی ذکر اللہ کا منظر سب کونظر آتا حسبنا اللہ تکیہ کلام تھا اٹھتے بیٹھتے اکثر وبیشتر حسبنا اللہ فرماتے اور ایسے ہی موقعہ بموقعہ اللہ اجل فرماتے رہتے تھے درس میں بعض اوقات غایت خشیت سے آنکھوں میں نمی آجاتی جسے ضبط کرنے کی کوشش کرتے تھے انشاء وقصائد اور وعظ میں خوف وخشیت کے اشعار اکثر تر آنکھوں کے ساتھ پڑھتے جس سے چہرہ مظہر خشیت الٰہی نظر آتا تھا اور سامعین کی آنکھیں تر ہوجاتی تھیں ٹھیک طریقہ نبوی کے مطابق کن انکھیوں سے دیکھتے اور جدھر متوجہ ہوتے پورے متوجہ ہوتے تھے۔

ادب علم کا یہ عالم تھا کہ خود ہی فرمایا کہ میں کتاب کو مطالعہ کے وقت اپنا تابع کبھی نہیں کرتا بلکہ ہمیشہ خود کتاب کے تابع ہوکر مطالعہ کرتا ہوں مطلب یہ کہ اگر کسی کتاب پر حاشیہ ٹیڑھا تر چھا ہے تو بجائے اس کے کہ کتاب کو حاشیہ کے مطابق پھیرلیں/ کتاب کو بغیر ہلائے آپ اس طرف گھوم جاتے تھے چنانچہ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ لیٹ کر مطالعہ کرتے ہوں/ یا کتاب پر کہنی ٹیک کر مطالعہ میں مشغول ہوں، بلکہ کتاب کو سامنے رکھ کر مودب انداز سے بیٹھتے گویا کسی شیخ کے آگے بیٹھے/ ہوئے استفادہ کررہے ہیں/ گویا مشہور مقولہ کے مطابق کہ علم اپنا بعض بھی کسی کو نہیں دیتا جب تک اپنا کل اس کے حوالہ نہ کردیا جائے، ایک دفعہ فرمایا کہ ''میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد

سے اب تک دینیات کی کسی کتاب کا مطالعہ بے وضونہیں کیا سبحان اللہ کہنے کوتو یہ بات چھوٹی سی نظر آتی ہے لیکن اس پر استقامت اور دوام ہر ایک کے بس کی بات نہیں یہ وہی کر سکتا ہے جسے حق تعالی نے ایسے کاموں کے لئے موفق ومیسر کر دیا ہے اور وہ گویا بنایا ہی اس لئے گیا ہے کہ اس سے دینی آداب کے عملی نمونے پیش کرائے جائیں کل میسر لماخلق له۔

ہر کسے را بہر کارے ساختند
میل او را دردلش انداختند

ادب شیوخ واکابر کا یہ عالم تھا کہ انکے سامنے کبھی آنکھ اٹھا کر یا آنکھ ملا کر گفتگو نہ فرماتے حضرت شاہ صاحب اپنے باطنی کمالات کو ہمیشہ چھپائے رکھتے تھے اور یہ بھی بات ہے کہ علمی کمالات حضرت کے ساتھ ایسے خیرہ کن تھے اور علم کا حضرت پر ایسا غلبہ تھا کہ مجسمہ علم معلوم ہوتے لیکن بفحوائے قرآن پاک انما یخشی الله من عباده العلماء۔

آپ صحیح معنوں میں خدا ترس انسان تھے لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا کہ علمی کمال کا آپ پر اتنا غلبہ تھا کہ دوسرے تمام کمالات اور زندگی کے دوسرے پہلو اس کے نیچے بالکل دبے ہوئے تھے/ چنانچہ آپ کی زندگی کا وہ بلند ترین پہلو بھی جس کو سلوک وتصوف سے تعبیر کرنا چاہئے اس علمی کمال اور شغف علمی سے دبا ہوا تھا مگر اللہ تعالی نے آپ کو اس دولت سے بھی حصہ وافر عطا فرمایا تھا اور آپ یقیناً آراستہ باطن اصحاب احسان میں سے تھے/ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے مجاز تھے لیکن اس لائن کی باتیں کرنے کی عادت نہ تھی ایک دفعہ واقعہ سنایا اور اس سلسلہ میں جو کچھ جوش آ گیا تو ایک آدھ بات کا پتہ چل گیا فرمایا کہ:

> ایک دفعہ میں کشمیر سے یہاں کے لئے چلا راستہ کی کافی مسافت گھوڑے پر سوار ہو کر طے کرنا پڑتی تھی/ راستہ میں ایک صاحب کا ساتھ ہو گیا یہ پنجاب کے ایک مشہور پیر صاحب کے مرید تھے/ یہ مجھ سے اپنے پیر کے کمالات وکرامات کا تذکرہ کرتے رہے ان کی خواہش اور ترغیب یہ تھی کہ میں بھی ان پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوں اور اتفاق سے وہ مقام میرے راستہ میں بھی پڑتا تھا میں نے بھی ارادہ کر لیا جب ہم دونوں پیر صاحب کی خانقاہ پر پہنچے تو ان صاحب نے کہا کہ نئے آدمیوں کو اندر حاضر ہونے کے لئے اجازت کی ضرورت ہوتی

ہے چنانچہ وہ اندر تشریف لے گئے ان بزرگ نے اطلاع پا کر خود اپنے
صاحبزادے کو مجھے لینے کے لئے بھیجا اور اکرام سے پیش آئے خود ایک تخت پر
بیٹھے ہوئے تھے باقی سب مریدین وطالبین نیچے فرش پر تھے مگر مجھے اصرار سے
اپنے ساتھ تخت پر بٹھایا کچھ باتیں ہوئیں اس کے بعد اپنے مریدین کی طرف
متوجہ ہوئے اور اپنے طریقہ پر ان پر توجہ ڈالنی شروع کی اور اس کے اثر سے وہ
بے ہوش ہو ہو کر لوٹنے اور تڑپنے لگے/ میں یہ سب دیکھتا رہا پھر میں نے کہا میرا
جی چاہتا ہے کہ اگر مجھ پر بھی یہ حالت طاری ہو سکے تو مجھ پر بھی توجہ فرمائیں
انھوں نے توجہ دینا شروع کی اور میں اللہ تعالی کے ایک اسم پاک کا مراقبہ کر کے
بیٹھ گیا بے چاروں نے بہت زور لگایا اور بہت محنت کی لیکن مجھ پر کچھ اثر نہ ہوا
کچھ دیر بعد انھوں نے خود ہی فرمایا کہ آپ پر اثر نہیں پڑ سکتا۔

حضرت نے یہ واقعہ اتنا ہی نقل فرمایا اور اس کے بعد ایک غیر معمولی جوش کے ساتھ فرمایا:۔

''کچھ نہیں ہے لوگوں کو متاثر کرنے کے لئے ایک کرشمہ ہے اور کچھ مشکل بھی
نہیں معمولی مشق سے ہر ایک کو حاصل ہو سکتا ہے ان باتوں کا خدا رسیدگی سے
کوئی تعلق نہیں''

پھر اسی سلسلہ میں اور اسی جوش کی حالت میں فرمایا:
اگر کوئی چاہے اور استعداد ہو تو انشاء اللہ تین دن میں یہ کیفیت پیدا ہو سکتی ہے کہ قلب
سے اللہ اللہ کی آواز سنائی دینے لگے لیکن یہ بھی کچھ نہیں اصل چیز تو بس احسانی کیفیت اور شریعت
وسنت پر استقامت ہے۔

حضرت علامہ اپنی اس جلالت قدر اور رفع منزلت کے باوجود اکابر دیوبند کے متعلق کیا
خیال رکھتے تھے اس کو بھی ملاحظہ فرمائیے ایک دفعہ فرمایا:۔

''ہم یہاں آئے (یعنی کشمیر سے ہندوستان) تو دین حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ
علیہ کے یہاں دیکھا اس کے بعد حضرت استاذ یعنی شیخ الہند اور حضرت رائپوری
(یعنی حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ) کے یہاں دیکھا اور اب جو
دیکھنا چاہے تو وہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب کے یہاں جا کر دیکھے''

اندازہ کیجئے جن حضرات کی تعریف وتوصیف انور شاہ جیسے محدث وفقیہہ کی زبان سے ہو رہی ہو انکا مقام کتنا بلند ہوگا اس کا مجھ جیسے لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے/ حضرت گنگوہی/ حضرت شیخ الہند/ مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر اسی کتاب میں اپنے اپنے مقام پر آرہا ہے/ حضرت رائپوری علیہ الرحمہ حضرت شیخ عبدالقادر کے پیر ومرشد تھے/ انکا ذکر شیخ عبدالقادرؒ کے حالات میں ملاحظہ فرمائیے گا۔

حضرت شیخ عبدالقادر رائے پوری فرماتے تھے کہ کچھ دنوں میں نے بھی حضرت شاہ صاحبؒ سے پڑھا ہے میں ایک دفعہ سنہری مسجد مدرسہ امینیہ میں گیا تو دیکھا کہ حضرت شاہ صاحب ایک حجرے میں دروازہ بند کئے ذکر دوضربی جہر کے ساتھ کر رہے ہیں اللہ اللہ اللہ دیر تک اسم ذات کرتے رہے اس وقت عمر اکیس بائیس سال کی ہوگی نیز فرمایا جب حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بازار نکلتے تو سر پر رومال ڈال کر آنکھوں کے سامنے پردہ کر کے نکلتے مبادا کسی عورت پر نظر پڑ جائے۔

عارف باللہ حضرت میاں شیر محمد صاحب شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ نے جب حضرت شاہ صاحب کا نام اور شہرت سنی۔ دعا فرمایا کرتے کہ زندگی میں شاہ صاحب کی زیارت ہو جائے۔ ایک دفعہ لاہور حضرت کی تشریف آوری کی خبر سن لی۔ کار بھیج کر دعوت دی۔ حضرت نے پہلے تو انکار کر دیا لیکن مولانا احمد علیؒ کے اصرار پر منظور فرما لیا۔ شرق پور پہونچے اور اپنے قدوم میمنت لزوم سے شرق پور کو مشرف فرمایا۔ حضرت میاں صاحب بہت ہی ممنون ہوئے۔ حضرت کے سامنے دونوں زانو ہو کر بیٹھے اور کہا کہ آپ نائب رسول ہیں میرا جی چاہتا ہے کہ جناب کے چہرہ مبارک پر انوار کو دیکھتا ہی رہوں۔ گفتگو فرماتے رہے اور حضرت شاہ صاحب خاموش سنتے رہے کہیں کہیں کچھ ارشاد فرماتے رہے۔ میاں صاحب علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ مجھے نجات کی انشاء اللہ توقع ہوگئی ہے۔ حضرت واپس ہونے لگے تو برہنہ پا پختہ سڑک تک ساتھ مشایعت کے لئے تشریف لائے۔ موٹر چلنے لگی تو پچھلے پاؤں واپس ہوئے فرمانے لگے کہ:

"دیو بند میں چار نوری وجود ہیں۔ ایک ان میں سے حضرت شاہ صاحب بھی ہیں۔"

دیو بند میں شاہ صاحب سے کسی نے پوچھا کہ آپ شرق پور گئے تھے۔ میاں صاحب کو کیسے پایا، فرمایا: میاں صاحب عارف ہیں اور صحیح معنی میں عارف ہیں ("حیات انور" بروایت

مولانا محمد انوری) مولانا محمد انوری رقمطراز ہیں:
بہاول پور شہر میں جامع مسجد ودیگر مقامات پر قادیانیت کے خلاف تقریر کرنے کے لئے علماء کو بھیجتے رہتے تھے۔ دو دفعہ احقر کو بھی بھیجا۔ ان ایام میں اس قدر حضرت رحمہ اللہ کے چہرہ مبارکہ پر انوار کی بارش ہوتی رہتی تھی۔ ہر شخص اس کو محسوس کرتا تھا۔ احقر نے بارہا دیکھا کہ اندھیرے کمرے میں مراقبہ فرما رہے ہیں۔ لیکن روشنی ایسی جیسے بجلی کے قمقمے روشن ہوں حالاں کہ اس وقت بجلی گل ہوتی تھی۔ بہاول پور جامع مسجد میں جمعہ کی نماز حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ پڑھا یا کرتے تھے۔ بعد نماز کچھ بیان بھی ہوتا تھا۔ ہزاروں ہزار کا مجمع رہتا تھا۔ پہلے جمعہ میں فرمایا کہ:
''حضرات میں نے ڈابھیل جانے کے لئے سامان سفر باندھ لیا تھا کہ یکا یک مولانا غلام محمد شیخ الجامعہ کا خط دیوبند موصول ہوا کہ شہادت دینے کے لئے بہاول پور آیئے/ چنانچہ اس عاجز نے ڈابھیل کا سفر ملتوی کیا۔ اور بہاول پور کا سفر کیا یہ خیال کیا کہ ہمارا نامہ ءاعمال تو سیاہ ہے ہی شاید یہی بات میری نجات کا باعث بن جائے کہ محمد ﷺ کا جانب دار ہو کر بہاول پور میں آیا تھا۔
بس اس فرمانے پر تمام مسجد میں چیخ و پکار پڑھ گئی/ لوگ دھاڑیں مار مار کر اور پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے خود حضرت پر ایک عجیب کیفیت وجد طاری تھی۔ ایک مولوی صاحب نے اختتام وعظ پر فرمایا۔ کہ حضرت شاہ صاحب کی شان ایسی اور آپ ایسے بزرگ ہیں وغیرہ/ حضرت فوراً کھڑے ہو گئے اور فرمایا/
حضرات! ان صاحب نے غلط کہا ہے، ہم ایسے نہیں ہیں۔ بلکہ ہمیں تو یہ بات یقین کے درجے کو پہونچ گئی ہے کہ ہم سے گلی کا کتا بھی اچھا ہے۔ ہم اس سے گئے گزرے ہیں۔ یعنی وہ اپنے گلی اور محلے کا حق نمک خوب ادا کرتا ہے۔ مگر ہمارے ہوتے لوگ ناموس پیغمبر پر حملہ کرتے ہیں۔
سبحان اللہ! انکسار اور تواضع کی حد ہوگئی۔ حضرت مولانا انوری مدظلہ فرماتے ہیں کہ:
اُسی سفر کے دوران لاہور میں دو روز قیام فرمایا تھا۔ آسٹریلین بلڈنگ کی مسجد میں بعد نماز فجر وعظ فرمایا۔ علماء فضلاء بالخصوص ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم اور انکے ساتھی اہتمام سے حاضر ہوتے تھے۔ بیان ہوتا تھا۔ حضرت نے خطبہ شروع فرمایا وعظ کرسی پر بیٹھ کر فرما رہے تھے۔ احقر کے دل میں وسوسہ گزرا کے مسجد میں تو شاید کرسی بچھانا سوئے ادب ہو/ حضرت نے فورا خطبہ بند کر دیا۔ فرمایا کہ مسجد میں کرسی بچھانا نبی ﷺ سے ثابت ہے/ چنانچہ مسلم شریف میں روایت ہے کہ سائل کا

جواب دینے کے لئے حضور ﷺ کے لئے مدینہ کے بازار سے کرسی لائی گئی۔راوی کہتا کہ اس کرسی کے پائے سیاہ تھے غالباً لوہے کے تھے۔مصلے کے قریب رکھی گئی حضور نبی کریم ﷺ نے اس پر بیٹھ کر جوابات دیئے یہ فرمایا اور پھر خطبہ شروع فرمادیا احقر ندامت سے پسینہ پسینہ ہوگیا۔

رسول اللہ ﷺ کے جو اخلاق وشمائل سب حدیث میں روایت کئے گئے ہیں انمیں ایک عادت مبارکہ یہ بھی نقل کی گئی کہ آپ بہت زیادہ خاموش رہتے تھے (گویا بلاضرورت بولتے ہی نہ تھے) حدیث کے الفاظ ہیں۔کان رسول اللہ ﷺ طویل الصمت حضرت شاہ صاحب اس عادت مبارکہ کے کامل نمونہ تھے۔معلوم ہوتا تھا کہ انکو صرف علمی اور دینی استفادہ وافادہ کے لئے اور ناگزیر ضروری باتوں ہی کے لئے زبان دی گئی ہے۔

اور اس خاموشی میں تنفس کی منضبط کیفیت اور ایک خاص نوعیت سے محسوس کرنے والے محسوس کر لیتے تھے کہ پاس انفاس کے شغل میں برابر مشغول ہیں (صوفیہ کے اشغال میں سے صرف پاس انفاس کے متعلق آپ کا خیال تھا کہ اس کی اصل حدیث وسنت سے کچھ معلوم ہوتی ہے اس لیے خود اپنا شغل بھی تھا اور رجوع کرنے والے نیاز مندوں کو تلقین بھی فرماتے تھے) اسی طرح حضور ﷺ کی عادات مبارکہ میں صحابہ کرامؓ ذکر فرماتے ہیں کہ:

''مسکرانے کی تو بہت زیادہ عادت تھی مگر کھلکھلا کر ہنستے ہوئے کبھی نہیں دیکھا'' یہی حال حضرت شاہ صاحب کا تھا۔

اس زمانہ میں غیبت کی بیماری کس قدر عام اور متعدی ہوگئی ہے اور اس سے اس کے اڑتے ہوئے جراثیم سے محفوظ رہنا مشکل ہوگیا ہے اس کا اندازہ بہت سے حضرات کو شاید نہ ہوا اور بہت کم لوگ ہیں جو اس سے بچتے ہوں اور اس دور میں جو بندہ غیبت سے محفوظ ہو وہ اللہ کی خاص حفاظت میں ہے اور یہ اس کی بڑی کرامت ہے مگر حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کو اللہ تعالی نے ایسا محفوظ فرمایا تھا کہ کبھی اشارۃً یا کنایۃً بھی غیبت کی کسی قسم کی کوئی بات کبھی کسی نے ان سے نہیں سنی بلکہ ایسا تھا کہ اگر حضرت کے سامنے کسی نے غیبت کی کوئی بات کی تو حضرت نے فوراً روک دیا اگر کوئی شخص کوئی مسئلہ دریافت کرنے آتا تو اس کا جواب دیتے اور اس کے بعد اگر وہ بیٹھتا اور باتیں کرتا تو یہ فرماتے جاؤ بھائی آرام کرو آرام بہت اچھی چیز ہے یعنی مالا یعنی سے احتراز میں دنیا اور آخرت دونوں کی راحت ہے/ براویت حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی۔

نور تقوی کا یہ عالم تھا کہ جو شخص بھی دیکھتا وہ اول نظر میں یقین کر لیتا کہ یہ خدا کا کوئی نیک بندہ ہے حق یہ ہے کہ نور تقوی اجلی بدیہیات میں سے ہے مگر حقیقت کی تنقیح بہت دشوار ہے او ر درجہ اتصاف کی دشواری کو تو پوچھو ہی مت **وانہا لکبیرة الا علی الخاشعین الذین یظنون انہم ملقوا ربہم وانہم الیہ راجعون**. شاہ صاحب اگر کسی مجلس میں تشریف فرما ہوتے اور باہر سے کوئی اجنبی مجلس میں داخل ہوتا تو یہ دیکھتے ہی سمجھ لیتا تھا کہ اس مجلس میں سب سے بڑا عالم اور متقی یہی شخص ہے۔

مرد حقانی کی پیشانی کا نور !

کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور !

یہ ناچیز (مولانا محمد ادریس کاندھلوی) جب بھی حضرت شاہ صاحب کو دیکھتا تو یہ شعر زبان پر آتا۔

المسلمون بخیر ما بقیت لھم ولیس بعدک خیر حین تفتقد

''جب تک آپ زندہ ہیں اس وقت تک مسلمان خیر و برکت میں ہیں اور تیرے گم ہونے کے بعد کوئی خیر نہیں'' طبقات شافعیہ میں ہے کہ یہ شعر کسی نے امام بخاری کو دیکھ کر پڑھا تھا شاہ صاحبؒ چونکہ اس زمانے کے امام بخاریؒ تھے اس لیے یہ ناچیز ان کو دیکھ کر یہ شعر پڑھتا تھا۔

شکل وصورت اور لطافت طبع:

قدرت نے جس طرح حضرت شاہ صاحب کو اقلیم علم و عمل میں تاجداری عطا فرمائی تھی اسی طرح جسمانی ہئیت اور قد و قامت اور شکل وصورت میں بھی ایک خاص امتیاز عطا فرمایا تھا مولانا سعید احمد، ایم، اے اکبر آبادی کا بیان ہے کہ مجھ کو ہندوستان مصر و حجاز اور دوسرے ممالک عربیہ کے بڑے بڑے علماء اور مشائخ کو دیکھنے کا موقعہ ملا ہے لیکن جو وجاہت جو وقار و متانت جو دلکشی اور جاذبیت میں نے حضرت الاستاذ میں پائی وہ کہیں کسی اور جگہ نظر نہیں آئی، ہزار علماء میں بھی بیٹھتے تو سب سے الگ اور سب سے نمایاں رہتے/ دیکھنے والوں کی نگاہ ادھر ادھر گھومنے کے بعد وہیں پر جا کر ٹھیرتی تھی اور پھر جمتی تو اس طرح کہ وہاں سے ہٹنے کا نام نہ لیتی کشمیری النسل تھے اس لیے خوب کھلا ہوا سپید رنگ، کشیدہ و دراز قامت چوڑا چکلہ سینہ دوہرا اور گداز جسم بڑی بڑی مگر رسیلی اور شرمیلی نگاہیں/ کشادہ و فراخ پیشانی وطویل مگر ستواں بینی/ بڑے بڑے کان پر گوشت اور فربہ چہرہ ابریشم اور حریر کی مانند نرم و سبک جلد/ چلتے تھے تو معلوم ہوتے تھے کہ علم کا ایک کوہ گراں سبک

گامی کر رہا ہے بیٹھتے تھے تو محسوس ہوتا تھا کہ علم وفضل کا ایک آفتاب نظام شمس سے وابستہ ستاروں کو اپنے گرد لیکر بیٹھ گیا ہے کبھی سفید اور کبھی سبز سر پر عمامہ اور قامت بالا پر سبز قبا! دیکھنے والے ڈر ڈر کے دیکھتے تھے کہ کہیں نظر نہ لگ جائے کہ فرمان نبوی ہے العین حق غرض کوئی ایک ادا ہوتو اس کا ذکر کیجئے کوئی ایک خوبی ہوتو اس کو بیان کیا جائے جہاں یہ عالم ہو کہ:۔

زفرق نا بقدم ہر کجا کہ می نگرم   کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جا است

وہاں خاموشی کو ہی ترجمانی دل کا منصب تفویض کر دینے کے سوا اور کیا چارہ ہے۔

اسی حسن و جمال ظاہری و باطنی کے باعث طبیعت میں لطافت بھی بہت زیادہ تھی بہت صاف اور اجلے کپڑے پہنتے تھے غذا میں سادگی پسند تھے البتہ تازہ پھلوں اور طیور کے عاشق تھے ایک مرتبہ فرمایا کہ بیس سال میری زندگی میں ایسے گذرے ہیں کہ میں نے پرندوں کے علاوہ اور دوسرا گوشت کھایا ہی نہیں میٹھے خربوزوں کے بہت شوقین تھے اگر میٹھے خربوزے میسر آجائیں تو او رکھانا بہت کم کھاتے تھے۔

ابن تیمیہ اور ابن قیم کے بہت معترف تھے ان کے علم کی عظمت وشان کو بہت وقیع اور عقیدت بھرے الفاظ میں بیان کرتے ہوئے فرماتے کہ حافظ ابن تیمیہ جبال علوم میں سے ہیں ان کی رفعت شان اور جلالت قدر کا یہ عالم ہے کہ اگر میں ان کی عظمت کو سر اٹھا کر دیکھنے لگوں تو ٹوپی پیچھے سے گر جائیگی لیکن بایں ہمہ مسئلہ استواء علی العرش میں اگر وہ یہاں آنے کا ارادہ کریں گے تو درس گاہ میں نہیں گھسنے دوں گا۔

ایک دفعہ عصر مغرب کے درمیان بخاری شریف کا درس زور وشور سے ہو رہا تھا کہ اچانک کتاب بند کر دی اور فرمانے لگے کہ جب بھائی شمس الدین ہی رخصت ہو گئے تو درس کا کیا لطف رہا جاؤ تم بھی گھر کا راستہ لو طلبہ حیران ہوئے کہ بھائی شمس الدین کون اور کب آئے اور کب رخصت ہو گئے؟ کیا وہ لطف کا سبق ہوگا؟

ایک بار پچھلی صف میں سے کسی طالب علم نے سوال کیا مگر مہمل انداز سے فرمایا کہ جاہل تجھے معلوم نہیں کہ میں اسناد متصل کرنا بھی جانتا ہوں، جانتا ہے کس طرح اسناد متصل ہوگی؟ میں اس اپنے پاس والے کو تھپڑ ماروں گا وہ اپنے پاس والے کو تھپڑ مارے گا اور وہ اپنے پاس والے کو تھپڑ رسید کرے گا یہاں تک کہ تھپڑ کا یہ فعلی سلسلہ سند تجھ تک پہنچ جائے گا۔

ایک دفعہ مسائل فقہیہ کے ذیل میں نابالغ کی امامت کا ذکر آ گیا کہ اس کے پیچھے نماز نہیں ہوتی۔ فرمانے لگے مسئلہ تو یہی ہے مگر بعض نابالغوں کے پیچھے ہو بھی جاتی ہے (اس وقت حضرت شاہ صاحب ہی مسجد دارالعلوم میں امامت کرتے تھے) فرمانے لگے تم نے کبھی پیر نابالغ بھی دیکھا ہے؟ جو چالیس برس کا بھی ہو اور نابالغ بھی؟ جاہلین وہ ۴۰ برس کا نابالغ میں ہوں (اس وقت تک حضرت کی شادی نہیں ہوئی تھی) اشارہ اسی طرف تھا۔

ایک دفعہ ملا علاء الدین میرٹھی قلفی کا برف لے کر آئے حضرت مہتمم صاحب مولانا محمد احمد مرحوم نے اس کو بلایا اور شاہ صاحب سمیت دوسرے اکابر کھانے لگے/ کھانے کے دوران شاہ صاحب نے پوچھا کہ ملا جی؛ اس برف میں کتنا کما لیتے ہو؟ کہا کہ ساٹھ روپے مسکرا کر فرمانے لگے کہ تو پھر تمہیں دارالعلوم کی صدر مدرسی کی ضرورت نہیں۔ (ان دنوں حضرت کی تنخواہ ساٹھ روپے تھی)

بہر حال شاہ صاحب علمی و عملی کمالات رکھنے کے ساتھ ساتھ خوش طبع بھی تھے مگر اس کے باوجود مجلس شرعی آداب سے بھرپور ہوتی تھی/ جس میں غیر متعلق فضول اور لایعنی باتوں کا کوئی وجود نہ ہوتا تھا اگر کسی نے کسی کی برائی یا فضول بات شروع کی تو معاف فرماتے کہ بھائی ہمیں اس کی فرصت نہیں ہے کوئی مسئلہ پوچھنا ہے تو پوچھو ورنہ جاؤ/ ہمارا وقت ایسی باتوں کے لئے فارغ نہیں وقت کی بہت زیادہ قدر اور حفاظت کیا کرتے تھے۔

اوقات کا بڑا حصہ مطالعہ کتب میں گزرتا تھا ذوق مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ طبعی اور شرعی ضروریات کے علاوہ کوئی وقت کتب بینی یا افادہ سے خالی نہ رہتا تھا/ ایک دفعہ فرمایا کہ فتح الباری کا (جو تیرہ جلدوں کی کتاب ہے) تیرہویں دفعہ مطالعہ کر رہا ہوں اور یہ بھی فرمایا کہ میں درس کے لئے کبھی مطالعہ نہیں دیکھنا، مطالعہ کا مستقل سلسلہ ہے اور درس کا مستقل اس لئے درس میں ہر سال نئی نئی تحقیقات آتی رہتی ہیں۔

اخلاق:

علم و فضل کی بلندی کے تناسب سے اخلاق بھی نہایت بلند اور پاکیزہ تھے کبھی نہیں دیکھا گیا کہ کوئی سائل حضرت کے پاس آیا ہو اور نامراد گیا ہو جیب میں جو کچھ ہوتا اٹھنی یا روپیہ سائل کے حوالہ کر دیتے/ ایسی بات کرنے سے احتراز کرتے جس سے کسی کی دلآزاری ہو/ ایک دفعہ امرتسر تشریف لے گئے وہاں ایک نامی گرامی بیرسٹر بر بنائے عقیدت حاضر ہوئے لیکن داڑھی

مونچھ صاف ہونے کی وجہ سے بھنچے بھنچے سے بیٹھے شرمندگی محسوس کررہے تھے/ آپ نے بھانپ لیا اور فرمایا بیرسٹر صاحب آپ کیوں خواہ مخواہ شرمندہ ہورہے ہیں ہم دونوں کا فعل اگر چہ مختلف ہے لیکن غرض غایت دونوں کی ایک ہی ہے/ یعنی دنیا کمانے میں اگر مولوی ہوکر داڑھی نہ رکھوں تو کوئی مجھے کھانے کو نہ دے اور اسی طرح آپ بیرسٹر ہوکر داڑھی صاف نہ کرائیں تو ہر کوئی کہے کہ اب ان کو بیرسٹر کس نے بنادیا، یہ تو ملاجی ہیں، تو پھر آپ کو بھی بیرسٹری کے نام پر روٹی نہ ملے جب ہم دونوں کی غرض ایک ہے تو محض اختلاف فعل پر آپ شرمندہ کیوں؟

خودداری:

عام اخلاق وفضائل کے ساتھ حضرت شاہ صاحب میں خودداری بھی انتہادرجے کی تھی/ برار کے قضیہ کے سلسلہ میں نظام حیدرآباد دہلی آئے ہوئے تھے کہ خود نظام کی خواہش پر حضرت شاہ صاحب بھی دیوبند سے دہلی تشریف لائے اور وقت مقررہ پر نظام کی قیام گاہ پر پہنچے/ خبر ہوتے ہی نظام نے اندر بلالیا/ حضرت شاہ صاحب پہنچے تو عام آداب وشرائط کا لحاظ اور نہ کسی شاہی دستور و آئین کی پابند روبرو ہوتے ہی شاہ صاحب نے پیش قدمی کی اور خالص اسلامی طریقہ سے السلام علیکم کہا/ نظام پیشوائی کے لئے آگے بڑھے اور وعلیکم السلام کہہ کر شاہ صاحب کا ہاتھ پکڑ کر ایک کرسی پر لے جاکت بٹھادیا اسکے بعد جو گفتگو ہوئی وہ زیادہ تر دائرۃ المعارف کے کام سے متعلق تھی/ حضرت شاہ صاحب نے حدیث کی چند اہم کتابوں اور ان کے قلمی نسخوں کا ذکر کرکے فرمایا کہ اگر آپ ان کو بھی حاصل کرکے دائرۃ المعارف کی طرح شائع کردیں تو بے شبہ علم حدیث کی اور اس کے واسطہ سے اسلام کی یہ بڑی خدمت ہوگی اس زمانے میں دیوبند سے ایک ہفت روزہ اخبار ''مہاجر'' نکلتا تھا۔ اسکے ایڈیٹر نے اس ملاقات کی خبر چھاپنے کا ارادہ کیا تو عام ذہنوں کے مطابق بارگاہ خسروی میں حضرت علامہ کشمیری کی باریابی یا اس مفہوم کی کوئی اور عبارت بطور عنوان خبر لکھی/ چھپنے سے پہلے اتفاق سے شاہ صاحب کو خبر ہوگئی تو حد درجہ خفا ہوئے اور فرمایا کہ میں ہر چند ایک (مرد بے مایہ وبے بضاعت ہوں لیکن اتنا منکسر المزاج بھی نہیں کہ یہ عنوان گوارہ کرلوں کیسی بارگاہ خسروی اور کیسی اس میں باریابی؟ صاف لکھئے کہ ''نظام اور انور شاہ کی ملاقات۔''

ایک مرتبہ حیدرآباد کے مولوی نواب فیض الدین صاحب ایڈوکیٹ نے حضرت شاہ صاحب کو اپنی لڑکی کی شادی میں بلایا چونکہ نواب صاحب اور ان کے خاندان کو علماء دیوبند کے

ساتھ قدیم رابطہ اور قلبی علاقہ تھا دوران قیام میں بعض لوگوں نے چاہا کہ حضرت شاہ صاحب اور نظام کی ملاقات ہو جائے حضرت کو اسکی اطلاع ہوئی تو فرمایا مجھ کو ملنے میں عذر نہیں ہے لیکن اس سفر میں نہیں ملوں گا کیوں کہ اس سفر کا مطلب نواب صاحب کی بچی کی تقریب میں شرکت تھا اور بس۔ اور میں اسکو خالص ہی رکھنا چاہتا ہوں ہر چند لوگوں نے کوشش کی اور ادھر نظام کا بھی ایما تھا مگر شاہ صاحب رضامند نہیں ہوئے۔

اسی قیام حیدرآباد کے زمانے میں ایک روز سر اکبر حیدری کا فون آیا (جو بعد میں آسام کے گورنر بنے) کہ میں مولانا انور شاہ صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ فرمایا کہ انھیں کہدو میں یہیں ہوں آجائیں/ حیدری صاحب کو پیام پہنچایا گیا تو انھوں نے کہا بہت اچھا میں حاضر ہوتا ہوں/ مگر میرے آنے پر حاضرین مجلس کو اٹھا دیا جائے/ میں تنہائی میں ملاقات کرنا چاہتا ہوں/ حضرت کو پیام دیا گیا تو فوراً ارشاد فرمایا کہ ناممکن ہے کہ میں حیدری صاحب سے باتیں کرنے کے لئے حاضرین مجلس کو چھوڑ کر الگ جا بیٹھوں یا ان لوگوں سے میں کہوں کہ چلے جائیں۔

اسلامی غیرت وحمیت:

حضرت علامہ کشمیری طبعاً بڑے حلیم اور بردبار تھے لیکن اسلامی اور دینی معاملات میں وہ کسی طرح کے تساہل یا غفلت شعاری کو گوارہ نہیں کرتے تھے۔

مقدمہ بہاولپور میں مرزائی وکیل ایک دفعہ کہنے لگا کہ فلاں بزرگ مرزا غلام احمد کو کافر نہیں کہتے آپ نے فرمایا نہ کہتے ہوں گے اس سے کیا فرق پڑتا ہے اس نے اس بات کی تکرار کی/ دراصل بات یہ تھی کہ اس بزرگ سے نواب بہاولپور کا روحانی تعلق تھا/ مرزائی وکیل چاہتا تھا کہ نواب صاحب کوئی سخت بات کہیں جس سے مقدمہ پر کوئی اثر پڑے/ شاہ صاحب سمجھ گئے تھے/ اس لئے نرمی سے کہتے رہے کہ اس سے کیا فرق پڑتا ہے/ جب اس نے تکرار کی تو شاہ صاحب جلال میں آگئے اور تن کر فرمایا/ اللہ کی جہنم بہت وسیع ہے اس میں (اس بزرگ کا نام لیکر) وہ بھی جا سکتا ہے فبهت الذی کفر مرزائی حیران دیکھتا رہ گیا۔

ایک دفعہ ڈابھیل سے دیوبند جا رہے تھے/ دہلی اسٹیشن پر گاڑی بدلنا تھی کافی دیر رکنا پڑا دوران گفتگو حضرت کو معلوم ہوا کہ دہلی میں قادیانیوں کا تین دن تک جلسہ ہوتا رہا ہے جس میں ہر قسم کی تقریریں کی گئیں/ لیکن علماء اسلام میں سے کسی شخص نے جلسہ میں پہنچ کر ان کو مناظرہ کی

دعوت نہیں دی، حضرت مولانا غصہ میں مولانا سعید احمد ایم اے اکبر آبادی سے فرمانے لگے" مولوی صاحب کسی شریف آدمی کی توہین گالی سننے ہی سے نہیں ہوتی بلکہ اگر وہ کوئی اپنے مرتبہ سے گرا ہوا کام کرے تو اس سے بھی اس کی توہین ایسی ہی ہوتی ہے جیسے کہ گالی وغیرہ سے۔

اس پر ایک واقعہ سنایا کہ حضرت عمرؓ کے پاس ایک متمول اور باعزت نے ایک شخص زبر قان نامی کے خلاف شکایت کی کہ اس نے ایک شعر میں اس کی بڑی شدید ہجو کی ہے/ حضرت عمرؓ نے شاعر سے جواب طلب کیا تو اس نے کہا امیر المومنین میں نے اس کی مدح کی ہے نہ کہ مذمت دیکھئے میں کہتا ہوں:

داع المكارم لا ترحل لبغيتها اقعد فانک انت الطاعم الكاسى

ترجمہ: تو چھوڑ بزرگوں اور بڑی طاقتوں کو مت سفر کران کی طلب میں تو بیٹھا بھی (رہ اپنے گھر کے اندر) کیونکہ تو کھانے والا بھی ہے اور پہننے والا بھی۔ ماشاءاللہ خوب کھاتا پیتا آدمی ہے۔

حضرت عمرؓ نے یہ شعر سنا تو فرمایا استغاثہ بالکل صحیح ہے درحقیقت ایک شریف آدمی کی اس سے زیادہ توہین اور کیا ہوسکتی ہے کہ حصول مکارم کو غریبوں کے لئے مخصوص کردیا جائے۔

زبان اردو وانگریزی کی اہمیت:

ایک دفعہ دورہ حدیث شریف کے طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا" میں نے اپنے عربی وفارسی ذوق کو محفوظ رکھنے کے لئے ہمیشہ اردو پڑھنے لکھنے سے احتراز کیا یہاں تک کہ عام طور سے اپنی خط وکتابت کی زبان بھی عربی وفارسی رکھی لیکن اب مجھے اس پر افسوس ہے ہندوستان میں/ اب دین کی خدمت اور دین کا دفاع کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اردو میں مہارت پیدا کی جائے اور باہر کی دنیا میں دین کا کام کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انگریزی زبان کو ذریعہ بنایا جائے میں اس بارے میں آپ صاحبان کو خاص طور سے وصیت کرتا ہوں"۔

ختم نبوت اور حضرت شاہ صاحب:

اس صدی کے دو چار عظیم فتنوں میں سے ایک بڑا فتنہ مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت کا ذبہ کا فتنہ ہے اور یہ فتنہ اس لحاظ سے اور بھی شدید تھا کہ اس کو اس وقت حکومت کی سرپرستی کا شرف حاصل تھا جس کی سلطنت میں آفتاب غروب ہوتا تھا اللہ کی شان ہے کہ آج دوپہر کے وقت بھی نظر نہیں آتا کیونکہ انگریز کی اب موثر حکومت صرف اپنے ہی ملک پر ہے اور وہاں سورج سال میں

کبھی کبھار ہی نظر آتا ہے/ اور یہ بات صرف ہمارا قیاس ہی نہیں خود متنبیٔ قادیان نے کہا ہے کہ وہ انگریزوں کا خود کاشتہ پودا ہے اور یہ بات اور بھی نمایاں ہو کر اس وقت سامنے آ گئی جب سقوط بغداد پر مرزائیوں نے قادیان میں گھی کے چراغ جلائے۔

غلام احمد قادیانی کی نبوت مذہبی سے زیادہ سیاسی تحریک تھی مگر اس کو مذہبی رنگ میں پیش کیا گیا اور قادیانی اسلامی اصطلاحوں اور علمی مغالطوں کے ذریعے مسلمان کی دولت ایمان کو لوٹنے لگے اسلامیان ہندوستان اس سے برفروختہ ہوئے اور ہر مسلک و خیال کے سر برآوردہ حضرت نے اس سلسلہ میں کافی کام کیا اور حق یہ ہے کہ پیر مہر علی شاہ صاحب اور ابوالوفا مولانا ثناءاللہ امرتسری، مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی رحمہم اللہ اجمعین نے رومرزائیت میں خوب کام کیا/ جنگ عظیم میں سقوط بغداد پر قادیان میں گھی کے چراغ جلنے اور اس جنگ میں مرزائیوں کے علی الاعلان انگریزوں کی حمایت نے اس جماعت کے کارکنوں کے حوصلے بڑھا دیئے اور یہ لوگ کھل کر سامنے آنے لگے/ حضرت علامہ انور شاہ صاحب علیہ الرحمۃ جیسا محبّ رسول عالم اور نور بصیرت و دانش سے بہرہ مند انسان اس پر تلملا اٹھا اور حضرت شاہ صاحب نے اس سلسلے میں سب سے جامع کام کیا قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر یوں فرمایا ہے۔

ان ابراھیم کان امة" بے شک ابراہیم امت تھے"، یعنی اپنی ذات کے لحاظ سے تو ایک فرد تھے لیکن کام کے لحاظ سے ایک امت کے برابر انہوں نے کام کیا بعینہ اسی طرح شاہ صاحب علیہ الرحمۃ اس امت محمدیہ علیہ التحیۃ والصلوۃ والسلام کے ان جامع افراد میں سے ایک تھے جنھوں نے بیک وقت مختلف محاذوں پر کام کیا اور جن کے نور معرفت نے ہر شعبہ زندگی میں برقی لہر دوڑا دی/ تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ہم اجمالی طور پر مختصراً ختم نبوت کے سلسلہ میں حضرت شاہ صاحب کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہیں۔

ختم نبوت کے سلسلہ میں کام کرنے کے کئی تھے/ ایک تو یہ تھا کہ خالص علمی اندازہ میں ردمرزائیت کے لئے ایک جماعت ہو جو نہایت سنجیدگی اور متانت سے اس کام کو سرانجام دے ایک صورت یہ تھی کہ شعلہ نوا مقرروں کی ایک کھیپ تیار کی جائے جو اپنی شعلہ نوائی اور آتش بیانی سے عوام کو اس تحریک کے خفیہ مقاصد سے آگاہ کرے اور حسب ضرورت قربانی سے بھی گریز نہ کرے ایک پہلو کام کرنے کا یہ تھا کہ کسی ایک بڑی شخصیت کو ردمرزائیت کا مبلغ بنا دیا جائے جس کا

ایک ایک لفظ خرمن قادیانیت کے لیے صاعقہ برق ثابت ہو/ ایک انداز کام کرنے کا یہ کہ اگر مرزائی متکلمین تحریر کے ذریعے تبلیغ کریں تو ان کے مقابلہ کرنے والے تحریر میں ان کا جواب دیں۔ایک شعبہ کام کرنے کا یہ تھا کہ مناظروں میں انکو شکست دی جائے۔

بہ نظر غائر دیکھا جائے تو حضرت شاہ صاحب نے ان تمام محاذوں پر بطور خود سالار اعلیٰ کے فرائض انجام دیئے اور ہر موقعہ وجگہ کے لیے کام کرنے والے افراد کی تربیت کی اور ان کو آگے لائے۔

علمی میدان میں شاہ صاحب نے علماء کے لیے عربی اور فارسی میں مختلف رسائل لکھے جو ردمرزائیت میں اصولی انداز پر حرف آخر ہیں اور اسی طرح علماء کی تربیت کی کہ وہ اس محاذ پر علمی رنگ میں کام کریں/ چنانچہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی، حضرت مولانا سید محمد بدر عالم صاحب میرٹھی مہاجر جدنی جیسے یگانہ روزگار اہل قلم کو اسطرف متوجہ کیا/ عوامی سطح پر کام کرنے کے لیے مجلس احرار اسلام کو متوجہ کیا اور لاہور انجمن خدام الدین کے جلسہ پر اردو زبان کے سب سے بڑے عوامی خطیب اور شعلہ نوا جادو بیان مقرر مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری کو اس بارے میں امیر شریعت کا خطاب دیا اور سب سے پہلے خود ان کی بیعت کی اور اسی مجلس میں پانچ سو جید علماء نے حضرت کی اقتداء میں بخاری علیہ الرحمۃ کے ہاتھ پر بیعت کی اور دنیا جانتی ہے کہ حضرت امیر شریعت کی قیادت میں مجلس احرار نے ردمرزائیت پر جو کام کیا وہ سنہری حروف سے لکھنے کے اقبال ہے، اسی طرح فلسفی شاعر علامہ اقبال علیہ الرحمہ کو مرزائیت کے خدوخال سے آگاہ کیا اور انہوں نے جیسا کہ مولانا سعید احمد ایم اے اکبرآبادی کے حوالہ سے گذشتہ سطور میں گذر چکا ردمرزائیت پر جو کام کیا وہ حضرت علامہ کشمیری کی توجہ کا اثر تھا/ حضرت شاہ صاحب کا اس مسئلہ پر خصوصی توجہ فرمانا علماء وخواص کے لیے کافی تھا مزید برآں علامہ اقبال جیسے عظیم مفکر وشاعر کی توجہ خصوصی اس طرف مبذول کردینے نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا آخری کام یہ تھا کہ اگر کہیں مرزائی مبلغ مناظرہ کا کھیل کھیلیں تو اس میدان میں بھی ان کی سرکوبی کی جائے۔

فیروز پور میں مرزائیوں کے ساتھ ایک مناظرہ طے پایا اور عام مسلمانوں نے جو فن مناظرہ سے ناواقف تھے مرزائیوں کے ساتھ بعض ایسی شرائط پر مناظرہ طے کرلیا جو مسلمان مناظرین کے لیے خاصی پریشان کن ہوسکتی تھیں/ دارالعلوم دیوبند کے اس وقت صدر مہتمم حضرت مولانا حبیب الرحمان رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شاہ صاحب کے مشورہ سے مناظرہ کے لیے حضرت

مولانا سید مرتضیٰ حسن چاند پوری، حضرت مولانا سید محمد بدر عالم میرٹھی، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب/ حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی تجویز ہوئے/ یہ حضرات جب فیروز پور پہنچے تو مرزائیوں کی شرائط کا علم ہوا کہ انھوں نے کس طرح دجل سے من مانی شرائط سے مسلمانوں کو جکڑ لیا ہے/ اب دو ہی صورتیں تھیں کہ یا تو ان شرائط پر مناظرہ کیا جائے یا پھر انکار کر دیا جائے/ پہلی صورت مضر تھی/ دوسری صورت مسلمانان فیروز پور کے لیے سبکی کا باعث ہوسکتی تھی کہ دیکھو تمہارے مناظر بھاگ گئے/ انجام کار انہی شرائط پر مناظرہ کرنا منظور کر لیا گیا اور حضرت شاہ صاحب کو تار دید دیا گیا/ اگلے روز مقررہ وقت پر مناظرہ شروع ہو گیا اور عین اسی وقت دیکھا گیا کہ حضرت شاہ صاحب بہ نفس نفیس حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ تشریف لا رہے ہیں/ انھوں نے آتے ہی اعلان فرمایا کہ جائیے ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ تم نے جتنی شرائط مسلمانوں سے منوائی ہیں اتنی شرائط اور من مانی لگوالو/ ہماری طرف سے کوئی شرط نہیں۔ مناظرہ کرو اور خدا کی قدرت کا تماشہ دیکھو/ چنانچہ اسی بات کا اعلان کر دیا گیا اور مفتی صاحب، مولانا محمد ادریس کاندھلوی اور مولانا سید بدر عالم صاحب نے مناظرہ کیا/ اس میں مرزائیوں کی جو درگت بنی اس کی گواہی آج بھی فیروز پور کے درو دیوار دے سکتے ہیں مناظرہ کے بعد شہر میں جلسہ عام ہوا جس میں حضرت شاہ صاحب اور شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی نے تقریریں کیں/ یہ تقریریں فیروز پور کی تاریخ میں یادگار خاص کی نوعیت رکھتی ہیں بہت سے لوگ جو قادیانی دجل کا شکار ہو چکے تھے اس مناظرہ اور جلسہ کے بعد اسلام پر واپس لوٹ آئے۔

علامہ کشمیری کا دورۂ پنجاب:

۱۳۴۳ھ میں حضرت شاہ صاحب نے پنجاب کا ایک وسیع دورہ کیا تا کہ مختلف مقامات پر قادیانیوں نے قادیانی منطق کا جو جال پھیلا رکھا ہے اس کا تار و پود بکھیرا جائے، چنانچہ حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا مرتضیٰ حسن صاحب، مولانا قاری محمد طیب صاحب، مولانا سید محمد بدر عالم صاحب، مولانا محمد ادریس صاحب مولانا مفتی محمد نعیم صاحب اور حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کی معیت میں حضرت شاہ صاحب پنجاب کے دورے پر نکلے، یہ علم و عمل کے پہاڑ اور فضل و ولایت کے سمندر، لدھیانہ، امرتسر، لاہور، گوجرانوالہ، گجرات اور راولپنڈی، ایبٹ آباد مانسہرہ، ہزارہ او

رکوئٹہ وغیرہ میں جلسوں میں مرزائیوں کو للکارتے ہوئے پھرے/ مرزائی دجال جو آئے دن اہل اسلام کو مناظروں کے چیلنج کرتے پھرتے تھے ایسے چھپے کہ کسی ایک جگہ بھی چہرہ نہ دکھایا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس جہان میں نہیں ہیں۔

بہاولپور کا معرکتہ الآرا تاریخی مقدمہ:

۱۹۲۶ء میں احمد پور شرقیہ بہاولپور کی ایک مسلمان عورت نے بہاولپور کی ایک عدالت میں دعویٰ کیا کہ اس کا شوہر مرزائی ہو چکا ہے لہذا اسکا نکاح فسخ کیا جائے، سات سال تک یہ مقدمہ بہاولپور کی ادنیٰ عدالتوں میں پیش ہوتا رہا بالآخر دربار معلیٰ میں پہنچا، ۱۹۳۳ء میں دربار معلیٰ سے یہ قلمی ہو کر کہ اس مسئلے کی دونوں طرف کے علماء کی شہادتیں لے کر تنقیح کر کے کوئی فیصلہ کیا جائے/ پھر نچلی عدالت میں آیا، مدعیہ غریب عورت تھی اس کے بس کی بات نہ تھی کہ اتنا لمبا چوڑا کام کرے/ درآں حالیکہ دوسری طرف قادیان کا بیت المال اور رجال کار سب کچھ اس کے لیے وقف ہو گیا/ لیکن الحمد اللہ بہاولپور کے غیور مسلمان انجمن موید الاسلام نے اس کا بیڑا اٹھایا اور شیخ الجامعہ بہاولپور کی زیر سرپرستی تمام مشاہیر علماء کو شہادت کے لیے دعوت دی/ حضرت شاہ صاحب ان دنوں ڈابھیل میں صدر مدرس تھے/ مگر بوجہ علالت دیو بند میں فروکش تھے لیکن جب اس مسئلہ کا علم ہوا تو اپنی صحت اور دیگر مصروفیتوں کی پرواہ کیے بغیر دیگر مشاہیر کی معیت میں تاریخ مقدمہ سے کئی روز پیشتر بہاولپور تشریف لائے اور تقریباً ۲۵ روز بہاولپور میں قیام فرمایا۔

حضرت علامہ کشمیری کا مسلسل تین دن بیان ہوتا رہا، ناظرین وسامعین کا بیان ہے کہ حضرت کے بیان کے وقت احاطہ عدالت میں سکتہ طاری رہتا تھا اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ علم کا ایک سمندر ہے جس کی گہرائی کا سوائے قدرت باری تعالیٰ کے کسی کو علم نہیں/ بیان ۶۰ صفحات پر قلمبند ہوا/ لیکن سارا اول تا آخر نہیں صرف اتنا طبع ہوا جو حضرت جج صاحب لکھواتے تھے/ جو جو عبارات اثناء بیان میں تشریحات وتفسیرات کے ساتھ پیش کی جاتی تھیں وہ قلم بند نہیں ہوئیں/ نیز حوالہ جات میں حرف اول اور آخر لفظ لے لیا گیا حالانکہ حضرت پوری عبارت معہ تشریح وتفسیر سناتے تھے اگر پورا بیان مفصل شائع کیا جاتا تو تقریباً ایک سو ساٹھ صفحات پر پھیل جاتا۔

بہر حال حضرت علامہ کشمیری اور دوسرے محقق علماء کے بیانات ہوئے اور مقدمہ کا

فیصلہ ۱۹۳۵ء ۷؍فروری کو سنایا گیا جو ایک سو باون صفحات پر اردو زبان میں شائع ہوا اور ڈسٹرکٹ جج نے مرزائی کو مرتد قرار دیتے ہوئے نکاح فسخ کر دیا و للّٰہ الحمد المنة عدالتی سطح پر اہل اسلام کی اتنی بڑی فتح یہ حضرت شاہ صاحب کی ذات گرامی قدر کی بدولت ہوئی اس مقدمہ کی مفصل کارروائی مطبوعہ ملاحظہ کی جائے یا پھر حیات انور نامی کتاب میں حضرت مولانا محمد انوری صاحب کا مضمون پڑھا جائے جس میں اس کارروداداجمالی ساخاکہ آ گیا ہے۔

قادیان میں اعلان حق:

''اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی'' کے مصداق حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمۃ اعلان حق کرنے کے لیے نیز قضیہ زمین برسر زمین کی خاطر کئی دفعہ قادیان تشریف لے گئے او روہاں پبلک جلسے کر کے اعلاء کلمۃ الحق کا فریضہ سرانجام دیتے رہے/ مرزائیوں نے حکام سے مل کر بہت کوشش کی کہ ان جلسوں پر پابندی لگا دی جائے، مگر یہ جلسے جس متانت اور سنجیدگی کے ساتھ ہوتے تھے اس کی بناء پر پابندی کا کوئی جواز نہیں تھا/ جب قادیانی جلسے بند کرانے میں کامیاب نہ ہو سکے تو پھر جلسہ سے قبل حضرت شاہ صاحب کو دھمکی آمیز خطوط لکھا کرتے کہ اگر تم یہاں آئے تو قتل کر دیئے جاؤ گے اور واپس نہ جا سکو گے اور یہ صرف دھمکی ہی نہ ہوتی تھی بلکہ کئی دفعہ عملاً کوشش کی گئی مگر۔

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

تصانیف:

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ان کی تربیت سے ایسے متجر اور عظیم عالم پیدا ہوئے کہ جن کی نظیر کم از کم برصغیر میں ملنا مشکل ہے/ حضرت کے حافظہ فہم و ذکاء اور جودت ذہن کے متعلق سابق میں گزر چکا ہے کہ حضرت اس بارے میں آیۃ من آیات اللہ تھے/ اگر چاہتے تو ایک ہی نشست میں جس موضوع ہر قلم اٹھاتے بیش قیمت کتاب تربیت دے لیتے مگر اس کے باوجود حضرت کی افتاد طبع کچھ اس طرح کی واقع ہوئی تھی کہ انھوں نے تصنیف و تالیف کی طرف کم توجہ دی اور کسی بڑے عالم کی تصانیف نہ ہونا یا کم ہونا اسکی عظمت و

جلالت میں کمی نہیں کرتا، امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی جلالت قدر وفضل وعلم سے کون ناواقف ہے کہ آج دنیائے اسلام میں مسلمانوں کی اکثریت فقہ حنفی کی پیروکا ہے مگر اس کے باوجود حضرت امام کی تصانیف نہ ہونے کے برابر ہیں/ صحابہ رضی اللہ عنہ کے دور کی طرف چلئے تو حضرت ابو ہریرہؓ کی روایات سب صحابہ سے زیادہ نظر آئیں گی مگر حضرت صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کی مرویات انگلیوں پر گنی جاسکتی ہیں/ کیا یہ کوئی کہہ سکتا۔ ہے کہ درجہ اور مرتبہ کے اعتبار سے صدیق اکبر اور فاروق اعظم کم تھے/ کیونکہ ان کی مرویات کم ہیں، ان کی دوسری مصروفیات اور شغل حل وتدبیر نے ان کو اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ وہ اس بارے میں بھی توجہ کرسکیں۔

حضرت مولانا محمد بدر عالم نے ایک دفعہ عرض کیا کہ اگر جامع ترمذی وغیرہ پر کوئی شرح تالیف فرمادیتے تو پسماندگان کے لئے سرمایہ ہوتا غصہ میں آکر فرمانے لگے کہ زندگی میں نبی کریم ﷺ کی احادیث پڑھا کر پیٹ پالا، کیا آپ چاہتے ہیں کہ مرنے کے بعد بھی حدیث کی خدمت بکتی رہے۔

ہر گلے را رنگ وبوئے دیگر است

اس کے باوجود علمی اور دینی تقاضوں کیوجہ سے چند رسائل ایسے یادگار چھوڑ گئے جن کی رہتی دنیا تک قدر ہوتی رہے گی اور

زمانہ جسے لیکر آفتاب کرتا ہے انہی کی رگ میں پوشیدہ ہے وہ چنگاری

کے مصداق علماء کو مشکل راہ کا کام دیں گے

حضرت کی چند مایۂ ناز تصنیفات یہ ہیں۔

۱-عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام
۲-التصریح بما تواتر فی نزول المسیح
۳-اکفار الملحدین فی ضروریات الدین
۴-تحیۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام
۵-خاتم النبیین (فارسی)
۶-فصل الخطاب فی مسئلہ ام الکتاب

۷-خاتمۃ الخطاب فی فاتحۃ الکتاب (فارسی)

۸-نیل الفرقدین فی مسئلہ رفع الیدین ۱۵اللمعہ فی صلوۃ الجمعہ

۹-بسط الیدین لنیل الفرقدین

۱۰-ضرب الخاتم علی حدوث العالم

۱۱-کشف الستر عن صلاۃ ابوتر خزائن الاسرار

۱۲-مرقاۃ الطارم لحدوث العالم

۱۳-ازالتہ الرین فی الذب عن قرۃ العینین

۱۴-سہم الغیب فی کبد اہل الریب

ان کتابوں کے علاوہ حضرت کی وہ تقریریں جو درس کے وقت املا کراتے تھے اور جن کو حضرت کے اجلہ تلامذہ نے تحریر کیا ہے ان میں مشہور ترین تقریر فیض الباری کے نام سے جو مولانا سید بدر عالم میرٹھی نے تحریر کی ہے چار جلدوں میں چھپ چکی ہے اور تمام علماء کے حلقوں سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے/ یہ بخاری کی تقریر ہے اسی طرح العرف الشذی درس جامع ترمذی کی املا ہوئی/ جس کو مولانا محمد چراغ گوجرانوالہ نے اور انوار المحمود نی شرح سنن ابی داؤد جس کو مولانا محمد صدیق صاحب نجیب آبادی مرحوم نے منضبط کیا ہے یہ دونوں کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں/ اس کے علاوہ مسلم کی املائی شرح منضبط کردہ مولانا مناظر احسن گیلانی اور حاشیہ سنن ابی داؤد منضبط کردہ مولانا سید محمد ادریس صاحب سکروڈھوی غیر مطبوعہ ہیں اور اب اردو میں شرح بخاری بنام انور الباری حضرت شاہ صاحب کے افادات ۳۲ حصوں میں ساڑھے چھ ہزار صفحات پر شائع ہو رہے ہیں ان سب شرحوں کو دیکھا جائے تو یہ شرحیں بے شمار نئی پرانی شرحوں سے بے نیاز کر دیتی ہیں/ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری جو حضرت کے شاگردان رشید میں سے ایک ہیں نے حضرت کی حیات طیبہ پر ایک کتاب بنام نفحۃ العنبر بزبان عربی لکھی ہے، اس میں حضرت کی خصوصیات نیز ان کے علمی شہ پاروں کی مکمل تفصیل بیان فرمائی ہے۔ شائقین اس طرف مراجعت فرمائیں نیز حیات انور کے نام سے ایک کتاب اردو میں شائع ہو چکی ہے جس میں حضرت کے اجلہ تلامذہ نے حضرت کو خراج تحسین پیش کیا ہے مطالعہ کے قابل ہے۔

حضرت علامہ کشمیریؒ کا

علمی مقام

حضرت مولانا سید احمد رضا بجنوریؒ

حضرت اقدس رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ کے علم وفضل، تبحر وجامعیت وغیرہ فضائل ومناقب کے بارے میں بہت کچھ پہلے بھی لکھا گیا، اوراب بھی موجودہ تقریب سعید کے موقع پر مقالات کی صورت میں آپ حضرات کے سامنے ہے مجھے دیر سے اطلاع ملی اس لئے کو تاہیوں کونظر انداز فرمائیں مقالہ کا عنوان بھی اپنی بے بضاعتی اور حضرات اکابر کی موجودگی میں 'چھوٹا منہ بڑی بات'' کے مترادف ہے، مگر دل کا تقاضا یہی ہوا کہ حضرتؒ کے اعلی وارفع علمی مقام کی نشاندہی حتی الوسع کردی جائے۔ وما تو فیقی الا باللہ

میرا حضرت سے تعلق تلمذ دارالعلوم دیوبند کے زمانہ تحصیل ۲۷ء سے شروع ہوا/ پھر زمانہ قیام ڈابھیل میں دوسال آپ کی خدمت میں شب وروز استفادہ اور درس بخاری شریف میں شرکت کا موقع میسر ہوا/ اس وقت حضرتؒ کی تفسیر وحدیثی تالیفات مرتب کرکے شائع کرائیں/ اسی کے ساتھ حضرت اقدس مجدد صاحبؒ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کی نادر تالیفات بھی شائع ہوئیں، قیام ڈابھیل کے ۱۶ سال اسی مشغلہ میں گذرے پھر اب ۱۵،۱۶ سال سے انوارالباری شرح اردو صحیح البخاری کی تالیف میں مصروف ہوں اس میں حضرت کے امالی درس بخاری شریف اور دوسری شروح بخاری کے افادات پیش کررہا ہوں۔

اس پچاس سال کا حاصل مطالعہ یہ ہے کہ میرے نزدیک حضرت شاہ صاحبؒ دوسرے معدودے چند حضرات اکابر امت کی طرح عالمی شخصیت تھے یا بالفاظ دیگر ورلڈ فیم (world fame) کے مستحق تھے/ اسی لئے میں سمجھتا ہوں کہ حضرت کا ''علمی مقام'' اس سے کہیں زیادہ اعلی

وارفع ہے جو عام طور سے اب تک بہت سے حضرات نے سمجھا ہے/ اس امر کا اندازہ سب سے پہلے مجھے اور میرے رفیق سفر مولانا سید محمد یوسف بنوری کو مصر کے ایک سالہ قیام میں ہوا جبکہ ہم فیض الباری اور نصب الرایہ طبع کرانے کے لئے وہاں گئے تھے۔

وہاں ہماری ملاقاتیں علامہ کوثریؒ اور دوسرے علماء سے ہوئیں جس طرح ہندوستان میں حضرت شاہ صاحب نادرۂ روزگار متجر عالم تھے/ نہ صرف مصر بلکہ عرب دنیا میں علامہ کوثری کی بھی ایسی ہی شان تھی/ جس طرح ہمارے علامہ کشمیری حفظ واتقان، جامعیت علوم وفنون اور عادات وشمائل کے لحاظ سے یہاں فرد فرید تھے/ وہاں علامہ کوثریؒ حضرت کے شبیہ ومثیل تھے۔

محض فضل وتوفیق خداوندی تھی کہ ہمارا ان سے بھی ایک سال تک تعلق ورابطہ رہا اور استفادہ کا موقع ملا۔

(۱) علامہ کوثری صاحب نے حضرت شاہ صاحبؒ کی تالیفات پڑھیں تو وہ بھی حضرتؒ کے نہایت گرویدہ ہوئے، اور حضرتؒ کا تعارف مصری مجلات میں کرایا۔ آپ نے لکھا کہ احادیث سے دقیق مسائل کے استنباط میں شیخ ابن ہمام (م ۸۶۱ھ) صاحب فتح القدیر کے بعد ایسا محدث وعالم امت میں نہیں گذرا اور یہ کوئی کم زمانہ نہیں ہے۔

(۲) سلطنت ٹرکی کے سابق شیخ الاسلام مصطفیٰ صبری نے حضرت شاہ صاحبؒ کی تالیف **مرقاۃ الطارم علیٰ حدوث العالم** کا مطالعہ کر کے فرمایا کہ میں نہیں سمجھتا تھا کہ فلسفہ وکلام کے دقائق اس انداز سے سمجھنے والا اب بھی کوئی دنیا میں موجود ہے/ جتنا کچھ آج تک اس موضوع پر لکھا جا چکا ہے اس رسالہ پر سب کو ترجیح دیتا ہوں بلکہ ''اسفار اربعہ'' علامہ شیرازی کی چار مجلات کبیر پر بھی۔

اس وقت دوران قیام مصر میں ہمیں یہ بھی احساس ہوا کہ اگر دارالعلوم دیوبند والے حضرت شاہ صاحبؒ کو مصر وشام اور ٹرکی کے ایک دو سفر کرا دیتے تو علم وتحقیق کی دنیا بدل جاتی، اور دنیائے اسلام کے علماء میں وہ روابط قائم ہو جاتے کہ رہتی دنیا تک ان کے بے نظیر فوائد ومنافع قائم رہتے/ جس طرح ہمارے شاہ صاحبؒ نے یہاں کے فتنۂ مرزائیت وغیرہ کے استیصال کے لئے سعی فرمائی، علامہ کوثریؒ اور علامہ صبریؒ نے ممالک اسلامیہ میں پیدا شدہ فتنوں کا سد باب کیا تھا اور نہایت مفید علمی وتحقیقی تالیف کی تھیں۔

میرا یقین ہے کہ اگر حضرت شاہ صاحبؒ ممالک اسلامیہ کا سفر فرماتے تو ساری دنیائے اسلام سے خراج تحسین حاصل فرماتے اور آپ کو عالمی شہرت کا مقام ملتا، چونکہ حضرت نہایت ہی خمول پسند اور عزت شہرت سے نفور تھے، اس لئے اتنا عرصہ بغیر علمی شہرت کے گزر گیا اور اب کہ محترم شیخ محمد عبداللہ صاحب وزیر اعلیٰ جموں وکشمیر نے حضرتؒ کی یاد میں سمینار منعقد کیا ہے اور اس کی خبریں سارے عالم السلام میں جائیں گی تو اس سے آپ کی اعلیٰ وارفع حیثیت ضرور نمایاں ہوگی، انشاءاللہ۔

علامہ کوثریؒ اور علامہ صبریؒ سے پہلے حضرت شاہ صاحبؒ کی زندگی میں جو اکابر علماء اسلام مصر وشام وغیرہ سے ہندوستان آئے اور حضرتؒ سے ملے تھے انھوں نے بھی حضرتؒ کی بے نظیر فضل وتبحر اور جامعیت معقول ومنقول کا اعتراف کیا تھا۔

(۳) آپ کے استاذ حدیث صدرالمدرسین دارالعلوم دیوبند شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ بھی آپ کے وسیع وعمیق مطالعہ کتب کی وجہ سے آپ سے استفادہ فرماتے تھے اور آپ ہی کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔

(۴) حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ بھی مشکلات فقہ وحدیث وغیرہ میں آپ کی طرف رجوع کرتے تھے اور آپ سے روایت ودرایت دونوں کی روشنی میں فیصلے طلب کرتے تھے، آپ کی پوری زندگی کے حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد ان کی یہ بھی رائے تھی کہ آپ کے مزاج میں کسی قسم کی کجی نہیں ہے اور آپ اعتدال واستقامت کا بلند پایہ نمونہ تھے۔

(۵) حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ نے فرمایا کہ طبقہ علماء میں حضرت شاہ صاحب کا تبحر وکمال، فضل وورع، تقویٰ وجامعیت، استغناء وغیرہ مسلم تھا۔ وہ بلاشبہ وقت حضر کے کے کامل ترین عالم ربانی تھے، موافق ومخالف سب ان کے سامنے تسلیم وانقیاد سے گردن جھکاتے تھے یہ بھی آپ کی رائے تھی کہ حضرت کا علم لدنی تھا، فی زمانہ کسب سے اتنا علم حاصل نہیں ہوسکتا اور ایک تعزیتی مکتوب میں لکھا کہ حضرت امام وامت تھے آپ کی موت درحقیقت علم وعلماء کی موت ہے۔

(۶) حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ نے فرمایا تھا کہ میں ہندوستان وحجاز، عراق وشام کے اکابر علماء اسلام سے ملا ہوں، اور علمی مسائل میں ان سے بحثیں کی ہیں مگر

حضرت شاہ صاحب کا سا تبحر اور جامعیت واحاطہ علوم نقلیہ وعقلیہ کسی میں نہیں پایا۔

(۷) علامہ سلیمان ندوی نے ''معارف'' میں لکھا تھا کہ حضرت شاہ صاحبؒ کی مثال اس سمندر جیسی ہے جس کی اوپر کی سطح ساکن ہو اور اندر کی گہرائیاں گراں قدر موتیوں سے معمور ہوں، وہ قوت حافظہ وسعت نظر اور کثرت مطالعہ میں اس عہد کی بے نظیر شخصیت تھے/ علوم حدیث کے حافظ ونکتہ شناس، علوم ادب میں بلند پایہ/ معقولات میں ماہر شعر وسخن سے بہرہ مند اور زہد وتقوی میں کامل تھے۔ مرتے دم تک علم ومعرفت کے اس شہید نے قال اللہ وقال الرسول کا نعرہ بلند رکھا ان کو زندہ کتب خانہ کہنا بجا ہے شاید ہی کوئی کتاب مطبوعہ یا قلمی جوان کے مطالعہ سے بچی ہو۔

(۸) علامہ رشید رضا مصری ۱۳۳۰ھ میں دار العلوم دیوبند آئے تھے اس وقت اساتذہ وطلبہ کے جلسہ میں حضرت شاہ صاحبؒ نے نہایت فصیح وبلیغ عربی میں ایک مبسوط تقریر فرمائی جس میں دار العلوم دیوبند کے طریق درس خصوصاً علم حدیث کے پڑھانے کے طور وطریق کو پوری تفصیل سے واضح کیا، پھر حضرت شاہ ولی اللہؒ سے لے کر اپنے اساتذہ واکابر دار العلوم تک کے مناقب وفضائل اور طرز وطریق خدمت دین وعلم پر روشنی ڈالی، علامہ رشید رضا آپ کی فصاحت تقریر، سلاست بیان اور قوت دلائل سے نہایت متاثر ہوئے اور اس کے بعد علامہ موصوف نے بھی اپنی طویل تقریر عربی میں ان امور کو سراہا اور حضرت کے غیر معمولی علم وفضل وتبحر ووسعت مطالعہ اور بے نظیر استحضار وحافظہ کی نہایت مدح کی۔ طریق درس حدیث کی بھی تصویب کی اور کہا کہ جو طریقہ آپ کے یہاں درس حدیث کا ہے یہی سب سے اعلیٰ وافضل وانفع ہے آخر میں یہ بھی کہا کہ اگر میں یہاں آکر اس دار العلوم کو نہ دیکھتا اور ایسے اکابر اہل علم سے نہ ملتا تو میں ہندوستان سے مایوس وغمگین لوٹتا۔

(۹) علامہ محدث شیخ علی حنبلی مصری جو صحیحین کے حافظ مشہور تھے/ ہندوستان آئے تو دیوبند بھی پہنچے، دار العلوم میں تین ہفتہ قیام کیا ایک یمنی متعلم دار العلوم سے مل کر درس واساتذۂ دار العلوم کے حالات معلوم کئے، علامہ نے خاص طور سے حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے درس صحیح مسلم میں شرکت کی، آپ نے علامہ کی رعایت سے روزآنہ عربی میں درس دیا، اور شیخ علی کے اعتراضات وسوالات کے جواب بھی دیتے رہے، اسی کے ساتھ شیخ نے حضرت شاہ صاحب کے

درس بخاری شریف میں بھی شرکت فرمائی اوراس میں بھی حضرت سے سوالات کرتے رہے،اور حضرت جوابات دیتے رہے کہ آپ نے بھی شیخ کے زمانہء شرکت درس میں روزآنہ فصیح وبلیغ عربی زبان میں ہی تقریر فرمائی۔

اس کے بعد شیخ حنبلی نے جوتبصرہ حضرت شاہ صاحبؒ کے بارے میں کیا،وہ قابل ذکر ہے،فرمایا:

''میں نے عرب ممالک کا سفر کیا اور علماء زمانہ سے ملا/ خود مصر میں کئی سال حدیث کا درس دیا ہے، ہر جگہ کے علماء کرام سے حدیثی مباحث کئے مگر میں نے اب تک اس شان کا کوئی محدث عالم نہیں دیکھا/ میں نے ان کو ہر طرح بند کرنے کی سعی کی،مگر ان کے استحضار علوم،تیقظ،حفظ واتقان اور ذکاوت ووسعت نظر سے حیران ہوں/ میں نے شاہ صاحبؒ کے علاوہ اس درجہ کا کوئی عالم نہیں دیکھا جوامام بخاری،حافظ ابن حجر،علامہ ابن تیمیہ،ابن حزم وشوکانی وغیرہ کے نظریات پر تنقیدی محاکمہ کرسکتا ہو،اوران حضرات کی جلالت قدر کا پورالحاظ رکھکر بحث وتحقیق کا حق ادا کرسکے۔

شیخ موصوف اپنے طویل قیام دارالعلوم کے عرصہ میں برابر حضرت شاہ صاحبؒ سے استفادہ کرتے رہے اور سند حدیث بھی حاصل کی اور ایک روز یہ بھی کہہ دیا کہ اگر میں حلف اٹھالوں کہ شاہ صاحبؒ امام ابوحنیفہ سے زیادہ علم رکھتے ہیں تو مجھے امید ہے کہ حانث نہ ہوں گا حضرت شاہ صاحبؒ کواس جملہ کی خبر ہوئی تو ناخوش ہوئے اور فرمایا کہ ''ہمیں امام صاحبؒ کے مدارکِ اجتہاد تک قطعاً رسائی نہیں ہے۔''

پھر مصر واپس جاکر شیخ موصوف نے اپنا سفرنامہ شائع کیا علماء دیوبند اور خاص کر حضرت شاہ صاحبؒ کے علمی کمالات پر ایک طویل مقالہ لکھا۔

(۱۰)مشہور اہل حدیث عالم علامہ ثناء اللہ امرت سریؒ حضرت شاہ صاحبؒ کے مداحین میں سے تھے آپ کی خدمت میں دیوبند جاتے اور استفادہ کرتے تھے۔

(۱۱)علامہ ابراہیمؒ میر سیالکوٹی فرمایا کرتے تھے کہ اگر کسی کو مجسم علم دیکھنا ہوتو حضرت شاہ صاحبؒ کو دیکھ لے۔

(۱۲)علامہ اقبال مرحوم نے اصول السلام کی ارواح سمجھنے میں حضرت شاہ صاحبؒ

سے بالمشافہہ اور ذریعہ مکاتبت بھی بہت استفادہ کیا تھا اور دارالعلوم سے علیحدگی کے بعد آپ کو لاہور لانے کی بھی بہت کوشش کی تھی۔

آپ نے حضرتؒ کی وفات کے بعد لاہور کے تعزیتی جلسے میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "اسلام کی ادھر کی پانچ سو سالہ تاریخ حضرت شاہ صاحب کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے" ڈاکٹر اقبال نے ایک موقع پر محترم مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی سے فرمایا تھا کہ آپ کا یا دوسرے مسلمانوں کا (حضرت شاہ صاحب کے ترک تعلق دارالعلوم کے بارے میں) جو بھی تأثر ہو، مگر میں ان کے استعفےٰ کی خبر سن کر بہت خوش ہوا کیونکہ دارالعلوم کو صدر مدرس اور بھی مل جائیں گے مگر اسلام کے لئے اب جو کام میں شاہ صاحب سے لینا چاہتا ہوں وہ کوئی دوسرا انجام نہیں دے سکتا۔

حضرتؒ کی وفات کے بعد علامہ اقبالؒ کی مکاتبت راقم الحروف سے بھی رہی اور علامہ چاہتے تھے کہ کسی جید عالم کو اپنے پاس رکھ کر اس دور کے پیچیدہ فقہی مسائل پر کوئی کتاب لکھوائیں/ غالباً وہ حضرت شاہ صاحبؒ کے افادات کی ہی روشنی میں اتنا بڑا کام کرنا چاہتے تھے مگر افسوس کہ علامہ کو اس مہم میں کامیابی نہیں ہوئی۔

(۱۳) ایک دفعہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب علی گڑھ سے دیوبند آئے اور حضرت شاہ صاحبؒ کے درس مسلم شریف میں بیٹھے تو کہا کہ آج تو آکسفورڈ اور کیمبرج کے لکچر ہال کا منظر سامنے آگیا تھا، یورپ کی ان یونیورسٹیوں میں پروفیسروں کو جس طرح پوری تحقیق وریسرچ کے ذریعہ پڑھاتے ہوئے میں نے دیکھا تھا آج ہندوستان میں میری آنکھوں نے وہی نقشہ دیکھا۔

(۱۴) حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوریؒ اپنی مشہور حدیثی تالیف بذل المجهود شرح ابی داؤد کی مشکلات میں حضرت شاہ صاحبؒ سے رجوع کرتے تھے، حالانکہ وہ آپ کے درجے میں تھے۔

(۱۵) علامہ محدث نیمویؒ نے اپنی پوری تصنیف آثار السنن طبع واشاعت سے قبل حضرت شاہ صاحبؒ کے ملاحظہ سے گزاری اور آپ کے علمی مشوروں سے استفادہ کیا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ پہلے علامہ نے اس تالیف کے مسودات حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں ملاحظہ کے لئے بھیجے۔ تھے مگر آپ نے مشورہ دیا کہ انکو حضرت شاہ صاحبؒ کے پاس بھیجا جائے۔

(۱۶) حضرت علامہ مولانا شبیر احمد صاحبؒ نے اپنی شرح مسلم شریف اور فوائد قرآن مجید میں حضرت شاہ صاحب کی تحقیقات سے پورا استفادہ فرمایا تھا، سورہ نجم کے ایک تفسیری استفادہ کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے فتح الملہم ص ۳۳۵، ج ا میں حضرت شاہ صاحبؒ کو القاب عالیہ کے ساتھ ذکر کرتے ہوئے یہ جملہ بھی لکھا ہے کہ لوگوں کی نظروں نے ان کا مثل نہیں دیکھا اور نہ خود انھوں نے اپنا مثل دیکھا تھا۔

مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ نے نفحۃ العنبر ص ۲۲۷ میں یہ جملہ نقل کر کے یہ بھی بتلایا کہ یہ جملہ کتب تراجم وطبقات میں صرف ۶، ۷، اکابر امت کے حق میں استعمال کیا گیا ہے گویا شاہ صاحب ان اعلیٰ وارفع شان کے اکابر واساطین امت میں سے ایک تھے۔ و کفیٰ به منقبة

اب تک میں نے شاہ صاحب کے اعلیٰ وارفع ''علمی مقام'' کے لئے اکابر معاصرین کے اجمالی ارشادات سے استدلال کیا ہے اسکے بعد میں کچھ علوم وفنون میں حضرت شاہ صاحبؒ کی تحقیقات عالیہ کی مثالیں اور نمونے بھی بطور استشہاد پیش کرتا ہوں۔ و به نستعین۔

علم تفسیر میں حضرتؒ کا مقام رفیع

حضرتؒ کی عادت مبارکہ تھی کہ آپ ہر علم وفن کی مشکلات ومختارات دونوں پر پوری نظر رکھتے تھے اور مشکلات کے حل کی فکر میں رہتے تھے/ مختارات کی نشان دہی فرمادیتے تھے آپ کی تالیفات میں سے ''مشکلات القرآن'' اسی کا ایک نمونہ ہے اسی کتاب کو راقم الحروف نے ہی حضرتؒ کی یادداشتوں سے مرتب کیا تھا اور حوالوں کی تخریج حاشیہ کتاب میں کی تھی اور اس پر نہایت مفید علمی وتفسیری مقدمہ رفیق محترم مولانا محمد یوسف بنوری مرحوم نے لکھا تھا یہ کتاب مجلس علمی ڈابھیل سے شائع شدہ ہے اگرچہ اب نایاب ہے یہاں اسی سے چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

۱-سماع موتی کا مسئلہ:

حضرت نے آیات وآثار سے ثابت کیا کہ ارواح موتی سب سنتی ہیں جہاں نفی آگئی ہے وہ اجساد سے متعلق ہے یا اس امر کی نفی ہے کہ مرنے کے بعد ان کے لئے سننا نفع بخش نہیں ہے/ یہ بھی حضرتؒ نے فرمایا کہ جو کچھ اس بارے میں اختلاف بھی ہوا ہے وہ عام ارواح کے بارے میں ہوا ہے باقی ارواح انبیاء علیہم السلام کے سماع میں کسی کا بھی اختلاف نہیں ہے حضرت قاضی ثناء اللہ صاحبؒ نے بھی تفسیر مظہری میں لکھا ہے کہ ارواح انبیاء علیہم السلام کے سماع پر سب کا

اتفاق ہے (مشکلات القرآن ص۲۲۲)

۲-سورج کی حرکت:

حضرت نے سورہ یسین کی آیت **والشمس تجری لمستقر لها** کے بارے میں افادہ کیا کہ اس کو جدید ہیئت کے مخالف نہ سمجھنا چاہئے کیونکہ قرآن مجید کا مطمح نظر طبعی و سائنسی معلومات فراہم کرنا نہیں ہے بلکہ صرف اپنی قدرت عظیمہ کاملہ کا بیان ہے/ اور ایسے مواقع پر جو بات عام طور سے عوام جانتے پہچانتے ہیں اسی کے مطابق کلام کیا گیا ہے/ اگر عوام کے اذہان کو کوئی حقائق اور سائنسی تحقیقات میں الجھا دیا جاتا تو وہ ہدایت ونصیحت کی طرف کما حقہ متوجہ نہ ہو سکتے/ قرآن مجید کے وقت نزول سے ہزار بارہ سو برس تک لوگ یہی سمجھتے رہے کہ سورج حرکت کرتا ہے تو اسکے خلاف کی طرف ذہنوں کو موڑنے کی سعی لا حاصل اور بے فائدہ تھی اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ آیت میں **مستقر** سے مراد قیامت ہو کہ سورج کی خدمت وکارفرمائی کا دور قیامت تک باقی رہے گا (پھر اور مخلوقات کی طرح وہ بھی فنا ہو جائے گا) اور احادیث میں جو سجدہ کا ذکر ہے وہ معمور ہے (یعنی دریافت امریکہ کے بعد وہ سجدہ ان کے **معمورۂ ارضی** کے لحاظ سے ہیارضی کے لحاظ سے ہوگا) مشکلات القرآن ص۲۲۹

نیز حضرت نے فرمایا کہ سورج کے لئے بالکلیہ سکون وعدم جریان ہیئت جدید میں بھی مسلم نہیں ہے/ کیونکہ وہ بھی اگر چہ سورج کی حرکت زمین کے گرد تو نہیں مانتے مگر سورج کے لئے بھی ایک حرکت وجریان فضاء بسیط کے اندر مانتے ہیں، جو مستقر یا قیامت تک کے لیے ہوگی، احقر نے انوار الباری میں اسکی پوری تحقیق درج کی ہے ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ جدید ہیئت وسائنس چونکہ مشاہدہ پر مبنی ہے اس لئے وہ قدیم سے زیادہ قابل وثوق ہے یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ اسلامی تعلیمات سے جدید سائنس کا کوئی تعلق ٹکراؤ نہیں ہے بلکہ وہ ان سے زیادہ قریب ہے۔

واضح ہو کہ ہمارے اکابر میں سے سب سے پہلے حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے شق قمر کی بحث میں جدید ہیئت کی برتری وصحت کی طرف اشارہ فرمایا تھا۔

۴-ان الذین امنوا والذین هادو (بقرہ):

اس آیت کی تفسیر میں علامہ ابن تیمیہ اور ان کے بعد بھی بعض حضرات کو اشکالات پیش

آئے ہیں ان حضرات نے آیت میں ذکر شدہ اہل مذاہب کا حکم ماضی سے متعلق سمجھا ہے/ حضرت شاہ صاحبؒ نے اس کو زمانہ نبوت سے متعلق ثابت فرمایا اور تفصیل کی جس کو بسبب طوالت مضمون ترک کر رہا ہوں۔

(مشکلات ص ۱۶)

۵-وان استنصروکم فی الدین (انفال):

بظاہر ارشاد ربانی یہ ہے کہ اگر کسی دارالحرب کے مسلمان باشندے دارالاسلام کے مسلمان باشندوں یا اس کی حکومت سے کسی دینی معاملہ میں نصرت و مدد طلب کریں تو ان کا فرض ہے کہ دارالحرب کے مسلمانوں کی مدد کریں/ بشرطیکہ ان دونوں ملکوں میں کوئی باہمی معاہدہ نہ ہو (کیونکہ معاہدہ کے خلاف کرنا اسلام میں جائز نہیں)

حضرت شاہ صاحبؒ نے تفسیر ابن کثیر وغیرہ کے حوالوں سے یہ تحقیق فرمائی کہ یہ معاہدہ والی شرط ظلم کی صورتوں پر عائد نہیں ہوتی / کیونکہ ظلم کی صورت میں ہر مظلوم کی مدد کرنا شرعاً ضروری ہے خواہ دارالاسلام ہی کے اندر کوئی مسلمان دوسرے مسلمان پر ظلم کرے/ لہٰذا آیت مذکور کے استثناء میں ظلم کفار والی صورت داخل نہ ہوگی اور معاہدہ مظلوم مسلمانوں کی نصرت سے مانع نہ ہوگا (مشکلات ص ۱۹۰)

۶-آیت النار مثواکم خلدین فیھا الا ماشاء اللہ (انعام و ھود):

حضرت شاہ صاحبؒ نے تفسیر بحر محیط کے حوالوں سے تحقیق فرمائی کہ آیت میں استثناء مذکور سے عدم خالدین عذاب کفار ثابت کرنا صحیح نہیں اور علامہ ابن تیمیہ وغیرہ کی غلطی کو دلائل کے ساتھ واضح فرمایا حوالوں کی تخریج راقم الحروف نے کردی ہے (مشکلات القرآن ص ۱۷۷ تا ۱۸۰)

۷-آیت فاشھدو اانا معکم من الشاھدین (آل عمران):

حضرتؒ نے تفاسیر کے حوالوں سے شہادت امت مرحومہ کی مکمل وضاحت فرما کر ضمناً یہ بھی تحقیق فرمائی کہ صوفیہ جو وساطت فی النبوۃ کا ذکر کرتے ہیں اس سے مراد فتح باب نبوت ہے اس سے اصطلاح اہل معقول کے مطابق بالذات و بالعرض کی بات سمجھنا درست نہیں۔ (مشکلات ص ۴۷)

حضرتؒ نے کئی جگہ درس بخاری شریف میں یہ بھی فرمایا تھا کہ مذکورہ بالا تعبیر خلاف

احتیاط معلوم ہوتی ہے کیونکہ یہ اہل معقول کی اصطلاح کے مطابق سلف سے ثابت نہیں ہوگی۔
طوالت کے خیال سے ان ہی چند نمونوں پر اکتفا کرتا ہوں ورنہ پوری کتاب حضرتؒ کے حل مشکلات تفسیر حوالوں کے ۷۷ ۲ صفحات پر مشتمل ہے۔
واضح ہو کہ تفسیر قرآن مجید ایک محفوظ طریقہ تو تفسیر القرآن بالقرآن کا ہے اس کے بعد تفسیر القرآن بالحدیث الصحیح کا درجہ ہے مگر کسی بھی تفسیر بالماثور پر پورا بھروسہ اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک کہ اس ماثور کا صحیح درجہ معلوم نہ ہو/ تفسیر بیضاوی، تفسیر در منشور سیوطیؒ، تفسیر روح المعانی، تفسیر ابن جریر طبری/ تفسیر ابن کثیر وغیرہ مستند تفاسیر ہیں مگر ان میں بھی حذف والحاق اور اندراج ضعاف وموضوعات کا سقم موجود ہے۔ ان اکابر مفسرین کا مطمح نظر یہ تھا کہ کسی آیت کی تفسیر میں جتنا بھی مواد مل سکے وہ سب اسانید کے ساتھ جمع کر دیں اور چونکہ پہلے دور کے علماء رجال سے واقف ہوتے تھے وہ سند حدیث سے ہی معلوم کر لیتے تھے کہ حدیث کس درجہ میں قابل استناد ہے اور قابل استناد بھی ہے تو صرف فضائل اعمال کے لئے ہے یا اس سے بڑھ کر احکام حلال وحرام یا واجبات وفرائض کے لئے بھی اور اس سے بھی آگے درجۂ اصول وعقائد کے لئے ہے جن کے اثبات کے لئے اور بھی زیادہ قوی احادیث درکار ہیں۔
علامہ ابن کثیر نے یہ بہت بڑا کام کیا کہ تفسیر ابن جریر کی روایت کو سند کے ساتھ بیان کیا اور ان کی علل بھی بیان کیں۔ احادیث ضعاف وموضوعات کی نشاندہی کر دی/ یہ ان کی نہایت عظیم الشان خدمت ہے مگر اس کے باوجود ان سے بھی بعض احادیث کے اندر کوتاہی ہوگئی کہ ان کی علت ونکارت پر تنبیہ نہیں کی/ ملاحظہ ہو ص ۱۰۷۔ الاجوبۃ الفاصلہ مولانا عبدالحی لکھنویؒ، شاید علامہ نے ان کی بین نکارت کی وجہ سے تنبیہ ضروری نہ سمجھی ہو جس طرح امام ابوداؤد نے اپنی سنن میں کئی احادیث منکر وشاذ رواۃ سے درج فرمادیں اور تنبیہ نہیں فرمائی/ حالانکہ انہوں نے بھی اپنی کتاب میں صرف صحیح احادیث ذکر کرنے کا ارادہ کیا تھا اور فرمایا تھا کہ جس حدیث کی سند پر سکوت کروں اس کو بھی صحیح سمجھا جائے مگر حدیث ثمانیہ اوعال اور اطیط عرش، وغیرہ بلا تنبیہ ذکر فرمادیں جن سے بڑے بڑوں کو مغالطہ لگ گیا۔ تاہم علامہ ذہبی نے سیر اعلام النبلاء میں تصریح کی کہ امام ابوداؤد نے اگر چہ بین الضعف راویوں پر سکوت نہیں کیا بلکہ ان کا ضعف بتلا دیا ہے/ پھر بھی بعض جگہ انہوں نے کسی راوی کے نہایت ضعیف ومنکر ہونے کی شہرت کی وجہ سے بھی سکوت کیا ہے

ملاحظہ ہوص ۶۸ وص ۷۳ وص ۱۴۴۔ الاجوبہ مولانا عبدالحی لکھنوی مطبوعہ حلب۔

یہاں صرف اتنا عرض کرنا تھا کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے کتب تفاسیر میں سے جتنا حصہ مشکلات قرآنیہ کے حل کے لئے اہم وضروری تھا نیز جس قدر مختارات مفسرین حضرتؒ کی نظر میں معتمد وپسندیدہ تھے وہ ایک جگہ جمع فرمادئے تھے۔ احقر نے اپنے ابتدائی دور میں کچھ کام اسکی ترتیب وتخریج حوالات کا انجام دیکر مجلس علمی سے اس کو شائع کردیا تھا، اب کتاب مذکور مکمل تشریحات اور مزید تائیدی حوالات کی محتاج ہے/ اللہ تعالی کسی کو اس کام کی توفیق عطا فرمائے۔

علم حدیث میں حضرت شاہ صاحب کا اعلی مقام:

حضرت شاہ صاحبؒ نے درس بخاری شریف باب الاذان قبل الفجر میں امام طحاویؒ کی تحقیق کو سراہا اور اس کو بیان کر کے فرمایا کہ امام طحاویؒ کی قدر وہ کرسکتا ہے جس کو معلوم ہو کہ پہلے کیا کچھ اعتراضات وابحاث ہو چکی ہیں اور فرمایا کہ حنفیہ کے مذہب پر جس قدر احسانات امام طحاویؒ کے ہیں اور کسی کے نہیں/ میں نے اکثر دیکھا کہ امام طحاویؒ کی تحقیق کی بنیاد امام محمدؒ کے کلام پر ہوتی ہے اور بعض اوقات ان کے ایک ہی لفظ پر بنیاد رکھ کر امام طحاویؒ اس کو پھیلا کر پوری تحقیق قائم کردیتے ہیں/ اور اعلی درجہ کی تحقیقات کی نشاندہی جتنی امام طحاوی نے کی ہے اور کسی نے نہیں کی/ پھر انکی تقریرات وتائیدات جس قدر میں نے جمع کردی ہیں اور کسی نے نہیں کیں۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ امام محمدؒ اکابر سلف اور امام اعظم رضی اللہ عنہم کے علوم و کمالات کے جامع تھے اور امت محمدیہ کے نہایت جلیل القدر محقق ومدقق تھے/ بقول حضرت شاہ صاحبؒ آپ کے علوم کی تشریحات امام طحاوی نے کیں اور امام محمد کے تلمیذ خاص امام شافعیؒ کی وساطت سے وہ علوم دوسرے ائمہ مجتہدین ومحدثین کو بھی حاصل ہوئے/ پھر ایک مدت مدید کے بعد ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے جن کا سلسلہ نسب بھی امام اعظمؒ کے خاندان سے ملتا ہے/ ان علوم وتحقیقات عالیہ محمدیہ وطحاویہ کو سامنے رکھ کر تیس چالیس سال تک ان کے لئے تائیدی دلائل وبراہین جمع کئے، اور انکی شان علم وفضل وجامعیت بھی بقول حضرت تھانویؒ قدس سرہٗ ایسی تھی کہ ان کے ایک ایک جملہ ہر ایک ایک رسالہ مدوّن ہوسکتا تھا اور بقول حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ آپ کی گراں قدر علمی تالیفات کی قدر بھی وہی کرسکتا ہے جس کے سامنے سابقہ اعتراضات وابحاث ہوں اور خود علامہ موصوف نے ہی حضرت شاہ صاحبؒ کا رسالہ کشف الستر پڑھ کر یہ بھی

فرمایا تھا کہ اس رسالہ کا مطالعہ سترہ بار کرنے کے بعد میں سمجھ سکا ہوں کہ حضرت نے کن کن مشکلات واشکالات کا حل فرمادیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ امام محمدؒ، امام طحاویؒ اور علامہ کشمیریؒ تینوں حضرات کی محدثانہ شان تحقیق وتدقیق علماء امت میں سے ایک نرالی شان کی تھی۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے رسالہ مذکور اور نیل الفرقدین، بسط الیدین مرقاۃ الطارم وغیرہ کی یادداشتیں احقر کے سپرد فرما کر نقل وترتیب کا کام کرایا تھا، جن کی ''مجلس علمی'' ڈابھیل سے اشاعت ہوئی تھی، اور یہ ادارہ اولاً حضرت کے علوم کی اشاعت ہی کے لئے قائم کیا گیا تھا۔

حضرت کی اسی طرح کی یادداشتوں کے تین صندوق بھرے ہوئے گھر پر تھے، جن کا اکثر ذکر فرمایا کرتے تھے، ان سے سینکڑوں مسائل میں مدد مل سکتی تھی اگر آج وہ سب موجود ہوتیں تو صحاح ستہ ومعانی الآثار طحاوی وغیرہ کی بے نظیر شروح تالیف کی جاسکتی تھیں، مگر صد افسوس کہ حضرت کی وفات کے بعد اس بے مثال خزینہ میں سے ہمیں کچھ نہ مل سکا/ بلکہ حضرت کی وہ کتابیں بھی جن پر حضرت نے اپنے قلم سے حواشی لکھے تھے، وہ بھی حاصل نہ ہوسکیں۔

ان حالات میں حضرت کی وفات کے بعد سوچا گیا کہ کم سے کم حضرتؒ کے درس حدیث کے امالی ہی کو مرتب کرا کر شائع کردیا جائے چنانچہ فیض الباری مرتب کرائی گئی جس کو مصر میں طبع کرا کے شائع کیا گیا۔ مگر افسوس ہے کہ اس سے جتنی امیدیں قائم کی تھیں، وہ پوری نہ ہو سکیں، کیونکہ اس میں نہ صرف ضبط وکتابت کی بے شمار غلطیاں ہیں بلکہ کتابوں کے حوالوں میں میں بھی مراجعت نہ کرنے کیوجہ سے فاحش غلطیاں ہوگئیں ہیں، اسی لئے انوار الباری میں ایسی فروگزاشتوں کی اصلاح بھی پیش نظر ہے، تاکہ حضرتؒ کے علوم وافادات کو حتیٰ الوسع صحیح صورت میں پیش کیا جائے، واللہ الموفق۔

اس تمہید کے بعد میں حضرت کی محدثانہ شان تحقیق کے بھی چند نمونے پیش کرتا ہوں۔

ا-حدیث سدوا عنی کل خوخة فی هذاالمسجد غیر خوخةابی بکر

بخاری ص ۶۷:

اس حدیث پر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ ارشاد نبوی دربارۂ سدالابواب غیر باب علی بھی قوی سند سے ثابت ہے (اگرچہ بخاری میں نہیں ہے) لیکن محدث ابن الجوزی نے اس

کوموضوع قرار دیا ہے جس کا حافظ ابن حجر نے رد وافر کیا ہے/ اور امام طحاوی کی مشکل لآ ثار سے بھی اپنے مدعا کو قوت پہنچائی ہے/ کیونکہ امام طحاویؒ نے توفیق بین الحدیثین کا راستہ اختیار کیا ہے۔

حافظ نے لکھا کہ محدث ابن الجوزی نے اس حدیث کو بوجہ اعلال بعض رواۃ کے گرایا ہے اور اس لئے بھی کہ اس کو بخاری وغیرہ کی صحیح روایت کے مخالف خیال کیا اور یہ بھی خیال کیا کہ اس حدیث کو روافض نے حضرت علیؓ کی منقبت کے لئے گھڑ لیا ہے/ حالانکہ یہ ابن الجوزی کی خطاء شنیع ہے کیونکہ اس طرح انہوں نے احادیث صحیحہ کو رد کرنے والوں کا طریقہ اختیار کیا ہے (فتح الباری ص ۱۲، ج ۷)

حضرت شاہ صاحبؒ نے مزید افادہ کیا کہ ایسی غلطیاں دوسرے اکابر امت سے بھی ہوئی ہیں کہ کسی ایک کو مجروح راوی کی وجہ سے حدیث صحیح یا حسن کو گرا دیا/ جبکہ وہ حدیث دوسرے ثقہ راویوں سے بھی مروی ہوتی ہے/ خود بخاری میں بھی بعض ضعیف راوی ہیں مگر ان کی حدیث اس لئے نہیں گرے گی کہ وہ دوسرے ثقہ راویوں سے بھی مروی ہے/ اسی لئے صحیح بخاری کی تمام احادیث صحیح وقوی قرار دی جائیں گی۔ بعض حضرات کسی حدیث کو اضطراب کی وجہ سے گرا دیتے ہیں جبکہ وہ معنیٰ کے لحاظ سے صحیح ہوتی ہے/ یا کبھی تعصب مسلکی کے سبب سے بھی کسی مخالف کی حدیث کو گرا دیا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے مسلک پر اس سے استدلال نہ کر سکے، چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی ہی نے علامہ ابن تیمیہ پر نقد کیا ہے کہ انہوں نے منہاج السنہ میں روافض کے مقابلہ میں اتنا زور دکھایا ہے کہ ان کی نقل کردہ صحیح احادیث کو بھی گرا دیا، یہ بات انصاف سے بعید ہے۔

۲-قولہ وقال الشعبی لا یشترط المعلم الا ان یعطیٰ شیئا فیقبلہ (بخاری ص ۳۰۴):

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ امام محمدؒ نے جو یہ تفصیل کر دی ہے کہ اجرت ممنوعہ اگر مشروط ہو تو ناجائز ہے ورنہ درست ہے تو اس پر علامہ ابن تیمیہ نے بڑے غیض وغضب کا اظہار کیا ہے اور امام محمدؒ کے رد کے لئے اپنے فتاویٰ میں مستقل جزو کہا ہے کہ "ہم نہیں سمجھ سکے اس قید کا خارج میں ثمرہ کیا ہے جبکہ وہ اجرت قبول کر لے۔ حالانکہ حدیث میں اس کی ممانعت ہے اور اس نے حدیث کی کھلی مخالفت کی ہے"، میں نے کہا کہ وہ اپنے غصہ کو اپنے پاس ہی رکھیں ہمیں ان کا علم بھی معلوم ہے، یہاں امام بخاریؒ نے علامہ شعبی کا قول نقل کیا کہ معلم اگر شرط نہ کرے اور اس کو

کچھ دیدیا جائے تو لینا جائز ہے اور ترمذی شریف میں صحیح حدیث ہے کہ حضور علیہ السلام نے عسب الفحل کی ممانعت فرمائی ہے اور اسکی اجرت حنیفہ کے نزدیک بھی حرام ہے، تاہم حدیث ہی میں یہ بھی حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ صحابہؓ نے عرض کیا ہمیں اکراماً وھدیۃ کچھ دیا جاتا ہے کہ اسکی آپ نے اجازت دی،

پس جبکہ ایک اصل اور جنس حضور علیہ السلام کے ارشادات سے ثابت ہوگئی تو اس کے تحت آنے والی جزئیات پر نکیر کیونکر درست ہوسکتی ہے/ غرض فقہ حنفی میں بہت سے جزئیات تعامل وتوارث کی وجہ سے جائز قرار دئے گئے ہیں/ جن پر دوسرے لوگ نکتہ چینی کیا کرتے ہیں/ اور یہ بات شان علم وتحقیق اور انصاف سے بعید ہے/ حضرت شاہ صاحب نے مزید فرمایا کہ علامہ ابن تیمیہ جب اکابر امت کی شان میں سخت الفاظ استعمال کرتے ہیں تو بڑا دکھ ہوتا ہے/ انہوں نے ائمہ حنفیہ پر بھی بہت کچھ لے دے کی ہے اور خاص کر امام محمدؒ سے تو بہت ہی ناراض معلوم ہوتے ہیں (شاید اسی لئے انھوں نے امام شافعیؒ کے امام محمدؒ سے تلمذ کا بھی انکار کیا ہوگا واللہ اعلم)

۳-مرض وفات میں نبی نمازیں مسجد نبوی میں

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ بخاری کی حدیث الباب (۶۵۱) میں حضور علیہ السلام کا مرض وفات میں ٹب میں بیٹھ کر غسل کرنے کا ذکر ہے اور نماز عشاء مسجد نبویؐ میں پڑھنے کی بھی صراحت ہے اور بخاری کے الفاظ سے بھی ۵، ۶ جگہ سے یہ بات نکلتی ہے کہ حضور ﷺ عشاء کے وقت حجرۂ شریفہ سے مسجد کی طرف نکلے ہیں اور خطبہ پڑھا ہے، مگر حافظ نے کہیں بول کر نہیں دیا، اور وہ صرف ایک ظہر کے نکلنے کو مانتے ہیں باقی کا انکار کرتے ہیں/ حالانکہ حضور ﷺ نے اپنے مرض وفات میں چار پانچ دن کے اندر چار بار مسجد نبوی کی نماز میں شرکت فرمائی ہے، اور تین نمازوں کی شرکت کو تو امام ترمذی نے بھی مانا ہے/ میں چار مانتا ہوں، جبکہ امام شافعیؒ اور حافظؒ صرف ایک نماز کی شرکت مانتے ہیں، پھر ان دونوں میں اختلاف ہے کہ امام شافعیؒ صبح کی نماز میں کہتے ہیں اور حافظؒ ظہر میں،

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ بخاری کی حدیث ص ۲۲ کے تحت بھی ضروری تفصیل انوار الباری ص ۱۰۴، ج ۵ میں آچکی ہے، وہ بھی اس کے ساتھ دیکھ لی جائے۔

اب حضرت نے سابق باب اھل العلم والفضل احق بالامامۃ کی حدیث انس میں

قولہ فنکص ااابوبکر الخ پر بھی فرمایا کہ اس کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ اس نماز میں داخل نہیں ہوئے، کہ ایسا ہوتا تو راوی اسکو ضرور ذکر کرتا، تاہم امام بیہقی نے شرکت پر اصرار کیا ہے اور دو روایتوں سے استدلال کیا ہے، میرے پاس دس وجوہ یا زیادہ ایسی ہیں جو شرکت نماز فجر (یوم الاثنین یوم وفات نبیؐ) پر دلالت کرتی ہیں، اور میرا خیال ہے کہ آپ نے اقتداء حجرۂ شریفہ سے کی ہے/ مسجد میں تشریف نہیں لے جاسکے، جسکی عورتیں جمعہ کے دن حجروں سے اقتداء کرتی تھیں (کمافی المدونہ لیکن میرے پاس اس کی کوئی نقل نہیں ہے) اور نسائی سے معلوم ہوتا ہے کی صف تک پہنچ گئے تھے۔ امام شافعی بھی نماز صبح کی شرکت کے قائل ہیں اور غالبًا وہ پیر کے دن کی ہے، حافظؒ نے صبح کی نماز کی شرکت سے انکار کیا ہے اور شرکت صرف ظہر میں مانی ہے۔ پہلے یہ بات بھی آچکی ہے کہ ایک نماز ظہر کی شرکت کو سب مانتے ہیں۔ علاوہ امام شافعیؒ کے خواہ وہ سنیچر کی ہو یا اتوار کی/ جمعہ کی تو ہو نہیں سکتی، اور جمعرات کی شام سے علالت شروع ہوئی تھی، جمعہ، سنیچر، اتوار، تین روز پورے علالت میں گزرے، پیر کے دن ظہر کے وقت وفات ہوئی۔ واللہ تعالیٰ اعلم،

آخر میں حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ بھی فرمایا کہ حافظ نے نماز عشاء کی شرکت سے بھی انکار کیا ہے/ جبکہ امام بخاری کی ۵،۶، روایات سے بھی حضور ﷺ کے حجرۂ شریفہ سے نکلنے اور نماز کے علاوہ خطبہ دینے کا بھی ثبوت موجود ہے/ مگر بڑا مغالطہ حدیث ابن یونس ص ۹۵۱ سے ہی لگا ہے جو اس وقت سامنے ہے کیونکہ اسکے شروع میں اگرچہ نماز عشاء کا ذکر صراحۃً موجود ہے مگر آگے راوی نے نماز ظہر کا بھی ذکر کردیا ہے، اس سے حافظ نے عشاء کی شرکت کو ہٹا کر ظہر کی شرکت ثابت کر دیا ہے اور علامہ عینی بھی یہاں چوک گئے کہ انہوں نے بھی غسل کے واقعہ میں ظہر کی نماز تسلیم کر لی، حالانکہ اس واقعہ کا کوئی تعلق نماز ظہر سے نہیں ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے جس عمدگی کے ساتھ اوپر کی محدثانہ بحث فرمائی ہے، وہ بھی آپ کے طرز تحقیق اور ریسرچ کا ایک نمونہ ہے اور عجیب بات یہاں یہ بھی ہے کہ ہمارے اکابر میں سے حضرت اقدس مولانا گنگوہیؒ اور حضرت شیخ الحدیثؒ نے بھی لامع الدراری اور اسکے حاشیہ میں اشکال مذکور اور اس کے حل کی طرف کوئی توجہ نہیں فرمائی۔ حضرت کی عادت مبارکہ تھی کہ کسی اشکال کے موقع سے خاموشی سے گزرنے کو گوارہ کر ہی نہیں سکتے تھے۔ گویا حضرت حل مشکلات کے لئے ہی پیدا ہوئے تھے

۴-قولہ فیصلی عندالاسطوانۃ التی عند المصحف(بخاری ص۷۲):

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہاں علامہ عینیؒ اور حافظ الدنیا ابن حجرؒ دونوں سے غلطی ہوگئی کہ اس اسطوانہ کو جو مصحف کے پاس تھا، اسطوانہ مہاجرین سمجھے شاید مخلقہ ہونے کی وجہ سے مغالطہ لگا ہو، علامہ سمہودی نے اس بارے میں اپنے استاد حافظ ابن حجر کا رد کیا ہے اور کہا کہ وہ دوسرا تھا، اسطوانہ مہاجرین نہیں تھا۔

پھر حضرتؒ نے فرمایا کہ میرے نزدیک علامہ سمہودی کا قول اس بارے میں زیادہ معتبر ہے، علامہ نے اپنی کتاب وفاء الوفا میں ص۲۶۲، ج۱، سے ص۳۲۱، ج۱، تک متعدد جگہ پر پوری تحقیق کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ مصحف شریف کے قریب والے جس اسطوانہ کا ذکر یہاں بخاری شریف میں ہوا ہے، وہ اسطوانہ علم المصلی الشریف تھا اور درمیان میں ص۲۶۴، ج۱، میں اپنے استاد محترم حافظ ابن حجرؒ کی غلطی مع وجوہ اشتباہ بیان کرکے تصحیح کا حق ادا کر دیا۔ پوری بحث اور اسطوانات کی تحقیق نقشہ کے ساتھ انوار الباری جلد نمبر۱۲ میں درج ہے۔

۵-امام بخاریؒ کے رفع یدین پر اتفاق صحابہؓ کے دعوے کی حقیقت:

حضرت شاہ صاحبؒ نے نیل الفرقدین ص۸۷ میں لکھا ہے کہ امام بخاریؒ نے اپنے رسالہ رفع یدین میں دعویٰ کیا ہے کہ تمام صحابہ رفع الیدین پر متفق تھے اور کسی سے ترک کا ثبوت نہیں ہوا۔ یہ امام بخاری کا حسب عادت مبالغہ ہے کیونکہ خود انکے خلیفہ اور تلمیذ رشید امام ترمذیؒ نے ہی اس دعوے کے خلاف فیصلہ دیا ہے، انہوں نے لکھا کہ ترک رفع کے قائل بھی بہت سے اہل علم صحابہؓ و تابعینؒ تھے۔ اور وہی سفیان اور اہل کوفہ کا مذہب ہے/ حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے رسالہ میں ثابت کیا کہ صحابہ میں سے حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابو ہریرہؓ وغیرہ اور تابعین میں سے اصحاب علی، و ابن مسعود، جماہیر اہل کوفہ، بہت سے اہل مدینہ اور دوسرے اہل بلاد سے بھی ترک رفع ثابت ہے۔ اس کے ساتھ اس مسئلہ میں ابن حزم اور ابن قیم کی غلطی کی طرف اشارات کئے ہیں اور حضرت کے رسائل فصل الخطاب، نیل الفرقدین وکشف الستر کا مطالعہ کر کے ہر مستغل بالحدیث حضرتؒ کی نہایت بلند پایہ محدثانہ تحقیقی شان سے واقف ہوسکتا ہے۔

حضرتؒ نے اس موقع پر یہ بھی فرمایا کہ عجیب شان ہے کہ بخاری میں تو زیادہ نہیں

کھلے، مگر اپنے رسائل قراءت ورفع یدین میں حنیفہ کے خلاف خوب تیز کلامی سے کام لیا ہے۔

٦-باب اذا اقیمت الصلواة فلا صلاة الا المکتوبۃ (بخاری ص ٩١)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہاں امام بخاری سے دوغلطیاں ہوگئیں، ایک تو یہ کہ حدیث الباب کی روایت مالک بن بحینہ سے کی، حالانکہ وہ مسلمان بھی نہ ہوا تھا اور یہ صحیح ہے کہ یہ روایت مالک کے بیٹے عبداللہ نے کی ہے، جو صحابی تھے، اور ابن ماجہ میں روایت ان ہی سے کی ہے جو صحیح ہے، دوسری غلطی یہ ہے کہ بحینہ کو مالک کی ماں کا ذکر کیا گیا ہے حالانکہ وہ مالک کی بیوی اور عبداللہ کی ماں ہے۔

پھر فرمایا کہ میرے نزدیک شارع علیہ السلام کا منشا اقامت صلواۃ کے بعد دوسری نماز کی ممانعت مسجد کے اندر ہے، اسی لئے امام ابوحنیفہؒ کا مذہب جواز فی الخارج کا ہے نظر شارع میں داخل مسجد و خارج مسجد کے احکام الگ الگ ہیں/ امام شافعی کا مسلک یہ ہے کہ اقامت صلوات کے بعد کوئی دوسری نماز نہ مسجد کے اندر پڑھ سکتا ہے نہ باہر۔ حالانکہ راوی حدیث حضرت ابن عمرؓ کا فتویٰ موطاء امام مالک میں اور دوسرے راوی حضرت ابن عباسؓ کا فتویٰ معانی الآثار میں موجود ہے کہ صبح کی دو رکعت خارج مسجد پڑھی جائیں اگر چہ امام نے نماز فرض شروع کر دی ہو۔ پھر یہاں ایک حدیث صحیح ابن خزیمہ کی بھی ہے جو عمدۃ القاری ص ١١٧ میں نقل ہوئی ہے کہ حضور ﷺ اقامت نماز کے وقت نکلے تو لوگوں کو دیکھا کہ جلدی جلدی دو رکعت پڑھ رہے ہیں، آپؐ نے فرمایا کہ دو نمازیں ایک ساتھ؟ پھر آپ نے ممانعت فرمائی کہ اقامت ہو جائے تو مسجد میں دوسری نماز نہ پڑھی جائے۔ حافظ کے سامنے صحیح ابن خزیمہ کا نسخہ تھا، جس کے حوالے وہ دوسری جگہ دیتے ہیں، مگر یہاں اس کا ذکر نہیں کیا بلکہ تاریخ بخاری و مسند بزار وغیرہ کا حوالہ دیا ہے، جس میں مسجد کا ذکر نہیں ہے۔

٧-باب دخول المشرک فی المسجد (بخاری ص ٦٧):

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ مشرک کے دخول مسجد کے مسئلہ میں اکابر امت کا اختلاف ہے، حنیفہ کے نزدیک مطلقا جواز ہے، مالکیہ کے نزدیک مطلقا عدم جواز، شافعیہ تفصیل کرتے ہیں کہ مسجد حرام میں ممنوع اور دوسری مساجد میں جائز، (عمدہ) امام محمدؒ کے نزدیک بھی شافعیہ کی طرح مسجد حرام میں دخول مشرک ناجائز ہے، جیسا کہ سیر کبیر اور شامی میں ہے/ امام احمدؒ

سے دو روایت ہیں ایک یہ کہ مطلقا ہر مسجد میں نا جائز ہے، دوسری یہ کہ امام وقت کی اجازت سے جائز ہے، لیکن حرم میں داخلہ کسی بھی حالت میں درست نہیں، جیسا کہ مغنی میں ہے

لہٰذا حدود حرم کی تمام مساجد میں بھی داخلہ جائز نہ ہوگا اور اسی پر اس وقت حکومت سعودیہ کا عمل بھی ہے، پھر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ امام محمدؒ کا مذہب ہی اختیار کرنا چاہئے جو نص قرآن مجید کے ساتھ زیادہ موافق اور دوسرے ائمہ سے زیادہ اقرب ہے، اور حضرت نے اصول و قواعد کے تحت بھی اس مسلک کی مفصل دلائل سے تائید کی۔ یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ حضرتؒ کی ایک خاص شان تحقیق یہ بھی تھی کہ ائمہ حنفیہ میں سے اگر وہ کسی کی رائے کو اپنی نظر میں کتاب و سنت سے زیادہ قریب اور دوسرے مذاہب ائمہ مجتہدین سے اوفق دیکھتے تھے تو اسی کو ترجیح دیا کرتے تھے، خواہ وہ امام ابوحنیفہ کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، جس طرح مسئلہ زیر بحث میں کیا جبکہ عام طور سے دوسری شان اختلافی مسائل میں یہ بھی تھی کہ امام صاحب کی رائے کو ہی ترجیح دیا کرتے تھے اور حضرت شیخ الہندؒ کا بھی مقولہ نقل ہوا ہے کہ میرے نزدیک جس مسئلہ میں امام صاحب دوسروں سے الگ اور منفرد ہوتے ہیں وہاں امام صاحبؒ کی رائے سب سے زیادہ قیمتی اور وزنی ہوتی ہے۔

۸- حدیث صحاح، بخاری وغیرہ انی لاراکم من وراء ظھری:

حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے تھے کہ حضور علیہ السلام کا اپنے پیچھے بھی آگے کی طرح دیکھنا جو اس حدیث سے ثابت ہے بطور معجزہ تھا، اور فلسفہ جدیدہ نے ثابت کر دیا ہے کہ قوت باصرہ تمام جسم میں موجود ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ دنیا میں سائنس وطبعیات میں جو حیرت انگیز ترقیات ہوئی ہیں انبیاء علیہم السلام کے معجزات میں ان کی نظیریں موجود ہیں اور انکے معجزات میں یہ چیزیں قدرت نے اس لئے ظاہر کرائیں کہ یہ آیندہ امت کی ترقیات کے لئے تمہید ہوں اور فرمایا کہ ''ضرب الخاتم'' میں۔

وقد قیل ان المعجزات تقدم بما یرتقی فیه الخلیقة فی المدی اسی کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔

ڈاکٹر اقبال مرحوم نے حضرت شاہ صاحبؒ سے ایسے امور میں کافی استفادہ کیا تھا، وہ خود بھی فلسفہ یونانی واسلامی کے ساتھ عہد حاضر کے فلسفہ مغرب سے خوب واقف تھے اس کے

علاوہ ان کا اسلامیات کا مطالعہ بھی وسیع تھا انہوں نے اپنے مشہور چھ انگریزی لکچروں کی تیاری میں بھی حضرتؒ سے کافی مدد لی تھی۔

ایک دفعہ حضرتؒ نے خود فرمایا تھا کہ جتنا استفادہ جدید معلومات کے سلسلہ میں مجھ سے ڈاکٹر اقبالؒ نے کیا ہے کسی اور نے نہیں کیا/ نیز فرمایا کہ ''ڈاکٹر صاحب علوم قرآن وحدیث پر کافی دسترس رکھتے تھے اور انہوں نے مولانا میر حسن صاحب سیالکوٹی مرحوم سے باقاعدہ پڑھا تھا۔''

علم واصول وعقائد میں حضرتؒ کا علمی وتحقیقی مقام

حضرت شاہ صاحبؒ نے دربارۂ مسائل اعتقادیہ اپنے رسائل اکفار الملحدین عقیدۃ الاسلام اور التصریح بما تواتر فی نزول المسیح میں جمہور سلف وخلف کے عقائد کی تائید میں مفصل دلائل تحریر فرمائے ہیں/ صحیح بخاری کی کتاب التوحید اور ابو داؤد کی کتاب السنہ کے ذیل میں ذات و صفات باری عز اسمہ پر کافی وشافی بحثیں فرمائی ہیں۔

آپ نے مشکلات القرآن ص ۱۴۹ میں محدث ابن خزیمہ کی کلامی خامیوں اور غلطیوں کی طرف بھی اشارات کئے ہیں جب کے اتباع میں علامہ ابن تیمیہ اور ابن قیم وغیرہ نے باب عقائد میں متعدد فاحش غلطیاں کی ہیں۔

اشاعرہ شیخ اکبر اور دوسرے اکابر صوفیہ کے بارے میں علامہ ذہبی اور ابن تیمیہ وغیرہ سے جو افراط وتفریط عمل میں آئی اس پر بھی حضرتؒ نکیر فرمایا کرتے تھے/ اس فن کی غایت اہمیت کے پیش نظر ضروری تھا کہ مثال کے طور پر کچھ ارشادات انوری نقل کئے جاتے مگر مضمون کی طوالت کے خیال سے ترک کئے گئے انوار الباری کے متعدد مواقع میں تفصیلات ملاحظہ کی جاسکیں گی/ ان شاء اللہ۔

علم فقہ میں حضرت کا علمی مقام

حضرت شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے ہر علم میں اپنی رائے رکھتا ہوں مگر فقہ میں نہیں اور حضرت چونکہ تمام فقہائے امت کے مدارج واقدار سے پوری طرح واقف تھے اس لئے ترجیح کا طریقہ جلالت قدر ہی کی بنا پر فرمایا کرتے تھے کسی فقیہ کا کوئی فیصلہ آپ کے سامنے پیش کیا جاتا تو فوراً فرماتے کہ ان سے زیادہ درجہ کے فلاں فقیہ کی رائے دوسری ہے وہ اختیار کی جائیگی یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ فقہاء نے صرف نزاع وجدال کی صورتوں کے لئے احکام لکھے ہیں، باہمی مسامحت والے معاملات کے لئے نہیں اس لئے ان میں شدت نہ کی جائے۔

مثلاً فقہاء نے لکھا کہ قربانی کے حصوں کا گوشت تول کر تقسیم کیا جائے اس پر فرماتے تھے کہ اگر کمی بیشی کی وجہ سے باہم دلوں کے اندر خیال وملال پیدا نہ ہو تو وزن کی کوئی ضرورت نہیں۔

۱۹۲۷ء میں حضرت نے جمعیۃ علماء ہند کے سالانہ اجلاس پشاور کے خطبہ صدارت میں دار الحرب، دار الاسلام و دار الامان کی فقہی تشریحات کیں/ حب وطن کی شرعی حیثیت واضح کی آیات سورۂ بقر الاالذین عاھدتم من المشرکین ثم لم ینقصو کم شیئاو لم یظاھرو علیکم احدا فاتموا الیھم عھدھم اور فما استقامو لکم فا ستقیمو الھم سے نیز حدیث نبوی ذمة المسلمین واحدة یسعی بھا ادناھم وغیرہ سے استشہاد کر کے ثابت کر کے فرمایا کہ اگر ہندوستان کے غیر مسلموں کے ساتھ برابری حقوق اور شرع اسلامی کے تحفظ کی بنیاد پر کوئی معاہدہ ہو اور وہ اس پر صدق دلی کے ساتھ پابندی بھی ہوں تو باہر سے کسی اسلامی حکومت کے حملہ کا خطرہ نہیں ہوسکتا نہ اس کو ایسے اقدام کا حق ہے نہ مسلمانان ہند اس کا ساتھ دینگے مسلمانوں کا اسلامی فرض ہے کہ وہ معاہدہ کے تحت ملک کے ساتھ پوری پوری وفاداری برتیں۔

مقالہ ضرورت سے زیادہ طویل ہوگیا، اس لئے معافی چاہتا ہوں۔ میرا مقصد یہ تھا کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے نہایت ہی رفیع و بلند علمی مقام کی کچھ نشاندہی کروں، کیونکہ میں حضرت کو بحیثیت مذکورہ نوادر امت میں سے ایک نادرہ خیال کرتا ہوں اور جتنا بھی حضرت کے علوم وافادات میں غور وفکر کرنے کا موقع میسر ہوا اور ہو رہا ہے میرے دل ودماغ پر آپ کی عبقریت، آپ کی انفرادیت ولامثالی شان کا یقین واذعان بڑھتا جا رہا ہے۔ اگرچہ میں اس کے اظہار وبیان پر کماحقہ قادر نہیں ہوں۔

حضرتؒ کے علوم وکمالات پر نفحۃ العنبر (حضرت مولانا نبوری مرحوم)، حیات انور (مرتبہ مولانا ازہر شاہ قیصر) ''مولانا انور شاہ کشمیری کی حیات اور علمی کارنامے'' (دکتور قاری محمد رضوان اللہ) اور ''الانور'' (فاضل نو جوان عبد الرحمان کوندو کشمیری) میں کافی اور وافی ذخیرہ آچکا ہے۔ مگر اس سے بھی زیادہ کی ضرورت ہے اور سب سے بڑی ضرورت حضرتؒ کی شایان شان علمی یادگار کی ہے۔ اگر آل جموں وکشمیر اوقاف ٹرسٹ اس طرف توجہ کرے تو یہ اس کا عظیم کارنامہ ہوگا۔

میں محترم المقام شیخ محمد عبد اللہ وزیر اعلیٰ جموں وکشمیر وچیئر مین آل جموں وکشمیر مسلم اوقاف ٹرسٹ کے اس سمینار کو منعقد کرنے کے اقدام کو مستحق صد تحسین وتبریک سمجھتا ہوں اور سب ہی کارپردازان سمینار کے شکریہ پر اس مقالہ کو ختم کرتا ہوں۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی

درسی خصوصیات

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ

حضرت شاہ صاحب پر میری پہلی نظر پڑی تو ایسا معلوم ہوا کہ معنوی معصومیت کو دیدہ اور مرئی قالب میں ڈھال کر کسی نے رکھ دیا ہے آنکھوں میں معصومیت، چہرے پر معصومیت، لبوں میں معصومیت از سرتا پا ہمہ تن معصومیت/حسن کردار کا مجسمہ، عفاف واستغناء صفاء قلب وتقوی کی ڈھلی ہوئی کوئی گڑیا جو کچھ باہر میں ہے وہی سب کچھ اندر بھی ہے۔ سنہرا دمکتا ہوا چہرہ۔ جس پر رونق ونضارت شادابی وتروتازگی کھیل رہی تھی۔ نثار ہو رہی تھی داڑھی کے بال سیاہ حد سے زیادہ سیاہ زردی مائل سرخی کی جھلک کے ساتھ روئے انور کے رنگ کا ایک جان بخش دل آویز نظارہ میری نگاہوں کے سامنے آیا۔(۱) حضرت الاستاد الامام کا شباب کا زمانہ تو شاید نہ تھا۔ غالباً چالیس سے اس وقت عمر مبارک متجاوز ہو چکی ہوگی۔ لیکن آب ورنگ کی تازگی وشادابی ایسی تھی کہ ہزار ہا ہزار شبابی مظاہر اس پر نثار تھے۔ غالباً چھوٹی سی دستی میز پر کتاب تھی یہ میر زاہد رسالہ تھا۔ شاہ صاحب نے کتاب کھولی وہ کتاب کھول رہے تھے۔ اور میرے جسم پر رعشہ طاری تھا۔ پیشانی پسینہ سے شرابور، کانپ رہا تھا۔ دیکھئے کہاں سے پوچھتے ہیں کیا پوچھتے ہیں۔ شاید ابتدائی ورق ہی میں خیال آتا ہے۔ کہ **بتحقق کل فرد منہ بعد تحقق الموصوف** کے الفاظ سے **العلم المتجدد** کی تعریف میر زاہد نے جو کی ہے دریافت فرمایا گیا کہ اس عبارت کا مطلب بیان کرو۔ یہ وہی مقام تھا جس کے **مالہ وماعلیہ** کے پڑھنے میں تقریباً ایک مہینہ ٹونک کی درس گاہ میں صرف ہو چکا تھا۔ **میرز اھد کامنھیہ غلامہ یحیٰ** کے حواشی **عبد العلے بحر العلوم العلامہ** کے اضافے مولوی عبدالحق خیرآبادی نے اپنے حاشیہ میں ان سب پر جو کچھ لکھا تھا۔ اور خود استاذ مرحوم کا ذاتی حاشیہ اس مقام پر جو تھا۔ سب ہی کو گھونٹے ہوئے اور پیئے ہوئے تھا۔ لیکن جواب تو وہ دے جو اپنے آپ میں موجود بھی ہو تین چار دن یا کم بیش ایک ہفتہ کے اس عرصہ میں جو

دارالعلوم کے احاطہ میں داخلہ کے اس امتحان سے پہلے گزرا تھا۔ حضرت شاہ صاحب کے فضائل و کمالات علمی تبحر اور غیر معمولی معلومات ومخزونات کے ذکر سے دل اس حد تک مرغوب ہو چکا تھا کہ جس وقت پوچھا گیا مطلب بیان کرو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کبوتر شاہین کے پنجوں میں آ گیا ہے نہ ہوش ہی باقی تھا اور نہ حواس کچھ یاد نہیں کہ بدحواسی کے اس عالم میں منہ سے کیا اول فول بے تکی باتیں بے ساختہ نکلیں۔ ایک دو سال ہی کے بعد کتاب بند ہوگئی اور اجازت اٹھ جانے کی عطا فرمائی گئی۔ جس وقت اٹھا اس یقین کے ساتھ اٹھا کہ دارالعلوم سے روانگی کا نظم کر لینا چاہئے۔ داخلہ کے لئے جس قابلیت کی ضرورت مدرسہ قانون کی رو سے ہے اس معیار پر جس حد تک کوئی کھوٹا ثابت ہوسکتا ہے میں نے محسوس کیا کہ قسمت نے آج وہی مجھے ثابت کر دیا، اٹھا اور سفر کے خیال کو دماغ میں لے کر اٹھا، منہ خشک تھا لب پر پپڑیاں تھیں۔ واپس ہوتے ہوئے دوسرے ہم چشم طلبہ کے خیال سے مصنوعی اطمینان کی کیفیت کو دل سے چہرے پر منتقل کرنے کی کوشش اترتے ہوئے سیڑھی کے زینوں پر کرتا رہا نیچے اترا۔ ساتھیوں میں پہونچا دل کے خیال کو دل ہی میں دبائے رکھا۔ واقعہ کا علم ان لوگوں کو خود ہو جائے گا کہ داخلہ کی اجازت اس منحوس طالب العلم کو دورے میں شریک ہونے کی نہیں ملی۔

بات بہت پرانی ہو چکی ہے۔ ہلکا ہلکا سا خیال اس کا بھی آتا ہے کہ میر زاہد رسالہ کے ساتھ غالباً ہدایہ اولین میں بھی میرا امتحان لیا گیا۔ ہدایہ اولین کا کچھ حصہ ٹونک میں اپنے پنجابی استاد سمینہ (ملتان) کے رہنے والے مولانا محمد اشرف[1] مرحوم سے خصوصی طور پر فقیر نے پڑھا تھا۔ ورنہ عام طور پر ہدایہ اولین درس نظامیہ کے نصاب میں شریک نہیں ہے جو حشر میر زاہد رسالہ کے امتحان کا میری نظروں میں ہوا تھا۔ شاید وہی کچھ انجام ہدایہ اولین کے امتحان کا ہوا ہو۔ میر زاہد والی بات تفصیلاً اب تک یاد ہے لیکن ہدایہ کا خیال کچھ مٹ سا گیا ہے۔

بہر حال امتحان کے قصے میں جو کچھ گزری تھی اسے دل ہی میں دبائے اور دارالعلوم سے وبوریا بستر اٹھا لینے کی اندرونی فکروں میں ہی الجھا ہوا تھا کہ اچانک حکیم منظر حسن صاحب ہی نے غالباً یہ خبر سنائی کہ آپ کے امتحان کی بڑی تعریف ہو رہی ہے۔ اور داخلہ آپ کا دورے میں منظور کر لیا گیا ہے۔

اب یہاں سے حافظہ کچھ جواب دے رہا ہے۔ تفصیلات پر نسیان وذہول کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ بعض باتوں کا خیال بھی آتا ہے تو چاند کی اس روشنی کی طرح جو گھنگور گھٹا کے

کسی پھٹے ہوئے حصے سے اچانک نمودار ہوتی ہو اور پھر چھپ جاتی ہو اور کیا کیا صورتیں اس سلسلہ میں پیش آئیں یاد نہ رہیں۔ بس اب اتنا یاد رہ گیا ہے جس امتحان کے متعلق اپنی ناکامی کا قطعی یقین مجھ میں پیدا ہو چکا تھا۔ ثابت ہوا کہ وہ یقین نہیں صرف وہم تھا۔ اور حضرت الاستاذ العلامہ الکشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے خاکسار کے داخلہ کی سفارش اس امتحان کے بعد فرمائی ہے۔

کتابیں مل گئیں اور کچھ دنوں بعد غالباً شوال کی ۲۰۔۲۱ سے باضابطہ درس دورہ کا جاری ہو گیا۔ دیوبند میں تعلیم پانے والے تو دورہ کی اصطلاح سے واقف ہی ہیں۔ لیکن جن کے لئے مدرسہ کی یہ اصطلاح اجنبی ہو۔ ان کے لئے اتنی بات کہہ دینی چاہئے کہ صحاح ستہ حدیث دورے کی مشہور و مسلمہ کتابوں کو ایک ہی سال میں بطریقہ سرد پڑھانے کا قاعدہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ مدینہ منورہ سے سیکھ کر ہندوستان تشریف لائے۔ اور اسی طریقہ درس کو آپ نے یہاں جاری کیا۔ طریقہ یہ تھا کہ حدیثوں کے معنی و مطالب، مشکلات وغیرہ کے متعلق جو کچھ پڑھانا ہوتا تھا۔ وہ مشکوۃ شریف میں پڑھا دیا جاتا تھا۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا تو قاعدہ تھا کہ ایک دن مشکوۃ کی حدیثیں پڑھاتے اور دوسرے دن ان ہی حدیثوں کے متعلق علامہ طیبی کی شرح کا درس طلبہ کو دیتے۔ اسی طرح سے مشکوۃ جب ختم ہو جاتی تھی۔ تب دوسرے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحاح ستہ کی حدیثوں کی سند کو متصل کرنے کے لئے مشکوۃ ہی کی حدیثوں کو اس میں سند کے بغیر پڑھائی گئی تھیں۔ اب سند کے ساتھ اس طور پر پڑھاتے کہ طالب علم حدیثوں کو پڑھتا جاتا اور استاد سنتا جاتا بیچ بیچ میں خاص اہم بات کا ذکر ضروری معلوم ہوا تو ذکر کر دیا گیا۔ یوں روزانہ پانچ ورق چھ ورق ہو جاتے۔ حضرت شاہ صاحب نے حدیث کے درس کے اس طریقہ کا نام طریقہ سرد رکھا ہے لکھا ہے کہ مدینہ منورہ کے عام اساتذہ حدیث کا یہی دستور اس زمانہ میں تھا۔ جب وہ حدیث کا علم حاصل کرنے کے لئے ہندوستان سے سفر کر کے مدینہ منورہ پہونچے تھے۔ اسی سرد کے لفظ کا ترجمہ سمجھئے یا زیادہ مانوس لفظ میں اسی کی تعبیر دورہ کے لفظ سے دارالعلوم دیوبند میں مشہور ہو گئی ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے کے حساب سے دارالعلوم والے دورے یا طریقہ سرد میں اتنی ترمیم اور کر دی گئی تھی کہ اہل حدیث کا نیا فرقہ ہندوستان میں جو اٹھ کھڑا ہوا تھا اور حنفی مذہب کے متعلق یہ شہرت دینے لگا کہ کلیۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کیخلاف امام ابوحنیفہ نے اپنے ذاتی قیاسات سے اسلامی شریعت کا ایک مستقل نظام قائم کر دیا تھا۔

اسی مغالطہ کے ازالہ کے لئے اکابر دیوبند میں سب سے پہلے حضرت مولانا گنگوہی

رحمتہ اللہ علیہ نے حدیث کے درس میں اس التزام کا اضافہ کیا کہ حنفی مذہب کے جن مسائل کے متعلق فرقہ اہل حدیث نے مشہور کر رکھا ہے کہ صریح حدیثوں کے وہ مخالف ہیں ان کے اس الزام کا سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا جائے۔ دارالعلوم دیوبند میں طریقہ سرد کے ساتھ اس الزام کو باقی رکھا گیا تھا اور بحمد اللہ اب تک اس کا سلسلہ جاری ہے اگر چہ وہ محاذ اہل حدیث طبقہ نے قائم کیا تھا۔ تقریباً ٹوٹ پھوٹ کر ختم ہو چکا ہے لیکن مبادا کہ پھر یہ فتنہ سر نہ اٹھائے۔ دارالعلوم میں اب تک تروتازہ حالت میں درس حدیث کا یہ التزام زندہ و پائندہ ہے اور جہاں تک میرا خیال ہے اس کو اسی طرح جاری رکھنا چاہئے۔ اس سے جامد تقلید کی سمیت کا ازالہ بھی ہوتا رہتا ہے اور حنفی مسلک پر علمی بصیرت کے ساتھ قائم رہتا ہے گزشتہ ادیان و مذہب میں یہ حادثہ پیش آ چکا ہے کہ بنیادی تعلیم سے ہٹتے ہوئے لوگ فروعی مباحث میں کچھ اس طرح منہمک اور مستغرق ہو گئے کہ بنیادی تعلیم کے سارے وثائق ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو کر رہ گئے۔ اسلام کی منجملہ دوسری خصوصیتوں کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ ابتدا ہی سے کچھ ایسے قدرتی اسباب پیش آتے رہے جن سے مذہب و ادیان کے اس عام عارضہ کا ردعمل مسلسل ہوتا رہا۔ خدا خنک اور ٹھنڈی رکھے امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کی قبر مبارک کو کہ دوسری صدی ہجری ہی میں سب سے پہلے وہی اس سلسلہ میں چونکے، خطیب نے بغداد کی تاریخ میں نقل کیا ہے کہ امام مالک اپنے استاذ کے حلقہ درس سے فارغ ہو کر امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ عباسیوں کے جدید دارالسلطنت بغداد جب تشریف لائے اور وہاں کی جامع مسجد میں اہل علم کی درسگاہوں کا جب آپ کو تجربہ ہوا دیکھا کہ چالیس پچاس کے قریب حلقے قائم ہیں۔ لیکن جس حلقہ میں بھی پہونچتے وہاں نہ قال اللہ کا ذکر تھا اور نہ قال الرسول کا بلکہ فرماتے تھے کہ **ھم یقولون قال اصحابنا** (تاریخ بعداد ص ۶۱ ج ۲) ان میں ہر ایک یہی کہتا کہ ہمارے اصحاب یعنی اساتذہ نے یہ کہا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امام کی دینی حمیت کی رگ پھڑک اٹھی۔ اسی طرز عمل کا جو انجام ہو سکتا تھا وہ ان کے سامنے آ گیا اور ٹھیک جیسے اس زمانہ میں ہر پارلیمانی مجلس میں ایک اپوزیشن پارٹی بھی قائم ہو جاتی ہے اور نہیں ہوتی ہے تو ایسی صورتیں نکالی جاتی ہیں کہ ارکان پارلیمان کی لگام کھینچنے کے لئے کسی نہ کسی طرح مخالفانہ تنقید کرنے والوں کی ٹولی پیدا ہو جائے کچھ اس نوعیت کی خدمت حضرت امام شافعی سے بن آئی انہوں نے بھی اپنا حلقہ بغداد ہی کے جامع میں قائم فرمایا۔ اور بجائے اصحابنا کے قال اللہ اور قال الرسول کے سننے کا عادی لوگوں کو آپ نے اس طرح بنا دیا

کہ خطیب نے اسی موقعہ پر نقل کیا ہے۔

حتی ما بقی فی المسجد حلقة غیره — یہاں تک کہ مسجد میں امام شافعی کے سوا کوئی دوسرا حلقہ باقی نہ رہا۔

اس سلسلے میں حضرت امام شافعی میں فرض کا احساس شدت پذیر ہوتے ہوئے اس حدتک پہونچ گیا تھا کہ اس راہ میں اپنے استاذ امام حضرت امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کے احترام کی بھی دیکھا گیا کہ اس راہ میں ان کو پروانہ ہوئی بیہقی کا بیان ہے کہ

''امام شافعی کو جب اس کی اطلاع ملی کہ امام مالک کے تلامذہ بجائے یہ کہنے کے کہ اللہ نے یہ فرمایا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے، عموماً اپنے حلقوں میں کہتے ہیں کہ امام مالک کا قول یہ ہے تو میں نے ایک سال تک استخارہ کیا اور اس کے بعد میں نے اعلان کیا کہ امام مالک جو کچھ بھی ہوں۔ بہر حال آدمی تھے اور آدمی سے غلطیاں سرزد ہوتی ہیں''۔

بیہقی نے اس قصے کو نقل کر کے آخر میں لکھا ہے کہ:

فدعاه ذلک الی تصنیف الکتاب فی اختلافه معه — اور اسی احساس نے امام شافعی کو آمادہ کیا امام مالک کے مقابلے میں کتاب تصنیف کریں۔

اس معاملہ میں امام شافعی کا جو حال تھا اس کا اندازہ اس قسم کی روایتوں سے بھی ہوتا ہے الی التاسیس میں حافظ ابن حجر نے نقل کیا ہے کہ کسی نے امام شافعی سے کوئی مسئلہ دریافت کیا۔ جواب میں آپ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اس مسئلہ میں یہ ہے لیکن پوچھنے والا جو لوگوں کا بگاڑا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ آپ فرمایئے کہ اس بات میں آپ کی رائے کیا ہے؟ اس کے منہ سے یہ الفاظ نکل رہے تھے اور امام شافعی کا خون کھول رہا تھا۔ اپنی بات پوچھنے والے نے جب ختم کی تو وہ سن رہا تھا کہ امام کی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکل رہے ہیں۔

''بھلے آدمی! تو نے کیا میری کمر پر زنار (جھینو) دیکھا۔ یا کسی گرجے سے نکلتے ہوئے مجھے کبھی دیکھا ہے؟ میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم نے یہ فرمایا اور تو پھر بھی پوچھتا ہے کہ میری رائے کیا ہے''۔ (تعالی ص ۶۳۰)

سچ تو یہ ہے کہ حضرت امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ نے اسلام کی ابتدائی صدیوں میں مسلمانوں کو اسلام کے بنیادی وثائق الکتب والسنتہ کی طرف واپس لے جانے کا رواج قائم فرمادیا

میرا تو خیال بھی ہے کہ تھوڑے وقفہ سے ان ہی کی آواز بازگشت اسلامی ممالک میں گونجتی رہی جب کبھی دین کے حقیقی سرچشموں یا کتاب وسنت اسے مسلمان کسی ملک میں دور ہوئے تو اپوزیشن پارٹی (عرب الاختلاف) کسی نہ کسی شکل اور نام سے عموماً نکل پڑی ہے اور اپنے تنقیدی ہنگاموں سے مسلمانوں کو ہمیشہ مجبور کرتی رہی ہے کہ۔ کتاب وسنت پر پیش کر کے پھر اس دستور کو جانچ لیں جس کی پیروی دین کے نام سے وہ کر رہے ہیں۔

اسلامی علماء کی اسی اپوزیشن پارٹی کے مشہور سرگرم ممبر حافظ ابن حزم اندلسی جو ظاہریوں کے ممتاز پیشواؤں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے زمانہ میں بھی یہی صورت پیش آئی تھی۔ ابوبکر ابن العربی صاحب احکام القرآن وشارح ترمذی نے اپنی کتاب "العواصم والقواصم" میں لکھا ہے کہ ایک ایسا وقت بھی اندلس کے مسلمانوں پر آ گیا تھا جو مالکی مذہب کے پیرو تھے کہ قرآن وحدیث یعنی الکتاب دانستہ تو دور کی بات تھی ابن العربی کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے کہ:

"لوگوں نے امام مالک اوران کے جلیل القدر ممتاز تلامذہ کا ذکر بھی ترک کر دیا۔ بلکہ عام رواج یہ ہو گیا تھا۔ فتوی دیتے ہوئے لوگ کہتے کہ قرطبہ والے یہ کہتے ہیں۔ طلیطلہ کے مولویوں کا خیال یہ ہے"۔

طلیطلہ کے علماء کا قول یہ ہے:

ابن العربی کے آخری الفاظ یہ ہیں کہ

فانتقلوا من المدینة رفقهائها الی طلبیرہ و طریقها (القواصم و العواصم) — لوگ مدینہ اور مدینہ کے فقہاء کو چھوڑ کر طلبیر اور طلبیرہ کے راستے پر چل پڑے تھے۔

قرطبہ طلیطلہ طلبیرہ یہ اندلس کے ان شہروں کے نام تھے، جو ابن حزم کے زمانہ میں دینی علوم کی مرکزیت میں غیر معمولی شہرت حاصل کئے ہوئے تھے گویا اس زمانہ میں ہندوستان کے اندر دیوبند سہارنپور، فرنگی محل، بریلی، بدایوں، دہلی وغیرہ شہروں کا جو حال ہے یا یوں سمجھئے کہ ہندوؤں میں کاشی متھرا، ہردوار، کورک شیتر، پراگ جیسے مذہبی مقامات کی جو نوعیت ہے۔ یہی کچھ نوعیت اندلس کے ان شہروں کی مسلمانوں کے عہد حکومت میں تھی۔ حافظ ابن حزم اور ان کے ماننے والوں کو جہاں تک میرا خیال ہے مذہب کی آزاد تنقید پر بغیر کسی رو رعایت کے اسی حال نے آمادہ کیا تھا۔

اور دور کیوں جائیے۔ خود ہمارے ملک ہندوستان کو بھی اسی زمانہ میں جب مسلمانوں نے اس کو اپنا وطن بنایا تھا اور ان وطن بنانے والوں میں زیادہ تعداد خراسان اور ماوراء النہر وغیرہ

علاقوں کے مسلمانوں کی تھی۔ ان کی دینی ذہنیت کا اندازہ اس مشہور تاریخی مناظرہ سے ہوتا ہے جو غیاث الدین تغلق کے دربار میں مسئلہ سماع پر ہوا تھا۔ ایک طرف خراسان اور ماوراء النہر کے نو وار د مولوی تھے جو ہندوستان پہونچ کر شیخ الاسلام اور قضا و افتا کے عہدوں پر سرفراز تھے۔ اور دوسری طرف صوفیوں کے سرخیل و امام حضرت سلطان جی نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ تھے مسئلہ جب چھڑا اور سلطان جی کی طرف سے بجائے فقہ کی کسی کتاب سے صحیح مسلم وغیرہ جیسی حدیث کی کتابوں کی روایتیں پیش ہونے لگیں۔ جن سے جواز سماع کا پہلو پیدا ہوتا تھا۔ تو خود سلطان جی کا مشہور بیان ہے کتابوں میں یہ فقرے آپ کی زبانی نقل کئے گئے ہیں کہ مناظرہ کی مجلس سے اٹھ کر جب اپنے لوگوں میں سلطان جی تشریف لائے تو فرمایا کہ:

در معرض حجت احادیث صحیح حضرت مصطفےٰ ﷺ نمی شنود ہمیں گوئند کہ در شہر ما عمل بروائت فقہ مقدم ست بر حدیث۔ (سفرنامہ ضیاء الدین برنی)

یعنی مقابلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیثوں کو (یہ خراسانے مولوی) نہیں سنتے تھے۔ اور یہی کہے چلے جاتے تھے کہ ہمارے شہر (دہلی) میں حدیث کے مقابلہ میں فقہ کی روایتوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔

خیر میں کہاں کی ہانکنے لگا۔ عرض یہ کر رہا تھا کہ مغلوں کے زوال حکومت کے بعد جب سلطنت کا دباؤ اٹھ گیا اور براہ راست اس کے بعد دلوں میں اس قسم کے خیالات پیدا ہوئے۔ یا پیدا کرنے والوں نے مختلف حیلوں سے کام لے کر مسلمانوں میں انتشار و افتراق کی وبا پھیلانے کے لئے ان خیالات کو پیدا کرایا جن میں ایک حادثہ یہ بھی تھا کہ ہندی مسلمانوں کی دینی زندگی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی مخالف ثابت کرنے کی کوشش ملک کے مختلف گوشوں میں جاری ہوئی اور ان مسلمانوں کے پیشوا اور امام حضرت امام ابوحنیفہ کو لعن طعن کا نشانہ چاروں طرف سے بنالیا گیا تھا تو گو بذات خود اس تحریک کو آپ جو کچھ بھی قرار دیں۔ لیکن خیر کا بہترین پہلو اسی شر سے یہ نکل آیا کہ جس ملک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں سے زیادہ فقہاء کے اقوال اور فتووں کو اہمیت دینے کا دستور چلا آ رہا تھا۔ اس میں ایک نئی ہلچل پیدا ہوئی۔ اور حنفی علماء کے ایک طبقہ نے سنجیدگی کے ساتھ واقعی حنفی مذہب کے مسائل کا کتاب و سنت سے بغیر کسی جنبہ داری کے مقابلہ کر کے جائزہ لینا شروع کیا ان کی سعی اس باب میں مشکور ہوئی اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف بہتانوں کا طوفان اٹھایا گیا تھا۔ ان کی کوششوں سے خدا خدا کر کے بیٹھ گیا۔ انہوں نے حنفی

مذہب کے ایک ایک جزئیہ کے متعلق احادیث و آثار کا ذخیرہ جمع کر کے رکھ دیا کتابیں بھی لکھیں گئیں۔لیکن کتابوں سے زیادہ موثر اور کارگر مفید طریقہ اس میں حدیثوں کے درس کا دیوبندی طریقہ ثابت ہوا۔اسی کا نتیجہ ہے بلاخوف تردید اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ حنفی مذہب کا ایسا کوئی جزئیہ نہیں نکالا جاسکتا جس کے متعلق آپ کو دیوبندی درس کے پڑھے ہوئے مولوی حدیث آثار صحابہ سے تائیدی موادنہ پیش کر سکتے ہوں۔باتیں عام ہوگئیں کے دمہ تک ان باتوں کو درس کے اسی عام طریقہ نے پہونچا دیا اب ایک حنفی حنفی مذہب پر عمل ضرور کرتا ہے۔لیکن اس لئے نہیں کرتا کہ وہ صرف امام حنیفہ کا فتوی یا ان کی رائے ہی ہے بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی جانتا ہے کہ یہی اقتضاء فلاں فلاں حدیثوں کا بھی ہے اور یہی طرز عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں سے فلاں فلاں صحابی کا بھی تھا۔یعنی یہ طریقہ ان بزرگوں کا ہے جن کا ذکر کرتے ہوئے اس میں فرمایا گیا ہے۔

تراھم رکعاً سجدا یتبغون فضلا من اللّٰہ و رضوانا سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود (فتح)	تو دیکھتا ہے ان لوگوں کو رکوع کرتے ہوئے سجدے کرتے ہوئے ڈھونڈتے ہیں وہ اللہ کے فضل اور اسکی خوشنودیوں کے صلاح کے نشانات (جھلکتے ہیں) ان میں سجدوں کے اثر ہے۔

بھلا قرآن میں جن کے نمازوں اور جن کے رکوع جن کے سجدوں کی تعریف کی گئی ہو۔حرف گیری کی ان ہی کے متعلق گنجائش ہی کیا باقی رہتی ہے۔

الغرض حدیث کے درس کے اس دیوبندی طریقہ نے مسلمانان ہند کے دینی تعلقات کو دین کے اصلی سرچشموں اور حقیقی بنیادوں (الکتاب والسنۃ) کے ساتھ وابستہ کر کے نئے سرے سے پھر تروتازہ اور شگفتہ کردیا اور ان کی تقلید کے اسی تحقیقی پہلو نے:

اتخذوا احبارھم و رھبانھم اربابا من دون اللہ	بنالیا (یہود و نصاری) نے اپنے علماء اور مشائخ کو اللہ کے سوا اپنا رب۔

کی قرآنی لعنت سے ان کو ان کے دین کو بحمد اللہ محفوظ کر دیا اور یہی میں کہنا چاہتا تھا کہ درس حدیث کی اس خصوصیت کو جب تک زندہ رکھا جائے گا اور وہی اہمیت اس کو حاصل رہی جو پچھلے دنوں میں تھی۔اور اس وقت تک جہاں تک میں جانتا ہوں کسی قسم کی لاپروائی اس سے اختیار نہیں کی گئی ہے تو مسلمانان ہند کی دینی زندگی قرآن سے ذکر کردہ اس زہر سے انشاء اللہ پاک رہے گی۔واللہ ولی التوفیق

میں قلم روک رہا ہوں مگر وہ رک نہیں رہا ہے۔ مفید خیالات سامنے آتے چلے جاتے ہیں۔ میں بھی لکھتا ہی چلا گیا ورنہ ذکر تو اس کا ہو رہا تھا کہ ۱۳۳۰ھ کے ماہ شوال کی ۲۱ یا ۲۲ تاریخ یا اس کے قریب قریب کسی تاریخ میں جہاں تک میرا حافظہ مجھے یاد دلا رہا ہے دورۂ حدیث کے آغاز کی خبر مجھ تک پہنچی۔ اب یہ یاد نہیں رہا کہ باضابطہ کسی نوٹس کے ذریعہ یہ اطلاع شائع ہوئی تھی یا افواہاً یہ خبر طلبہ میں پھیل گئی، زیادہ احتمال دوسری صورت ہی کا ہے اور فقیر بھی دورے کے دوسرے طلبہ جن کی تعداد صحیح طور پر تو محفوظ نہ رہی۔ مگر ستر اسی کے درمیان غالباً ہوگی (۱۳۳۰ھ کے داخلہ کی تعداد اس سال کی روداد میں مل سکتی ہے)۔

بہر حال اب تک دس پندرہ سے زیادہ ساتھیوں کے ساتھ پڑھنے کا موقعہ ساری زندگی میں جسے نہیں ملا تھا۔ اسی کے لئے طلبہ کے اس جم غفیر کے گویا میلے یا جھیلے میں پڑھنے کا نیا بالکل نیا تماشا اور نیا تجربہ تھا۔ اس میں یو پی بہار کے سوا بنگال پنجاب۔ سرحد، کشمیر، کابل قندھا، بخارا اور غالباً چینی ترکستان کاشغر وغیرہ کے طلبہ بھی تھے۔

بہرحال یوں اب صحیح طور پر یاد نہیں رہا کہ ہفتہ یا ہفتہ سے زیادہ دن گزرے کے درس کا اعلان ہوا۔ معلوم ہوا کہ کل سے دورے [1] کے اسباق شروع ہوں گے۔ کتابیں جن کے اسباق شروع ہونے والے تھے۔ کتب خانے سے برآمد کرلی گئی تھیں۔ صبح کی نماز کے بعد ہی معلوم ہوا کہ سب سے پہلے حضرت سیدنا الامام الکشمیر ی کے یہاں صحیح مسلم کا سبق شروع ہوگا۔ طلبہ کا ہجوم تھا۔ ان ہی کے جھیلے میں خاکسار بھی نودرہ کی چھت کے شمالی سمت پر جو ایک کمرہ تھا اسی میں حاضر ہوگیا۔ اتنی بڑی تعداد والی جماعت میں شریک ہوکر پڑھنے کا یہ پہلا اتفاق تھا خیال آتا ہے کہ صحیح مسلم کا اتفاقاً وہی نسخہ مجھے کتب خانے سے ملا تھا، جو اپنے طول وعرض میں حدیث کی دوسری کتابوں کے مقابلے میں غیر معمولی طور پر ممتاز تھا۔ لیکن کرتا کیا اسی طویل وعریض کتاب کو لیکر کوٹھے پر چڑھ گیا۔ درس کے کمرے میں لکڑی کی چھوٹی چھوٹی تپائیاں رکھی ہوئی تھیں طالب علموں نے ان ہی تپائیوں پر قبضہ کرلیا۔ ایک تپائی میرے حصہ میں بھی آئی۔

خیال تھا کہ جیسے عام طور پر ہمارے مدارس کا دستور ہے طلبہ کتاب کی عبارت پڑھیں گے اور حضرت شاہ صاحب پھر اس عبارت کا مطلب اور ترجمہ طلبہ کو بتائیں گے۔ لیکن پہلی دفعہ درس کے ایک نئے طریقہ کے تجربہ کا موقع میرے لئے یہ تھا کہ بسم اللہ بھی کتاب کی شروع نہیں ہوئی تھی۔ کہ علم کا ایک بحر بے کراں بلا مبالغہ عرض کر رہا ہوں ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میرے دل و

دماغ کے ساحلوں سے ٹکرانے لگا۔

ایسے اساتذہ (غفراللہ لہم) سے بھی پڑھنے کا موقعہ ملا تھا جو کتاب کو شروع کراتے ہوئے غیر ضروری طور پر اس قسم کی عام باتوں کا تذکرہ عموماً کیا کرتے ہیں کہ مصنف نے خدا کی حمد سے کتاب کیوں شروع کی اور اسی عام سوال کو اٹھا کر اس کا مقررہ جواب کتابوں میں لکھا ہے۔ لفظوں کے الٹ پھیر سے دہرانے کے عادی تھے۔ "صلوۃ" کی شرح اور مختلف امور کی طرف اس لفظ کا انتساب اس کے معانی میں کن تبدیلیوں کو پیدا کرتا ہے۔

الغرض مسلمان مصنفوں کی کتابوں کے دیباچہ کے عمومی اجزاء کے متعلق سوال و جواب رودقدح کا موروثی سرمایہ حواشی و شروح میں جو منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے اسی کو غریب طالب علموں پر پیش کر کے اپنی علمی وسعت کو ظاہر کرتے تھے۔ لیکن امام الکشمیری نے قبل اس کے کہ کتاب کا کوئی لفظ بھی شروع ہوا ہو۔ ایک خاص قسم کی دلکش، ترنم آمیز آواز میں تقریر شروع کی کس کس موضوع سے اس تقریر کا تعلق تھا۔ تقریباً چالیس سال بعد اس کا دہرانا آسان نہیں ہے لیکن بعض انقلابی تاثرات کا نشان حافظے پر جہاں تک خیال کرتا ہوں اب بھی باقی ہے۔

جاننے والے جانتے ہیں کہ صحیح مسلم کی خصوصیت یہ ہے کہ بطور مقدمہ کے شروع کتاب میں امام مسلم رحمتہ اللہ علیہ نے حدیث کے بعض بنیادی کلیات اور اساسی اصول ونظریات کی طرف سیدھے سادے الفاظ میں ایسے بلیغ و عمیق اشارے کئے ہیں جن کے صحیح وزن کو فن سے ناواقف آدمی محسوس نہیں کر سکتا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ امام مسلم کے بعد یوں تو اصول حدیث میں بڑی چھوٹی بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن باوجود اس کے امام مسلم کے مقدمہ میں اب بھی پانے والے اس علم کے ایسے اہم نکات اور حقائق کو پاتے ہیں یا پاسکتے ہیں جو شاید دوسری کتابوں میں نہیں مل سکتے۔ حق تعالیٰ کے افضال بے پایاں میں ایک بڑا فضل اس شور بخت سیاہ کار کے ساتھ بھی ہوا کہ حدیث ہی نہیں بلکہ اصول حدیث کے ان چند قیمتی اوراق کے پڑھنے ہی کا نہیں بلکہ ان اوراق پر وقت کے ایک امام کے عالمانہ خطبات ۔کے سننے کا موقع اس بے بضاعت کے لئے آسان کیا گیا۔ پہلے دن کے پہلے ہی سبق میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برسوں میں حاصل ہونے والے معلومات یکا یک میرے سامنے آ گئے۔ اس وقت تک میرا تاثر تھا کہ قرآن کے سوا بجز چند گنی چنی روایتوں کے صاحب شریعت کی طرف قطعی یقین اور کامل اطمینان کے ساتھ کسی امر کا انتساب نہیں کیا جاسکتا۔ گویا دین کا اکثر حصہ صرف ظنی اور یقین کی قوت سے محروم ہے لیکن یہ

پہلا دن تھا۔ جب میرے کانوں نے اسناد والے تواتر کے سوا تواتر طبقہ تواتر عمل، تواتر قدر مشترک کی نئی قسموں کو سنا سمجھایا گیا کہ چند روایتوں کے متعلق جس کے تواتر کا دعوے عام کتابوں میں کیا جاتا ہے۔ یہ دعوی صرف اسناد والے تواتر کی حد تک محدود ہے۔ ورنہ دین کا بڑا اہم حصہ تواتر طبقہ اور تواتر عمل و تواتر قدر مشترک کی راہ سے منتقل ہو کر مسلمانوں کی پچھلی نسلوں میں اگلی نسلوں سے پہونچا ہے اور تواتر کی ان تمام قسموں میں یقین آفرینی کی وہی نفسیاتی اور منطقی قوت ہے جو قوت اسناد والے تواتر میں پائی جاتی ہے [1] یہ پہلا دن تھا جس میں قرآن کے بعد دین کا سارا بینائی نظام میرے لئے یقینی وقطعی ہو گیا اور جیسے جیسے تمیز اور شعور میں سن کے لحاظ سے اضافہ ہوا بجائے گھٹنے کے میرا یہ تاثر گہرا ہی ہوتا چلا گیا۔ خاکسار نے اپنی مختلف کتابوں اور مقامات میں امام کشمیری کی عطا کی ہوئی اس روشنی سے استفادہ کیا مسلمانوں کے دینی اختلافات کی نوعیتوں میں تمیز کا سلیقہ اسی انوری تحقیق سے پیدا ہوا ہے۔

حضرت شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ یوں تو فطرتاً ادیب تھے اسی لئے اردو زبان، جوان کی مادری زبان نہ تھی۔ چاہتے تو اس زبان کے بہترین ادیب وخطیب کی شکل میں اپنے آپ کو نمایاں فرما سکتے تھے۔ لیکن مسلسل عربی کتابوں کے مطالعہ اور ادب عربی کی دوامی مزاولت کا یہ اثر تھا کہ زبان مبارک پر عربی زبان کے الفاظ ہی زیادہ تر چڑھ گئے تھے۔ بلکہ طریقہ بیان بھی آپ کا عربی طرز بیان سے زیادہ متاثر تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا۔ کہ گو تعلیمی وتدریسی زبان آپ کی اردو ہی تھی۔ لیکن عربی زبان کے ایسے الفاظ جو اردو میں عموماً مستعمل نہیں ہیں۔ اضطراراً آپ کی زبان مبارک سے مسلسل نکلتے رہتے تھے تواتر کے مذکورہ بالا اقسام چارگانہ کو بیان کرتے ہوئے شاہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی زبان سے پہلی دفعہ میں نے طبقۃً بعد طبقۃٍ کے عام الفاظ کے ساتھ جیلاً بعد جیلٍ کے الفاظ سنے تھے۔ ان کی غرابت کا احساس اب بھی میرے حافظہ میں زندہ ہے۔ شاید اسی موقعہ پر "الکافہ عن الکافہ" یا "الکاوف عن الکواف" ابن حزم کی مخصوص اصطلاح سننے میں آتی تھی۔

اس قسم کے غیر مشہور یا اردو زبان میں جو الفاظ عربی کے مروج نہ تھے ان کے استعمال کرنے کی غرض ممکن ہے کہ یہ بھی ہو کہ عام مسلمانوں کو نہ سہی لیکن عربی مدارس کے طلبہ کا ان الفاظ سے مانوس ہونا۔ ان کی شان کے مناسب تھا، اور شاہ صاحب شاید اس طریقہ سے طلبہ کو ان عالمانہ اصطلاحات اور تعبیروں سے مانوس بنانا بھی چاہتے تھے۔

مجھے یاد پڑتا ہے ایک دفعہ شاہ صاحب نے ان غریب اصطلاحات کے استعمال کی توجیہ کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا تھا کہ بعض چیزیں دنیا میں ایسی ہیں جن کا ذکر کنائے اور اشارے ہی میں کرنا عام انسانی تہذیب کا اقتضا ہے پھر یہ نکتہ ان ہی سے سننے میں آیا اور بالکل صحیح بات تھی کہ تراشنے والے ان ہی چیزوں کی تعبیر کے لئے اچھے اچھے الفاظ تراش لیتے ہیں "پائین خانہ" مکان کے پچھلے حصہ کو کہتے تھے پھر اس سے "بیت الخلاء" مراد لینے لگے۔ لیکن، رفتہ رفتہ یہ لفظ "پائخانہ" کی شکل اختیار کر کے خود یہ لفظ بھی گندہ ہوگیا۔ فرماتے تھے کہ معانی کی گندگی رفتہ رفتہ الفاظ تک منتقل ہو کر پہونچ جاتی ہے اس لئے ضرورت ہے کہ تھوڑے تھوڑے دن بعد اس قسم کے الفاظ پر نظر ثانی کی جائے۔ اپنے اسی خیال کے مطابق عورتوں کے ایام کی تعبیر میں وہ ہمیشہ ''ایام طمث'' استعمال کرنے کے عادی تھے کیونکہ "حیض" کا لفظ حالانکہ خود کنائی تعبیر ہے۔ لیکن کثرت استعمال نے اس کو بھی اس قابل نہیں رکھا کہ مہذب مجلسوں میں اس کے استعمال کو آئندہ جاری رکھا جائے۔

بہر حال پہلے دن کے درس میں علاوہ معانی کے نئے نئے عربی الفاظ کا ایک بڑا ذخیرہ بھی میرے دماغ میں شاہ صاحب کے درس کے اندر جمع ہوگیا۔ ان کے بیان کی خصوصیت کا ایک غیر شعوری اثر مجھ میں یہ پیدا ہو رہا تھا۔ کہ عربی زبان میں اب تک کسی مطلب کو ادا کرنے کی ہمت مجھ میں نہ ہوئی تھی۔ لیکن سبق پڑھ کر جب قیام گاہ آیا۔ اور شاہ صاحب کے عطا کئے ہوئے گونا گوں معلومات کا جائزہ لینے لگا تو یہ محسوس ہوا کہ اپنے کمزور حافظہ سے اس کی امید نہیں کہ ان کی بتائی باتوں کو وہ یاد رکھے گا۔

اسی لئے فیصلہ کیا کہ کل سے کاغذ اور پنسل ساتھ لیتا جاؤں گا۔ اور ان کی تقریر کو قلم بند کردوں گا اور آج جو کچھ سنکر آیا ہوں قبل اس کے کہ میرے حافظہ سے وہ نکلے۔ اسے لکھ لینا چاہئے۔ شاہ صاحب کی تقریر جیسا کہ عرض کر چکا ہوں اس کا اسلوب بھی ایسا تھا کہ بجائے اردو کے ان کے معلومات کا مجھے محسوس ہوا کہ عربی میں قلم بند کرنا شائد زیادہ آسان ہے۔

یہی سوچ کر جو کچھ آج سن کر آیا تھا۔ پنسل سے ان کو عربی عبارت میں نوٹ کرنے لگا اور پہلی دفعہ مجھے اس کا اندازہ ہوا کہ غلط سلط سہی لیکن ٹوٹی پھوٹی عربی میں مطالب کی تعبیر کی گونہ صلاحیت مجھ میں بھی ہے۔ دار العلوم میں حدیث کی تقریروں کے قلم بند کرنے کا رواج نیا رواج نہ تھا۔ حضرت مولانا گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ کی تقریر بعض لوگوں کے پاس مکتوبہ شکل میں پائی جاتی تھی

اسی طرح حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی بھی ترمذی والی تقریر متعدد بزرگوں کی مرتب کی ہوئی طلبہ میں پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن میں جہاں تک جانتا ہوں۔ حضرت الامام الکشمیری کی تقریروں کے قلم بند کرنے کا ارادہ شاید اس فقیر سے پہلے کسی صاحب نے نہیں کیا تھا۔ یوں بھی عربی زبان میں حدیث کی تقریروں کی تعبیر کی روایت مجھ تک نہیں پہونچی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ اس فقیر کے بعد اس سے کہیں زیادہ لائق، فائق قابل و فاضل متعدد اور جفاکش محنتی طلبہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اردگرد جمع ہو گئے۔ جنہوں نے اپنی زندگی کا نصب العین ہی یہ قرار دیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو "معارف انوریہ" کے اس بحر بے کراں کو قید تحریر میں لانے کی کوشش کی جائے۔ مولانا بدر عالم میرٹھی اور مولانا محمد یوسف البنوری (متعنا اللہ بطول بقائہما) کے سوا پنجاب کے ایک بزرگ مولانا محمد چراغ جامع تقریر ترمذی خاص طور پر قابل ذکر ہیں ان کے سوا سنن ابی داؤد اور ابن ماجہ کے متعلق بھی حضرت شاہ صاحب کے درسی افادات کے جمع کرنے کی توفیق خاکسار کے بعد مختلف افراد کو بخشی گئی۔ جہاں تک میں جانتا ہوں ان صاحبوں نے بھی بجائے اردو کے عربی زبان کو ہی تعبیر کے لئے اختیار فرمایا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا حضرت شاہ صاحب کے طرز بیان اور طریقہ تدریس کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ اردو سے زیادہ عربی زبان ہی میں ان کی تقریروں کا قلم بند کرنا زیادہ آسان معلوم ہوتا تھا" ہے نہیں ہے" یا ازیں قبیل اردو کے عام افعال کے سوا الفاظ کا بڑا ذخیرہ ان کی تقریروں میں عربی کا ہوتا تھا۔ کم از کم فقیر کا احساس تو یہی ہے اور اسی چیز نے خود مجھ میں بھی یہ جسارت پیدا کی کہ پہلے عربی عبارت کی لکھنے کی مشق و عادات کا موقعہ حالانکہ اپنی تعلیمی زندگی میں نہ ملا تھا۔ لیکن الامام الکشمیری کے صف فعال میں شریک ہو جانے کا اثر تھا کہ روزانہ تین تین چار چار ورق بلکہ کبھی اس سے بھی زیادہ برجستہ قلم عربی میں ان کی تقریروں کو لکھ لیا کرتا تھا۔

اس کا افسوس ہے کہ ظلم کرنے والوں نے مجھ پر ظلم کیا۔ اور زندگی کے اس مسودے کو جو جان سے بھی زیادہ عزیز تھا کسی صاحب نے اس سے مجھے محروم کر دیا۔ جب اس کا خیال آتا ہے تو بے ساختہ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات شریفہ کا مشہور شعر ہے۔

انچہ از من گم شدہ راز سلمیاں کمشدے ہم سلیماں ہم پری ہم اہرمن بگریستے

میرے پاس زمانے تک کئی سو صفحات کی تقریر موجود تھی جلد بندھوالی گئی تھی۔ حضر سفر میں ساتھ رہتی تھی۔ اچانک ایک دن تلاش پر معلوم ہوا کہ کسی نے اڑالی (۱)۔

سچ تو یہ ہے کہ فقیر کے بعد ترمذی اور بخاری شریف کی املائی شرح فیض الباری مرتبہ

مولانا بدرعالم المیرٹھی اور اسی کے ساتھ مجلس علمی حضرت شاہ صاحب کے دوسرے افادات کو شائع کر کے محفوظ نہ کر دیتی تو خدا ہی جانتا ہے کہ اپنی اس ٹوٹی پھوٹی شکستہ وپراگندہ تقریر کے گم ہو جانے کا اثر مجھ پر کیا مرتب ہوتا۔ لیکن حق تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ مشہور قرآنی قانون۔

و اما الزب د فیذھب جفاء و اما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض (رعد)

لیکن جھاگ سوسوکھ کر ختم ہو گیا اور لوگوں کو جس سے نفع پہونچتا ہے وہ ٹھہر گیا زمین میں۔

کی علمی تفسیر اس باب میں بھی مرنے سے پہلے اپنے سامنے آ گئی جو چیز مٹنے اور کم ہونے کی مستحق تھی وہ گم ہو گئی لیکن واقعی منافع الناس کی جن چیزوں میں ضمانت تھی قدرت کی طرف سے اس کے باقی رکھنے کا ایسا استوار و محکم نظم کر دیا گیا کہ جس وقت خاکسار نے اپنی املائی تقریر کو قلم بند کرنا شروع کیا تھا اس زمانہ میں اس کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ حق تعالی نے اپنے بعض خاص مخلص بندوں [1] کے دل میں "معارف نوریہ" کی صحیح قدر و قیمت کا احساس پیدا کیا۔ بخاری کی املائی شرح فیض الباری کے مسودے کو لیکر ایک صاحب مصر بھیجے گئے اور مصر میں قیام کر کے اس عزیز الوجود گرامی منزلت کتاب کو بہترین کاغذ پر روشن اور مجلی ٹائپ کے حروف میں طبع کرا کے واپس آئے شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے وہی افادات۔ قیمہ جن کے متعلق اندیشہ تھا کہ دارالعلوم دیوبند کے احاطہ میں خدانخواستہ گم ہو کر ختم ہو جائیں گی۔ چاہنے والے نے جب چاہا تو اسلامی دنیا کے مشارق الارض و مغاربہا کے آخری تک ان کو پہونچا دیا۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ مسلمانوں کی آئندہ کتنی نسلیں سرزمین ہند کے ان علمی اکتشافات سے مستفید اور تمتع پذیر ہوتی رہیں گی۔ قابل رشک ہیں وہ لوگ جنھیں اس علمی فہم کی مختلف منزلوں میں حصہ لینے کی توفیق بخشی گئی۔ تاہم میرا یہ فطنہ اگر صحیح ہے کہ اپنی ساری کوتاہ نصیبیوں کے ساتھ حضرت شاہ صاحب کی درسی تقریروں کی قلم بندی کے سلسلے میں تقدم و سبقت کی نعمت سے ابتداً وہی دیوانہ سرفراز ہوا تھا جس کا جنون اس علمی امانت کے بار کا متحمل نہ ہو سکا۔ توارادی نہ سہی اضطراری سعادت سے چاہئے تو یہی کہ اسے بھی محروم نہ ٹھیرایا جائے جب ورقار غض ایکہ (بکائن کی شاخ پر کوکو کرنے والی فاختہ) کے "فضل وتقدم" کا اعتراف کرتے ہوئے عرب کے شاعر نے کہا تھا اور چڑیا تک کہ متعلق انسانوں نے اقرار کیا کہ:

ولکن ربکت قبلے فھیح لی البکاء　　بکاھافقلت الفضل اللمتقدم

لیکن فاختہ مجھ سے پہلے رو پڑی، اسی کے رونے سے مجھ پر بھی گریہ طاری ہوا۔ اسی

لئے میں نے مان لیا کہ برتری اسی کو حاصل ہوئی جس نے رونے میں سبقت کی) شاید کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ:

میں جو رد یا تو رو پڑی دنیا   شور سے اپنے شور ہے برپا

بہر حال بقول شخصے کہ:

عشق سے ہوں گے جن کے دل آباد
قیس مرحوم کو کریں گے یاد

اور میں ممنون ہوں کہ بخاری کی املائی شرح فیض الباری کے مقدمہ میں صحیح مسلم کی گم شدگی میری مرتبہ املائی تقریر کا ذکر کر دیا گیا۔ جزاہم اللہ عنی خیرا الجزاء۔

خیر قصہ تو حضرت شاہ صاحب کی درسی خصوصیات کا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ باتوں باتوں میں صرف حدیث ہی نہیں بلکہ دوسرے علوم کے ایسے اہم کلیات ہاتھ ان کے درس میں آ جاتے تھے کہ اپنے ذاتی مطالعہ سے شاید ساری عمر ان تک ہم جیسے نارساؤں کی رسائی آسان نہ تھی۔

حدیث کے متعلق "تواتر" کی اقسام چارگانہ کے سوا اصول حدیث کے الاعتبار کی اصطلاح کی شرح کرتے ہوئے شاہ صاحب نے جو تقریر فرمائی تھی حالانکہ تقریباً نصف صدی کے قریب زمانہ گزر چکا ہے لیکن وساوس وشبہات وشکوک اوہام کی جو تاریکیاں اچانک میرے سامنے سے چھٹ گئی تھیں۔ اور سکینت وطمانینت کی جو لذت اس وقت میسر آئی تھی دل میں اس کی خنکی اور حلاولت اس وقت تک موجود ہے۔ ایک ہی حدیث کے متعلق اعتبار کے قاعدے سے اعتماد اور بھروسہ کی جو منطقی قوت فراہم ہوتی ہے۔ صحیح طور پر اس وقت کے واقف ہو جانے کے بعد اپنی جبلت سے آدمی اعتماد کی اس کیفیت کے نکالنے سے عاجز ہو جاتا ہے جو قدرتاً اس عمل کے بعد دلوں میں حدیثوں کے متعلق پیدا ہو جاتی ہے۔ (۱)

اور صرف یہ ہی نہیں بلکہ جیسے "تواتر" کی تقسیم کی روشنی میں حدیثوں کا معتد بہ معقول حصہ جزا حاد کی مظنونیت کے دائرے سے نکل کر یقین واذعان کی قوت کا حامل بن جاتا ہے اسی طرح عموماً جو یہ سمجھا جاتا ہے کہ روایت کرنے والوں نے بجائے الفاظ کے حدیثوں کے سلسلے میں زیادہ تر حاصل مطلب یعنی روایت بالمعنی کو اداء فرض کے لئے کافی قرار دیا ہے۔

کافی ہونے میں جیسا کہ بجائے خود یہ ثابت ہے روایت بالمعنی کے طریقہ پر اعتراف کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ قطع نظر تفصیلات کے اور کچھ نہیں صرف ترجمہ ہی کی حقیقت اگر آدمی کے

سامنے ہوتو روایت بالمعنیٰ کی افادیت کے اعتراف پر وہ مجبور ہو جائے گا۔

آخر روایت بالمعنیٰ کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ ایک ہی مطلب کو اسی زبان کے دوسے الفاظ اور تعبیروں میں راوی ادا کرے۔

جس زبان میں بات اس سے کہی گئی تھی پھر ترجمہ میں تو دوسری زبان کے الفاظ میں مطلب کو ادا کرنا پڑتا ہے پس لفظوں صرف لفظوں کے ادل بدل جانے سے اگر یہ کلیہ ٹھیرالیا جائے کہ مطلب بھی ہمیشہ بدل جاتا ہے تو چاہئے کہ ترجمہ اور اس ذریعہ سے علوم وفنون کی جو اشاعت دنیا میں ہوتی ہے سب کو لغو اور مہمل قرار دیا جائے جنون کے سوا خود سوچئے کہ یہ اور بھی کچھ ہے۔

لیکن قطع نظر اس سے حضرت شاہ صاحب نے "الاعتبار" کے جس طریقہ عمل سے روشناس فرمایا تھا اس کی روشنی میں جیسا کہ شاہ صاحب نے بھی فرمایا تھا۔ حدیثوں کا بڑا ذخیرہ بجائے روایت بالمعنے کے روایت باللفظ کی مد میں داخل ہو جاتا ہے۔ غور کرنے کی بات یہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے ہم پاتے ہیں کہ مثلاً دس اصحابی کسی روایت کو بیان کرتے ہیں۔ ان صحابیوں کی روایت میں مشترک الفاظ کے متعلق اگر یہ سمجھا جائے کہ براہ راست خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمائے ہوئے ہیں تو عقل کا تقاضا ظاہر ہے کہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے عام حالات میں کسی مطلب کو اپنے الفاظ میں ادا کرنے والوں کے الفاظ میں وحدت مشکل ہے۔ اعتبار کے طریقہ سے تائیدی روایتوں کو اصطلاحاً متابعات وشواہد کہتے ہیں۔ خاص خاص کتابیں اس عمل میں امداد دینے کے لئے لکھی گئی ہیں۔ صحیح مسلم میں امام مسلم کے کام کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے الاطراف کی کتابوں سے بھی کافی مدد اس راہ میں ملتی ہے۔

بہر حال یہ تو ایک علمی مسئلہ ہے۔ میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جیسے حدیث کے متعلق شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے درس میں گر کی باتیں معلوم ہوتی رہتی تھیں۔ ایسی باتیں جن سے تاثرات میں غیر معمولی انقلاب پیدا ہو جاتا تھا۔ یہی حال دوسرے علوم وفنون کے متعلق تھا۔ درس تو ہوتا تھا حدیث کا لیکن شاہ صاحب کی ہمہ گیر طبیعت نے معلومات کا جو گرانمایہ قیمتی سرمایہ ان کے اندر جمع کر دیا تھا وہ ان کے اندر سے بے ساختہ چھلکتے رہتے تھے۔

میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ قانون اور شریعت کے متعلق جو دو مختلف قدرتی فرائض ہیں۔ یعنی واقعات وحوادث پر قانون کو منطبق کرنا۔ ایک قاضی اور جج کا سب سے اہم فریضہ یہی ہے اسی طرح قانون کے محدود کلیات سے ہر نئے پیش آنے والے حادثے کے متعلق

حکم لگانا۔ یہ فرض مجلس وضع قوانین اورارباب اجتہاد کا ہے۔

حضرت شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ قانون کے مناط کی تقسیم کرتے ہوئے تنقیح مناط تخریج مناط، تحقیق مناط کے اقسام کو بیان کر کے جو سیر حاصل بحث ان اقسام پر کیا کرتے تھے۔ میرا خیال تو یہی ہے کہ قضا (ججی) اوراجتہاد یعنی قانون سازی دونوں راہوں کی ایسی روشنی ان کی تقریر سے مہیا ہوتی ہے کہ دونوں پر چلنے والے انشاء اللہ اس کی روشنی میں بھٹک نہیں سکتے تھے۔ تفصیلات کے لئے ان کی مطبوعہ تقریروں کا مطالعہ کرنا چاہئے اسی کے ساتھ مجھے اس کا بھی اعتراف کرنا چاہئے کہ شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کو حالانکہ اپنی حنفیت پر اصرار بلیغ تھا۔ اور ائمہ اجتہاد میں ابوحنیفہ الامام کے مقابلہ میں دوسروں کا اجتہاد ان کو بہت کم متاثر کرتا تھا۔ مگر بااین ہمہ یہ ان ہی کے درسی افادات کا شعوری اور کچھ غیر شعوری اثر ہے کہ اپنے دل کو اہل السنۃ والجماعت کے تمام ائمہ اجتہاد امام مالک شافعی اور احمد رحمتہ اللہ علیہم کی عظمت سے بھی معمور پاتا ہوں اور انہی کے سمجھانے سے یہ سمجھ میں آیا کہ سارے اجتہادی مسائل جن میں بظاہر اختلاف نظر آتا ہے۔ سب ہی حق ہیں اور سب حق تعالی کی مرضی کے مطابق ہیں۔

خیال آتا ہے کہ ائمہ اجتہاد میں حق دائر ہے۔ یعنی ان میں سے لاعلی سبیل التعیین کوئی ایک حق پر ہے۔ بجائے اس کے شاہ صاحب نے طلبہ کو سمجھایا کہ سب ہی کو حق پر سمجھنا چاہئے تو سرحد کے بعض خشک مزاج علماء پر یہ بات گراں گزری اور مختلف قسم کے اراجیف کی اشاعت ان کی طرف سے طلبہ میں ہونے لگی۔ لیکن ان بیچاروں کو کون سمجھاتا کہ۔

اشفق[1] علی الراس لاتشق علی الجبل

بظاہر تصوف اور صوفیاء کے متعلق خیال ہوتا تھا کہ اس طبقہ اور ان کے علوم ومعارف سے شاہ صاحب کو شاید چنداں دلچسپی نہیں ہے۔

لیکن وہی بھولے بسرے خیالات جو دماغ میں رہ گئے ہیں ان ہی میں دو باتیں میرے اندر اس طرح جاگزیں ہوگئی ہیں کہ تصوف کے نظری وعملی دونوں حصوں کے متعلق بعد کو جو کچھ اس فقیر نے سوچا یا سمجھا زیادہ تر ان ہی دونوں کی روشنی میں سوچا اور سمجھا۔ حادث یعنی کائنات مخلوقات کا قدیم یعنی خالق تعالی جل مجدہٗ سے تعلق ہے۔ شاہ صاحب کے الفاظ میں ''ربط الحدیث بالقدیم'' کا عنوان دائم کر کے اس سلسلہ میں جو کچھ فرماتے تھے یہی تصوف کے نظری حصہ کا بنیادی واساسی مسئلہ تھا۔ پہلی دفعہ شاہ صاحب نے اس مغالطہ کا ازالہ فرمایا کہ عوام الناس خالق ومخلوق کے

تعلقات کو صانع و مصنوع یا معمار و مکان کی مثال سے سمجھنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ مصنوع اپنے باقی رہنے میں چونکہ صانع کا محتاج نہیں رہتا۔ یعنی مکان کو مثلاً بن جانے کے بعد معمار کی ضرورت باقی نہیں رہتی عوام کی سمجھ میں صحیح طور پر اسی لیے نہیں آتا کہ پیدائش میں تو عالم خدا کا محتاج ہے۔ لیکن پیدا ہو جانے کے بعد عالم کو اپنی بقاء میں خدا کی کیا ضرورت ہے؟

صوفیہ اسی وسوسہ کا ازالہ اپنے اس نظریہ سے کرتے ہیں جو "وحدت الوجود" وغیر ناموں سے مشہور ہیں۔ اور نہ جاننے والوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ صوفی وحدت الوجود کے جو قائل ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا ایمان وحدت الوجود پر ہے۔ یعنی سارے موجودات ایک ہیں حالانکہ "الوجود" کی وحدت کو "الموجود" کی وحدت سے کیا تعلق۔

خاکسار نے اپنی کتاب "الدین القیم" میں اسی "وحدت الوجود" کے مسئلہ کی جو تشریح و تفصیل کی ہے سچی بات یہ ہے کہ بنیادی امور اس کے شاہ صاحب کی تقریر ہی سے ماخوذ ہیں۔

اسی طرح مشہور حدیث جبرئیل جس میں ہے کہ ایمان و اسلام اور احسان کے متعلق رسول ﷺ سے مسافر کے بھیس میں جبرئیل علیہ السلام نے سوالات کئے تھے اسی حدیث میں "الاحسان" کے لفظ کا ترجمہ ہی شاہ صاحب نے ایسا کیا کہ تصوف کے عملی حصہ کی اصل خصوصیت سامنے آگئی فرمایا تھا کہ احسان کا صلہ جب الی کے ساتھ ہے تو کسی کے ساتھ حسن سلوک کرنا۔ اس کا مطلب ہوتا ہے لیکن صلہ کے بغیر صرف احسان کا ترجمہ حسن پیدا کردن" کرنا چاہئے یہی یا قریب قریب اسی کے فارسی زبان میں احسان کا ترجمہ کر کے فرمایا کرتے تھے کہ عقائد و اعمال اور زندگی کے ان تمام شعبوں میں جو مذہب کے دائرے میں داخل ہیں۔ ان کو بار ٹھیراتے ہوئے سر سے ٹالنا ایک حال تو یہ ہے لیکن ان میں "حسن آفرینی" کی کوشش بس یہی احسان ہے۔ اور تصوف کا مطلب یہی ہے کہ بجائے تکلیف کے دین ہی زندگی کا اقتضا بن جائے اور یوں دین کے ہر شعبہ میں حسن کے اندر حسن اور جمال میں جمال کا اضافہ کرتے چلا جانا چاہئے۔ یہی الاحسان کے مقام کا اقتضاء ہے۔ خیال آتا ہے کہ قرآن مجید میں جہاں کہیں "المحسنین" کا لفظ آیا ہے اس کا صحیح مصداق شاہ صاحب کے نزدیک مسلمانوں کا وہی طبقہ ہے جو دینی مطالبات کی تعمیل میں اپنے پیش نظر احسانی نقطہ نگاہ کو رکھتا ہے [1]۔

ان تقریروں کو سنے ہوئے عرض کر چکا ہوں کہ چالیس سال کے قریب زمانہ زگر چکا ہے۔ ٹوٹا پھوٹا، تحریری نوٹ جو میرے پاس تھا مدت ہوئی وہ بھی غائب ہو چکا ہے۔ لیکن تصوف

کے عملی حصہ کے متعلق زمانہ کی اس طویل مدت میں جو کچھ فقیر نے بعد کو پڑھایا سمجھایا لکھا زیادہ تر جوہری اثر سب میں شاہ صاحب کی اسی تقریر کا تھا۔ اگر چہ افسوس کے ساتھ اس کا بھی اقرار کرنا پڑتا ہے کہ پڑھنے سمجھنے سمجھانے اور لکھنے لکھانے ہی کی حد تک میرا کام محدود رہا اور کرنے کی توفیق میسر نہ آئی لے دے کر اپنا سرمایہ ناز احساس صرف وہی ہے کہ:

احب الصالحین ولست من هم　　　لعل الله یرزقنی صلاحاً

لیکن آہ! کہ مرا لعل اب لیت کے حدود میں داخل ہو چکا ہے اور نہیں کہہ سکتا ہے کہ جس چیز کو عمر بھر اچھا سمجھتا رہا اسی کو اپنی علمی زندگی میں داخل کرنے سے کیوں قاصر رہا۔ قسمت کی تہی دستی کے سوا اس کی اور کیا توجیہ کی جائے۔

شاہ صاحب کی بعض باتیں عجیب وغریب تھیں۔ بظاہر ان کے مطالعہ کا موضوع دینیات ہی کی کتابیں تھیں لیکن جب عقلی مسائل پر اتفاقاً کچھ فرمانے کا موقعہ آ جاتا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نادان بچوں سے زیادہ ان کے سامنے بڑے سے بڑے فلاسفہ کی وقعت نہیں ہے۔ ایمان بسیط ہے یا مرکب یعنی عمل بھی ایمان کا جز ہے یا نہیں۔ علم کلام کا مشہور خلافیہ ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے کہ مناطقہ (منطقی کے لفظ کی جمع عموماً معقولیوں کے متعلق اسی لفظ کو استعمال کرنے کے عادی تھے اور اسی کے ساتھ علیہم[1] ماعلیہم کے توبیخی الفاظ بھی اس موقع پر ان کی زبان مبارک سے خلاف دستور نکل جاتے) بہر حال فرماتے کہ ان مناطقہ کی طرف سے ان لوگوں پر جو ایمان کی حقیقت میں سارے دینی اعمال کو شریک سمجھتے ہیں ان پر اعتراض کرتے ہوئے جو یہ کہا جاتا ہے کہ جز کے ارتفاع سے قاعدہ ہے کہ کل بھی مرتفع ہو جاتا ہے یعنی کسی کل کا کوئی جز اگر غائب ہو جائے تو منطقی نقطہ سے نظر سے کل کل باقی نہ رہا۔ اور اسی بنیاد پر ایمان کو مرکب حقیقت قرار دینے والوں پر اعتراض کرتے ہیں کہ کسی مسلمان کی زندگی میں کوئی اسلامی عمل اگر نہ پایا جائے تو مطلب اس کا یہ ہوا کہ ایمان ہی کا اس اس سے ازالہ ہو گیا اور وہ مومن باقی نہ رہا۔ حالانکہ ایمان کو مرکب قرار دینے والے بھی اس کے قائل نہیں ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ ایمان مرکب ہے یا بسیط دلچسپ بات اس موقعہ پر شاہ صاحب جو فرمایا کرتے تھے وہ یہ تھی کہ ذرا ان منطقیوں کی حماقت ملاحظہ کیجئے درخت ایک مرکب حقیقت ہے۔ جڑ۔ تنہ۔ شاخیں برگ وبار سب ہی اس کے اجزاء ہیں۔ فرض کیجئے کہ کوئی ہلکا سا پتہ درخت کا گر گیا۔ تو منطقی کہہ دے گا کہ درخت باقی نہ رہا اس لئے کہ جز کا ارتفاع کل کے ارتفاع کو مستلزم ہے لیکن منطقیوں کے سوا کوئی انسان جب

تک پاگل نہ ہو جائے اس کا قائل ہوسکتا ہے کہ کسی ایک پتہ کے جھڑ جانے سے درخت ہی ناپید ہوگیا۔ کل اور اجزاء کے صحیح تعلق کو بتاتے ہوئے فرماتے کہ دراصل ہر کل میں دو قسم کے اجزاء ہوتے ہیں۔ بعض اجزاء کے نکل جانے سے تو کل یقیناً غائب ہو جاتا ہے مثلاً گردن آدمی کی کٹ جائے سراڑ جائے دل نکل جائے۔ ان کے مقابلہ میں کل ہی کے بعض اجزاء ایسے بھی ہوتے ہیں جو جز ہونے کے باوجود کل سے اگر غائب ہو جائیں تو کل باقی رہتا ہے جیسے آدمی کا بال گر جائے۔ انگلی کٹ جائے۔ تو کیا کسی بال کے گر جانے سے زیداس لئے زندہ باقی نہ رہا کہ زید کے کل کا بال بھی ایک جز تھا۔ یا کسی قلعہ کی دیوار کی کوئی اینٹ نکل جائے تو سمجھنا چاہئے کہ قلعہ ہی غائب ہوگیا۔ فرمایا کرتے تھے کہ کثرتوں کو واحد تعبیر کے قالب میں لاکر کلی بنالینا مناطقہ اس کو اپنا کمال سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اصل حقیقت سے اپنے آپ کو اندھا بنانے کی یہ بدترین شکل ہوسکتی ہے۔

فرماتے کہ میرے نزدیک آعقل الناس فی الناس اہل لغت یا زبانوں کے بنانے والے ہیں جو کائنات کے ایک ایک ذرہ کی خصوصیت پر نظر جما کر الگ الگ الفاظ بناتے ہیں زبان اور لغت والوں کے بعد فقہا کی تعریف کرتے اور ان کے عقلی رسوخ کی داد دیتے کہ مشتبہ مسائل کے مختلف پہلوؤں کو متعین کر کر کے ہر ایک پہلو کے متعلقہ احکام کا سراغ لگانا چاہتے ہیں۔

الغرض ہر ہر چیز کے امتیازی اوصاف کا جاننا ان کے نزدیک کمال تھا۔ اور امتیازی اوصاف سے قطع نظر کر کے کلی کی لاٹھی جزؤں پر چلانا اندھے کی لاٹھی کے سوا ان کے نزدیک اور کچھ نہ تھی۔

بہر حال خاکسار کو دوسرے علماء اور شاہ صاحب میں جو کھلا ہوا فرق محسوس ہوتا تھا وہ یہ تھا کہ عموماً لوگوں میں استعدادی علم پایا جاتا ہے یعنی اس پر قناعت کرلیا جاتا ہے کہ جب اپنے متعلقہ علوم کی کتابوں کا مطالعہ کریں گے تو مسائل کے مالھاو ماعلیھا سے واقف ہو جائیں گے لیکن شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کو عموماً ہر اس علم سے حضوری تعلق تھا جس سے وہ دلچسپی رکھتے تھے۔ اور ان علوم کے کلیات و جزئیات کا کافی ذخیرہ فعلیت کے رنگ میں ان کے حافظہ کے محافظ خانے میں اس طرح محفوظ رہتا کہ جس مسئلہ کو چاہتے آسانی کے ساتھ اپنے حس مشترک کے سامنے لے آتے۔ طلبہ اسی لئے ان کے دماغ کو کتابوں کی الماری سے تشبیہ دیتے تھے۔ فقیر بجائے الماری کے اسے ایک مستقل کتب خانہ ہی خیال کرتا تھا۔

بہر حال وہ اپنے عہد کے طلبہ کی بے بضاعتیوں کا اندازہ کر کے تکلیف اٹھا کر علاوہ موضوع درس کے چند خاص امور کا تذکرہ التزاماً اپنے درس میں ضرور فرمایا کرتے مثلاً جن مصنفین

کی کتابوں کا حوالہ دیتے ان کی ولادت ووفات کے سنین کے ساتھ ساتھ مختصر حالات اوران کی علمی خصوصیت علم میں ان کا خاص مقام کیا ہے ان امور پر ضرور تنبیہ کرتے چلے جاتے۔ یہ ان کا ایسا اچھا طریقہ تھا۔ جس کی بدولت شوقین اور محنتی طلبہ ان کے حلقہ درس میں شریک ہوکر علم کے ذیلی سازوسامان سے مسلح ہوتے تھے۔ یا کم ازکم مسلح بننے کا ڈھنگ ان کو آجاتا تھا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ ہر غریب مدرس اوراستاذ کے بس کی یہ بات ہے بھی نہیں کہ مطالعہ کئے بغیر جس بڑے عالم کا ذکر آجائے ان کے متعلق مذکورہ بالاتفصیلات سے طلبہ کو آگاہ کرنے پر قادر ہو۔ یہ تو ان کے خصوصی حافظہ کا کمال تھا۔

ایک دلچسپ تجربہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق میرا یہ بھی تھا کہ اشخاص ورجال جن کا وہ تذکرہ حلقہ درس میں فرمایا کرتے تھے ان میں زیادہ تر ایسی ہستیاں تھیں جواب دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ زندہ علما کا ذکر مشکل ہی سے ان کے درس میں ہوتا اور زندہ کیا سچ پوچھئے تو حافظ ابن حجر نویں صدی ہجری کے عالم ومحدث کے بعد والوں کے نام بھی ان کی زبان مبارک پر اتفاقاً ہی کبھی آتے ہوں۔ ان کے حلقہ درس میں پہونچ کر کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ درمیان کی چند صدیاں گویا حذف ہوگئی ہیں اور ہم نویں، آٹھویں، اوران سے پہلے کی صدیوں میں گویا زندگی بسر کررہے ہیں۔ پچھلوں کا نہ وہ نام ہی عموماً لیتے تھے، اوران کے کام ہی کا مدحاً یا قدحاً ذکر کرتے۔ ان کا معاملہ پس ان ہی گزرے ہوئے اگلے بزرگوں تک محدود رہتا تھا کہ اسی کا نتیجہ تھا کہ اپنے معاصر اور ہم چشم علماء کے متعلق ان کے تاثرات کا دریافت کرنا مشکل تھا اور میرا تو خیال کچھ ایسا ہے کہ کسی قسم کا تاثر اس باب میں وہ رکھتے ہی نہ تھے۔ اس ذریعہ سے حق تعالے نے علماء کے ایک بڑے مہلک اخلاقی رذیل سے ان کو محفوظ فرمادیا تھا۔

اس سلسلے میں معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ علماء کی علمی اورفنی تنقید کی طرف ان کے جذبہ کا رخ پھیر دیا گیا تھا۔ ان کی علمی چشمک اگر کچھ تھی بھی تو ان ہی وفات یافتہ بزرگوں سے تھی، حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ایک طرف ان کی غیر معمولی عقیدت کا حال یہ تھا کہ جبل العلم حافظ الدنیا کے الفاظ سے ان کی مراد حافظ ہی ہوتی لیکن شافعی ہونے کی وجہ سے اخلاقی مسائل میں حنفی مذہب کے متعلق جہاں شاہ صاحب کو محسوس ہوتا کہ جان بوجھ کر حافظ سردمہری اور لاپروائی سے کام لے رہے ہیں تو اس وقت مسکراتے ہوئے فرماتے حافظ الدنیا نے اس موقعہ پر کف لسانی سے کام لیا ہے کبھی کبھی ان کے طرز عمل کو طوطے کی چال سے تشبیہ دیتے جو آنکھوں کو گردش دیتے

ہوئے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے نکل جاتا ہے۔ اختلافی حدیثوں کے باب اصح مافی الباب کا ترجیحی طریقہ شوافع میں عموماً جو مروج ہے۔ جب ان کے اس اصول کا ذکر کرتے تو فرماتے کہ لیجئے علماء شافعیہ نے پٹھے ٹٹولنے کا کام شروع کر دیا[1]۔ عموماً وہ اس کا بھی موقعہ تلاش کیا کرتے کہ علاوہ حدیث کے اسلامی علوم وفنون کے جن اصول وکلیات کا جاننا ضروری ہے ان کا باولیٰ مناسبت ذکر فرماتے اور مسئلہ کی ایسی تاریخ بیان کرتے جس کے سننے کے بعد معلوم ہو جاتا تھا کہ اس مسئلہ کی ابتداء کس شکل میں ہوئی اور کن کن نقاط نظر سے گزرتے ہوئے اپنے موجودہ حال تک پہونچا ہے۔ یاد آتا ہے ایک دفعہ مرحوم صاحبزادہ آفتاب احمد خاں جو کسی زمانہ میں علی گڑھ کالج کی روح رواں جز وکل یا کم از کم غیر معمولی موثر عنصر تھے پچھلے دنوں جب علی گڑھ اور دیوبند کے درمیانی خلیج کی وسعت کم ہو رہی تھی[2] تو صاحب زادہ مرحوم کبھی کبھی دیو بند تشریف لایا کرتے تھے ایک دفعہ صحیح مسلم کے درس میں آ کر وہ بھی شریک ہوئے۔ واپس ہو کر میں نے خود ان سے سنا کہتے تھے کہ آج تو آکسفورڈ اور کیمبرج کے لکچر ہال کا منظر مرے سامنے آ گیا تھا۔ یوروپ کی ان یونیورسٹیوں میں پروفیسروں کو جیسے پڑھاتے ہوئے میں نے دیکھا ہے آج ہندوستان میں مری آنکھوں نے اس تماشے کو دیکھا۔

یادداشت اور حافظہ کی غیر معمولی قوت کا نتیجہ یہ تھا کہ معلومات کا طوفان شاہ صاحب کے اندر تلاطم پذیر رہتا تھا۔ خیال آتا ہے کہ کسی مسئلہ پر تقریر فرماتے ہوئے اس کی مناسبت سے ان کا ذہن کسی دوسرے مسئلہ کی طرف منتقل ہوتا تو عموماً فرماتے دفاع ہو گیا مجھے اس مسئلہ کی طرف ان دفاعی مسائل میں صرف ونحو، معانی، بیان، بدیع وغیرہ فنون تک کے مسائل شریک تھے۔

عربیت سے تعلق رکھنے والے ان علوم سے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو غیر معمولی دلچسپی تھی، ان علوم کی اعلیٰ بنیادی کتابوں کا غیر معمولی فکر ونظر کے ساتھ انہوں نے مطالعہ کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ کافیہ اور شرح جامی کے ساتھ مدارس کے عام مولویوں کا جو تعلق ہوتا ہے۔ یہی تعلق شاہ صاحب کو سیبویہ کی الکتاب سے تھا، ابن عصفور جس کے نوٹ اور کچھ حواشی سیبویہ کی کتاب پر ہیں۔ اس نام کو پہلی دفعہ خاکسار نے شاہ صاحب ہی سے سنا تھا۔ اور کہہ سکتا ہوں کہ ان کے بعد پھر کسی مولوی کی زبان سے یہ لفظ سننے میں نہ آیا۔ دوسروں کی کہوں، سیبویہ کی اس الکتاب کے مطبوعہ نسخہ پر میری نظر تو ضرور پڑی ہے شاید ادھر ادھر سے کچھ اس کو دیکھا اور پڑھا بھی ہوگا۔ لیکن ابن عصفور کے حاشیہ کے دیکھنے کا بھی شرف حاصل نہ ہوا۔ معانی و بیان، بدیع کے

مسائل میں الجرجانی کی دلائل الاعجاز، اسرار البلاغت یا زمخشری کی مفصل کے سوا تفتازانی وغیرہ مصنفوں کی کتابوں کا حوالہ دیتے ہوئے شاہ صاحب کو فقیر نے کبھی نہیں دیکھا۔ اصول فقہ میں وہ ابن ہمام کی تحریر کو گویا حافظ تھے۔ فقہ میں ابوبکر کاشانی صاحب بدائع شمس الائمہ سرخسی اور ابن نجیم صاحب بحر الرائق سے ان کو بہت متاثر پاتا تھا۔ شامی کے تفقہ پر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چنداں بھروسہ نہیں فرماتے صاحب ہدایہ کے بڑے مداح تھے۔ عموماً فرماتے کہ ابن ہمام کی فتح القدیر کی جیسی کتاب کے لکھنے کا ارادہ چاہوں تو کر سکتا ہوں۔ لیکن ہدایہ جیسی کتاب لکھنے سے اپنے آپ کو قطعاً عاجز پاتا ہوں۔

ان کی ایک عادت یہ بھی تھی کہ عربی زبان کے کسی مشکل لفظ کی تشریح کرتے ہوئے یا کسی اور ضرورت سے عربی شعر کو پیش کرنا چاہتے تو گو شہادت کے لئے ایک مصرعہ یا ایک شعر ہی کافی ہوتا۔ لیکن یادداشت کی بے پناہ قوت کا نتیجہ تھا کہ ایک مصرعہ کے لئے بیس بیس پچیس پچیس بلکہ اس سے بھی زیادہ اشعاء والی نظموں کو مسلسل سناتے چلے جاتے ظاہر ہے کہ اس وقت ہم طالب علموں کی حیثیت ٹھیک ان بھینسیں کی ہو جاتی ہے جن کے سامنے بجانے والا بین باجہ بجار ہا ہو۔ اور غریب بھینسوں ٹک ٹک اس کو دیکھ رہی ہیں۔ دوسروں کے متعلق تو مجھے کہنے کا حق نہیں۔ لیکن فقیر کی حیثیت تو اس وقت "اخفش" کے بزہی کی ہو جاتی تھی۔ اپنی یافت اور سمجھ کے مطابق جیسا کہ عرض کر چکا ہوں۔ شاہ صاحب کی تقریروں کو میں مسلسل نوٹ کرتا چلا جاتا تھا۔ لیکن جب انشاء و شعر گوئی کا یہ جذبہ شاہ صاحب پر طاری ہوتا تو میرے قلم اور انگلیوں کو آرام کرنے کا قدرتی موقع مل جاتا۔

اسی لئے میری مرتبہ تقریر تقریباً شاہ صاحب کے ان سنائے ہوئے اشعار سے خالی تھی ۔شاید چند ضروری مصرع یا اشعار مشکل ہی سے اس سلسلہ میں قلم بند ہوئے ہوں۔ میرا اندازہ تھا کہ مجموعی طور پر نصف لاکھ یعنی چالیس پچاس ہزار سے کم تعداد ان عربی اشعار کی نہ ہوگی جو شاہ صاحب کو زبانی یاد تھے۔ جنہیں جس وقت جی چاہتا وہ سنا سکتے تھے۔ فارسی ادب کا مذاق بھی کافی رکھتے تھے کبھی کبھی درسی تقریروں میں فارسی کے موزوں اشعار کو ترنم کے خاص لہجہ میں استعمال فرماتے۔

کارِ زلفِ تست مشک افشانی اما عاشقاں　　مصلحت را تہمتے بر آہوے چیں بستہ اند (1)

جب توحیدی کیفیت کا غلبہ ہوتا مسکراتے ہوئے حافظ کے اس مشہور شعر۔

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز   ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

کو خاص مستانہ انداز میں سناتے، فرماتے کہ جی ہاں! یہ سب بڑے میاں کی کارروائی ہے۔ اس وقت ایک خاص قسم کی سرمستی ان کے جبین مبارک کے اسارير میں چمکنے لگتی۔ عموماً یہی وقت ہوتا جب بٹوا کھولتے چھالیا اور زردہ نکال کر پان کے ساتھ استعمال فرماتے:

اپنے باطنی حال کے اخفاء میں ان کی کوشش حد سے گزری ہوئی تھی۔ کھلنے کا موقع اتفاقاً کہیں آ جاتا تو اسی وقت ظرافت اور طبیعت کا لہجہ اختیار فرما لیتے۔ بظاہر عام مجلسوں اور صحبتوں میں ان پر سکینت و وقار کی خاموشی طاری رہتی۔ لیکن حلقہ درس میں شگفتگی و مزاح کا جبلی رجحان ان کا نمایاں ہو جاتا اس وقت ان کی زبان مبارک پر معصومانہ انداز میں بڑے پر کیف فقرے جاری ہوتے۔ اسی سلسلہ میں فرمایا کرتے کہ جی ہاں ظرافت کی یہ مد وہاں بھی کافی وسیع ہے بڑے صاحب یہاں بھی اس کا تماشا پیش ہوگا۔ پھر مثلاً ان حدیثوں کا ذکر فرماتے جن میں آیا ہے کہ قیامت کے دن بعض گنہگاروں کے ساتھ یہ معاملہ کیا جائے گا کہ ان ہی سے ان کے گناہوں کا اعتراف کرا کے حق سبحانہ وتعالی کی طرف سے حکم ہوگا کہ ہر وہ گناہ جس کا اس نے اقرار کیا ہے اس کے مقابلہ میں اسے نیکی کا اجر دو گنا ملے گا اقرار کرنے والا گنہگار اس حکم کو سن کر فرشتوں سے کہے گا کہ ٹھہرو میرے گناہوں کی فہرست تو بہت طویل ہے جب ہر گناہ کے بدلہ میں نیکی کا اجر مجھے دیا جائے گا تو ان گناہوں کو بھی گن لو۔ او کما قال

صحیح مسلم ہی کی مشہور حدیث جس میں جنت کے داخل ہونے والے سب سے کمتر وجہ کے آدمی کا ذکر کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جہنم سے نکلنے کے بعد اپنے سامنے ایک درخت کو پائے گا۔ عرض کرے گا کہ اے اللہ اس درخت کی چھاؤں کے نیچے پناہ لینے کی اجازت دی جائے۔ حق سبحانہ تعالی اس سے اقرار لیں گے کہ اس سے زیادہ تو اپنے مطالبہ کو تو آگے نہ بڑھائے گا قسم کھا کر اقرار کرے گا کہ بس اس سے زیادہ میں کبھی اور کچھ نہ چاہوں گا اجازت دے دی جائے گی، یوں ہی ایک درخت کے بعد اس سے زیادہ گھنا اور بہتر درخت اس کے سامنے آئے گا اور اپنے معاہدہ کو توڑ کر اس کے نیچے جانے کی اجازت چاہے گا۔ تا کہ آنکہ بالآخر سرکتے ہوئے وہ جنت کے دروازے پر پہونچ کر جنت میں داخل ہو جانے کی اجازت چاہے گا۔ اس وقت حق سبحانہ تعالی اس سے فرمائیں گے کہ

مایصرفنی منک تجھ سے میرا پیچھا آخر کون چیز چھڑائے گی۔

ایک فرمائش کے بعد اس سے زیادہ بہتر فرمائش کرتا ہی چلا جاتا ہے۔ اور اسی کے ساتھ ارشاد ہوگا کہ:

"کیا اس پر تو راضی ہو جائے گا کہ تجھے ساری دنیا اور اس دنیا کے مانند دوسری دنیا دیدی جائے"

تب وہ غریب گنہگار عرض کرے گا کہ:

یارب اتستھزء منی و انت رب العلمین آپ مجھ سے مذاق کرتے ہیں حالانکہ آپ سارے جہانوں کے مالک ہیں۔

حدیث کے راوی صحابی ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب اس روایت کو بیان کرتے تو ہنسنے لگتے اور کہتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی یوں ہی اس حدیث کو بیان کرتے ہوئے ہنستے تھے آپ سے ہنسنے کی وجہ پوچھی گئی تو فرمایا تھا کہ:

''اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے سے یہ سن کر کہ سارے جہانوں کے مالک ہوکر مجھ غریب سے مذاق کرتے ہیں''۔

گنہگار کے اس فقرے پر خود اللہ تعالیٰ کو ہنسی آجائے گی۔

اور اس کے بعد اس غریب بندے سے ارحم الراحمین فرمائیں گے کہ:

''میرے بندے میں تجھ سے مذاق نہیں کرنا لیکن جو میرے جی میں آتا ہے وہ کرتا ہوں''۔

اس حدیث پر پہونچنے کے بعد شاہ صاحب کے جذبات چھپانے کے باوجود چھلک کر باہر آجاتے تھے۔ اور اس قسم کی عام حدیثوں مذظرافت میں شریک فرما کر آگے بڑھ جاتے۔

اسی سلسلہ میں کبھی کبھی ان پر خاص جذبہ طاری ہوتا طلبہ جماعت سے مخاطب ہوکر فرماتے تم سمجھتے ہو کہ میں کوئی بڑا کام کر رہا ہوں حالانکہ جانتے ہو میری حیثیت بھی وہی جو مدرسہ کے منیر خاں کی۔ منیر خاں (۱) بھی چکی پیستے ہیں اور میں مدقق ہوں۔ دقیق (آٹا) پیستا ہوں۔ اس سے زیادہ کچھ اور نہیں۔ اسی موقعہ پر خیال آتا ہے بسا اوقات ان کی زبان مبارک سے فقیر ان الفاظ کو سنا کرتا تھا۔ فرماتے کہ:

"مجھے کچھ نہیں چاہئے صرف دو پیالیاں کشمیری (۲) چائے کی دو بسکٹ ایک نیزا ایک گھوڑا"

بظاہر مطلب حضرت مرحوم کا یہ ہوتا کہ اصلی اور صحیح زندگی ایک مومن مسلم کی یہ ہے کہ "میدان جہاد" میں اپنا وقت صرف کرے۔ ان کے دل کی یہی حسرت حقیقی حسرت تھی۔ اس کے مقابلہ میں درس و تدریس تعلیم و تعلم کے جذبات کی ان کی نظروں میں کوئی قدر و قیمت نہ تھی لیکن جیسے اللہ اور اس کے رسول (علیہ السلام [۲]) کے ساتھ اپنے صحیح تعلقات کو کوشش کر کے چھپانے کے عادی تھے۔ اسی طرح وہ اپنی دل کی اس آرزو کے متعلق بجائے لمبی چوڑی تقریروں کے صرف مزاحی کنایوں اور اشاروں میں کبھی کبھی فرما کر۔

باهم نگرستیم گرستیم و گذشتیم

کے نفسیاتی اثر کے ساتھ گزر جاتے۔

دورہ اختتام کی حد پر جب پہونچتا تو اس وقت اپنے خاص انداز میں فرماتے کہ اب زیادہ دیر نہیں ہے میں مرغوں کا دڑبہ کھول دوں گا یہ مرغے جو ہمارے اردگرد جمع ہیں ڈربے سے نکلیں گے۔ دیکھتا ہوں کہ بلندیوں پر چڑھ چڑھ کر بازوؤں کو پھڑ پھڑاتے ہوئے کون بانگ دیتا ہے۔ کس کی آواز کتنی اونچی ہوتی ہے اس قسم کے لطیفوں میں وہ سب کچھ کہہ دیا کرتے تھے جو کہنا چاہتے تھے۔

نور اللّٰه ضريحه و طاب ثراه و جعل الجنة مثواه للهم

اغفرله و رحمه كما ربياني صغيرا

حضرت شاہ صاحب کے حلقہ درس کی ایک خصوصیت کا خیال ہی نہ آیا۔ حالانکہ درس انوری کا یہی لازمی جز تھا شدت ظہور کہتے ہیں کہ کبھی خفا کا سبب بن جاتا ہے جسے سب سے زیادہ یاد رہنا چاہئے تھا وہی یاد نہ آیا خیر قصہ یہ ہے مجھ سے پہلے اور میرے بعد والوں کا مشاہدہ اس باب میں کیا ہے۔ لیکن میں نے تو یہی دیکھا تھا کہ صحیح مسلم کا درس ایک گھنٹہ یا اس سے کچھ زیادہ روزانہ ہوا کرتا تھا۔ اور پورا وقت علمی مباحث و مسائل ہی کی شرح و تفسیر تطبیق و ترجیح میں صرف ہوتا تھا۔ نہیں کہہ سکتا کہ اپنی اور طلبہ کی طبیعت کے ملال اور تکان کا خیال کر کے یہ طرز عمل شاہ صاحب نے اختیار کر رکھا تھا یا فطرت میں ان کی ظرافت، مزاح کا جو فطری جذبہ پوشیدہ تھا یہ اس کا اقتضا تھا۔ کچھ بھی ہو درس کے پہلے ہی دن سے دیکھنا شروع کیا کہ ہمارے ایک رفیق درس جن کا اسم گرامی غالباً مولوی محمد عیسے تھا۔ شاید بگھرہ نامی قصبہ کے رہنے والے تھے۔ بیچارے بڑے متین اور سنجیدہ اور نیک آدمی معلوم ہوتے تھے۔ شدت نیکی کی وجہ سے تعلق ان کا علم کے ساتھ بھی نیک ہی

نیک ساتھا۔ شاہ صاحب کے متصل دست چپ کی طرف شروع ہی سے اپنی جگہ انہوں نے بنالی تھی۔ وقت پر ٹھیک اپنی اسی مقررہ جگہ پر آ کر بیٹھ جاتے۔ شاید کسی دوسرے طالب علم کی ہمت بھی نہ ہوتی تھی کہ ان کی جگہ پر قبضہ کرے۔ ہوتا یہ تھا کہ کسی بلند و بالا مسئلہ پر شاہ صاحب کے معلومات کا بحر ذخار موجیں مارتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ حافظ الدنیا، اور شیخ ابن ہمام، شمس الائمہ سرخسی اور ابن نجیم کا ذکر ہو رہا ہے کہ اچانک شاہ صاحب مولوی محمد عیسی کی طرف تبسمانہ لہجہ میں مخاطب ہو جاتے اور ان کی طرف خطاب کر کے کچھ فرماتے رہتے۔ صحیح الفاظ تو اس وقت یاد نہ رہے اور الفاظ کی نوعیت ایک رہتی کب تھی تاہم حاصل یہی ہوتا تھا کہ جو کچھ بیان کیا گیا گویا مولوی محمد عیسی صاحب سے اس کی تصدیق چاہی جا رہی ہے۔ بیچارے مولوی عیسی صاحب خاموش مسکرانے لگتے۔ سارا حلقہ اس وقت صرف مسکراہٹ ہی مسکراہٹ تبسم ہی تبسم بن جاتا تھا "ہاں مولوی عیسی صاحب تو اب آپ کی رائے اس مسئلہ میں کیا ہے"۔ یہ یا اسی کے قریب قریب عموماً ان سے سوال کیا جاتا۔ بظاہر مولوی عیسی صاحب کے وجود سے استرواح اور ازالہ ملال وسامہ کا کام لیا جاتا تھا۔ شاید ہی کوئی دن ایام درس کے اس طویل عہد میں ایسا گزرا ہو جس میں دلوں کے انبساط و انشراح کا یہ موقعہ اول یا آخر یا وسط میں نہ نکل آتا ہو معلوم نہیں ہمارے یہ رفیق درس آج کل کہاں ہیں کس مشغلہ میں ہیں۔ اسی دنیا میں ہیں۔ یا اپنے محبوب استاذ اور سلف صالحین کے ساتھ لاحق ہو گئے۔ اگر اسی دنیا میں موجود ہوں تو ان سے معافی کا خواستگار ہوں۔ درس انوری کی اس خصوصیت سے سکوت پر دل راضی نہ ہوا۔

اللهم ارحمنی بعبادک الغرّ الکرماء

جیسا کہ میں نے عرض کیا، اسلامی علوم وفنون کے دائرے کا شاید ہی کوئی علم یا فن ہوگا۔ جس سے شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کو دلچسپی نہ تھی اور ہر ایک علم وفن کے اصولی مسائل کے متعلق کوئی خاص تحقیق نظریہ وہ نہ رکھتے ہوں بلکہ عہد حاضر کے جدید کار آمد علوم کے صحیح معلومات کا بھی کافی ذخیرہ ان کے پاس موجود تھا۔ خصوصاً ہئیت (اسٹرانومی) کی جدید اصطلاحات کا انہوں نے تحقیقی و تفصیلی مطالعہ کیا تھا۔ انگریزی زبان سے تو ناواقف تھے اگرچہ کبھی کبھی حلقہ درس میں یہی فرماتے کہ ابتداءً جیسا کہ مجھے خیال آتا ہے کہتے تھے کہ کشمیر کے کسی عصری اسکول میں کچھ دن شریک ہونے کا موقعہ بھی ان کو ملا تھا لیکن فرماتے کہ انگریزی کے دو لفظ غالباً

پگ (Pig) اورفش (Fish) یہی دو لفظ مجھے یاد رہ گئے ہیں۔

لیکن بااین ہمہ ایک تو اسلامی عبادات کے متعلق کچھ دنوں سے ''فیلاسوفی'' نکالنے کا راوج جو چل پڑا ہے مثلاً وضو، باعث نشاط ہے اور ورزش جسمانی کا فائدہ نماز کے قیام وقعود سے حاصل ہوتا ہے۔ ازیں قبیل مصالح وحکم ان شرعی امور کے جو بیان کئے جاتے ہیں شاہ صاحب ان کی تعبیر حکمت سے کرتے تھے۔ اور فرماتے کہ ارباب قانون وتفقہ کی نظر حکمت پر نہیں بلکہ حکم کی علت پر ہوتی ہے۔ مثالاً کہتے ہیں کہ سفر میں روزے کی تاخیر کی حکمت تو یہ ہے کہ مشقت سے بچانا مقصود ہے لیکن سفر میں تاخیر صوم کی یہ علت نہیں ہے۔ اسی لئے ایسا مسافر جسے سفر میں روزہ رکھنے کی سہولت ہی کہیں میسر نہ ہو۔ وہ تاخیر صوم کے اس قانون سے مستفید ہوسکتا ہے۔ قانون کا فیصلہ یہی ہوگا۔

بہرحال شرائع کے متعلق حکمت نوازیوں کے اس مذاق کی شاہ صاحب حوصلہ افزائی نہیں فرماتے۔ اسی سلسلہ میں عموماً حضرت مولانا گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ کی طرف منسوب کرکے سنایا کرتے تھے کہ کسی نے تشہد میں انگلیوں کے اٹھانے کی مصلحت یا حکمت آپ سے دریافت کی تو سوال کو بے پروائی کے ساتھ سنتے ہوئے اور شاید یہ فرماتے ہوئے کہ ان باتوں میں کیا رکھا ہے. جی میں آئے تو کہہ دیا جاسکتا ہے کہ انگلی تشہد کی اٹھا کر اقرار توحید اور دوسری انگلیوں کے بند کرنے کا مطلب یہ لیا جائے کہ اسی توحید کے ساتھ اپنے دل کے اعتقاد کو نمازی وابستہ کرتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ نماز و روزہ کے فلسفہ سے شاہ صاحب کو کوئی دلچسپی نہ تھی اور جیسے کہتے ہیں سور تو حرام اپنی نجاست کی وجہ سے ہے اور آدمی کا گوشت بھی حرام ہی ہے لیکن کراہت کی وجہ سے اسی طرح حضرت شاہ صاحب کتابوں میں اگر کسی کتاب سے مرعوب اور حد سے زیادہ مرعوب تھے وہ اللہ کی کتاب قرآن تھا۔ قرآنی آیات کی تشریح وتفسیر میں آج جن بیجار جسارتوں کا مشاہدہ ہم کررہے ہیں اس کو دیکھ کر اب سمجھ میں آتا ہے کہ قرآن اور قرآنیات کے ساتھ حضرت شاہ صاحب کے سکوت کا راز کیا تھا۔

کبھی کبھی اس باب میں ان سے کچھ سنا بھی تو یہ سنا کہ بعض غالی عقیدت مندوں نے یہ جو مشہور کر رکھا ہے کہ دین اور دنیا کا کوئی کلی اور جزئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جو قرآن میں موجود نہ ہو۔ یا قرآن سے نکالا نہ جاسکتا ہو۔ اس خیال کی شدت کے ساتھ تردید فرماتے۔ فرماتے کسی بڑے غبی

کا یہ شعر ہے کہ:

جمیع العلم فی القرآن لکن　　　　تقاصر عنہ افہام الرجال

یعنی سارے علوم قرآن میں موجود ہیں۔ مگر لوگوں کی سمجھ اس کے پانے سے قاصر ہے ۔مگر اپنی تقریر کو بس اسی غلط خیال کی تردید تک محدود رکھتے۔ لیکن یہ سوال کہ پھر قرآن میں کیا ہے یا اس کے بحث کا حقیقی موضوع کیا ہے۔ کم از کم اس باب میں ان کا کوئی خاص خیال مجھے معلوم نہ ہو سکا۔ بعض خانگی صحبتوں میں ڈرتے ڈرتے فقیر نے ایک دفعہ اس پہلو کے متعلق کچھ دریافت بھی کرنا یا چاہا۔ لیکن کچھ تو ان کے علم وتقوے اور شخصیت سے غیر معمولی مرعوبیت کی وجہ سے اپنے دل کی بات واضح لفظوں میں پیش نہ کر سکا۔ اور انہوں نے میرے اس سوال کو جس توجہ سے چاہئے تھا۔ سنا بھی نہیں ۔ بعد کو "مشکلات القرآن" کے نام سے ان کے بعض ارشد تلامذہ نے ایک مجموعہ شائع کیا ہے لیکن میرا احساس اس کتاب کے بعد بھی یہی ہے کہ قرآن کی غیر معمولی عظمت و جلال ان کو اس کتاب کی طرف اس طریقہ سے متوجہ ہونے کی اجازت ہی نہیں دیتا تھا۔ جیسے وہ انسانوں کی بنائی ہوئی کتابوں کا مطالعہ فرمایا کرتے تھے۔

بہرحال سیدنا الامام الکشمیر ی سے براہ راست قرآن پڑھنے کا موقعہ تو مجھے نہ مل سکا۔ لیکن حدیث ہی کے درس میں جہاں دوسرے علوم وفنون کے مسائل کی طرف شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا ذہن موقعہ موقعہ سے منتقل ہوتا رہتا تھا اور اپنے اس ذہنی انتقال کا حضرت والا نے اپنی خاص اصطلاح میں "دماغ" نام رکھ لیا تھا۔

درس کی تقریر کرتے ہوئے قاعدہ تھا کہ بیچ بیچ میں فرماتے کہ "دفاع" ہو گیا۔ اس وقت مجھے اصول فقہ کے فلاں مسئلہ کی طرف یا معانی وبیان وبدیع کے نکات کی طرف پچھلے تینوں علوم یعنی معانی بیان۔ بدیع جن میں عربی زبان کی نثر ونظم کے محاسن اور خوبیوں کے سمجھنے کا سلیقہ کلی قاعدوں کی مدد سے اس لئے پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ قرآنی تعبیروں کے اعجازی پہلوؤں کی یافت کی صلاحیت طلبہ میں نشوونما پائے۔ لیکن بجز حضرت شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے کم از کم میں نے کسی مولوی کو نہیں دیکھا جسے صرف یہی نہیں کہ ان علوم کے مسائل مستحضر ہوں ۔ بلکہ ان کے کلیات کو جزئیات پر منطبق کرنے کی مہارت رکھتا ہو۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاہ صاحب نے ان علوم کا مطالعہ غیر معمولی شوق اور دلچسپی کے

ساتھ کیا تھا۔ قرآنی آیات حدیث کے فقروں عربی زبان کے اشعار کے ساتھ کبھی کبھی فارسی بلکہ کبھی تو اردو تک کے اشعار کے ان پہلوؤں کو نمایاں کر کے ادبی مذاق کو بلند کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ سخن طرازی اور عبارت آرائی کے لئے گو فطری مناسبت کی ضرورت ہے لیکن سخن سنجی اور سخن فہمی کا سلیقہ مصنوعی کدو کاوش سے بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ مگر سچی بات یہی ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے درس کا یہ پہلو بھی عموماً طلبہ کے لئے کچھ غیر مفید ہی ثابت ہو کر رہ جاتا ہے۔

محروموں میں دوسروں کے ساتھ خود یہ فقیر بھی تھا۔ تاہم اس ذریعہ سے کبھی کبھی قرآن و قرآنیات کے متعلق شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے خصوصی نقاط نظر کے سننے کا موقع مل گیا۔ اور نہیں کہہ سکتا ان ہی گنی چنی باتوں سے کتنے بے شمار فوائد مجھے حاصل ہوئے۔ مثلاً ایک خیال ان کا یہ تھا کہ:

و لقد یسرنا القرآن للذکر اور ہم نے آسان کیا ہے قرآن کو چونکہ پیدا کرنے کے لیے یا اسی قسم کی دوسری آیتوں میں سہولت اور آسانی اپنی خصوصیت قرآن جو قرار دی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قرآنی حقائق و معارف کی گہرائیوں تک ہر کہ ومہ کی رسائی آسان ہے بلکہ حق سبحانہ تعالے کی مرضی مبارک کے مطابق زندگی بسر کرنے کا جو طریقہ قرآن میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کا ذکر کچھ اس انداز میں قرآن کے اندر کیا گیا ہے کہ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میری سمجھ میں وہ نہ آیا۔ اس بارہ میں قرآن کا طریقہ خطاب اتنا واضح صاف وشستہ اور روشن ہے کہ کوئی سمجھنا ہی نہ چاہے یہ تو دوسری بات ہے ورنہ قرآن اپنی حجت پوری کر چکا ہے۔ مثلاً توحید و شرک کے مسئلہ میں قرآن پڑھنے کے بعد بھی خود سوچنا چاہئے۔

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ بات میری سمجھ میں نہ آئی؟ قرآن پڑھنے اور سمجھنے کے بعد بھی مشرکانہ کاروبار میں کوئی الجھا ہوا نظر آئے تو یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ قصداً وارادتاً قرآنی مطالبات سے کترا رہا ہے بلکہ کہا جائے تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ٹکرا رہا ہے اور بغاوت کی راہ اختیار کر رہا ہے۔

حضرت شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے اسی نکتہ کو فقیر کبھی کبھی اس تمثیل کے رنگ میں اپنے طلبہ کے آگے پیش کیا کرتا تھا کہ جمادات و نباتات آب و آتش خاک و باد وغیرہ کی شکلوں میں مادے کا جو ذخیرہ تمہارے سامنے پھیلا ہوا ہے یہ خدا کا کام ہے اس کا ایک پہلو تو یہ کہ ہر عامی و خاصی، جاہل و عالم کی ضرورت اس سے پوری ہو رہی ہے۔ بلکہ انسانوں سے آگے بڑھ کر دیکھنا چاہئے تو عقل سے جو محروم ہیں۔ یعنی حیوانات بھی مادے کے اس ذخیرہ سے مستفید ہو رہے ہیں

ان میں ہر ایک کی شخصی ونوعی بقاء کی ضمانت استفادہ کے اس عام پہلو کے ساتھ وابستہ ہے اپنے اپنے ظرف اور اپنی اپنی ضرورت کے مطابق سب ہی اسی سے اپنا اپنا حصہ تاریخ کے نامعلوم زمانہ سے حاصل کرتے چلے آرہے ہیں۔ اس وقت بھی حاصل کررہے ہیں۔ آئندہ رہتی دنیا تک عام افادہ واستفادہ کا یہ قصہ یوں ہی جاری رہے گا۔

لیکن اسی کے مقابلہ میں مادے کے اسی ذخیرے اور اسی کے مختلف مظاہرے کے ساتھ تعلق ہی کی دوسری نوعیت وہ ہے جو سائنس اور حکمت والے اس سے رکھتے ہیں۔ یہی مٹی یہی پانی یہی ہوا یہی لوہا یہی لکڑی یہی معدنیات جمادات ان کے سامنے بھی ہیں۔ جیسے ہر دیکھنے والے کے سامنے ہیں۔ مگر حکمت وسائنس والے انہی پیش افتادہ چیزوں کے اندر غور کرتے ہیں۔ ٹٹولتے ہیں۔ ڈھونڈتے ہیں تجربہ کرتے ہیں اور آئے دن ان پر نت نئے نوامیس واسرار کا انکشاف ہوتا رہتا ہے اور کیسے کیسے انکشافات کہ ہم جن باتوں کو سوچ بھی نہیں سکتے تھے آج ان ہی مادی انکشافات کی بدولت وہی ہمارے سامنے ہیں۔ سائنس والوں کے طفیل میں ہم بھی ان کو برت رہے ہیں۔ موٹروں پر چلتے ہیں ہوائی جہازوں پر اڑ رہے ہیں۔ گھر بیٹھے سارے جہان کی خبریں سنتے ہیں۔

عرض کیا کرتا تھا کہ قدرت کے کام کا یہ رنگ جو نظر آرہا ہے کچھ یہی حال اس قدرتی کلام کا بھی ہے۔ جسے ہم "القرآن" کہتے ہیں۔ ضرورت کی حد تک تو اس کتاب پر ایمان لانے والوں میں سے ہر ایک مستفید ہو رہا ہے اپنی اپنی حاجت کے مطابق اپنا اپنا حصہ ہر ایک اس قدرتی کلام سے حاصل کرسکتا ہے اور کررہا ہے لیکن اس قدرتی کلام کے ساتھ دوسرا تعلق ان لوگوں کا ہے جو تدبر تذکر کی دولت سے سرفراز کئے گئے ہیں۔ یہی لوگ اس قدرتی کلام کے حکماء (سائنٹسٹ) ہیں ان کو ان ہی آیتوں میں جنہیں پڑھنے والے پانچوں وقتوں کی نمازوں میں دہراتے رہتے ہیں اسرار ورموز کا سمندر موجیں مارتا ہوا نظر آتا ہے۔

بعض روایتوں میں قرآن کی خصوصیتوں کو بتاتے ہوئے اسی کی ایک شان کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔ سمجھنے والوں کے نزدیک

لا تنقضی عجائبہ ولا یخلق علی کثرۃ الرد. اس کے (یعنی قرآن کے) عجائب (یعنی ایسے انکشافات جو لوگوں کو حیرت میں ڈال دیں) ختم نہ ہوں گے اور بار بار دہرائے جانے کی وجہ سے یہ کلام کبھی پرانا نہ ہوگا۔

ان الفاظ کا یہی مطلب ہے۔[1]

میں نے مراجعت کی تو حسن اتفاق سے بخاری شریف کی املائی شرح فیض الباری میں قرآن کے متعلق حضرت شاہ صاحب کے اس نقطۂ نظر کو بھی دیکھا کہ ذکر کر دیا گیا ہے۔ جامع تقریر نے حضرت شاہ صاحب کے مقصد کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔ یعنی فرماتے تھے:

لیس معنی قوله تعالی و لقد یسرنا القرآن الآیه ان کنهه یحصل لکل من جل و قل بل معنی یسره انه یغترف منه کل غلیل و یشفی منه کل علیل فیهتدی منه کل احد الی ما یرضی به ربه و الی مالیسخط عنه و لایحتاج فی ذلک الی کبیر تفکیر. امامعانیه الغامضة، و مزایاه الرائقة و مرامیه الناعمة فقد انقصمت ظهور الفحول عن ادراکها. و عجزت الافکار عن الطواف حول حریموا

فیض الباری ص ۸۷، ج ۴

حق تعالیٰ کے ارشاد ولقد یسرنا القرآن (یعنی ہم نے قرآن کو آسان کر دیا ہے) اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر کہہ ومہ کی رسائی قرآن کے کنہہ اور تہ تک آسان کی گئی ہے۔ بلکہ اس آسانی سے مراد یہ ہے کہ ہر پیاسے کو موقع دیا گیا ہے کہ اس سرچشمہ سے پی سکتا ہے اور ہر بیمار اس سے اچھی شفا حاصل کر سکتا ہے یعنی جن باتوں سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتے ہیں اور جن باتوں کو ناپسند کرتے ہیں ان کو وہ پاسکتا ہے اس کے لیے مزید کنج و کاوٗ سوچ بچار کی ضرورت نہیں۔ باقی قرآن کے گہرے معانی اور اس کے عمیق شاداب پہلوؤں اور جن دل آویز حقائق کی نشان دہی اس کتاب میں کی گئی ہے تو ان کی یافت آسان نہیں ہے مردان راہ کی پیٹھیں اس نے توڑ دیں۔ ان لطائف و رموز کے احاطہ تک پہونچنا ان کے گرد چکر کاٹنا اس نے بڑے بڑے سوچنے والوں کو تھکا مارا ہے۔

کیا قرآن میں سب کچھ ہے؟

لیکن اس کے ساتھ حضرت شاہ صاحب وقتاً فوقتاً طلبہ کو اس پر بھی متنبہ کرتے رہتے تھے کہ قرآن کے نادان دوستوں میں یہ عامیانہ خوش اعتقادی جو پھیلی ہوئی ہے کہ ''قرآن میں سب کچھ ہے'' گویا کچھ یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ خدا سب کچھ چونکہ جانتا ہے اس لیے چاہیے کہ اس کتاب میں سب کچھ ہو۔

لا رطب و لا یابس الا فی کتاب مبین — نہیں ہے کوئی تر یا خشک بات مگر کتاب مبین میں سب کچھ ہے۔

یہ یا اسی کے ہم معنی وہم مفہوم آیتوں کو تائید میں پیش کر دیا جاتا ہے اس میں شک نہیں کہ اہل علم کے سنجیدہ طبقات میں اس قسم کی خوش اعتقادیوں کی کبھی ہمت افزائی نہیں کی گئی۔ لیکن کھلے کھلے صاف الفاظ میں اس عامیانہ احساس کا ازالہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ درس میں بار بار مختلف پیرایوں میں جس زور اور قوت کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ اس کے تاثرات اب تک اپنے اندر پاتا ہوں۔ ان ہی کی زبان مبارک سے غالباً پہلی دفعہ یہ عربی شعر سنا تھا۔ فرمایا کرتے تھے کسی ''غبی'' کا شعر ہے ہے کہ

جمیع العلم فی القرآن لکن تقاصر عنہ افہام الرجال

(یعنی سارے علوم قرآن میں موجود ہیں لیکن لوگوں کی سمجھ ان کے پانے سے کوتاہ ہو کر رہ گئی)

حقیقت یہ ہے کہ اپنے معلومات کو ظاہر کرنے کے لیے قرآن کو خدا نے نازل کیا ہے۔ اگر یہ مانا جائے تو ساری کائنات بھی کاغذ کی شکل اگر اختیار کر لیتی جب بھی ''خدائی معلومات'' کے لیے وہ قطعاً کافی نہ ہوتے۔ میں تو کہتا ہوں کہ غریب جاہل آدمی کو بھی اپنی معلومات کو قلم بند کرنا چاہیے تو ان کے لیے مجلدات کی ضرورت ہوگی۔ پھر خدائی معلومات تو خدائی معلومات ہیں اور معلومات کا اظہار اگر مقصود نہیں ہے۔ بلکہ نسل انسانی اپنے صحیح انجام تک علم و عمل کے جس نظام کی پابندی کر کے پہنچ سکتی ہے۔ فقط اس نظام کے بنیادی کلیات سے آگاہ کرنے کے لیے قرآن نازل ہوا ہے اور یہی اس کتاب کی بحث کا اساسی و جوہری موضوع ہے بھی تو اس کے سوا قرآن میں خارج از موضوع معلومات کا تلاش کرنا۔ نہ صرف تلاش کرنے والوں کی غباوت و بلاوت ہی کی دلیل ہے بلکہ قرآن کے نازل کرنے والے کی طرف ایک ایسے نقص کو منسوب کرنے کی یہ جرأت ہوگی جسے یہ بہ ثبات عقل و ہوش کوئی صاحب تمیز و خرد آدمی بھی اپنی کسی تصنیف کے متعلق شاید برداشت نہیں کر سکتا۔ آخر طب کی کسی کتاب میں شرح وقایہ کے فقہی مسائل یا شرح وقایہ میں امیر اور داغ کے کلام کے تنقیدی مضامین کو جو ڈھونڈے گا۔ اس کے جنون میں کیا کوئی شبہ کر سکتا ہے۔

یاد آتا ہے کہ مذکورہ بالا شعر کو شاہ صاحب اکثر دہراتے۔ کبھی تو کہنے والے کو صرف ''غبی'' ہی کہہ دینے پر اکتفاء کرتے اور جب زیادہ جلال آتا تو کہتے کہ کس ''غبی الاغبیا'' کا یہ شعر ہے[1]

قرآنی تعبیروں کے متعلق ایک عالمانہ نکتہ:

بلکہ اس باب میں قرآن کے پیرایۂ بیان اور طریقۂ تعبیر کے ایک خاص پہلو کی طرف

بھی شاہ صاحبؒ اشارہ فرمایا کرتے تھے۔ اس کو اگر سمجھ لیا جائے تو بہت سی غلط فہمیوں کا خود بخود ازالہ ہو جاتا ہے اور بیسیوں بے معنی الجھنوں سے نجات مل جاتی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ قرآن میں مثلاً حکم دیا گیا ہے کہ کیا تم اونٹ کو نہیں دیکھتے یا آسمانوں کو، پہاڑوں کو، زمین کو نہیں دیکھتے؟

الغرض (دیکھنا نظر و بصر) ایک انسانی فعل ہے۔ جس کو قرآن عموماً گرد و پیش کی چیزوں کی طرف منسوب کرتا ہے اب کوئی یہ کہنے لگے کہ آدمی درحقیقت صرف رنگ کو دیکھتا ہے۔ رنگ کو بھی نہیں بلکہ روشنی سے حقیقی تعلق آدمی کی قوت بینائی کا قائم ہوتا ہے اور روشنی کے توسط سے رنگوں (ہرے، پیلے، سبزہ وغیرہ) کو دیکھتا ہے لیکن جو چیز نہ روشنی ہے اور نہ رنگ اس کے ساتھ تو بینائی کی قوت کا تعقل ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔ بینائی کی گرفت میں ہوا مثلاً اسی لیے تو نہیں آتی کہ وہ بے رنگ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قدیم و جدید حکیمانہ تحقیق کا یہی صحیح نتیجہ ہے بھی۔

اب سائنس کی اس تحقیق کو بنیاد بنا کر قرآن پر کوئی معترض ہو کہ جو چیزیں نہ رنگ ہیں نہ روشنی ان کی طرف بصر یا نظر (یعنی بینائی اور دیکھنے) کو منسوب کرکے قرآن نے ایک ایسی بات بیان کی ہے جو واقعہ کے مطابق نہیں ہے۔

شاہ صاحب فرماتے کہ یہ اعتراض قرآن پر اگر اعتراض کرنے والے کے مخبوط ہونے کی دلیل ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اپنے احساسات و تاثرات کی تعبیر کا جو عام طریقہ انسانوں میں مروج ہے۔ اسی طریقۂ معتبر کو اختیار کرکے قرآن باتیں سمجھاتا ہے اور قرآن ہی کیا۔ یوں بھی سائنس اور فلسفہ کے مسائل کا کوئی خبطی اپنی بیوی سے کہہ بیٹھے کہ ''تم کو اگر میں دیکھوں تو تم پر طلاق پڑ جائے''۔

اس کے بعد بیوی کو دیکھنے کے بعد دعوی کرے کہ میں نے بیوی کو کب دیکھا میں نے تو صرف اس رنگ کو دیکھا جو اس کے چہرے کی کھال پر چڑھا ہوا ہے اور اس لیے کہتا پھرے کہ طلاق نہیں پڑی پاگل خانوں کے سوا ایسوں کے لیے اور بھی کہیں جگہ ہوسکتی ہے؟

اس مثال کو سمجھانے کے بعد فرمایا کرتے کہ قرآن میں اس قسم کی آیتیں جو پائی جاتی ہیں جن میں حرکت اور جاری ہونے کے تعلق کو آفتاب و ماہتاب کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ مثلاً

و الشمس تجری لمستقرلها اور آفتاب اپنے ٹھکانے کے لیے جا رہا ہے۔

وغیرہ جیسی آیتوں میں یہی کہا گیا ہے تو اس کا مطلب بھی ظاہر ہے کہ یہی ہوسکتا ہے بلکہ یہی ہے کہ

اپنے مشاہدات واحساسات کی جو تعبیر عموماً لوگوں میں مروج ہے۔ اسی طریقۂ معتبر و پیرایۂ بیان کو قرآن نے اختیار کیا ہے جیسے نظر و بصر (بینائی) کو ان ہی چیزوں کی طرف قرآن نے منسوب کر دیا ہے۔ جس کی طرف منسوب کرنے کا رواج ہے لیکن نظر و بصر کے متعلق جیسے یہ سمجھا جاتا ہے کہ واقعی بینائی کا تعلق جن چیزوں سے ہوتا ہے اس حقیقت کا اظہار یہ قرآن کا مقصود نہیں ہے۔

اسی طرح آفتاب و ماہتاب وغیرہ کی طرف جاری ہونے کے فعل کے انتساب سے یہ سمجھ لینا کہ رات اور دن کا جو چکر ہمارے سامنے جاری ہے اس کی اصل حقیقت کو قرآن واشگاف کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب تو پھر وہی ہوا کہ اپنی معلومات کو ظاہر کرنے کے لیے قرآن کو حق تعالی نے نازل فرمایا ہے۔

لیکن جب معلوم ہو چکا کہ قرآن کے موضوع پر بحث سے جو جاہل ہے وہی اس قسم کے مالی خولیا میں مبتلا ہو سکتا ہے تو حوادث کائنات کی توجیہ و تاویل کے قصوں کو قرآن میں ڈھونڈھنا اس سلسلہ میں قرآن کی طرف کسی قطعی فیصلہ کی جرات خود اپنی عقل کی اہانت ہے اور ایسے عیب و نقص کو قرآن کی طرف منسوب کرنا جسے عرض کر چکا ہوں، کوئی صحیح العقل آدمی بھی اپنی تصنیف میں پسند نہیں کر سکتا۔ دیوانہ ہی ہوگا جو تاریخ کی کتاب میں ڈاکٹری نسخوں کا ذکر چھیڑ دے یا طب کی کتاب میں شعر وادب کی تنقید ڈھونڈھنے لگے۔

بہرحال رات اور دن کے الٹ پھیر کے واقعی اسباب خواہ کچھ ہی ہوں زمین گھومتی ہو یا آفتاب چکر ارہا ہو یا آسمان گردش میں ہو، قرآنی مباحث کے دائرے سے یہ سوالات خارج ہیں۔

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہی فرمایا کرتے تھے کہ اس سلسلہ میں اپنی تعبیروں کو عام انسانی احساسات کے مطابق اگر قرآن رہنے نہ دیتا، مثلاً رات دن کے اسی قصہ میں اعلان کر دیتا کہ زمین کی گردش کا یہ نتیجہ ہے تو مطلب اس کا یہی ہوتا کہ جب تک زمین کی گردش کا مسئلہ طے نہ ہوتا قرآن پر ایمان لانے سے لوگ محروم رہتے۔

کہا کرتے تھے کہ لوگ دن رات ہی کے ایک قصے میں الجھے ہوئے ہیں۔ لیکن حقیقت کی پیشگاہ میں انسانیت جب داخل ہوگی۔

—السرائر—پوشیدہ حقائق—

ابل کر اپنی اصلی شکلوں میں جب سامنے آ جائیں گے تو اس وقت پتہ چلے گا کہ دن اور رات

کے الٹ پھیر ہی کی صرف یہی ایک بات نہیں بلکہ جو کچھ دیکھا سنا جا رہا ہے۔ چکھا اور چھوا(۱) جا رہا ہے۔

الغرض ہمارے احساسات کا بڑا حصہ معلوم ہوگا۔ اس کی نوعیت ان حالات سے مختلف ہے جنہیں اس وقت ہم پا رہے ہیں۔ گویا **وبد الھم من اللہ ما لایعلمون** کی قرآنی خبر چہرے سے نقاب الٹ کر سامنے آجائے گی تب پتہ چلے گا کہ ہم کیا سوچتے تھے اور اب کیا ہو رہا ہے۔

یہ بھی کبھی کہا کرتے کہ لیل و نہار کا انقلاب زمین کی گردش کا نتیجہ ہے، حالانکہ علم کے عصری حلقوں میں اس کو ایک ثابت شدہ غیر مشتبہ فیصلہ قرار دیا جاچکا ہے لیکن با ایں ہمہ بولنے والے اب بھی جب بولتے ہیں تو یہی کہتے ہیں کہ آفتاب غروب ہو رہا ہے طلوع ہو رہا ہے۔ سورج سمت الراس پر آگیا یہ کیا ہے؟

وہی بات کہ افہام و تفہیم میں عام قاعدہ یہی ہے کہ عام احساسات کے مطابق تعبیریں اختیار کی جاتی ہیں۔ بجائے اس کے کوئی طلوع کی اطلاع دیتے ہوئے کہنے لگے کہ گھومتے ہوئے زمین اس نقطہ تک پہنچ گئی۔ جہاں سے آفتاب کا کنارہ دکھائی دیتا ہے اور خیال کریئے کہ واقعہ کی صحیح نوعیت یہی ہے ممکن ہے کہ واقعہ بھی ہو(۱) لیکن طریقۂ تعبیر غلط۔ ہے۔

آپ نے ملازم کو حکم دیا کہ بالا خانے پر چڑھ کر دیکھو آفتاب نکلا یا نہیں؟ دیکھنے کے باوجود آپ کا فلسفی ملازم یہ فلسفہ اگر بگھارنے لگے کہ آفتاب مجھے نظر نہیں آیا اور مطلب یہ لے لے کہ میں نے جس چیز کو دیکھا یعنی روشنی وہ آفتاب کی نہ تھی اور واقع میں جو آفتاب ہے وہ مجھے نظر نہ آیا؟ تو خود ہی بتایئے کہ اپنے اس فلسفی ملازم پر آپ کا غصہ تھم سکتا ہے؟ یا وضوء کے لیے ملازم سے کہا جائے کہ کنویں کا گرم تازہ پانی نکال کر لاؤ ملازم یہ سوچ کر پانی کا درجۂ حرارت تو گرما و سرما دونوں موسموں میں ایک ہی رہتا ہے نہ جائے اور کہنے لگے کہ پانی کنویں کا گرم کب ہوتا ہے جو لاتا تو اس کی ملازمت کے سلسلہ کو اس کا فلسفہ آئندہ کیا جاری رہنے دے گا؟

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اسی خیال نے میرے ذہن کو ادھر منتقل کیا کہ قرآنی آیات کو محکمات و متشابہات دو حصوں میں تقسیم کر کے قرآن ہی میں جو اطلاع دی گئی ہے کہ جن کے دلوں میں کجی اور ٹیڑھ ہے۔ وہی فتنہ انگیزیوں کے لیے متشابہ آیتوں کی تاویل و توجیہ کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ فرمایا گیا ہے کہ:

فالذین فی قلوبھم زیغ فیتبعون ماتشابہ منہ ابتغاء الفتنۃ و ابتغاء تاویلہ

کچھ ادھر دھیان جاتا ہے کہ قدرت کے کلام کی یہی خصوصیت قدرت کے کام میں بھی نظر آتی ہے۔ یعنی جیسے کلامی آیات کی ایک قسم وہ ہے جس کا نام قرآن نے متشابہات رکھا ہے۔ اسی طرح کائناتی آیات اور نشانی آیات اور نشانیاں جنہیں صحیفۂ قدرت پر حق تعالی نے نمایاں فرمایا ہے ان آیات کے بھی بعض مظاہر کی نوعیت تقریباً متشابہات ہی جیسی نظر آتی ہے۔ بجائے خود کائناتی آیات کے متشابہات کی تاویل وتوجیہ ان کے اسباب وعلل کا سراغ اور ٹوہ لگانا یہ دوسری بات ہے۔

لیکن بعض لوگ جنہیں درحقیقت نہ حکمت اور سائنس ہی کا ذوق ہوتا ہے اور نہ دین اور مذہب ہی کی قدروقیمت کا انہیں صحیح اندازہ ہے بلکہ اپنی قلبی زیغ اور ذہنی کجی کی وجہ سے خواہ مخواہ ان کو اس کا شوق ہوتا ہے کہ کائناتی آیات کے متشابہات یعنی جن کی توجیہ وتاویل میں مختلف پہلو پیدا ہوسکتے ہیں ان کے درپے جاتے ہیں اور؟؟؟ وعقلیات کے تصادم وتناقض کا ہنگامہ برپا کرتے ہیں۔

مگر آپ دیکھ رہے ہیں **الراسخون فی العلم** کا مذاق متشابہات کی دونوں قسموں کے متعلق کتنا صاف وپاک، ستھرا اور اجلا ہے ایک کے متعلق اپنے اندر:

امنا به کل من عند ربنا وما یذکر الا اولوالالباب (آل عمران)

پروردگار کے پاس کی چیزیں ہیں اور نہ چونکتے مگر وہی لوگ جو مغز والے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ متشابہات خواہ قدرت کے کلام سے ان کا تعلق ہو یا قدرت کے کام سے، دل میں زیغ اور ٹیڑھ ہو تو دونوں ہی سے فتنہ انگیزی اور فساد پردازی کا کام لیا جاسکتا ہے۔ لیکن جن کا علم راسخ ہے اور قلب سلیم ہے وہ جانتے ہیں کہ قدرت ہی نے جن آیات اور نشانیوں میں ''تشابہ'' کا رنگ بھرا ہے ان میں بہرحال یہ رنگ باقی ہی رہتا ہے اس رنگ کو دور کرکے ''متشابہات'' کو بھی 'محکمات'' کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش سچ پوچھئے تو قدرت اور اس کے قوانین سے کش مکش کی یہ ایک گستاخانہ کوشش ہوگی۔

واقعہ یہ ہے کہ مادی کائنات اور قرآنی آیات جنہیں اپنی خاص اصطلاح میں فقیر روحانی کائنات بھی کہتا ہے ان دونوں قدرتی آیات اور نشانیوں میں مشابہت ومجانست کے...... بیسیوں وجوہ خاکسار پر واضح ہوتے ہیں جن میں بعض کا تفصیلی ذکر آپ کو میرے رسالہ'' کائنات روحانی'' میں ملے گا۔

مناسبت ومشابہت کے ان ہی پہلوؤں میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ قدرتی آیات کے

ان دونوں ہی شعبوں میں مملکت کے ساتھ ساتھ ایسی آیتیں اور نشانیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ جن کو ''متشابہات'' کے سوا ہم اور کچھ نہیں کہہ سکتے دونوں ہی کی توجیہ و تاویل میں مختلف شکوک اور احتمالات پیدا ہوتے ہیں۔

یہی رات دن کے الٹ پھیر کے قصہ میں دیکھئے۔ مادی کائنات کے۔ بے شمار مشاہدات میں ایک مشاہدہ یہ بھی ہے لیکن یہ کیوں ہو رہا ہے کیسے ہو رہا ہے؟ سن چکے کہ مادی کائنات کی اس آیت اور نشانی توجیہ میں سوچنے والوں کا دھیان کن کن باتوں کی طرف گیا۔ ہزار ہزار سال گزر چکے ہیں بیسویں صدی عیسوی کا نصف حصہ بھی گزر چکا ہے لیکن قطعی اور محکم فیصلہ جس میں آئندہ کسی ترمیم کی گنجائش باقی نہ رہے اس وقت تک طے نہ ہوسکا۔ زمین ہی کی گردش کا نتیجہ اس کو مان لیا جائے۔ جیسا کہ اس زمانہ میں مان لیا گیا ہے۔ لیکن خود زمین کی اس حرکت اور گردش کی نوعیت کے متعلق مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کی یہ خبر آپ تک پہنچا چکا ہوں کہ صحیح معنوں میں اب تک متعین نہیں ہوئی ہے۔

یورپ و امریکہ کے حکماء اس باب میں جو کچھ مان چکے تھے۔ پھر بحث طلب مسئلہ بن گیا اور خدا ہی جانتا ہے کہ آئندہ سوچنے والے اس راہ میں کن کن خیالات اور تجویزوں کو پیش کرنے والے ہیں اور اسی کو میں ''تشابہ'' کہتا ہوں یہ مثال تو مادی کائنات کی ایک قدرتی آیت اور نشانی کی ہوئی۔ اب روحانی کائنات میں آیئے۔ دور کیوں جایئے اسی رات اور دن جس کا بہرحال سورج کی روشنی ہی سے تعلق ہے جس وقت تک اس کے جس حصہ پر سورج کی روشنی پڑتی ہے اس حصہ کا وہ وقت دن ہے اور روشنی اس کی جب اس حصہ سے غائب ہو جاتی ہے تو وہی رات اس حصہ کی قرار پاتی ہے۔

قرآن میں اسی سورج کی طرف تجری کا لفظ منسوب کیا گیا ہے لیکن یہ ہمارے عام احساسات کی تعبیر ہے یا خالق کائنات کے علم میں واقعہ کی جو صحیح نوعیت ہے۔ اسی واقعہ کے مطابق تجری کے اس لفظ سے اپنے علم کو حق سبحانہ وتعالی ظاہر فرمانا چاہتے ہیں؟ ذہن دونوں پہلوؤں کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ یہی ''تشابہ'' کا اقتضاء ہے۔ پھر جن کے دلوں میں کجی ہوگی اور زیغ سے جن کے قلوب ماؤف ہیں وہ اس سے فتنہ انگیزی کا کام لے سکتے ہیں۔ لیکن راسخ علم والے اضابہ کل من عند ربنا کو متشابہات کے متعلق اصل قرار دے کر تاویل کی راہ اگر اختیار بھی کریں گے تو وہ ایسی راہ ہوگی جس سے بجائے بھڑکنے کے فتنوں کے دبانے میں مدد مل سکتی ہے۔

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اسی توجیہ کو دیکھئے۔ گردش لیل ونہار کی وجہ خواہ کچھ ہو۔ آسمان یا آفتاب یا زمین کے گھومنے کا یہ نتیجہ ہو یا آئندہ اس انقلابی مشاہدے کے متعلق سوچنے والوں کا کوئی نیا راز واضح ہو، کچھ بھی ہو ہر حال میں قرآن کے حریم ادب کا تقدس واحترام قائم و دائم باقی و برقرار رہتا ہے۔ اس کے سراپردۂ عصمت وجلال کو حکمت وسائنس کا کوئی نتیجہ بھی ہو۔ چھو بھی نہیں سکتا۔ یوں فلسفہ وحکمت کے سیمیائی نظریات اور موہی تاثرات کی رست نگری سے قرآن پر ایمان لانے والے جیسے آزاد رہتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح کائناتی آیات اور نشانیوں کی توجیہ وتاویل تلاش وجستجو کے اطلاقی اختیارات پر بھی قرآن کی طرف سے کسی قسم کی پابندی عائد نہیں ہوتی۔ ایمان بھی آزاد اور عقل بھی آزاد اپنی اپنی راہوں پر دونوں ہی کسی تصادم اور کشمکش کے بغیر سرگرم سیر رہتے ہیں۔

یقین کیجئے کہ دانش کی پختگی، علم کا رسوخ خواہ قرآنی آیات میں ارزانی ہو، یا کائناتی آیات میں میسر آئے۔ ہمیشہ اس نے اسی خوشگوار ماحول کو پیدا کیا ہے۔ لیکن خام فکروں اور خام کاروں کے ہاتھوں میں پہنچ کر پکی باتیں بھی کچی بن جاتی ہیں [1]۔ عارف روم نے سچ فرمایا ہے:

ہر چہ گیرد علتی علت شود　　　کفر گیر د کاملی ملت شود

اسی مضمون کو کسی ظریف نے یوں موزوں کیا تھا

اصیل مرغ سمجھتے ہیں اور ہیں خاموش　　　سنو گے ٹیٹیوں میں چوں وچرا کا جوش خروش

تفسیر بالرائے:

اسی سلسلہ میں قرآن ہی کے متعلق حضرت شاہ صاحب کی اس اصولی بات کا بھی خیال آتا ہے یہ تفسیر یا تاویل بالرائے'' کا مسئلہ ہے بعض روایتیں جن میں تاویل بالرائے کی ممانعت کی گئی ہے اور اسے جرأت بیجا قرار دیتے ہوئے دھمکی دی گئی ہے کہ ''اس جرم کا ارتکاب جہنم کو آدمی کا ٹھکانا (مقعد) بنا دیتا ہے عام طور پر اسی روایت کو بنیاد بنا کر کچھ اس قسم کا خیال پھیلا دیا گیا ہے کہ قرآنی آیات کا مطلب کوئی بیان نہیں کر سکتا۔ جب تک کہ اس مطلب کی تائید میں کسی روایت کی پشت پناہی اسے حاصل نہ ہو، اسی وجہ سے تفسیروں کی ان کتابوں کو بہت اہمیت دی جاتی ہے جن میں ہر آیت کے ذیل میں روایات کے درج کرنے کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔

ابن جریر طبری کی تفسیر کی عظمت کا مدار زیادہ تر اسی پر ہے کہ تفسیری روایات کا غیر معمولی سرمایہ

اس کتاب میں جمع ہوگیا ہے۔ یا طبری کے بعد السیوطی کی تفسیر درمنثور کی قدر و قیمت کا راز بھی یہی ہے۔

اسی نقطۂ نظر سے کہنے والوں نے "امام فخر الدین رازی" کے متعلق یہ لطیفہ مشہور کر رکھا ہے۔

فی کل شیء الا التفسیر [1] امام رازی کی تفسیر میں تفسیر کے سوا سب کچھ ہے۔

اشارہ اسی طرف کیا گیا ہے کہ روایت کی امام نے اپنی تفسیر میں جتنی توجہ چاہیے نہیں کی ہے اور اس لحاظ سے کچھ یہ واقعہ بھی ہے۔

نہ سوچنے والوں میں یہ یا کچھ اسی قسم کے احساسات پائے جاتے ہیں۔ اسی کے مقابلہ میں ایک طبقہ بے باکوں کا بھی ہے جو قرآنی آیات کی تشریح و توجیہ میں نہ اس ماحول ہی کو اپنے سامنے رکھنا چاہتا ہے جس میں قرآن نازل ہوا تھا یا جن بزرگوں کو اپنا مخاطب قرآن نے پہلی دفعہ بنایا تھا (یعنی صحابۂ کرام) قرآنی آیات کے متعلق ان کے تاثرات کی وہ پروا نہیں کرتا۔ حتی کہ شوریدہ سری میں عقل باختوں کا یہ گروہ کبھی کبھی ترقی کر کے اس حد تک آ پہنچا ہے کہ عربی لغت اور الفاظ کے لغوی معانی کی رعایت سے بھی اس راہ میں اگر ضرورت ہوئی ہے تو آزاد ہوگیا ہے۔

آج ہی نہیں، بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کے ہر دور میں اس قسم کی ناہمواریوں کا مشاہدہ قرآنی آیات کی تشریح و توضیح کے سلسلے میں کیا گیا ہے "اتقان" میں سیوطی نے نقل کیا ہے کہ "**لیطمئن قلبی**" میں "قلبی" کے لفظ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے ایک دوست کی طرف اشارہ کیا تھا جس کا نام "قلبی" تھا۔ مقصد یہ تھا کہ میں تو مطمئن ہوں۔ لیکن میرا دوست قلبی مرنے کے بعد جی اٹھنے کے مسئلہ میں چونکہ متردد ہے اس کی تسکین خاطر کے لیے بعض لوگوں نے دعوی کیا ہے کہ:

رب ارنی کیف تحیی الموتی اے میرے پروردگار! دکھا دے مجھ کو مردے کو تو کیسے زندہ کرے گا۔

کی استدعا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے بارگاہ الٰہی میں پیش ہوئی تھی۔

اسی طرح بعضوں کا قول تھا کہ **میتہ لحم خنزیر** وغیرہ بعض مردوں اور عورتوں کے نام ہیں مسلمانوں کو حکم دیا گیا تھا کہ ان سے ملنے جلنے میں پرہیز کریں اور ان خرافات کا ذکر کہاں تک کیا جائے۔ بقول ابو مسلم اصفہانی ان اقوال کا ذکر صرف اس لیے کرنا چاہیے۔

ان یعلم ان فیمن یدعی العلم حمقی (اتقان ص ۱۵۵، حصہ دوم) تا کہ معلوم ہو کہ علم کے دعوی کرنے والوں میں احمقوں کی کمی نہیں ہے

اور ان حماقتوں کا تعلق تو ''قدیم علم'' یا ''دانش پارینہ'' سے تھا۔ اس کے مقابلہ میں ''دانش نو'' کی بوالعجبیوں کا جو طوفان عہد حاضر میں امنڈ آیا ہے اس کا نہ اور ہے اور نہ چھور۔

بھلا اس دعوی کے ساتھ کہ قرآن میں نہ غلامی کا ذکر ہے اور نہ تعدادِ ازدواج کے قانون کا، نہ معجزوں کا، نہ کرامتوں کا نہ فرشتوں کا، نہ جنوں کا، نہ جنت کا اور نہ دوزخ کا اور نہ جنت کی حور کا، نہ قصور کا، نہ اس کے اشجار کا، نہ انہار کا، نہ دوزخ کی نار کا، نہ اس کے ملائکہ اغلاظ شداد کا۔ نہ اس زقوم کا، نہ غسلین کا، الغرض قرآن میں جو کچھ ہے وہی سب کچھ قرآن میں نہیں ہے۔

اس عجیب و غریب ادعا کے ساتھ قرآنی الفاظ کی تشریح و توجیہ میں جن طلمساتی نیرنگیوں کے تماشے سامنے آسکتے ہیں اور لفظوں کے ساتھ ساحرانہ کھیل کھیلے جا سکتے ہیں۔ اس کا اندازہ ہر صاحب عقل و شعور کر سکتا ہے۔ یہ صرف احتمال نہیں ہے۔ بلکہ یہی کر کے رکھایا گیا ہے اور قرآن کے ساتھ ان بدبختانہ بازیگریوں کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ عربی زبان کی ایک سطر بھی صحیح طریقے سے جو پڑھ نہیں سکتے ہیں قرآن کے اردو ترجمہ کی مدد سے ان ہی ناقابل عفو گستاخیوں پر کوتاہ نصیبوں کا یہ گردہ جری ہو گیا ہے۔ طرفہ تماشہ یہ ہے کہ اپنی ان مذبوحی حرکات پر داد کا بھی طالب ہے آج ان ہی مجرمانہ جسارتوں کا یہ نتیجہ ہے کہ جس مطلب اور مقصد کو بھی چاہا جاتا ہے۔ قرآن اور قرآنی الفاظ پر اسے تھوپ دیا جاتا ہے۔

بہرحال یہ بھی ہو رہا ہے اور وہ بھی ہو رہا ہے ایک طرف اس پر اصرار ہے کہ روایت کے بغیر کسی آیت کے مطلب کا بیان کرنا جہنم کو اپنا ٹھکانہ بنانا ہے روایت کسی درجہ کی ہو، صحیح ہو حسن ہو، ضعیف ہو، ضعف میں اس کا حال جو کچھ بھی ہو، لیکن صحیح تفسیر وہی ہے اور قابل اعتماد تفسیر وہی ہے۔ جو ان روایتوں ہی کی روشنی میں قرآنی آیتوں کے مطلب اور منشا کو متعین کرتا ہو۔ دوسری طرف آزادی بخشی گئی ہے کہ اپنے جس وسوسہ اور وہم کو جس کا جی چاہے قرآن کی طرف منسوب کر دے۔ بقول اکبر مرحوم۔

مجھے تفسیر بھی آتی ہے، اپنا مدعا کہیے

اسی کو بنانے والوں نے اپنا علمی پیشہ اور ذہنی مشغلہ بنا رکھا ہے۔

بجنسہ پوری تقریر تو محفوظ نہیں ہے۔ لیکن مطلب شاہ صاحب کا یہی تھا کہ مسلمانوں میں نسلاً بعد نسل، سلفاً بعد خلف جن حقائق سے اسلامی دین کی تعمیر و تقویم ہوئی ہے، جن کے بغیر اسلام

کا تصور مسلمان تو مسلمان شاید کوئی لکھا پڑھا غیر مسلم بھی نہیں کر سکتا۔ یعنی دین کی ضروریات میں جو چیزیں شمار ہوتی ہیں۔ اول سے آخر تک بغیر کسی اختلاف کے اسلام کی جو جانی پہچانی باتیں ہیں۔ ان سے ہٹ کر قرآنی آیات کی توضیح و تشریح کی جرأت ایمان سوز جرأت ہے۔ گویا فقیر اپنی خاص اصطلاح میں 'البینات' سے جن کی تعبیر کرتا ہے۔ دین کے ان بیناتی مسلمات پر جس تفسیر سے زد پڑتی ہو۔ قرآنی آیتوں کی جس تاویل سے مذہب کا یہ غیر مشتبہ حصہ متاثر ہوتا ہو۔ تفسیر و تاویل کی یہی وہ قسم ہے جسے شاہ صاحب ''تاویل بالرائے'' قرار دیتے تھے۔ [1]

لیکن یہ بات کہ قرآن کی کسی آیت کا کوئی مطلب تفسیری روایتوں کی پشت پناہی کے بغیر بیان کرنا ہر حال میں یہ تفسیر بالرائے ہے اور جو ایسا کرتا ہے وہ قرآن کی تشریح و تاویل اپنے من مانے خیالات کے زیر اثر کر رہا ہے جہاں تک میں جانتا ہوں۔ حضرت شاہ صاحب شدت کے ساتھ اس کی تردید فرمایا کرتے تھے۔ ان سے زیادہ باخبر اس حقیقت سے اور کون ہو سکتا تھا کہ تفسیر کی کتابوں میں جن روایتوں کا لوگ ذکر کرتے ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ فرمایا کرتے تھے کہ اکثر و بیشتر حصہ ان کا ایسا ہے جس کی اصل نہیں ہے۔

سیوطی نے اتقان میں امام کے اس قول کو نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

قال احمد ثلاثة کتب لیس لها اصل التفسیر و الملاحم و المغازی: ص ۵۳۸، ج ۲	تین کتابیں، روایتوں کی ایسی ہیں جن کی اصل نہیں ہے ایک تفسیر دوسرے ملاحم و آئندہ پیش آنے والی جنگیں اور فتنے) اور جنگی مصر کے عہد نبوت میں جو پیش آئے ان کے متعلقہ قصے جن کو المغازی کہتے ہیں۔

پھر خود بھی سیوطی نے اپنی طرف یہ اس دعوے کو پیش کیا ہے:

اصل المرفوع منه فی غایة القلة ص ۸۳۱، ج ۲	ایسی روایتیں جو براہ راست رسول اللہ ﷺ کی طرف صحت کے ساتھ منسوب ہوں، تفسیر کے متعلق بہت ہی کم ہیں۔

یہ حال تو ان روایتوں کا ہے جن کو اصطلاحاً مرفوع کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ باقی رہے صحابۂ کرام کے تفسیری اقوال سو ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس باب میں غیر معمولی شہرت حاصل ہے لیکن جو ذخیرہ اس سلسلے میں ان کی طرف منسوب ہے خود السیوطی نے بھی اسی کے متعلق علماء کا یہ فیصلہ نقل کیا ہے کہ:

وھذہ التفاسیر الطوال التی اسندوھا الی ابن عباس غیر مرضیۃ ورواتھا مجاھیل: ص ۵۵۳	یہ لمبی لمبی تفسیری روایتیں جو ابن عباس کی طرف منسوب میں سنداً پسندیدہ نہیں ان کے روایت کرنے والے نامعلوم اشخاص ہیں۔

حضرت امام شافعیؒ نے ابن عباس کی طرف منسوب تفسیری اقوال کا جب جائزہ لیا تو اس نتیجہ تک پہونچے کہ:

لم یثبت ابن عباسؓ فی التفسیر الاشبیہ بمائۃ حدیث ص ۵۵۴	تقریباً سو روایتوں کے سوا ابن عباس کی طرف منسوبہ اقوال صحیح ثابت نہیں ہوئے۔

جس کی ایک کھلی دلیل یہ بھی ہوسکتی ہے کہ حدیثوں کے سب سے زیادہ معتبر اور صحیح مجموعے یعنی صحیح بخاری میں تفسیری روایات کا سرمایہ شاید تمام دوسرے ابواب کے مقابلہ میں سب سے زیادہ کم ہے، امام بخاری کے بجائے روایتوں کے جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں قرآنی الفاظ کی لغوی تشریح پر زیادہ توجہ کی ہے اور وہ بھی بقول شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسا کہ "فیض الباری" میں بھی نقل کیا ہے اور حافظ ابن حجر نے اس راز کو واضح کیا ہے کہ "ابوعبید معمر بن المثنی" کی کتاب "مجاز القرآن" پر امام نے زیادہ بھروسہ کیا ہے شاہ صاحب کا خیال تھا کہ:

لم یعرج الی النقد اصلا	امام بخاری نے معمر بن المثنی کے اقوال تنقید کے بغیر اپنی کتاب میں نقل کردیئے ہیں۔

اسی لیے ابن المثنی کی کتاب میں جو نقائص پائے جاتے تھے وہی کوتاہیاں صحیح بخاری کی کتاب "التفسیر" میں باقی رہ گئی ہیں۔ یہ نکتہ خاص طور پر قابل توجہ ہے

شاہ صاحب فرماتے تھے کہ صحیح بخاری ہی جو تفسیری اقوال پائے جاتے ہیں۔ ان کے متعلق یہ سمجھنا مناسب نہ ہوگا کہ یہی امام بخاری کا فیصلہ بھی ہے۔ بلکہ اس باب میں ان کی حیثیت صرف ایک ناقل کی ہے (۱)۔

کچھ بھی ہو کم از کم امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق جب یہ مانا جاتا ہے کہ ضعاف و حسان ہی نہیں بلکہ خبر واحد خواہ محدثین کی اصطلاح کی رو سے مرفوع و متصل صحیح ہی کیوں نہ ہو۔ باوجود اس کے قرآنی نصوص میں کسی ترمیم کو احادخبروں کی روشنی میں امام صاحب جائز نہیں سمجھتے تھے۔

اصول فقہ کی ہر چھوٹی بڑی کتاب میں ان کے اسی فیصلہ کی تعبیر یہ کی گئی ہے کہ کتاب میں زیادت خبر واحد سے نہیں ہوسکتی۔ اس کے بعد بھلا یہ کون کہہ سکتا ہے کہ روایتوں کی دستگیری کے

بغیر قرآنی آیات کے مطالب کے سمجھنے اور سمجھانے کی اجازت ہی نہیں دی جاسکتی۔ کتنی عجیب بات ہے قرآنی نصوص قطعیت اور تعین آفرینی کے جس زور اور قوت کے حامل ہیں، واحد خبروں سے ان کے سمجھنے میں مدد لینے کے بعد ان کا یہ زور اور ان کی یہ قوت کیا باقی رہ سکتی ہے؟ واحد خبروں کا مفاد بہر حال ظنی ہے ظاہر ہے کہ یہی مظنونیت کی صفت نصوص قرآن کی طرف بھی منتقل ہو جائے گی۔

امام ابو حنیفہؒ اگر خبر احاد سے کتاب پر زیادت کو جائز نہیں سمجھتے تھے تو بتایا جائے کہ یقین آفرینی اور قطعی سکون بخشی کی طاقت جو قرآنی آیات میں پائی جاتی ہے اس کی حفاظت کی دوسری شکل ہی کیا تھی؟ مگر افسوس ہے کہ حضرت امامؒ کی بلند نظری کا صحیح اندازہ لوگوں کو نہ ہوا۔ بلکہ برعکس اس کے بھی یہی پھیلا دیا گیا کہ قرآنی نصوص کے مطالب کو بجائے روایات کے صرف قرآنی الفاظ سے ہی سمجھنے کی جو کوشش کرے گا یا دوسرے کو سمجھائے گا وہ تفسیر بالرائے کے جرم کا مجرم اور دوزخی ہے۔

خدا جزاء خیر دے حضرت شاہ صاحبؒ کو تفسیر بالرائے کے اس غلط مطلب کا اپنے درس میں ازالہ فرماتے رہتے تھے خدا کا شکر ہے کہ ان کا یہ فیصلہ بخاری کی املائی تقریر میں بھی درج کر دیا گیا ہے۔ ان کی طرف آخر میں یہ فقرے بھی اسی کتاب میں منسوب کیے گئے ہیں کہ فرمایا کرتے تھے:

و من حجر علی العلماء ان لا یبرزوا یبر زمعانی الکتاب بعد الامعان فی السباق و السیاق و النظر الی حقائق الا لفاظ المراعیة لعقائد السلف

کس نے اہل علم کو روکا ہے اس بات سے کہ کتاب اللہ کے معانی اور مطلب کو آیات کے سیاق و سباق اور الفاظ کے اقتضاء کے مطابق جس میں سلف صالح کے عقیدے کی بھی رعایت کی گئی ہو۔ ان امور کو پیش نظر رکھ کر نہ ظاہر کریں۔

آگے اس کے بعد اسی میں یہ بھی ہے کہ:

بل ذلک حظهم من الکتاب فانهم هم الذین ینظرون فی عجائبه و یکشفون الاستار عن وجوه دقائقه و یرفعون الحجب عن خبأت حقائقه فهذا النوع من التفسیر بالرائے حظ اولی العلم و نصیب العلماء المستنبطین.

بلکہ اللہ کی کتاب میں اہل علم کا واقعی حصہ یہی ہے اور اس کتاب کے نت نئے پہلوؤں پر غور کرتے ہیں اور اس کے پوشیدہ اسرار سے نقاب اٹھتے ہیں جو باتیں چھپی ہوئی ہیں۔ انہیں نمایاں کرتے ہیں۔ اگر یہی تفسیر بالرائے ہے تو اہل علم کا یہی حصہ ہے اور قرآنی آیات سے نتائج پیدا کرنے والے صاحبان آگہی کی خوراک یہی ہے۔

آخر میں اسی کے ساتھ اس پر بھی تنبیہ فرمادیتے تھے:

و اما من تکلم فیه بدون صحة الادوات لاعنده علم من کلام السلف و الخلف و لاله ذوق بالعربیة و کان من اجلاف الناس لم یحمله علی تفسیر کتاب الله غیر الوقاحة و قلة العلم فعلیه الاسف کل الاسف و ذلک الذی یستحق النار

مگر قرآنی مطالب سے صحیح واقفیت کے لیے جن قدرتی اسباب وذرائع کی ضرورت ہے جوان سے تہی دامن ہو۔اس کے پاس اگلوں اور پچھلوں کے اقوال کا علم نہ ہواور نہ عربی ادب کا ذوق رکھتا ہو۔اس قسم کے کمینے آدمیوں میں قرآن کی تفسیر کی جسارت محض بے شرمی اور بے حیائی اور جہالت ہی کی وجہ سے ہوسکتی ہے ان پر افسوس صد افسوس بے شک یہی لوگ جہنم کے مستحق ہیں۔

سمٹنا چاہتا ہوں۔مگر پھیل جاتا ہوں۔سیدنا الامام الکشمیری قدس سرہ سے میرے غیر معمولی تاثرات کا یہ شاید شعوری نتیجہ ہے۔سمجھتا ہوں کہ ان کے متعلق باتیں ختم ہوگئیں کہ ذاکرہ کسی نئی چیز کو سامنے پیش کردیتا ہے۔ایسی نئی چیز کہ دل اس کے چھوڑ دینے پر کسی طرح راضی نہیں ہوتا۔ ناظرین شاید تھک چکے ہوں گے دل پر جبر کر کے اپنے محبوب ومرحوم استاذ کے ذکر کو ختم کرتا ہوں۔

آپ انصاف کیجئے،اپنے حقیر وفقیر،جہول وظلوم ادنی ترین شاگرد کی حوصلہ افزائیوں میں جس کا یہ حال ہو کہ دارالعلوم دیوبند میں طالب العلمی کی زندگی ختم کرنے کے بعد کچھ دنوں خاکسار القاسم والرشید نامی ماہواری پر چونکہ ادارت کے ساتھ کچھ درسی غیر تدریسی وغیرہ کے خدمات جب انجام دے رہا تھا۔لیکن تنخواہ جو مدرسہ سے ملتی تھی ضروریات کے لیے کافی نہ تھی۔ رخصت لے کر آگیا اور دارالعلوم کے مہتمم مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو یہ اطلاع دینے پر مجبور ہوا کہ''موجودہ تنخواہ پر کام کرنا اپنے حالات کے لحاظ سے خاکسار کے لیے دشوار ہے''۔یہ درخواست جب پہنچی اس کا اثر اور انجام کیا ہوا اس کو تو چھوڑیئے۔کہنا یہ ہے کہ بعد کو مولانا حبیب الرحمٰن صاحب سے جب نیاز حاصل ہوا تو براہ راست ان سے یہ سن کر ششدر و حیران ہوگیا۔فرمانے لگے کہ:

''بھائی! مولانا انورشاہ صاحب تم سے تو غیر معمولی طور پر متاثر نظر آتے ہیں۔
تمہاری وہ درخواست جب پہنچی تو میں نے شاہ صاحب سے اس مسئلہ میں مشورہ

لیا۔ جواب میں انہوں نے کہا کہ یہاں جتنے کام کرنے والے ہیں ان کو دیکھتا ہوں کہ جو درس دیتے ہیں وہ تحریر کا کام نہیں کرتے۔ یا نہیں کر سکتے۔ جو تحریری سلیقہ رکھتے ہیں۔ ان سے آپ تقریر و وعظ کا کام نہیں لے سکتے۔ الغرض ان تین شعبوں یعنی درس و تحریر و تقریر کے لیے اسی وجہ سے آپ کو الگ الگ آدمی رکھنے پڑتے ہیں۔ لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ اس غریب سے رسالہ کی ادارت و تحریر کا کام بھی آپ لیتے رہے درس و تدریس کا کام بھی اس کے سپرد کرتے رہے جہاں سے طلبی آئی وعظ تقریر کے لیے بھی بھیجتے رہے۔ گویا ان تینوں شعبوں کا کام حسب دل خواہ وہ تنہا انجام دیتا رہا۔ اب اگر ان تینوں مدوں کے سلسلہ میں ایک ایک آدمی کی تنخواہ اسے دی جائے تو شاید اس کا یہ ناجائز مطالبہ نہ ہوگا''۔

سفارش کی اس تحلیلی ترکیب کا خطرہ خود میرے دل میں بھی نہیں گزرا تھا۔

بہر حال الفاظ تو بجنسہ یاد نہ رہے۔ مفہوم یہی تھا۔ حضرت شاہ صاحب کے ان الفاظ کو جس وقت میرے کان سن رہے تھے آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں اپنی بے بضاعتی اور کم مائے گی کا خیال آیا۔

اُف زندگی کو اس کا آقا کافور ٹھیرا رہا تھا۔ حالانکہ پہلے بھی زنگی ہے اور بعد کو بھی زنگی۔ اس وقت تک زنگی ہونے کے سوا وہ اور کچھ اور نہیں ہے۔ سوچتا ہوں استاد مرحوم کی قدر شناسیوں کا دھیان آتا ہے دل کہتا ہے۔

بریں قول گر جاں فشانم رواست

علم و معرفت کا احتساب ایک ذرہ کو چکا رہا تھا۔ حالانکہ ذرہ کے پاس تھا بھی کیا اور جو کچھ تھا سب آفتاب کا تھا۔

الغرض یہ اور اسی قسم کی بعض خصوصی عنایات و نوازشوں کا سلسلہ حضرت شاہ صاحبؒ کی طرف سے آخر تک جاری رہا۔ اس زمانہ میں بھی جب دائرۂ اہتمام اور حضرت شاہ صاحب میں شکر رنجیوں کی صورتیں پیش آ گئیں یعنی دارالعلوم دیوبند کی تاریخی زندگی کا وہی شہر جس سے گجرات کے مشہور دارالعلوم ڈابھیل کا جز پیدا ہوا۔ اس زمانہ میں بھی جب خاکسار حیدرآباد میں تھا اور کش مکش کی ان صورتوں پر حیدرآباد کا دباؤ بھی پڑ رہا تھا یا چاہا جاتا تھا کہ حیدرآباد کی حکومت بھی اپنا اثر

اس پر ڈالے۔ اس زمانہ میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا اور شاید مشہور بھی کر دیا گیا تھا کہ اس دباؤ میں بجائے شاہ صاحب کی جماعت کے فقیر دائرۂ اہتمام کے بزرگوں کی پشت پناہی کر رہا ہے۔ مجھ تک بھی اس قسم کی بدگمانیوں کی خبریں پہنچائی جا رہی تھیں۔ حضرت شاہ صاحب کے قلب مبارک کی گرانی کا خیال مجھے بے چین کیے ہوئے تھا کہ عین انہیں دنوں میں قطعاً خلاف دستور اپنے دستخط خاص سے ایک رجسٹرڈ والا نامہ حضرت شاہ صاحب کا اس فقیر کے نام شرف صدور لایا۔ تھراتے ہوئے مرتعش ہاتھوں لرزتی ہوئی اور کانپتی ہوا نگلیوں سے اس گرامی نامہ کو کھولا پڑھتا جاتا تھا اور روتا جاتا تھا۔ اللہ اللہ سنانے والے مجھے کیا کیا سناتے رہے اور آنکھیں آج کیا دیکھ رہی ہیں مودت ومحبت، سرفرازی وحجت بیکراں کے...... سوا اس میں اور کچھ نہ تھا ایک خاص خدمت کے لیے اس ذرۂ ناچیز کا انتخاب فرمایا گیا تھا۔

حیران تھا کہ ہزار ہزار تلامذہ جس کے اقطار ہند بلکہ اسلامی دنیا کے کناروں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اسی کے حافظہ میں مجھ جیسے کس مپرس ہیچمداں، طالب الدنیا کا خیال اور وہ بھی اتنی خصوصیتوں کے ساتھ کیسے باقی تھا افسوس ہے کہ بخت کی تہی دستی اور مزاج کے لاابالی کی وجہ سے اس والا نامہ کی حفاظت میں کامیاب نہ ہوسکا۔ ورنہ آج جس حال میں ہوں شاید وصیت کرتا کہ میرے کفن کے ساتھ اس کو میرے ساتھ دفن کر دیا جائے۔ تاہم امید ہے کہ اس میں جو ''راز'' تھا انشاء اللہ وہ اپنے ساتھ ہی دفن ہوگا۔

بہر حال حضرت شاہ صاحب کے ظل عاطفت وسایۂ عاطفت میں رہنے کا موقع اگرچہ دوڈھائی سال سے زیادہ اس فقیر کو نہیں ملا ہے۔ لیکن اب میں کیا کروں کہ جن صحبتوں میں قرنہا قرن گزرے ان کی یاد پیرانہ سالی کے ان ایام میں تقریباً کچھ مٹ سی ہی گئی ہے لیکن خدا ہی جانتا ہے کہ دوڈھائی سال کے ان متبرک علم ریز، معارف بیز، محبت خیز ایام کی ایک ایک بات دماغ میں کیوں تر وتازہ ہے اسی لیے سچ پوچھئے تو شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق جو کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اس کا عشر عشیر بھی نہ کہہ سکا۔ لیکن پڑھنے والوں کے نفسیات کا خیال کر کے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب دوسرے اساتذۂ کرام کے متعلق ارتسامی تاثرات کو پیش کروں۔

والله ولی الامر و التوفیق

●▭●

حضرت علامہ کے درس حدیث کی خصوصیات

مولانا انظر شاہ کشمیریؒ

حضرت علامہ مولانا محمد انور شاہ کشمیری کا حقیقی رنگ درس حدیث ہی میں نمایاں ہوا۔ یہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ دینی درس گاہوں کا منتہائے کمال حدیث کا درس ہے۔ غالبا یہ اس وجہ سے کہ جناب رسول اکرم ﷺ کی احادیث کا معاملہ قرآن کریم سے جدا اور ممتاز ہے/ حالانکہ قرآن مجید کا سر چشمہ، علوم کا بحر ذخار، معارف کا حسین آبشار ہے۔ ان خصوصیات کا تقاضہ تھا کہ ہر قسم کی رفعتیں اور علم و تحقیق کے امتیازات قرآن ہی کے لئے خاص ہوں۔ لیکن قرآن مجید کا ثبوت اس قدر متواتر، غیر مشتبہ اور یقینی ہے کہ خاص وہ مباحث جو حدیث کے باب میں ردو قبول کے لئے چل پڑے ان سے ''القرآن'' کو سابقہ نہیں رہا لیکن اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ قرآن سے اعتناء نہیں کیا گیا۔ اہل علم خوب جانتے ہیں کہ قرآنی علوم و معارف میں بھی انکشافات، نکتہ سنجی، نکتہ آفرینی کا ایک چمن ہمارے کتب خانہ علم کی دلفریب بہار ہے۔ لیکن حدیث کا فن جیسا کہ عرض کیا گیا، وسیع تر ہوتا گیا حدیث ثابت ہے یا نہیں، ثبوت کے بعد پھر کس درجہ کی ہے۔ تعامل سلف مؤید ہے یا نہیں، شواہد موجود ہیں یا نہیں، اس کے رواۃ کس درجہ کے ہیں۔ کیا ان احادیث سے احکام کا استنباط و استخراج ہوتا ہے ؟ پھر مختلف متضاد احادیث میں تطبیق، ترجیح و تاویل، رواۃ کی سوانح، ان کے تذکرے ایک ہی نام یا القاب میں شرکت ایسے اور اس طرح کے دوسرے مباحث نے فن حدیث کو ایک اہم حیثیت دینے

کے ساتھ دشوار تر بنا دیا۔ نتیجۃً کسی دانشور کا کمال فن حدیث ہی میں نمایاں اور سند کی حیثیت اختیار کر گیا۔ مزید برآں حدیث مذکورہ بالا حیثیتوں سے ہٹ کر کچھ اور رخوں سے بھی زیر بحث آ گئی۔ مثلاً حدیث کی فصاحت و بلاغت، حدیث میں بدیع و معانی کے فیصلے، صرفی ونحوی مباحث، مذاہب فقہیہ کا بیان، کسی ایک فقہی مکتب فکر کی ترجیح و وجوہ ترجیح، احکام و مسائل کا استخراج، کلامی مباحث، ضلالت پسند فرقوں کی تردید اور ان کے زیغ وضلال پر حدیث کے سرمایہ سے بھرپور تردید، بلکہ حدیث کے رخ زیبا سے نقاب کشائی کرتے ہوئے ان انوار وتجلیات کی تشخیص و تعیین، جن کی اس امت کو تا قیامت قدم قدم پر ضرورت پیش آتی رہے گی۔

ظاہر ہے کہ جب امت کے اساسی علوم وفنون میں حدیث کو قرآن کے بعد دوسرا درجہ حاصل ہے تو حدیث ہی سے کام لیکر دین دنیا کے حوادث میں کوئی جچا تلا فیصلہ کرنا ہوگا اس لئے ایک محدث درس حدیث میں صرف حدیث کی شرح، لغوی مباحث یا اسی طرح سامنے کے مسائل پر گفتگو نہیں کرتا بلکہ اسکی واقفیت وشناسائی دین کی تمام روایات و جوانب پر اتنی دبیز ہوتی ہے کہ اسکے فیصلے مبصرانہ اور اسکی آراء متوازن حیثیت اختیار کرتی ہیں اور درحقیقت مولانا انور شاہ ان ہی منتخب محدثین میں سے ہیں جن کی عبقریت وجامعیت ان کے لئے اسی اجتہادی مرتبہ کی سفارش کرتی ہے، ہندوستان میں درس حدیث کا جو رنگ حضرت شاہ ولی اللہؒ سے قائم ہوا اس میں حدیث کے اصل وطن کی گہری چھاپ کے باوجود خود ہندوستان کے ماحول نے مختلف اضافے اور رنگ آمیزیاں کی ہیں جس کی مختصر تفصیل یہ ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ کے عہد میں تقلید وعدم تقلید کے مسئلے کھڑے ہو چکے تھے/ یہی وجہ تھی کہ حضرت شاہ صاحب کے قلم نے عقد الجید، الانصاف جیسی وقیع کتابیں تصنیف کیں مگر جو فتنہ اٹھ چکا تھا تدریس وتالیف کے حدود میں اسکا بھرپور مقابلہ ایسا منافع بخش نہ ہوا کہ فضا کا یہ غبار ہمیشہ کے لئے بیٹھ جاتا بلکہ دھواں پھیلتا رہا اور اس نے بڑھ کر بڑے حصے کو اپنی تاریکی کے زد میں لے لیا، پھر شیعت کا ہنگامہ قیامت خیز انداز میں نمودار ہوا ازالۃ الخفاء، تحفۂ اثنا عشری کی باوقعت جدوجہد بھی اس بلائے بے درماں کو روکنے میں پوری طرح کامیاب نہ ہوسکی، مزید براں بدعت وسنت کی کشمکش میں ایک خاص جماعت کی اٹھائی ہوئی آندھی میلوں کی رفتار سے ہندوستان کے طول وعرض میں پھیل گئی اس ہنگامہ کے خلاف ہزاروں علماء کی مخلصانہ جدوجہد سنت اور اسکی اشاعتی مہم کا قیمتی سرمایہ ہے تاہم آئندہ سطور سے معلوم ہوگا کہ اس گمراہی کی بیخ کنی واستیصال کی سعادت اس مکتبۂ فکر کے حصہ میں آئی جس سے علامہ کشمیریؒ کا دین ودانش ہمیشہ کے لئے وابستہ

ہے اور پھر جب ہندوستان خانہ ساز نبوت کا بلاخیز سیلاب امڈ آیا تو اسکی سرکوبی کے لئے بھی اسی درس گاہ کی قوت علم وعمل کو حرکت میں آنا پڑا ان تمام ہنگاموں بلکہ اس قبیل کے تمام فتنوں میں ''القرآن اور الحدیث'' کے مجموعے سے تردیدی مسالہ بہم پہونچایا گیا گویا کہ حدیث کی نگی بندھی بحثوں پر یہ نئے اضافے تھے جنہیں دارالعلوم کے اجتہادی طریق درس نے نمایاں کیا۔

دارالعلوم دیوبند کا یہ تعارف کہ وہ ہند بشمول پاکستان میں ایک عظیم دینی ادارہ ہے دارالعلوم کی وسعت ہمہ گیری، اور اس کے ٹھوس و لگے بندھے فکر سے ناواقفیت ہے یہ درسگاہ در حقیقت مکتبۂ فکر ہے اور اس کے تاسیسی پس منظر میں کچھ اہم حقائق جلوہ افروز ہیں/ جماعت دیو بند کے ایک عظیم مفکر مولانا عبیداللہ سندھی کا مقولہ ان حقائق کی نقاب کشائی کرتا ہے آپ نے ایک بار فرمایا تھا کہ ''دیوبند نام ہے اتباع سنت اسکی اشاعت کی مجاہدانہ کوشش، حقیقت کی ترجیح وتفوق کا یقین اور اعلاءِ کلمۃ الحق کا جذبہ بے قرار''۔

مفکر سندھی کا یہ ارشاد دارالعلوم کے عمومی جذبہ کا آئینہ دار ہے اور اس کا اثر اس کے اجتہادی طرز تعلیم میں بھرپور نمایاں ہے/ درس میں کچھ تو وہ اضافے ہوئے جن کا سطور بالا میں مختصر ذکر آیا، اس کے علاوہ توسط و اعتدال، تطبیق بین الاحادیث ترجیح فقہ حنفی، حدیث کے متعلق اس یقین کی آبیاری کہ وہ تعلیمات اسلامی کا سرچشمہ ہے یا حدیث کی اس نقطہ نظر سے تعلیم کہ وہ متن قرآنی کی جامع شرح ہے اور ان سب کے ساتھ اسلام کی حقیقی روح کی نقاب کشائی اور اس کو اپنے واقعی پس منظر میں جلوہ طراز کرنے کی کاوش دارالعلوم کی ان فکری و علمی خصوصیات کا اظہار یوں تو دارالعلوم کے روز تاسیس ہی سے شروع ہو گیا لیکن ان ممیزات وخصوصیات کا بدرجہ اتم ظہور حضرت مولانا انور شاہ کشمیری قدس سرہ کے درس میں ہے اس دعوے کا صحیح ثبوت اس مرقع سے بہم پہونچے گا جو قلم ان کے باالخصاص تلامذہ کے بیانات سے تیار کر کے پیش کرتا ہے راقم السطور نے اسکی کوشش کی ہے کہ اس منفرد تدریس کی اہم خصوصیات آپ کے سامنے آجائیں سب سے پہلے درس کی انفرادیت پر انکے معروف ومشہور تلمیذ مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم کی شہادت پیش ہے موصوف نے اپنے مقالہ برائے ''حیات انور'' میں تحریر کیا ہے کہ:

> ''حضرت شاہ صاحب کے درس حدیث میں کچھ ایسی خصوصیات نمایاں ہوئیں جو عام طور سے دروس میں نہ تھیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ آپکا انداز درس دنیائے درس وتدریس میں ایک عظیم انقلاب کا باعث ثابت ہوا''۔

اس کی مزید توثیق مولانا مناظر احسن گیلانی کے قلم سے پیش ہے وہ شاہ صاحب مرحوم

کی خصوصیات درس پر اپنے البیلے انداز میں رقمطراز ہیں:

''خیال تھا کہ جیسے عام طور پر ہمارے مدارس کا دستور ہے طلباء کتاب کی عبارت پڑھیں گے اور حضرت شاہ صاحب'' اس عبارت کا ترجمہ و مطلب طلباء کو بتائیں گے لیکن پہلی مرتبہ درس کے نئے طریقہ کے تجربہ کا موقع میرے لئے یہ تھا کہ بسم اللہ بھی کتاب کی شروع نہیں ہوئی تھی کہ علم کا ایک بحر بیکراں بلا مبالغہ عرض کر رہا ہوں میرے دل و دماغ کے ساحلوں سے ٹکرانے لگا۔''

ہندوستان کی درس گاہوں میں درس کا جو روایتی طریقہ چلا آرہا ہے فاضل گیلانی نے اس کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ:

''ایسے اساتذہ سے بھی پڑھنے کا موقعہ ملا تھا جو کتاب کو شروع کراتے ہوئے غیر ضروری طور پر اس قسم کی عام باتوں کا تذکرہ عموماً کیا کرتے ہیں کہ مصنف نے خدا کی حمد سے کتاب کیوں شروع کی؟ اور اسی عام سوال کو اٹھا کر اس کا جو مقررہ جواب کتابوں میں لکھا ہے لفظوں کے الٹ پھیر سے دہرانے کی عادی تھے/صلوۃ کی شرح اور مختلف امور کی طرف اس کا انتساب اسکی معانی میں کن تبدیلیوں کو پیدا کرتا ہے الغرض مسلمان مصنفوں کی کتابوں کے دیباچے کے عمومی اجزاء کے متعلق سوال و جواب، رد و قدح کا موروثی سرمایہ جو حواشی و شروح میں منتقل ہوتا چلا آرہا ہے اسی کو غریب طالبعلموں پر پیش کر کے اپنی علمی وسعت کو ظاہر کرتے تھے''۔

صدیوں سے متوارث اس طریق تعلیم کی نشاندہی کے بعد یکا یک فاضل گیلانی کو طرز تعلیم کا جو ایک نیا مشاہدہ و تجربہ ہوا اس کی کچھ تفصیل مولانا ہی کے قلم سے سنئے، لکھا ہے کہ:

''لیکن الامام کشمیری نے قبل اس کے کتاب کا کوئی لفظ شروع ہوا ہوا ایک خاص قسم کی دلچسپ ترنم آمیز آواز میں تقریر شروع کی، کس کس موضوع سے اس تقریر کا تعلق تھا تقریباً چالیس سال بعد اسکا دہرانا آسان نہیں لیکن بعض انقلابی تأثرات کا نشان حافظہ پر جہاں تک خیال کرتا ہوں اب بھی باقی ہے''۔

صحاح ستہ میں مسلم شریف کو جو امتیازی اہمیت حاصل ہے اس پر ایک مختصر تبصرہ کرنے کے بعد فاضل گیلانی لکھتے ہیں کہ:

''پہلے دن کے پہلے ہی سبق میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برسوں میں حاصل ہونے

والی معلومات یکا یک میرے سامنے آگئے"۔

گویا کہ علامہ کے درس کی پہلی اور بنیادی خصوصیت یہی جامعیت اور ایک ہی وقت میں علمی نوادر سے طلباء کے دامن دماغ کو لبریز کرتا تھا پھر معلومات کا یہ وسیع افادہ کسی ایک ہی دائرہ میں بند نہیں تھا بلکہ اس کا تعلق مختلف علوم وفنون سے تھا متعلق موضوع کی مناسبت سے جب آپ ضمنی مسائل ومباحث کی طرف متوجہ ہوئے تو اس کا نام خود آپکی زباں پر "دفاع" تھا مولانا گیلانی ہی اس سلسلہ میں رقمطراز ہیں:

"یادداشت اور حافظہ کی غیر معمولی قوت کا نتیجہ تھا کہ معلومات کا طوفان شاہ صاحبؒ کے اندر تلاطم پذیر رہتا، کسی مسئلہ پر تقریر فرماتے ہوئے اسی کی مناسبت سے انکا ذہن کسی دوسرے مسئلہ کی طرف متوجہ ہوتا تو فرماتے کہ:

دفائی مسائل میں صرف ونحو، معانی بیان، بدیع وغیرہ تک کے مسائل شامل تھے درس کی اس اہم خصوصیت میں محقق گیلانی کے ساتھ مولانا محمد طیب صاحب کی یہ ہمنوائی بھی قابل غور ہے

"حضرت ممدوح کے علمی تبحر اور علم کے بحر ذخار ہونے کی وجہ سے درس حدیث صرف علوم حدیث تک ہی محدود نہ رہتا بلکہ ضمنا لطیف نسبتوں کے ساتھ ہر علم وفن کی بحث آتی، اگر معانی و بلاغت کی بحث آتی تو محسوس ہوتا کہ علم معانی کا یہ مسئلہ واضع نے اسی حدیث کے لئے وضع کیا تھا، معقولات کی بحث چل نکلتی اور آپ معقولین کے کسی مسئلہ کا رد فرماتے تو اندازہ ہوتا کہ یہ حدیث معقولات کے مسئلہ پر ہی تردید کے لئے قلب نبوی پر وارد ہوئی تھی، غرض اس نقلی وروایتی فن میں نقل و عقل دونوں کی بحثیں آتی اور ہر فن کے متعلق مقصد پر سیر حاصل اور محققانہ بحث ہوتی پھر علاوہ بحث حدیث کے وہ فنی مسئلہ ہی فی نفسہ اپنی پوری تحقیق کے ساتھ منقح ہو کر سامنے آجاتا تھا۔

فاضل مقالہ نگار کے قلم نے اس داستان کو آگے بڑھاتے ہوئے یہ بھی سنایا کہ:

"حضرت شاہ صاحبؒ کا درس حدیث محض حدیث تک محدود نہ تھا بلکہ فقہ، تاریخ، ادب، کلام، فلسفہ، منطق، ہیئت، ریاضی، سائنس الغرض تمام علوم جدیدہ وقدیمہ پر مشتمل ہوتا۔"

گویا کہ معلومات کا بیش بہا خزانہ مختصر مدت میں طالبعلم اپنے لئے فراہم پا [illegible] ضمنا حدیث وقرآن سے متعلق شک وریب کے وہ کانٹے بھی دل ودماغ سے نکل جاتے جن کی منش [illegible] مومن کے لئے انقباض ووحشت کا موجب ہے/ دہی پہلے دن کا درس جس کا قلمی نا[illegible] مولانا

گیلانی کے قلم نے تیار کیا، اس کی تفصیلات میں موصوف نے اپنی بعض خلشوں کا ذکر کرتے ہوئے الامام کشمیری کی شفاء بخش تقریروں کی چارہ سازی اس عنوان سے بیان کی ہے:

> ''اس وقت تک میرا تاثر یہ تھا کہ قرآن کے سوا بجز چند گنی چنی روایتوں کے صاحب شریعت کی طرف قطعی یقین اور کامل اطمینان کے ساتھ کسی اور کا انتساب نہیں کیا جاسکتا گویا دین کا اکثر حصہ صرف ظنی اور یقین کی قوت سے محروم ہے۔''

مولانا گیلانی ہی کیا خیر القرون کے اختتام کے ساتھ ہی دین کے اسی انتساب کے بارے میں نہ جانے کیسے کیسے ہولناک مغالطوں میں عوام مبتلا کردئے گئے اور عصر حاضر کے مہیب فتنوں میں تو حدیث کو عجمی سازش قرار دیکر دیدہ ودانستہ دین کے اہم، وبنیادی ستون پر حملہ کردیا گیا / عجمی سازش کا شوشہ چھوڑنے والوں نے اپنی چابک دستیوں سے لیکر / ہیچ پوچ دلائل اس مقصد کے لئے تلاش کئے ہیں انہیں سے مرعوب ہوکر بلا مبالغہ لاکھوں تک تعداد ان سادہ لوح مسلمانوں کی پہنچی ہے جو صاحب شریعت کی جانب حدیث کا انتساب مشتبہ گردان رہے ہیں / اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ دین کے خدام درس کے حلقوں میں بھی اس زہر کا تریاق بہم پہونچاتے رہیں / یقین ہے کہ اگر طلباء کے ذہنوں میں دلائل کے ساتھ یہ بات ڈال دی گئی کہ حدیث کوئی عجمی سازش نہیں بلکہ ایک بنیادی عنصر ہے اور مناسب ہتھیاروں سے انہیں مسلح کردیا گیا تو منکرین حدیث کی زہر چکانیوں کا شافی علاج ہوسکے گا، الامام کشمیریؒ کو خدا تعالی نے فتنوں کو بھانپ لینے اور ان کا ضروری مقابلہ کرنے کی جو غیر معمولی صلاحیت عطا فرمائی تھی اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ بالکل ابتدائی مرحلوں میں طلباء کے روبرو حجیت حدیث کے موضوع پر ایسی فاضلانہ تقریر فرماتے جس سے حدیث کی حجیت ایک حقیقت نظر آتی / ممدوح گیلانی نے تفصیل سناتے ہوئے بتایا ہے کہ:

> ''پہلا دن تھا جب میرے کانوں نے اسناد والے تواتر کے سواء تواتر طبقہ / تواتر عمل / تواتر قدر مشترک کی نئی قسموں کو سنا / سمجھایا گیا کہ چند روایتوں کے متعلق جس تواتر کا دعوی عام کتابوں میں کیا جاتا ہے یہ دعوی صرف اسناد والے تواتر کے حد تک محدود ہے ورنہ دین کا بڑا اہم حصہ تواتر طبقہ، تواتر عمل قدر مشترک کی راہ سے منتقل ہوکر مسلمانوں کی پچھلی نسلوں میں اگلی نسلوں سے پہونچا ہے اور تواتر کی ان تمام قسموں میں یقین آفرینی کی وہی نفسیاتی اور منطقی قوت ہے

جوقوت اسناد والے تواتر میں پائی جاتی ہے"۔

(ا) تواتر کی ان اقسام چہار گانہ کو مرحوم گیلانی ہی کے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ سند کی کثرت اور راویوں کے تعدد کی ضرورت عموماً ان ہی باتوں میں ہوئی ہے جو روایت کے راہ سے منتقل ہوئی ہوں لیکن ایسی بات کہ شاہ جہاں ہندوستان کا حکمراں تھا یا سکندر نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا اس قسم کے واقعات کے متعلق یہ تلاش کرنا کہ روایت کرنیوالے ان کے کون ہیں جنون کے سوا اور کچھ نہیں ہے، اسی طرح اس قسم کی باتیں کہ مسلمانوں پر پانچ وقتوں کی نمازیں فرض ہیں عرب میں الکعبہ نامی عمارت کا حج فرض ہے، سال میں جب رمضان کا مہینہ آئے تو روزہ مسمانوں کو رکھنا پڑتا ہے، یہ ایسی باتیں ہیں جسے مسلمانوں ہی نہیں، بلکہ جو مسلمان نہیں ہیں ان کے نزدیک بھی اسلام کے یقینی عناصر ہیں/ یہی تواتر عمل کی مثالیں ہیں/ اسی طرح حاتم کی سخاوت، رستم کی شجاعت ،اگر چہ گزرے ہوئے واقعات ہیں لیکن ان کی تفصیلات مثلاً حاتم کی طرف سخاوت پر یا رستم کی بہادری کے جو قصے مشہور ہیں ان قصوں کا یقین ہونا تو ضروری نہیں لیکن ان قصوں کا قدر مشترک یعنی حاتم سخی تھا رستم بہادر آدمی تھا اس قدر مشترک کے یقینی ہونے میں کون شبہ کر سکتا ہے/ الاستاذ العثمانی مولانا شبیر احمد مرحوم نے بھی صحیح مسلم میں تواتر کی ان قسموں کا ذکر کر کے اعتراف کیا ہے کہ پہلی دفعہ حضرت علامہ کشمیری سے ہی یہ بات سننے میں آئی۔

دین کے اس اہم اور ضروری عنصر پر جو فاضلانہ دلائل بہم پہنچائے گئے ان کو سن کر مرحوم گیلانی نے اپنے متعلق یہ شہادت دی ہے:۔

"یہ پہلا دن تھا جس میں قرآن کے بعد دین کا سارا انتظام میرے لئے یقینی و قطعی ہو گیا اور جیسے جیسے تمیز و شعور میں عمر کے لحاظ سے اضافہ ہوتا بجائے گھٹنے کے میرا یہ تاثر گہرا ہی ہوتا چلا گیا"

خاکسار نے ابھی عرض کیا تھا کہ درسی افادات میں معلم و استاذ اس نہج پر اگر دماغوں کی آبیاری کرتے رہے تو دین کی جانب سے دفاع کرنے والوں کا جو مضبوط حلقہ قائم ہوگا وہ درس گاہوں سے لی ہوئی روشنی سے ہمیشہ کام لیتا رہے گا، چنانچہ فاضل گیلانی نے اپنے متعلق خود لکھا ہے کہ:

"خاکسار نے اپنی مختلف کتابوں اور مقالات میں امام کشمیری کی عطا کی ہوئی اس روشنی سے استفادہ کیا"

بلکہ "مسلمانوں کے دینی اختلاف کی نوعیتوں میں تمیز کا سلیقہ اسی انوری تحقیق سے پیدا ہوا"

بہر حال درس میں جامعیت اور وسیع ترین افادی معلومات جو شاہ صاحبؒ کی دربار زبان سے ظاہر ہوئے اس سے جہاں ایک فائدہ وہ تھا جسے مولانا محمد طیب صاحب نے لکھتے ہوئے بتایا ہے کہ:

''اس جامع درس کا طالب علم اس درس سے ہر علم وفن کا مذاق لیکر اٹھتا اور اس میں یہ استعداد پیدا ہو جاتی کہ وہ بضمن کلام خدا اور سول ہر فن میں محققانہ انداز سے کلام کر جائے یہ در حقیقت درس کی لائن کا ایک انقلاب تھا جو زمانہ کی رفتار کو دیکھ کر الاستاذ الامام الکشمیر ی نے اختیار فرمایا۔''

مولانا طیب صاحبؒ ہی کے قلم نے حضرت شاہ صاحبؒ کے ایک ملفوظ سے اس حقیقت کو بھی بے نقاب کیا کہ درس کا آپ کا یہ اجتہادی طرز دور حاضر کے فتنوں کے مقابلہ کی سوچی سمجھی تیاری تھی چنانچہ آپ خود درس میں طلباء کو مخاطب کر کے فرماتے:

''بھائی اس زمانہ کے علمی فتنوں کے مقابلہ میں جس قدر ہو سکا ہم نے سامان جمع کر دیا ہے''۔

موصوف کے ارشاد سے یہ واضح ہوا کہ درس میں مختلف عنوانات سے متعلق تقریر اپنے علم کا اظہار یا اپنے تبحر کا مظاہرہ نہیں تھا بلکہ آپ طلباء کو نت نئے فتنوں کے مقابلہ میں اس طرح مسلح کر دینا چاہتے تھے کہ وہ دین کی جانب سے دفاع کر سکیں آج دار العلوم کی ممتاز پچاس سالہ تاریخ جس کی ابتداء آپ کی تدریس وتعلیم سے ہوتی ہے شاہد ہے کہ آپ کی درس گاہ سے نکلے ہوئے فضلاء اپنی اپنی جگہ دین کی حمایت ونصرت میں اپنی توانائیاں صرف کر رہے ہیں۔ بہر حال مرحوم کی درسی خصوصیات میں سے ان تک دو بنیادی خصوصیات کا ذکر آیا ہے، آپ کے درس کی تیسری خصوصیت یہ ہے جس کے ناقل ملک کے مشہور عالم وفاضل مولانا محمد ادریس کاندھلوی شارح مشکوۃ وشیخ الحدیث جامع اشرفیہ لاہور ہیں /حسب معمول مولانا کاندھلوی نے اپنے مقصد واضح کرنے کے لئے تھوڑی سی تفصیل سے کام کیا ہے اس تفصیل کے بغیر مولانا کا مقصد واضح نہیں ہوتا اس لئے خاکسار مفصل پیش کرتا ہے: لکھا ہے کہ:

''دنیا کے علم میں خیر وشر/محمود ومذموم کی تقسیم ہے مگر آخرت اور دین کے علم میں یہ تقسیم نہیں آخرت اور دین خداوندی کا علم خیر ہی خیر اور محمود ہی محمود ہے خلاصہ اس کا یہ ہے کہ اول مرتبہ ایمان واسلام کا ہے اور اس کے بعد علم دین کا ہے۔''

اس کے بعد یہ بتاتے ہوئے کہ علم کے لئے دو قوتیں درکار ہیں ایک قوت فہم دوسری

قوت حافظہ تحریر فرمایا کہ:

''حضرت شاہ صاحب مرحوم کو خدا تعالی نے ان تمام قوتوں سے اس طرح سرفراز فرمایا تھا کہ عالم میں اس وقت اس کی نظیر نہیں''۔

بلکہ طبقہ علماء میں آپ کی خصوصیت و امتیاز یہ تھا کہ:

''جب کوئی عالم کسی مسئلہ میں شاہ صاحب کی طرف مراجعت کرتا تو مسئلہ کا مادہ سامنے کر دیتے اور اس کے بعد اپنا فیصلہ بھی بتا دیتے کہ اس مختلف فیہ مسئلہ میں میری رائے یہ ہے''۔

جس کا حاصل یہی نکلا کہ خام علم اور نا پختہ آگہی کے جو مظاہر آئے دن ہمارے سامنے رہتے ہیں کہ اگر کسی سے کوئی بات پوچھی جائے تو اول تو بیچارہ شاید اس علم کے بارے میں ظنی و تخمینی رائے بھی نہ رکھتا ہو اور اگر مختلف اقوال نقل بھی کر دے تو راجح اور مرجوح کی تعیین سے بہر حال محروم ہی ہوگا/ لیکن علامہ کا یہ حال تھا کہ:

''ہر مسئلہ آپ کے نزدیک طے شدہ تھا، اختلاف اقوال کی وجہ سے تذبذب اور تردد نہیں بلکہ راجح اور مرجوح متعین رہتا۔''

جاننے والے جانتے ہیں کہ مولانا کاندھلوی اپنے جلیل استاذ کی جس خصوصیت کا ذکر کر رہے ہیں وہ فنی مہارت اور علمی حذاقت کی دوسری تعبیر ہے/ نقول کے انبار سے کار آمد چیز اٹھا لینا اس وقت تک ممکن نہیں تاوقتیکہ علم ملکہ راسخہ نہ بن جائے اس خصوصیت کے بعد فاضل مضمون نگار نے شاہ صاحب کے خداداد فہم کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ:

''فہم کا یہ حال تھا کہ ہر مسئلہ کی اصل اور اس کا سرا معلوم تھا/ اصل کلی کے بتلا دینے کے بعد یہ بتلا دیتے تھے کہ فلاں فلاں مسئلہ اس اصل پر متفرع ہے اور ان مسائل مختلف فیہ میں مابہ الاشتراک اور مابہ الاختلاف یہ ہے۔''

ظاہر ہے کہ اختلاف اور قدر مشترک کی بنیادوں کو متعین کرتے ہوئے مسئلہ کی روح پر اطلاع خود مولانا کے الفاظ میں کہ:

''یہ طریق نہایت دقیق اور عمیق ہے''

تاوقتیکہ اختلاف علماء کے پس منظر پر پوری اطلاع نہ ہو تمیز و امتیاز کی یہ قوت و صلاحیت ممکن نہیں/ چنانچہ موصوف لکھتے ہیں:

''جب تک روایات مختلفہ میں فقہاء کرام کا منشا خلاف اور سبب اختلاف معلوم نہ ہو مسئلہ کی حقیقت منکشف نہیں ہوتی''

اس کے بعد فاضل کاندھلوی نے علامہ کے درس حدیث کی بنیادی خصوصیات کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے یہ بھی سنایا کہ:

''درس حدیث میں سب سے اول اور زیادہ توجہ اس طرف فرماتے کہ حدیث نبوی کی مراد باعتبار قواعد عربیت و بلاغت واضح ہو جائے کوشش اس کی فرماتے کہ حدیث کی مراد کو علمی اصطلاحات کے تابع نہ رکھا جائے۔''

یہ اس لئے کہ:

''اصطلاحات بعد میں حادث ہوئیں اور حدیث نبوی زماناً اور رتبۃً مقدم ہیں۔''

اور یہ ساری کوشش اس لئے ہوئی کہ:

''حدیث کو اصطلاح کے تابع کرنا خلاف ادب ہے۔''

جو شخص مسائل و مباحث میں ان بنیادی اصول پر پوری بصیرت رکھتا ہو جس اصل پر یہ مسائل پھیلے ہوئے ہیں اسکی تعلیم و تدریس افادی نقطہ نظر سے بڑی جامع ہوگی/ قوت حافظہ نقول کی حد تک طلباء کے سامنے اقوال کا انبار لگا سکتی ہے/ لیکن فہم ثاقب کی جلوہ طرازیاں حاصل نہیں ہو سکتیں/ علامہ مرحوم کے درس کی یہی بڑی خصوصیت تھی کہ آپ اقوال میں اپنے خداداد فہم سے کام لیکر ترجیح بھی جاری فرما سکتے تھے/ مولانا کاندھلوی نصف صدی سے درس گاہی ضرورتوں پر تمام اطلاع رکھتے ہیں۔ اس لئے آپ کی نظر درس کے اس امتیازی پہلو پر جا پہونچی جو طلباء کے لئے سب سے زیادہ مفید ہے/ حدیث قرآنی بیانات و مضامین کی ایک واقعاتی تشریح ہے/ غالباً اسی لئے الشافعی الامام کو کہنا پڑا کہ قرآن جس قدر حدیث کا محتاج ہے حدیث اتنی قرآن کی محتاج نہیں/ اوکما قال/ مطلب اس کا یہی ہوا کہ قرآن کے مجملات کو حدیث ہی سے سمجھنا ممکن ہے/ جبکہ حدیث بجائے خود اس قدر واضح اور صاف ہے کہ اس کی مراد کی تعیین کے لئے کوئی تشریح درکار نہیں، اس اہم حقیقت کے پیش نظر علامہ نے درس میں اس کا بھی اہتمام فرمایا تھا کہ قرآن مجید کی ان آیات کی تعیین فرما دیں جو حدیث کا ماخذ یا حدیث جس اجمال کی شرح ہے/ مولانا کاندھلوی لکھتے ہیں کہ:

''حدیث نبوی کا ماخذ قرآن کریم سے بیان فرماتے''

اس التزام کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا کہ بہت سی مشکلات قرآنیہ کو حل فرما دیتے:

گویا کہ آپ کا درس حدیث ہی کی حد تک محدود نہیں تھا بلکہ دین کی اولین اور اہم بنیاد قرآن مجید کو بھی حل فرما کر طلباء کی واقفیت کے دائرہ کو وسیع کیا جاتا/ مولانا گیلانیؒ نے اپنے فاضلانہ مقالہ میں شاہ صاحبؒ کی اس درسی خصوصیت کا خصوصی تذکرہ کرتے ہوئے قرآن کریم سے متعلق آپ کے مخصوص نظریات کا ذکر کیا ہے۔

معلوم ہے کہ حدیث کی صحت وعدم صحت تمام تر راویوں کے احوال پر قائم ہے اور اسی ضرورت سے اسماء الرجال نامی فن کو محدثین نے ایجاد بھی کیا اور اختیار بھی، حدیث کی یہی ضرورت ہے جس کی بناء پر رسول کے مختصر ارشاد کے ساتھ سند کا طویل اضافہ کر دیا گیا، افسوس کہ آج ہماری درس گاہوں میں جن بنیادی علوم وفنون سے صرف نظر کی جارہی ہے/ انمیں اسماء الرجال بھی ہے/ اسماء الرجال ہی کی طرح اس کا دوسرا ضروری شعبہ جرح وتعدیل بھی اکثر چھوڑ دیا گیا، مذہبی وفقہی تعصب کی بناء پر بہت سی وہ روایتیں قبول کر لی جاتی ہیں جو کسی خاص مکتبۂ فکر کی تائید کرتی ہوں، حالانکہ اگر فنی نقطۂ نظر سے جانچ پڑتال کی جائے تو سلسلہ سند میں وہ شخصیتیں نظر آئیں گی جنکی حیثیت مجروح ہے، یا ان روایات پر ناروا جرح کا دفتر ہی ملے گا جس کی روایت کسی ناپسندیدہ فقہی اسکول کی تائید کرتی ہو اس لئے کوئی بالغ النظر عالم ہی ردو قبول کے ان ناملائم فیصلوں پر انصاف کی بات کہہ سکتا ہے اس لئے ضرورت اس بات کی تھی کہ اسماء الرجال اور جرح وتعدیل کے فنون کو ان درسگاہی علوم میں داخل کیا جاتا جن کی باقاعدہ تعلیم دی جارہی ہے مگر اسماء الرجال اور جرح و تعدیل کے فن سے اس غفلت کا کیا شکوہ درسگاہوں میں تو اصول حدیث کے فن کو بھی بڑی حد تک ترک کر دیا گیا بقول شاعر

ع دہن کا ذکر کیا یاں سر ہی غائب ہے گریباں سے

حافظ ابن حجر عسقلانی کی نخبۃ الفکر اصول حدیث میں ہماری درس گاہوں کا سب سے بڑا سرمایہ ہے اور اس کی بھی تعلیم جس ''لئے دئے'' انداز میں ہوتی ہے اس سے کچھ ہمارے طلباء ہی واقف ہیں، بہر حال شاہ صاحب مرحوم نے حدیث کی اس بڑی ضرورت کا خیال فرما کر راویوں سے متعلق مناسب تفصیل کا بھی التزام اپنے درس میں فرمایا اسی سلسلہ میں مولانا کاندھلوی کا بیان ہے:۔

''اسماء الرجال پر کلام فرماتے خصوصاً جن رواۃ کے بارے میں محدثین کا اختلاف ہے/ جرح وتعدیل کے اختلاف کو نقل کر کے اپنا قول فصیل بتلا دیتے کہ یہ راوی کس درجہ میں قابل قبول

ہے اور یہ کہ اس کی روایت حسن کے درجہ میں رہے گی یا صحیح کے درجہ میں یا قابل رد ہوگی یا قابل اغماض'' زیادہ تر فیصلہ کا یہ طریقہ ہوتا کہ جب کسی راوی کے جرح و تعدیل میں اختلاف ہوتا تو یہ فرماتے کہ یہ راوی ترمذی کی فلاں سند میں واقع ہے اور امام ترمذی نے اس روایت کی تحسین یا تصحیح فرمائی ہے۔''

اسماء الرجال کا یہی فن جو قوت حافظہ کا مطالبہ کرتا ہے اور ساتھ ہی وسعت مطالعہ کا بھی، حدیث کے طول وطویل دفتر میں ناقدین نے جہاں کہیں کسی راوی کی تعدیل کی ہے اور پھر کسی مذہبی عصبیت کی بناء پر اسی راوی کو مجروح قرار دیا ہے اسکی تعدیل سے فائدہ اٹھانے کے لئے حدیث کے پورے ذخیرہ پر واقفیت کی ضرورت ہے/ خدا تعالی نے آپ کو یادداشت کی غیر معمولی قوت کے ساتھ جو وسعت نظر عطا فرمائی تھی اس سے کام لیکر احناف کے لئے مفید روایتوں اور راویوں سے آپ کام لیتے اور سلسلہ میں شافعی المسلک ان علماء کی زیادتی پر خصوصی توجہ دلاتے جس کا مقصد احناف کے لئے مفید روایت اور رواۃ کی بیخکنی ہوتا، حافظ ابن حجر عسقلانی شارح بخاری سے آپ کی غیر معمولی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ جبل العلم حافظ الدنیا سے آپ کا اشارہ ابن حجر کی جانب ہوتا، لیکن جب محسوس فرماتے کہ ابن حجر دانستہ کف لسانی سے کام لے رہے ہیں اور حنفیہ کے لئے کسی مقید روایت سے سرد مہری کا معاملہ کر رہے ہیں تو ابن حجر کے اس طرز کو طوطے کی چال سے تشبیہ دیتے جو آنکھوں کو گردش دیکر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا نکل جاتا ہے/ اختلافی حدیثوں کے بارے میں شوافع کے یہاں اصح مافی الباب (یعنی اس باب میں اب سے زیادہ صحیح حدیث یہ ہے) کا جو ترجیحی طریقہ جاری ہے اس کا جب کبھی ذکر آتا تو فرماتے کہ لیجئے علماء شافعی نے پٹھے ٹٹولنے کا کام شروع کر دیا، اس علمی لطیفہ کی دلچسپ تفصیل فاضل گیلانی سے سنئے/ لکھتے ہیں کہ:

''اسماء الرجال کی کتابوں کو اٹھا کر راوی پر جرح کر کے مخالف کی حدیث کو نا قابل لحاظ بنا دینا اور صرف رجالی رجسٹروں کی مدد سے کسی روایت کو ترجیح دینا اور آثار صحابہ قرآنی آیات کے اقتضاء اور اسلام کے کلی قوانین واصول کی چشم پوشی حضرت شاہ صاحب، شافعیوں کے اس طرز عمل کو روایتوں کی ترجیح میں پسند نہیں فرماتے تھے/ جرح کے لئے رجالی جسٹروں میں راوی کی کمزوریوں کو ٹٹولنا اسی کا نام انہوں نے پٹھا ٹٹولنا رکھ لیا تھا، فرماتے کہ یہ قصابوں کا کام ہوا کہ جو جانور کمزور نظر آیا اسی کو کھینچ کر ذبح کر ڈالا'' عرض کر چکا ہوں کہ فن حدیث کا یہ اہم ترین شعبہ یعنے اسماء الرجال غیر معمولی اہمیت کا مقتضی ہے/ یاد پڑتا ہے کہ حجاج بن ارطات کی ایک روایت جو کسی

مسئلہ میں احناف کے لئے مفید ہے شوافع نے روایت کو نا قابل قبول ٹھہرانے کے لئے حجاج کی شخصیت پر جو تابڑ توڑ حملے کئے ہیں انمیں ایک بڑا اعتراض یہ بھی کیا گیا کہ وہ با جماعت نماز کا اہتمام نہیں کرتے تھے/ علامہ نے فرمایا کہ یہ انصاف کی بات نہیں کہ حجاج کو اس جرم کی وجہ سے متروک قرار دیا جائے درآنحالیکہ امام دارالہجرت مالک ابن انس ایک مدت تک مسجد میں تشریف نہیں لائے اور اس کے باوجود الامام کی روایتیں بدستور قابل قبول ہیں/ حجاج کی مدافعت میں جو دقیقہ شاہ صاحب نے دریافت فرمایا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کس دقت نظری سے اس فن کا مطالعہ فرمایا تھا، غرضیکہ اسماء الرجال جو فن حدیث کا ایک نہایت ہی ضروری اور اہم عنصر ہے شاہ صاحب اس فن کی اہمیت کے پیش نظر درس میں اس کا باقاعدہ اہتمام فرماتے/ اسماء الرجال ہی نہیں بلکہ درس میں جن تصانیف اور تالیفات کے حوالے پیش کرتے ان کے مصنفین و مؤلفین کے حالات مصنف کا علمی پایہ اور خود اس کتاب کی ثقاہت پر ایک جامع تبصرہ بھی ہوتا جس سے طلباء کو مختصر وقت میں سیر و سوانح کے ساتھ کتاب کی علمی حیثیت بھی معلوم ہوتی اور اس طرز سے نئی کتابوں کے مطالعہ کا شوق و ذوق بھی پیدا ہوتا فاضل گیلانی ہی لکھتے ہیں کہ:

> ''وہ اپنے عہد کے طلباء کی علمی بے بضاعتیوں کا اندازہ کر کے تکلیف اٹھا کر علاوہ موضوع درس کے چند خاص امور کا تذکرہ التزاما اپنے درس میں ضرور فرمایا کرتے تھے مثلا جن مصنفین کی کتابوں کا حوالہ دیتے انکی ولادت و وفات و سنین کے ساتھ ساتھ مختصر حالات اور انکی علمی خصوصیت، علم میں ان کا خاص مقام کیا ہے/ ان امور پر ضرور تنبیہ کرتے چلے جاتے/ یہ ان کا ایسا اچھا طریقہ تھا جسکی بدولت شوقین اور محنتی طلباء انکے حلقہ درس میں شریک ہو کر علم کے ذیلی ساز و سامان سے مسلح ہو جاتے یا کم از کم مسلح بننے کا ڈھنگ ان کو آجاتا تھا۔''

لیکن اسماء الرجال کی طرح یہ کام بھی انتہائی دشوار ہے غیر معمولی حافظہ کے ساتھ وسیع مطالعہ اس سنگلاخ وادی کو طے کرنے کے لئے ضروری ہے اور اسی لئے عام مدرسین و اساتذہ اگر اسکا اہتمام نہیں کر پاتے تو انہیں معذور سمجھنا چا/ ہئے فاضل گیلانی نے یہ بھی لکھا ہے:

> ''لیکن سچ یہ ہے کہ ہر غریب مدرس و استاد کے بس کی یہ بات نہیں کہ مطالعہ کئے بغیر جس عالم کا ذکر آجائے اس کے متعلق مذکورہ بالا تفصیلات سے طلباء کو آگاہ کرنے پر قادر ہو یہ تو انکے خصوصی حافظہ کا کمال تھا۔''

مشفقانہ افادہ کے وہ جذبات جو موصوف میں بقوت موجود تھے جس کے تقاضوں کی بناء پر آپ نے اپنے حلقہ درس میں شریک طلباء کی مناسب تربیت کے لئے جن ذیلی اضافوں کا اہتمام فرمایا تھا ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ دوسرے فن کے اہم مسائل خصوصاً اختلافی مباحث پر واقف کارانہ کلام فرما کر اختلاف کی ابتداء وانتہاء اور محاکمہ کرتے ہوئے قول فصیل سے بھی طلباء کو اطلاع کر دیتے، جیسا کہ مولانا گیلانی نے اس سلسلہ میں لکھا ہے:

"عموماً وہ اس کا بھی موقعہ تلاش کیا کرتے کہ علاوہ حدیث کے اسلامی علوم کے طلباء وعلماء کے لئے دوسرے متعلقہ علوم وفنون کے جن اصول وکلیات کا جاننا ضروری ہے ان کا بادنیٰ مناسبت ذکر فرماتے اور مسئلہ کی ایسی تاریخ بیان کرتے جس کے سننے کے بعد معلوم ہو جاتا تھا کہ اس مسئلہ کی ابتداء کس شکل میں ہوئی او رکن کن نقاط نظر سے گزرتے ہوئے موجود حال تک پہونچا۔"

اس ساری کدوکاوش سے مقصود طلباء کے ساتھ ان کی وہ غیر معمولی شفقت تھی جس سے انکا قلب معمور تھا، وہ چاہتے تھے کہ طلباء کو اس طرح تیار کر دیں کہ آئندہ علمی مرحلوں میں انکے لئے کوئی دشواری باقی نہ رہے اس لئے نہ وہ صرف مطالعہ کا طلباء میں ذوق پیدا کرنا چاہتے بلکہ انکے پیش نظر مطالعہ کے طریقے سے بھی طلباء کو آگاہ کرنا تھا خاص اس مقصد کے لئے انکے سامنے درس میں کتابوں کا انبار رہتا جس سے ضرورت کے وقت بطور حوالہ اصل ماخذ پر نشاندھی فرماتے تا کہ طلباء زبانی حوالوں پر ہی اکتفانہ کریں بلکہ مسائل میں مدلل گفتگو کی انہیں عادت پڑ جائے/ مولانا منظور نعمانی نے اپنے مقالہ میں انکی اسی خصوصیت پر توجہ دلاتے ہوئے لکھا ہے۔

'درس کے وقت صحاح ستہ اور انکے علاوہ حدیث کی اور کتابیں حضرت کے سامنے رہتی تھیں اور جب کسی مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے آپ کو کسی حدیث کا حوالہ دینا ہوتا تو صرف زبانی حوالے پر اکتفانہیں فرماتے تھے۔ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں اور آپ کے تلامذہ کے متعدد حوالوں سے واضح کیا گیا کہ علامہ کشمیری کا درس صرف حدیث ہی کی شرح وتفسیر تک محدود نہ تھا بلکہ حدیث کے عنوان پر ہمہ جہت افادات جنمیں تنوع کے ساتھ جامعیت وگہرائی ہوتی آپ کے درس کا امتیاز تھے/ اس کے باوجود جب آپ کسی مسئلہ پر کلام کرتے تو اگر چہ یہ کلام کسی ادنی مناسبت کی بناء پر ہوتا مگر جس جانب بھی طبیعت متوجہ ہوتی اس پر مکمل اور سیر حاصل بحث فرماتے/ درس میں خصوصی اضافوں میں ایک اضافہ اسرار وحکم کا تھا/ اسرار وحکم کا مطلب یہ ہے کہ شریعت پر احکام کی

علت اور حکمت کو دریافت کیا جائے/ قرآن کریم کے احکام جیسا کہ معلوم ہے حاکمانہ وحکیمانہ دونوں لب ولہجوں میں انسانوں تک منتقل کئے گئے ہیں/ حاکمانہ لب ولہجہ کسی حکم کے جاری کرنے کے بعد اسکی حکمت وعلت بیان نہیں کرتا جبکہ حکیمانہ انداز وبیان میں مصلحت وحکمت کی مختصر تفصیل آجاتی ہے/ اسے یوں سمجھئے کہ قبلہ کی تبدیلی پر ایک ان محروم عقل لوگوں کا گروہ تھا جو اس تبدیلی پر سب سے زیادہ چراغ پا ہو گیا ظاہر ہے کہ ان لوگوں کو سمجھانے کے لئے حکمت آمیز کلام کے مقابلے میں حکومتی لب ولہجہ درکار تھا، اس لئے خدا تعالیٰ نے انکی جانب روئے سخن فرمایا تو صرف اتنا ارشاد ہوا۔ قل للہ المشرق والمغرب ۔ ان معترضین سے کہہ دیجئے کہ مشرق ومغرب کے ہم مالک ہیں اس لیے جو چاہیں حکم دیں پس جس طرح ایک مکان کے مالک کو اپنے مکان میں اور ایک خسرو سلطنت کو اپنے ملک میں تمام تصرفات کا پورا اور قانونی حق حاصل ہوتا ہے ایسے ہی احکم الحاکمین کو اپنی وسیع حکمرانی میں ہر طرح کا اختیار حاصل ہے پھر اس کے کسی حکم پر اعتراض بے معنیٰ ہے/ دوسری جانب مخاطبین کا وہ گروہ تھا جنہوں نے تبدیلیٔ قبلہ کے حکم کو دل وجان سے قبول کیا تھا۔ ضرورت یہ تھی کہ انہیں اس حکم کی مصلحت سمجھائی جائے تاکہ وہ مومنانہ طمانیت سے بھی سرفراز ہوں، اسی لئے ان کے لئے ارشاد ہوا۔

الا لنعلم من یتبع الرسول ممن ینقلب علیٰ عقبیہ (اور یہ قبلہ ہم نے صرف اس لئے تبدیل کیا تاکہ رسول کی اتباع کرنے والے اور حکم کی مخالفت کر کے کفر کی جانب لوٹ جانے والے کھل کر سامنے آجائیں)

گویا کہ قبلہ کی تحویل سے متعلق چند در چند حکمتوں میں سے یہاں ایک حکمت رہی، حاکمانہ وحکیمانہ فرق کو قرآن مجید نے اس جگہ جیسے ملحوظ رکھا وہ اسکی معروف بلاغت کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے، بہرحال عرض تو یہ کیا جا رہا تھا کہ قرآن حکیم التزاما نہیں لیکن کہیں کہیں مصلحت حکم کو کھولتا بھی ہے جیسا کہ روزہ والی آیت میں ارشاد ہوا ہے کتب علیکم الصیام کما کتب علیٰ الذین من قبلکم لعلکم تتقون ہ ط (تم پر فرض کر دئے گئے روزے جیسا کہ تم سے پہلی امتوں پر فرض تھے توقع ہے کہ اس سے تم میں تقویٰ پیدا ہوگا)

اس ارشاد نے روزے کی فرضیت کی مصلحت تقویٰ کو قرار دیتے ہوئے اسے بیان بھی کر دیا گیا اس طرح نماز کے متعلق ارشاد فرمایا کہ:

تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر (کہ وہ تم کو برائیوں اور بدکاریوں سے روکنے والی ہے بہرحال اسلام کا سب سے پہلا مطالبہ ایک مسلمان سے احکام کی اطاعت کا

ہے یہ ایمانی تقاضے حکم کو بلا چوں و چرا تسلیم کرنے سے ہی پورے ہوتے ہیں اس لئے قرآن حدیث دونوں نے اسرار و حکم کے موضوع پر زیادہ توجہ نہیں کی مگر یہ بھی عجیب بات ہیکہ اسلامی تعلیمات کا متن یا اجمال ایک دوسری تفصیل و شرح کی جانب منتقل ہوتا رہا۔ ظاہر ہے قرآن مجید کے اجمال کی سب سے کامل اور کامیاب تفصیل حدیث ہے اور حدیث میں جو کچھ باقی رہ گیا اس کے ایک حصہ کا بیان فقہاء نے کیا اور دوسرے جز کی تشریح و تفصیل صوفیاء علیہم الرحمہ نے کی/ پس جس طرح فقہ اسلام میں نہ فقہاء سے نیازی برتی جاسکتی اور نہ صوفیاء ہی سے اس لئے علامہ کا خاص دستور تھا کہ وہ حدیث کے اسرار و حکم بلکہ مجموعہ شریعت کے مصالح پر طویل کلام فرماتے یوں بھی آپ کو صوفیاء سے ایک غیر معمولی عقیدت تھی یہی تاثر کبھی کبھی ان الفاظ میں آپ کی درسگاہ میں ہوتا کہ:

''صوفیا کی دل پذیر باتوں سے قلب و دماغ مطمئن ہوتے ہیں جبکہ مناطقہ وفلاسفہ کے ھفوات سے ایک نہ ختم ہونے والی تشویش پیدا ہوتی ہے۔''

بلکہ قرآن کلیم اور بعض اختلافی احادیث میں جہاں مختلف اقوال کی رہ نوردی کے باوجود تشفی نہیں ہوتی وہ اس قیل و قال میں صوفیا ہی کی ؟؟؟ کو اطمینان بخش قرار دیتے، سورہ والنجم میں وہی معرکۃ الآراء اختلاف کہ آپکی زبان مبارک پر العیاذ باللہ بتوں کی تعریف میں تلک الغرانیق العلیٰ ان شفامن لترجیٰ (یہ لمبی لمبی گردنوں والے بت انکی شفاعت کی توقع کی جاتی ہے) جاری اور بتوں کی یہ تعریف سن کر کفار مسرت سے جھوم اٹھے/ روایت کے اعتبار سے ابن حجر جیسے بلند پایہ محقق کو اصرار ہے کہ کثرت طرق کی بنا پر روایت کچھ نہ کچھ حیثیت رکھتی ہے ابن حجر اور دوسرے محدثین کے اس اصرار پر جاننے والے جانتے ہیں کہ حدود میں ہی مسئلہ اپنے دوررس نتائج کے اعتبار سے کیسی خوف ناک کشاکش کا باعث بنا ہے، عرض یہ کرنا ہے کہ شاہ صاحب نے اس بحث میں عبدالعزیز دباغ صاحبؒ کی صوفیانہ تحقیق کو مکمل قرار دیتے ہوئے فیصلہ کی اہم بنیاد قرار دیا ہے فقہاء نے تو نمونہ کے طور پر یہ ایک مثال ذکر کردی، آپ کی املائی تقریریں فیض الباری میں اس طرح کے بہت سے نمونے مل سکتے ہیں، غرض کہ آپ اسرار و حکم کو ایک اہم اور لدنی علم قرار دیکر اپنے درس میں اس کا ذکر فرماتے مجھ ہی سے آپ سن چکے ہیں کہ تواضع اور انکسار جس کا آپ پر غلبہ تھا، اس کے نتیجے میں ''ہمہ دانی'' کا دعویٰ تو درکنار ''ندانم'' کا نعرہ آپ کی زبان پر تھا لیکن اس کے باوجود فرماتے کہ جن دو چار علوم سے مجھے مناسبت ہے ان میں معانی و بلاغت، اعجاز قرآن اور اور اسرار و حکم کا خاص

طور پر ذکر ہوتا، یہ بھی فرماتے کہ:

"اسرار وحکم کو بجز شیخ محی الدین ابن عربی کے سب سے زیادہ جانتا ہو

ں بلاشبہ شیخ اکبر اس فن میں مجھ پر فائق ہیں۔"

شیخ اکبر سے اسی غیر معمولی عقیدت کی بنا پر اسرار وحکم کے موضوع پر ان کے اقوال یا پھر عبدالوہاب شعرانی کی تحقیقات درس میں زیر گفتگو آئیں۔ اکاندھلوی نے بھی اس کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

اسرار شریعت میں شیخ محی الدین ابن عربی اور شیخ شعرانی کا کلام ہمیشہ نقل فرماتے، معلوم ہوا کہ اسرار وحکم کے بیان سے شرعی احکام کو معقول سمجھنے کے ساتھ ان کی مقبولیت کے لئے بھی دل ودماغ کے دریچے کھل جاتے ہیں اس لئے درس کا یہ رخ بھی بڑی افادیت کا حامل تھا مگر افسوس کہ جہاں ہماری درس گاہوں میں اور بہت سے ضروری علوم چھوٹ گئے ان کے ساتھ اسرار وحکم کا فن بھی رخصت ہوا۔ علماء وطلباء تو اس حقیقت سے خوب واقف ہیں لیکن جو نہیں جانتے انہیں کو سمجھانے کے لئے اس کلپترہ گوئی سے کام لینا پڑا ہے کہ اہل علم پر اٹھائے ہوئے بہتان وافتراء جس سے دوچار امت کے عام ہی ممتاز ومنفرد اشخاص ہوتے رہے انہیں میں امام حنیفہ کی بھی ستودہ صفات گرامی ہے حسب ونسب سے لیکر انکی شخصیت، علم، تفقہ، دیانت وتقویٰ رائے اور حذاقت کون سادہ گوشہ ہے جو مخالفین کی نکتہ چینیوں سے محفوظ رہا ایک اور عام اعتراض اس جلیل امام پر یہ بھی کیا جارہا ہے کہ حدیث سے وہ سراسر ناواقف تھے یا ان کے فقہ کی تمام تر بنیاد ذاتی رائے وقیاس پر ہے حیرت اس پر ہے کہ کہنے والوں اور سننے والوں نے آخر یہ کیوں نہ سوچا کہ بھلا اسلامی فقہ کا استخراج واستنباط کرنے والا حدیث سے کس طرح بے نیاز ہوسکتا ہے عوام سے تو نہیں/ پوچھنا ان خواص سے ہے جو اس امام الائمہ پر اس اعتراض کو جڑنے کے لئے پھیپھڑوں کی تمام ہی قوت استعمال کررہے ہیں آخر بتائیں کہ فقہ کی چار اہم بنیادیں (یعنی قرآن، حدیث، اجماع امت، اور قیاس) پھر امام ابوحنیفہ کے فقہ کو مستقل فقہ مانتے ہوئے حدیث جیسے اہم جز سے بے اعتنائی کا التزام آخر کس معقول بنیاد پر ہے مگر جہاں نبی کو کاہن، ساحر اور جادوگر کہنے والے اور قرآن کریم کو اساطیر الاولین بتانے والے موجود رہے اور ان کی سب کہی ہوئی سننا پڑی تو غریب امام ابوحنیفہ کے متعلق اگر کچھ کہا جارہا ہے تو خواہی نخواہی اس کو سننا پڑے گا/ بہر حال شاہ صاحب جنہیں فقہ حنفی کے مطابق للحدیث ہونے کا پورا یقین تھا اور جنہوں نے تیرہویں صدی میں حنفیت کی خدمت اور اسکے استحکام میں تاریخی رول ادا کیا اپنے درس میں

احناف کے ماخذ کی خصوصی نشاندہی فرماتے/عادت یہ تھی کہ چاروں فقہاء کے مسلک کونقل فرما کر امام الائمہ کے قول کے ترجیحی دلائل بیان فرماتے کبھی کبھی مختلف اقوال میں جب کسی قول کوایک دوسرے کے مقابل میں راجح یا قوی وضعیف کے دائروں میں سمیٹنا مشکل ہوتا تو اپنی تحقیقی رائے پیش فرماتے جیسا کہ مولانا کاندھلویؒ نے لکھا ہے کہ:

''فقہ الحدیث پر جب کلام فرماتے تو اولا ائمہ اربعہ کے مذاہب نقل فرماتے اور پھر انکے وہ دلائل بیان فرماتے جواس مذہب کے فقہاء کے نزدیک سب سے زیادہ قوی ہیں پھران کا شافی جواب، اور امام اعظم ابو حنیفہؒ کے مسلک کی ترجیح بیان فرماتے''

حنفیت شافعیت بلکہ چاروں ہی فقہ متقدمین اور متاخرین کی جس تاریخی تقسیم میں بٹ گئے ان دونوں جماعتوں میں ان کا اعتماد اور بھروسہ متقدمین پر زیادہ تر تھا جیسا کہ فاضل مقالہ نگار نے بھی لکھا ہے:

''نقل مذاہب میں قدماء کی نقول پیش فرماتے بلکہ معمولا متاخرین کی نقول پر متقدمین کی نقول کو مقدم رکھتے''

بلکہ ان کی کوشش زیادہ تر یہ رہتی کہ اگر کسی اختلافی مسئلہ میں مجتہد اور خود صاحب مذہب کی کوئی تحقیق اور قول ہاتھ لگ جائے تو اسی کو بنیاد بنایا جائے عبور بالا مقالہ ہے۔ ائمہ اجتہاد کے اصل قول پہلے نقل فرماتے اور مشائخ کے اقوال بعد میں''۔ یہ تو عرض ہی کر چکا ہوں کہ خلافیات کے معرکۃ آلارا مباحث ومسائل میں خود انکی محققانہ رائے ہوتی جسے سننے والا سن کر مطمئن ہوتا اس ذیل میں مولانا کاندھلوی رقم طراز ہیں:

''مسائل خلافیہ میں تفصیل کے بعد یہ بھی بتلا دیتے کہ اس مسئلہ میں میری رائے یہ ہے گویا کہ وہ ایک قسم کا فیصلہ ہوتا جو طلباء کے لئے موجب طمانیت ہوتا۔''

بہر حال موصوف نے اپنے چالیس سالہ درس حدیث میں غیر متزلزل بنیادوں پر یہ حقیقت روشن کردی کہ نعمان ابن ثابت الکوفی ابی حیفہؒ طاب ثراہ، پر یہ الزام کہ انہوں نے حدیث سے ہٹ کر رائے وقیاس سے فقہ کی تعمیر کی ہے ایک بڑا جھوٹ ہے والقصۃ بطولہا۔

امام العصر حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ

فارق ارگلی

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ کی ذاتِ والا صفات نے اپنی تحریکات اور جہد مسلسل سے بانیانِ دارالعلوم دیوبند کے اس مقصدِ عظمیٰ کو پورا کر دکھایا جس کے لیے سرزمین ہند پر اس مقدس درسگاہ کا قیام عمل میں آیا تھا۔ ہندوستان پر انگریز قوم کے تسلط کے بعد کفر و شرک کی آندھیوں سے شمعِ اسلام کی حفاظت اور انقلاب 1857ء کی ناکامی کے بعد بری طرح کچلے گئے مسلمانانِ ہند کے مذہبی اور ملی وقار کی بحالی کے ساتھ ساتھ فرانگی استعمار سے وطن عزیز کی آزادی کے لیے وہ عظیم نصب العین تھا جس کے لیے حضرت شیخ الہندؒ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ وقف تھا آپ نے بیک وقت مذہبی، سماجی، تہذیبی اور سیاسی محاذ پر مردانہ وار جنگ تا حیات جاری رکھی۔ یہ آپ کا اخلاصِ نیت اور حقانی جذبہ ہی تھا جس کی برکت سے آپ کو ایسے لائق و فائق رفقاء اور جاں نثار شاگرد ملے جنھوں نے آپ کے مشن کو کبھی نہ مٹنے والی تاریخ بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ شیخ الہندؒ کے رفقاء اور شاگردوں میں اگر ایک طرف حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ اور مولانا حسین احمد مدنیؒ جیسے اہل عزیمت اور صاحبِ بصیرت مجاہدین دین و وطن سیاسی میدان میں فرنگی طاغوت سے برسرپیکار تھے تو دوسری طرف آپ کے عظیم المرتبت شاگرد حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ قرآن کریم اور احادیث مقدسہ کی تعلیمات سے کروڑوں دلوں کو منور کرنے کے ساتھ ساتھ دشمنِ اسلام انگریز قوم کی سازش سے پیدا ہونے والے کاذبِ اعظم اور مرزا غلام احمد قادیانی کے فتنے سے ملت اسلامیہ کو محفوظ رکھنے کی لڑائی لڑ رہے تھے۔ حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ ان علمائے اسلام کے سرخیل ہیں جنھوں نے اپنے علم و کمال سے قادیانی شیطان کی شر انگیزی اسلامیانِ عالم پر اس طرح واضح کر دی کہ مرزائیت کا وہ فتنہ گمراہوں کی محدود تعداد میں سمٹ کر رہ

گیااور سازشی انگریزوں کا یہ ناپاک حربہ بری طرح ناکام ہوا۔

حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ حلم وفضل کے کس بلند درجے پر فائز تھے اسکا اندازہ علامہ اقبالؒ کی رائے سے بہ آسانی ہوسکتا ہے:

''اسلام کی آخری پانچ صدیاں مولانا انور شاہؒ کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہیں''۔

مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی اسلامی اور علمی خدمات کے بارے میں نامور عالم دین حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ نے علامہ اقبالؒ کے تاثرات کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا ہے:

''آخری پانچ صدیوں کا تمام علم اگر یکجا کرلیا جائے تو انور شاہؒ کے علم کی زکوٰۃ بھی نہیں ہوتی''۔

آپ کے فرزند شیخ الحدیث حضرت مولانا انظر شاہ مسعودیؒ اپنے عظیم والد کے علم وفضل کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں:

''مرحوم علامہ کشمیریؒ اپنے بے پناہ علوم کے اعتبار سے آخری صدیوں میں آیۃ من اللہ تھے۔ اسلامی علوم وفنون میں کوئی فن ایسا نہ تھا جس میں وہ اپنی ذاتی رائے نہ رکھتے ہوں، خود فرماتے:

''میں کسی فن میں کسی کا مقلد نہیں ہوں، خود اپنی رائے رکھتا ہوں۔ بجز فقہ کے کہ ابوحنیفہؒ کی تقلید محض کرتا ہوں''۔

انہوں نے قرآن وحدیث اور اسلامی علوم کا بالغ نظری سے مطالعہ کیا تھا۔ قرآن کریم پر بھرپور نظر تھی۔ اعجازِ قرآن کا مسئلہ جو آج تک زیر بحث چلا آرہا ہے، فرماتے کہ:

''یہ مسئلہ میرے لیے سورج کی طرح روشن منور ہے۔''

وہ درسِ حدیث میں اس کا اہتمام کرتے تھے کہ احادیث کا مآخذ قرآن کی آیات سے طلبہ کے سامنے کھول دیں۔ مختلف الاحادیث میں تطبیق کی ایسی دلآویز شکل پیدا کرتے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال متعارض نہیں بلکہ ایک دوسرے سے مطابقت کرتے ہوئے دِکھائی دیتے۔ ان کا دستور خاص یہ تھا کہ قرآن وحدیث کے تمام بیانات کو سامنے رکھ کر پھر کسی مسئلہ کی تنقیح فرماتے تھے۔ ان کے آثر علمیہ میں سینکڑوں اس کے نظائر موجود ہیں کہ ائمہ اربعہ کے درمیان خلافیات میں مسئلہ کی وہ تطبیق کی کہ چاروں فقہا اپنے افکار ونظریات کے اعتبار سے ایک دوسرے کے قریب نظر آئے۔ فقہی اختلافات میں اختلافِ فقہا کی خلیج کو پاٹنے کی جدوجہد ہمیشہ سے تھی

اس لیے تین ائمہ میں اختلافاتِ ہوتا تو وہ حنفی مکتبہ فکر سے کسی ایسے حنفی عالم کی رائے لے لیتے جو باقی فقہاء کے اقوال سے اتحاد و اتفاق کی راہیں نکالتے۔" (ملفوظات محدث کشمیریؒ)

دارالعلوم کے اساتذہ میں ایک سے بڑھ کر ایک عظیم علمی شخصیتوں کے جھرمٹ میں حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی ذاتِ گرامی قرآنی علوم اور فقہ و حدیث کی لافانی خدمات کی وجہ سے پورے عالم اسلام میں نمایاں، مقبول اور معروف ہے۔

سرزمینِ کشمیر کو یہ شرف حاصل ہے کہ علاقہ لولاب کے ایک گاؤں ودھواں کے ایک ذی علم، دینی و روحانی خانوادے میں امت مسلمہ کا یہ فرزندِ عظیم 16 راکتوبر 1857ء کو پیدا ہوا۔ آپ کے والد محترم اپنے عہد کے بہت بڑے عالم باعمل تھے، جن کا نام نامی حضرت مولانا سیّد معظم شاہ تھا۔ تعلیم کا سلسلہ ساڑھے چار سال کی عمر میں شروع ہوا۔ اپنے والد سے قرآن پاک کے علاوہ چھ برس کی عمر تک فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھ لیں۔ اس کے بعد صوفی پورہ کے مولانا غلام محمد صاحبؒ سے فارسی و عربی کی تعلیم حاصل کی۔ تیرہ سال کی عمر میں آپ نے حصول علم کے ذوق و شوق میں وطن چھوڑ دیا اور ضلع ہزارہ پہنچ کر کئی نامور اساتذہ سے کسبِ فیض کیا۔ علم کے حصول کی جو شدید تشنگی ان کے اندر تھی وہ انہیں بے چین رکھتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب انہوں نے سولہ سترہ سال کی عمر میں ہندوستان کی عظیم دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کے بارے میں سنا تو خود کو روک نہیں سکے اور دیوبند پہنچ گئے۔ انہیں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ، حضرت حافظ خلیل احمد سہارنپوریؒ، حضرت مولانا اسحاق امرتسریؒ، حضرت مولانا غلام رسول ہزارویؒ جیسے عالی مرتبت اساتذہ سے شرفِ تلمذ حاصل ہوا۔ چار سال دارالعلوم کے سرچشمۂ علم سے سیراب ہو کر دستار فضیلت حاصل کی۔ حضرت شیخ الہند کو اپنے اس غیر معمولی شاگرد سے بے پناہ محبت تھی مولانا انور شاہ بھی شیخ الہند سے بیحد عقیدت رکھتے تھے۔ آپ کو حضرت شیخ الہندؒ نے اپنا جانشین مقرر فرما کر گویا یہ ظاہر فرما دیا کہ جوہری نے اس گوہر نایاب کو پہچان لیا تھا۔ دارالعلوم سے فراغت پاکر آپ نے گنگوہ جا کر امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے سندِ حدیث اور فیوضِ باطنی حاصل کیے۔ اس کے بعد آپ دہلی تشریف لے گئے، جہاں مدرسہ امینیہ میں تین برسوں تک درس و تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ دہلی میں کئی سال قیام کے بعد آپ کشمیر تشریف لے گئے، جہاں سے آپ حج بیت اللہ کے لیے حجاز مقدس روانہ ہوئے۔ حج کی سعادت حاصل کرنے کے ساتھ ہی آپ نے طرابلس، بصرہ اور مصر و شام کی سیاحت کی۔ وہاں کے جلیل القدر علماء آپ کی خداداد لیاقت اور غیر معمولی استعداد

سے بیحد متاثر ہوئے اور علم حدیث کی سندات عطا فرمائیں۔ سفر سے واپسی پر آپ بارہ مولہ کے رئیس خواجہ عبدالصمد کا کرو کی گزارش پر فیض عام کے نام سے ایک دینی مدرسہ قائم کیا جہاں تین سال تک علم دین کی روشنی پھیلاتے رہے۔ اسی دوران دارالعلوم کے جلسۂ دستار بندی میں شرکت کی دعوت ملی۔ آپ دیوبند تشریف لائے۔ اکابرین نے آپ کو درس و تدریس کے فرائض سپرد کیے۔ آپ کئی سال تک یہ مقدس فریضہ انجام دیتے رہے۔ مطالعہ، عبادتِ الٰہی اور طلبہ کو تعلیم دینا انہوں نے اپنی زندگی کا مقصد بنالیا تھا۔ وہ ساری عمر مجرد اور آزاد رہ کر گزارنا چاہتے تھے لیکن حضرت شیخ الہندؒ نے انہیں اتباعِ سنتِ رسول ﷺ کی تکمیل کے لیے نکاح کی ترغیب دی۔ چنانچہ گنگوہ کے ایک معزز خاندان میں آپ کی شادی ہوگئی۔ اس وقت آپ کی عمر 44 سال کی ہو چکی تھی۔ آپ کے زہد و تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ شادی ہونے تک آپ نے مدرسہ سے کبھی تنخواہ نہیں لی تھی البتہ شادی کے بعد بہت معمولی مشاہرہ قبول کیا۔ شاہ صاحب خود فرماتے ہیں:

''میں بااراده ہجرت وطن (کشمیر) چھوڑ آیا تھا اور دیوبند اٹھارہ سال رہا جن میں چھ سال دارالعلوم سے وظیفہ نہیں لیا پھر نکاح ہوا، صرف اپنے بزرگوں کی اتباع میں علم پڑھاتھا، نہ دنیا پیشِ نظر تھی نہ دین ہی کے لیے خاص نیت تھی۔''

حضرت مولانا کشمیریؒ نے دارالعلوم کی بے پناہ خدمت کی۔ آپ مدرسہ کے لیے مالی وسائل جمع کرنے کے لیے دور دراز کے سفر کرتے تھے اور جہاں بھی تشریف لے جاتے مخیّر مسلمان ان کے لیے پلکیں بچھاتے تھے۔ آپ کو اس زمانہ میں دارالعلوم کی مالی امداد و اعانت کے معاملے میں زبردست کامیابی حاصل ہوتی تھی۔

حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ نہ صرف اپنے عہد کے بہت عبقری عالم دین، مفسر اور محدث تھے بلکہ سادگی، پاکیزگی، قناعت، صبر و تقویٰ اور اخلاقِ حسنہ کی وجہ سے انتہائی احترام و عقیدت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ اسلام کی سربلندی ان کا مقصدِ حیات تھا۔ انہوں نے قادیانی فتنہ کا مقابلہ پوری قوت کے ساتھ کیا۔ ردِّ قادیانیت کے لیے ملک کے مختلف شہروں میں آپ کے مناظرے تاریخی حیثیت کے حامل ہیں۔ کئی بار بیماری کے عالم میں بھی اگر مناظرہ کا سوال سامنے آیا تو آپ خود کو سفر سے روک نہیں سکے۔ آپ نے اپنی مدلل تقریروں اور عالمانہ تحریروں سے قادیانیت کو ادھیڑ کر رکھ دیا۔ آپ کی تالیف ''خاتم النبیین'' قادیانی شیطنت کو سمجھنے اور اس کے مہلک اثرات سے ملتِ اسلامیہ کو بچانے کے لیے ختم نبوت کے مبلغ علماء و اہل دانش کے لیے رہنما ثابت ہوئی۔

آپ نے قادیانیت کو ذلیل وخوار کردینے کے سلسلے میں بہاول پور کے تاریخی مقدمے میں اپنے دلائل سے خود قادیانیوں کے در پردہ حامی انگریز جج کو بھی لاجواب کردیا۔

حضرت کا سب سے اہم علمی کارنامہ صحیح بخاری کی اُردو زبان میں شرح وتفسیر ہے۔ سات جلدوں پر مشتمل شرح بخاری شریف ''انوار الباری'' برِصغیر کے مسلمانو کے لیے حدیث شریف کو سمجھنے کا مؤثر وسیلہ ہے جس کے مطالعے سے اہم ترین دینی مسائل کا حل، اسلامی تعلیمات کی روشنی اور دین ودنیا میں کامیابی اور سرخروئی کی جانب مؤثر رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ آپ کی تقریباً دودرجن گرانقدر تالیفات دنیائے اسلام میں مقبولیت حاصل کرچکی ہیں۔

حضرت شاہؒ صاحب ایک عظیم محدث اور فقیہ ہونے کے ساتھ ساتھ سچے ہندوستانی تھے۔ حب الوطنی کا جذبہ ان کے دل میں امنڈتا رہتا تھا۔ وہ دل کی گہرائیوں سے انگریز کی غلامی کے دشمن تھے۔ جمعیۃ علماء ہند کی سرگرمیوں میں آپ کی قائدانہ مشاورت کا سلسلہ مسلسل جاری رہا۔ مجلس احرار کی تحریک آزادی میں بھی آپ عملی طور شامل رہے۔ 1927ء میں پشاور میں منعقدہ جمعیۃ علماء کے اجلاس میں آپ نے تاریخی خطبہ صدارت ارشاد فرمایا تھا جو کانگریس اور جمعیۃ علماء کی تحریکِ آزادی کی آواز بن گیا۔ یہ وہ قت تھا جب انگریزوں کی شاطرانہ سیاست سے ہندو مسلم اتحاد کو زبردست نقصان پہنچ رہا تھا۔ غدارانِ وطن نے فرقہ پرستی کا زہر پھیلا کر ملک کا ماحول پراگندہ کررکھا تھا۔ نہرو رپوٹ نے بھی جمعیۃ اور کانگریس کو ایک دوسرے سے خاصا دور کردیا تھا۔ اس وقت مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے ہندوستانیوں کو حب الوطنی کا سبق اور متحد ہوکر آزادی کی جنگ لڑنے کی ترغیب دی۔ اس تاریخی خطبے میں وطن سے محبت کی شرعی حیثیت واضح کرتے ہوئے آپ نے فرمایا تھا۔

> ''ہندوستان جس طرح ہندوؤں کا وطن ہے، اسی طرح مسلمانوں کا بھی وطن ہے۔ ان کے بزرگوں کو ہندوستان آئے ہوئے اور رہتے ہوئے صدیاں گزر گئیں۔ انہوں نے ملک پر صدیوں حکومت کی۔ آج بھی ہندوستان کے چپہ چپہ پر مسلمانوں کی شوکت اور رفعت کے آثار موجود ہیں۔ موجودہ نسل کا خمیر ہندوستان کے آب وگل سے ہے۔ ہندوستان میں اس کی عظیم الشان مذہبی اور تمدنی یادگاریں ہیں، کروڑوں کی جائدادیں ہیں، عالی شان تعمیروں اور وسیع قطعاتِ زمین کے مالک ہیں۔ ان کو ہندوستان سے ویسی ہی محبت ہے جیسی ایک سچے محبِ وطن کو ہونی چاہیے اور کیوں نہ ہو جب ان کے سامنے اپنے سیّد و

مولیٰ، اپنے آقا ﷺ کا اسوہ حسنہ موجود ہے، وہ یہ کہ حضور ﷺ نے کفار کے جور وستم سے مجبور ہو کر حکم خداوندی کے ماتحت اپنے پیارے وطن مکہ معظمہ سے ہجرت کے وقت وطن عزیز کو خطاب کر کے فرمای: "خدا کی قسم! خدا کی تمام زمین میں تو مجھے سب سے پیارا ہے، اور میرے قوم تیرے اندر سے مجھے نہ نکالتی تو میں کبھی تجھ کو نہ چھوڑتا۔" اس کے بعد حکم الٰہی سے آپ نے مدینہ طیبہ میں سکونت فرمائی اور ہجرت کے بعد دارالہجرت سے منتقل ہونا محبوب بحیثیت وطن رہنا تھا تو اس کے لیے دعا فرمائی: "بارِ خدایا! مدینہ کو ہمارے قلوب میں ایسا محبوب بنادے جیسا ہم مکہ سے محبت کرتے ہیں یا اس سے بھی زیادہ محبت دے دے۔ اے اللہ! ہمارے 'صاع' ہمارے 'مُد' (اوزان کے پیمانے) اور ہماری کھجوروں میں مکہ کی برکت دو چند عطا فرما۔ خداوندا! آپ کے بندے آپ کے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آپ سے مکہ والوں کے لیے برکت کی دعا کی تھی۔ میں تیرا بندہ، تیرا رسول 'محمد' ہوں، اہلِ مدینہ کے لیے تیری بارگاہ میں دعا کرتا ہوں کہ ان کے مد اور صاع میں اس برکت سے دو چند برکتیں عطا فرما۔ ایک برکت کے ساتھ دو برکتیں ناز فرما۔"

سیّد الکونین کے جذباتِ حبِ وطن یہ ہیں اور ان کے ہوتے ہوئے کیا ممکن ہے کہ مسلمان سچا مسلمان ہو کر اس جذبہ حب الوطنی سے خالی ہو اور چوں کہ ہندوستان میں دوسری قومیں بھی آباد ہیں، ان کو بھی طبعی طور پر اپنے وطن سے محبت ہونی چاہیے۔ اس لیے تمام ہندوستانیوں کے قلوب میں ہندوستان کی آزادی کی خواہش ایک ہی مرتبہ اور ایک ہی وجہ پر ہونی لازمی ہے۔

اپنے اس تاریخی خطبے میں حضرت محدث کشمیریؒ نے ملک کی اکثریت (ہنود) کو مخاطب کرتے ہوئے آزادیِ وطن کے لیے متحد ہو جانے کا پیغام ان الفاظ میں دیا تھا:

"میں نہایت بلند آہنگی کے ساتھ برادرانِ وطن کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ منصفانہ معاہدہ کرلیں اور اس معاہدے کو دیانت داری اور خلوص کے ساتھ پورا کرلیں۔ سیاسی چالوں اور نمائشی پالیسی سے کام نہ لیں تو مسلمانوں کو پورا پورا ہمسایہ پائیں گے کیونکہ مسلمان حکم قرآنی کے بموجب معاہدہ پورا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ ارشادِ خداوندی ہے:

''جن غیر مسلمانوں سے تم نے معاہدہ کیا انہوں نے ایفائے عہد میں تمھارے ساتھ کمی نہیں کی اور تمہارے خلاف کسی کو مدد نہیں دی تو تم بھی معاہدہ کی مدت تک معاہدہ پورا کرو۔ بیشک اللہ پرہیزگاروں سے محبت کرتا ہے۔ جب تک غیر مسلم تم سے سیدھے رہیں، تم بھی سیدھے رہو، بیشک اللہ پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے۔'' (قرآن کریم)

حضرت محدث کشمیریؒ کی ذاتِ گرامی علم وفہم اور ذہانت وذکاوت کی اس بلندی پر فائز تھی کہ استاذ الاساتذہ حضرت شیخ الہندؒ بھی بعض مسائل پر آپ سے استفسار کر لیتے تھے۔ جب شیخ الہندؒ مالٹا سے رہائی پا کر دیو بند تشریف لائے تو انگریز حکومت سے ترکِ موالات کا مسئلہ زیرِ غور تھا۔ اس کی طرف مسلمانانِ ہند کو متوجہ اور بیدار کرنے کے لیے فتویٰ جاری کرنا ضروری خیال کیا گیا۔ حضرت شیخ الہندؒ نے مولانا انور شاہؒ کو فتویٰ لکھنے پر مقرر کیا۔ آپ نے غاصب حکمرانوں سے ترکِ موالات کے جواز میں مختصر لیکن انتہائی جامع اور پراثر الفاظ میں فتویٰ تحریر فرمایا، جس پر شیخ الہندؒ نے بیحد طمانیت اور مسرت ظاہر کی۔

آپ کی علمیت اور افضلیت کے بارے میں حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے کہا تھا۔ اس قسم پر کوئی کفارہ نہیں جو اس امر پر کھائی جائے کہ مولانا انور شاہ صاحبؒ اس زمانہ میں بے نظیر عالم ہیں۔'' مصر کے مشہور عالم دین اور دانشور علامہ سیّد رشید رضا ندوۃ العلماء لکھنو کے سالانہ جلسہ میں شرکت کے لیے ہندوستان آئے تھے، بعد میں وہ دیو بند تشریف لے گئے اور دار العلوم کا معائنہ کیا۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے استقبالیہ جلسے میں عربی زبان میں تقریر فرمائی جس میں علامہ کے خیر مقدم کے ساتھ ساتھ دار العلوم کے حالات بھی بیان کیے۔ آپ کی تقریر فصیح و بلیغ اور اثر انگیز تھی کہ سیّد رشید رضا بیحد متاثر ہوئے۔ انہوں نے شافعی مذہب ہوتے ہوئے حنفی مذہب کے بارے میں آپ سے سوالات کیے۔ آپ کے جواب، اندازِ گفتگو، قوتِ بیان اور وسعتِ معلومات پر علامہ حیرت زدہ رہ گئے۔ انہوں نے رخصت ہوتے وقت فرمایا تھا:

''دار العلوم نہ دیکھتا تو ہندوستان سے مایوس ہو کر جاتا۔ دار العلوم نے مجھے بتایا دیا ہے ہندوستان میں بھی علومِ عربیہ اور تعلیماتِ مذہبی اعلیٰ پیمانہ پر موجود ہیں۔''

حضرت مولانا انور شاہؒ عربی زبان پر غیر معمولی دسترس رکھتے تھے۔ آپ نے ایک بار فرمایا تھا کہ جب وہ عرب ممالک کے سفر پر تھے اکثر اہل عرب بھی ان سے گفتگو کرتے ہوئے

جھجکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے دیگر خوبیوں کے ساتھ حافظہ کی غیر معمولی قوت بھی آپ کو عطا فرمائی تھی۔ مولانا کشمیریؒ کے فرزند اکبر حضرت ازہر شاہؒ فرماتے ہیں کہ: ''ایک کتاب کے اگر پانچ پانچ یا دس دس حواشی بھی تھے تو آپ کو یاد ہوتے تھے۔ کتابوں سے ضروری حوالے بمعہ جلد اور صفحات ایک بار کے ہی مطالعے سے محفوظ ہو جاتے تھے۔ جس وقت آپ کسی اہم علمی موضوع پر تقریر فرماتے تھے تو بے شمار کتابوں کے حوالے بے تکلف دیتے چلے جاتے تھے۔ احادیث کا تمام ذخیرہ اور ان کی صحت وعدم صحت کے متعلق طویل وعریض بحثیں، رواۃ کے مدارج ومراتب اس طرح محفوظ تھے کہ طلبہ اکثر آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر لائبریری کا کام لیتے تھے اور ایسے سوالات کا جواب منٹوں میں حاصل کر لیتے تھے جن کی تحقیق وجستجو کے لیے ایک پوری عمر درکار ہے۔ پھر ہر جواب میں جامعیت اس قدر تھی کہ اس موضوع پر کسی کتاب کو دیکھنے کی ضرورت نہیں رہتی تھی۔ مشہور ومعروف کتاب خانوں کے اکثر مخطوطات ان کی نظر سے گزر چکے تھے۔ وہ کتابیں ان کے ذہن میں اس طرح محفوظ تھیں کہ گویا آج ہی مطالعہ کیا ہے۔ ایک بار پنجاب سے ایک صاحب علم جفر سے متعلق چند مشکل ترین مسائل حل کرنے کے لیے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے ان کو تسلی بخش جواب عنایت کر کے واپس فرمایا، فلسفہ جدید (جدید سائنس) اور جدید علم ہیئت کا بھی آپ نے گہرا مطالعہ فرمایا تھا۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ اب علماء کو قدیم فلسفہ وہیئت کے ساتھ جدید فلسفہ وہیئت کی تعلیم بھی حاصل کرنی چاہیے۔'' (بحوالہ علمائے حق)

انگریزی زبان پر بھی حضرت کو خاصی مہارت حاصل تھی۔ ایک بار حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا: ''ہمارے ساتھیوں میں کسی نے انگریزی پڑھی ہے؟'' اس پر مولاناؒ نے عرض کیا: ''میں نے کشمیر میں چھ ماہ انگریزی پڑھی ہے۔ شیخ الہندؒ نے فرمایا: ''تو نے چھ مہینے میں اتنی انگریزی سیکھ لی جتنی کوئی دوسرا کئی سال میں پڑھے۔'' انگریزی زبان میں آپ ایک گریجویٹ سے کچھ زیادہ ہی استعداد رکھتے تھے لیکن اس زبان کو آپ پسند نہیں فرماتے تھے۔

عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں حضرت صاحب طرز قلمکار تھے۔ شعر وسخن کا بھی اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ فارسی میں ان کا کلام فصاحت اور حسن بیان کی روشن مثال ہے۔ حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول ﷺ آپ کے خاص موضوعاتِ سخن ہیں۔ ایک نعتیہ قصیدے کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

معراج تو کرسی شدہ وسیع سماوات
فرش قدمت، عرش بریں سدرہ سریری

برفرق جہاں پایہ پائے تو شدہ ثبت
ہم صدر کبیری و ہے بدر منیری
آدم بہ صفِ محشر و ذریتِ آدم
در ظل لوایت کہ امامی و امیری
اُمی لقب و ماہ عرب مرکزِ ایماں
ہر علم و عمل را تو مداری و مدیری
آیاتِ رسل بودہ ہمہ بہتر و برتر
آیات تو قرآں ہمہ دانی ہمہ گیری

اردو زبان کے متعدد اچھے اشعار آپ کو یاد تھے۔ خاص طور پر یہ شعر بہت پسند تھا:

اُٹھ باندھ کمر کیوں ڈرتا ہے
پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے۔

مقدمہ بہاول پور کی سماعت کے دوران آپ نے ملعون غلام احمد قادیانی کا یہ شعر اعتراضاً پڑھا:

ابنِ مریم کے ذکر کو چھوڑو
اس بہتر غلام احمد ہے

اس پر مرزائی وکیل نے جواب میں کہا کہ اسی طرح ایک شعر مولانا محمود حسنؒ نے بھی کہا ہے، اس کا کیا جواب ہے، وکیل نے شیخ الہندؒ کا شعر پڑھا:

مردوں کو زندہ کیا، زندوں کو مرنے نہ دیا
اس سچائی کو تو دیکھیں ذری ابنِ مریم

شاہ صاحب فرماتے ہیں: ''اس پر عدالت میں جو ہزاروں کا مجمع تھا اور ان میں ہندو بھی تھے، ذرا گھبرایا کہ شاہ جی اس کا جواب مجھ سے نہ ہو سکے تو میں نے کھڑے ہو کر تقریر شروع کی اور کہا کہ شعر میں ایک تو شاعری ہوتی ہے دوسرے جھوٹ (احسنہ کذب، کہ شعر میں جتنا زیادہ جھوٹ ہو اتنا ہی اچھا سمجھا جاتا ہے) اور تیسرے مبالغہ۔ شاعری میں تخیل اور خیال آفرینی ہوتی ہے یعنی حقیقتِ شے کے آس پاس آنا اور خود اس کا ظاہر نہ کرنا جس کا مقصد اچھنبے میں ڈالنا ہوتا ہے اور یہ بھی قابل ذکر ہے کہ کسی چیز کی حقیقت کو بتلانا یہ خاصہ خدا ہے، وہی اشیاء کے حقائق کو بلا کم و کاست بیان کر سکتا ہے دوسرا نہیں۔ پس شاعر اپنے شاعرانہ جذبات میں یہ ظاہری نہیں کرنا چاہتا کہ وہ کوئی حقیقت بیان کر رہا ہے، نہ وہ اس کا مدعی ہوتا ہے البتہ اپنے اچھوتے تخیل یا معنی آفرینی کی داد چاہتا

ہے۔ چنانچہ حضرت موالاستاذ مولانا شیخ الہندؒ کی مراد یہ ہے کہ ہمارے مشائخ طریقت وشریعت نے مردہ دلوں کو زندہ کیا اور زندہ دلوں کو مرنے نہ دیا۔ اس مصرعہ میں صرف دل کا لفظ محذوف ہے جس سے شاعر نے اچنبھے میں ڈالا ہے اور خیال آفرینی کی داد چاہی ہے۔ پھر چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کرنے کے بارے میں بڑے مشہور معروف پیغمبر گزر رہ ہیں اس لیے اس میں ان کو سب سے بڑا فرض کیا ہے، اور دوسرے مصرعہ سے منشاء یہ ہے کہ وہ دیکھیں تو اس کی داد دے سکتے ہیں جیسے بڑے چھوٹوں کو داد دیا کرتے ہیں۔ لہٰذا حضرت شیخ الہندؒ کے شعر میں خالص ایمان ہے اور مرزا کے شعر میں خالص کفر ہے۔ کیونکہ حضرت شیخ الہندؒ نے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اس منقبت احیائے موتیٰ میں سب سے زیادہ معظم ومکرم قرار دے کر اپنے اکابر کو بھی چھوٹوں کے مرتبے میں قرار دے کر اپنی طرف سے حضرت مسیح علیہ السلام کی بڑی سے بڑی عظمت کا اقرار فرمایا ہے۔ اس کے برعکس مرزا صاحب نے اپنے شعر کے پہلے مصرعہ میں تو حضرت مسیح علیہ السلام کے ذکر مبارک سے اعراض کی تلقین کی جیسے کسی کمتر کو نا قابلِ التفات سمجھ کر ایسا کیا جاتا ہے اور دوسرے مصرعے میں مزید اہانت یہ کہ صاف طور پر کہہ دیا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام سے بہتر غلام احمد ہے۔ نعوذ باللہ! اس سے زیادہ کفر کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔'' (ملفوظاتِ محدث کشمیریؒ)

حضرت محدث کشمیریؒ کے ادبی ذوق وشعور کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ ایک بار ایک مولوی صاحب نے آپ سے عرض کیا کہ حافظ شیرازی کی غزلوں میں شراب وکباب کا ذکر ہے تو پھر حافظ شیرازی کو عارف کیوں کہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ حافظ شیرازی نے کشاف کا حاشیہ لکھا ہے۔ میں نے سورہ کہف تک دیکھا ہے، بہت اعلیٰ حاشیہ ہے، وہ طبع نہیں ہوا۔ حافظ کی غزلیں بہت بلند پایہ ہیں، ہر شخص انہیں سمجھنے کا اہل نہیں ہے۔ باری تعالیٰ آوارہ لوگوں سے ایسے کام نہیں لیتا، جب انہوں نے تفسیر کشاف کا حاشیہ لکھا ہے تو بے ادبی کے الفاظ نہیں کہنے چاہئیں۔ آپ توبہ استغفار کریں۔''

آپ نے 1340ء ہجری تک دار العلوم کے مدرسِ اعلیٰ اور جانشینِ حضرت شیخ الہندؒ کی حیثیت سے درس وتدریس اور انتظامی فرائض بحسن وخوبی انجام دینے کے بعد انتظامی امور میں اختلاف کی وجہ سے دار العلوم سے علاحدگی اختیار کر لی اور ضلع سورت میں ڈابھیل نامی مقام پر واقع حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن کے قائم کردہ جامعہ اسلامیہ میں تدریس کے فرائض انجام دینے لگے۔ وہاں بھی تصنیف وتالیف اور رشد وہدایت کا سلسلہ جاری رہا۔ زندگی کے آخری دو سال سخت علالت میں گزرے۔ 29 رمئی 1933ء کو دیوبند میں انتقال فرمایا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت امام العصر شاہ صاحب رحمۃ اللہ اور

ان کی تصانیف

مولانا محمد یوسف صاحب بنوری

علمی دنیا کی تاریخ میں یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی شخص کے ذاتی کمالات وعلوم کے لیے یہ ضروری نہیں کہ دنیا ان کے کمالات سے واقف بھی ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کی اس عظیم مخلوق میں اور اللہ تعالیٰ کی اس وسیع سرزمین میں کتنی ایسی ہستیاں گزری ہوں گی جن کا صحیح اندازہ کسی کو نہ ہوا ہو۔

اور یہ بھی ایک مسلم امر ہے کہ کوئی شخص تصانیف کی محض عددی کمیت واکثریت کی بناء پر علامۂ عصر بن جائے ایسا نہیں ہو سکتا علماء اسلام کے علمی سمندر میں کثرت سے ایسے بیش بہا موتی موجود ہیں جو کبھی کسی تاج مرصع کی زینت نہیں بنے۔ قدرت کی معدنی کائنات میں ایسے بے بہا جواہرات موجود ہیں کہ ''کوہ نور'' نامی ہیرے اس کی چمک وتابانی کے سامنے ماند پڑ جائیں۔ و ان من شیء الا عندنا حزائنہ و ماننزلہ الا بقدر معلوم (حجر - ۲۱)

حافظ حدیث امام تقی الدین ابن دقیق العید رحمہ اللہ جیسے محقق عصر جن کے متعلق حضرت شاہ عبد العزیز دہلویؒ فرماتے ہیں کہ امت محمدیہ میں ایسا دقیق النظر محدث نہیں گزرا۔ اگر ان کی کتاب ''الاحکام'' یا کتاب الامام'' شرح الالمام کی ناتمام نقول کتابوں میں ہوتیں تو شاید موجودہ نسل کو ان کے کمالات کا کچھ علم بھی نہ ہوتا۔ کیا کوئی گمان کر سکتا ہے کہ شیخ جلال الدین سیوطی مصری اپنی کثرت مصنفات کی وجہ سے ابن دقیق العید جیسے محقق روزگار سے سبقت لے جائیں گے؟۔

بسا اوقات دفتر تاریخ کی ورق گردانی سے بھی اس کا پورا اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے۔ معاصرین فیض یافتہ اور چشم دید کمالات کے مشاہدہ کرنے والوں کو جن علمی حقائق کا انکشاف ہوتا ہے ان کے مولفات کے صفحات پڑھنے والوں کو پورا احساس بے حد مشکل ہے۔ پھر قدرت کا عجیب

نظام ہے کہ علماء امت اور ارباب ولایت کے مزاج بھی اتنے مختلف ہیں کہ عقل نارسا حیران رہتی ہے۔ کوئی دینی خدمت تعلیم وارشاد اور افادہ وافاضہ کے پیش نظر تالیف وتصنیف میں مشغول نظر آتا ہے، کوئی اصلاح وتربیت کی حرص کی خاطر حلقۂ صحبت واستفادہ کو وسیع کرنے کی فکر میں مصروف ہے۔ کوئی اللہ تعالیٰ کا بندہ خمول پسندی وتواضع وشہرت سے نفرت کی بناء پر گم نامی کو اپنا شیوۂ امتیاز بنائے ہوئے ہے۔ نہ نظام قدرت کے عجائبات کی انتہا ہے نہ کائنات کی نیرنگیوں کا شمار۔

رتب نقصر الامانی خسرابے　　　　دو نہا ماوارائہن وراء

صاحب فتح القدیر کے بعد ایسا محدث وعالم امت میں نہیں گزرا اور پھر فرمایا کہ یہ کوئی کم زمانہ نہیں۔ غالباً موصوف کے الفاظ یہ تھے۔

"لم یأت فی الأمة بعد الشیخ ابن الھمام مثله فی استثارة الابحاث النادرة من الاحادیث ویست ھذة المدة بقصیرة ھ" اور حیرت یہ ہوتی تھی کہ کسی موضوع پر جب کچھ تحریر فرمایا ایسا محسوس ہوتا تھا کہ شاید ساری زندگی اسی ایک موضوع کی نذر ہوئی ہے۔

ایک دفعہ ۱۳۴۰ھ میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی مرحوم حیدر آباد سے دیوبند تشریف لائے تھے اس وقت مرحوم امور مذہبی کے صدر الصدور کے عہدے پر فائز تھے۔ حضرت کی زیارت کے لیے قیام گاہ پر تشریف لائے۔ حضرت شیخ رحمہ اللہ نے مشکلات القرآن کا کچھ تذکرہ فرمایا اور بطور مثال سورۂ مزمل کی پہلی آیت میں علماء کو جو علمی اشکال تھا۔ اس کا ذکر فرما کر اپنی طرف سے ایک ایسی تفسیر بیان کر کے ایسی تحقیق کی کہ وہ مشکل حل ہو جائے۔ شیروانی صاحب نے حیران ہو کر بے ساختہ فرمایا کہ حضرت بات بالکل صاف ہوگئی ۱۳۴۸ھ کا واقعہ ہے کشمیر سے واپسی پر حضرت لاہور ایک دوروز کے لیے اترے آسٹریلیا بلڈنگ میں قیام تھا۔ میزبان نے ڈاکٹر اقبال مرحوم کو بھی دعوت دی۔ ڈاکٹر صاحب کے سامنے حضرت شاہ صاحب نے بہت سے علمی جواہرات بیان فرمائے۔ ان میں ایک موضوع یہ تھا کہ امت میں سائنس وطبعیات میں جو حیرت انگیز ترقیاں ہوئی ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کے معجزات میں ان کی نظیریں موجود ہیں اور انبیاء کرام کے معجزات میں یہ چیزیں قدرت نے اس لیے ظاہر کرائیں کہ یہ آئندہ امت کی ترقیات کے لیے تمہید ہوں اور فرمایا کہ ''ضرب الخاتم'' میں اسی کی طرف میں نے ارشاد فرمایا ہے راقم الحروف نے حضرت کی ایماء پر یاد سے وہ شعر سنائے جن میں ایک شعر یہ تھا:

و قد قیل ان المعجزات تقدم		یما یر تقی فیه الخلیقة فی مدی

میں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم بے حد محظوظ ہوتے رہے۔

بارہا یہ دیکھا گیا ہے کہ کسی مصنف نے بقصد تقریظ لکھوانے کے لیے کوئی کتاب حضرت کے سامنے پیش کی اور ظاہر ہے کہ کسی اہم موضوع پر کوئی محقق سنجیدہ اہل قلم یا معیاری مصنف علمی کتب خانوں کی اس فروانی میں کیا کسر باقی رکھے گا۔ لیکن دیکھا یہ گیا کہ حضرت سرسری نظر میں اہم ترین اصلاحات فرما کر بیش قیمت اضافہ بھی فرمادیا کرتے تھے جس سے مصنف حیرت میں پڑ جاتا تھا۔ افسوس کہ میں اس مختصر مقالے میں اس کے نظائر پیش نہیں کرسکتا۔ راقم الحروف کی کتاب ''نفحۃ العنبر'' میں اس کی کچھ مثالیں ملیں گی جو امام العصر کی حیات کے چند صفحے اب سے اٹھارہ بیس برس قبل راقم کے قلم سے بطور نقش اول نکل چکے ہیں اور اس حیرت انگیز کمال پر یہ کمال کہ جب تک کوئی شخص خود مسئلہ نہ دریافت کرے اپنی طرف سے کبھی سبقت نہ فرماتے تھے۔ درحقیقت اس حیرت ناک علمی تجربہ کے ساتھ یہ قلہ وسکون اور علم کے اس متلاطم سمندر کے ساتھ یہ خاموشی امام العصر کی مستقل کرامت ہے۔

مخدوم ومحترم مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مرحوم کا ایک بلیغ جملہ اس حقیقت کے چہرے سے پوری نقاب کشائی کرتا ہے، فرماتے ہیں:

مرحوم کی مثال ایک ایسے سمندر کی ہے جس کی اوپر کی سطح ساکن ہو اور اندر کی گہرائیاں گراں قدر موتیوں سے معمور ہوں (معارف غالباً جون ۱۹۳۳ء) غرضیکہ حضرت امام العصر رحمہ اللہ نے باوجود اس محیر العقول جامعیت، تبحر، کثرت معلومات وسعت مطالعہ، حیرت ناک استحضار وقوت حفظ کے شوق سے کبھی تالیف وتصنیف کا ارادہ نہیں فرمایا اور امت کے دل میں یہ تڑپ رہی ہے کہ کاش کسی اہم کتاب حدیث پر کوئی خدمت یادگار چھوڑ جاتے۔

حضرت مولانا بدر عالم صاحب نے ایک دفعہ عرض کیا کہ اگر جامع ترمذی وغیرہ پر کوئی شرح تالیف فرمادیتے تو پس ماندگان کے لیے سرمایہ ہوتا۔ غصہ میں آکر فرمانے لگے کہ زندگی میں نبی کریم ﷺ کی احادیث کو پڑھا کر پیٹ پالا۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ مرنے کے بعد میری حدیث کی خدمت بکتی رہے ہاں دینی اور کچھ علمی شدید تقاضوں کی وجہ سے چند رسائل یادگار چھوڑ گئے۔ اس طرح اللہ تعالی کو منظور تھا کہ علمی دنیا کچھ ان کی علمی تحقیقات وخصوصیات سے مستفید رہے۔ نیز ان کے تلامذہ واصحاب کی وساطت سے بھی اچھا خاصا ان کے علمی کمالات کا ذخیرہ امت کے ہاتھ

آیا۔اس طرح یہ محقق یگانہ عصر حاضر جامع الکمالات امام دنیا میں علم کا آفتاب و ماہتاب بن کر چمکا۔میرے ناقص علم میں غیر منقسم ہندوستان کی سرزمین میں جامعیت وتبحر کے اعتبار سے ایک حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی اور ان کے بعد حضرت امام العصر کشمیری کی نظیر نہیں ملے گی۔ ہندوستان کے غیر مقلد حضرات کی چیرہ دستیوں سے تنگ آکر بھی چند رسائل کی تالیف کی نوبت آئی ۔جن میں ''فاتحہ خلف الامام''۔''رفع یدین''مسئلہ''وتر''زیر بحث آئے ہیں۔ضمناً اور بہت سے مسائل آگئے ہیں۔فتنہ قادیانیت کی تردید کے سلسلہ میں چند تالیفات فرما چکے ہیں۔جن میں امت محمدیہ کے قطعی عقیدت''ختم نبوت'' کی تحقیق بھی آگئی ہے جو دین اسلام کا مرکزی نقطہ ہے۔ اس طرح کفر وایمان کا مدار جن امور پر ہے اس کی تحقیق واضح طور سے ہوگئی۔حیات مسیح علیہ السلام کے عقیدے کی تفصیلات بھی آگئی ہیں۔اس طرح علم کلام کے چند مشکل ترین مسائل کا فیصلہ بھی فرما چکے ہیں۔

حضرت امام العصر کی تالیفی خصوصیات:

''فیض الباری'' کے مقدمہ ص ۱۴۱ پر راقم نے لکھا تھا:

و منها انه كان عنى بحل المشكلات اكثر منه بتقرير الابحاث و تكرير الالفاظ و منها انه كان يهمه اكثار المادة فى الباب دون الاكثار فى بيانها و ايضا حها...... ثم ان هذا الايجاز فى اللفظ و الغزارة فى المادة اصبح له و ابا فى تدريسه و تاليفه و كان كما قال على رضى الله عنه ما رأيت بليغاً قط الاوله فى القول ايجاز و فى المعانى اطالة حكاه ابن الاثير الاديب (فى المثل السائر) و كان رايه

منجملہ حضرت شیخ کی خصوصیات میں سے یہ ہے کہ زیادہ تر اہتمام مشکلات کے حل کرنے کا فرماتے تھے۔بحثوں کو پھیلانے اور الفاظ بار بار استعمال کرنے پر زیادہ توجہ نہیں فرماتے تھے۔ نیز یہ کوشش فرماتاے تھے کہ موضوع کے متعلق مادہ زیادہ پیش کیا جائے اس کی توضیح و تشریح کے زیادہ درپے نہیں ہوتے تھے لفظوں میں اختصار اور معانی میں کثرت ان کی طبیعت و عادت بن گئی تھی۔خواہ تدریس میں ہو یا تصنیف و تالیف میں۔حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے جب کسی بلیغ کو دیکھا تو یہ دیکھا کہ الفاظ کے

ماكشف عنه ابن النديم فی الفهرست. النفوس (اطال الله بقاءک) تشرئب الی النتائج دون المقدمات و ترتاح الی الغرض المقصود دون التطویل فی العبارات و بلغنی ان حکیم الامة الشیخ التھانوی یقول. ان جملة واحدة من کلام الشیخ ربما تحتاج فی شرحھا و ایضاحھا الی تالیف رسالة.

اختصار کے ساتھ معانی میں تفصیل کرتا ہے ابن ندیم کتاب الفہرست میں لکھتے ہیں۔ طبیعتیں نتائج کی منتظر رہتی ہیں نہ مقدمات کی اور مقاصد سے خوش ہوتی ہیں نہ صرف عبارت کی طوالت سے مجھے پہنچا ہے کہ حضرت حکیم الامۃ مولانا تھانوی فرمایا کرتے کہ بسا اوقات حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے ایک جملہ کی تشریح میں ایک رسالہ کی ضرورت پڑتی ہے۔

یتیمة البیان مقدمه مشکلات القرآن ص۸۳ میں اور نفحۃ العنبر ص۱۰۵ پر راقم الحروف نے حضرت امام العصر کی تالیفی خصوصیات کو وضاحت و تفصیل سے بیان کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے:

جامعیت ودقت نظر وسرعت انتقال ذہنی و کثرت آمد کی بناء پر طبیعت اختصار کی عادت بن گئی تھی۔ معلومات کی فراوانی کی وجہ سے ضمنی مضامین کثرت سے بیان فرمایا کرتے تھے۔ حدیث کے لطائف میں جب علم عربیت و بلاغت کے نکات کا بیان شروع ہو جاتا تھا تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ علم عربیت کی تحقیقات ہی شاید کتاب کے اصلی موضوع ہیں۔ بعید ترین وعمدہ ترین مآخذ سے وہ نقول پیش فرمایا کرتے جن سے محققانہ شروح حدیث کا دامن بھی خالی ہوتا تھا۔ افسوس کہ اختصار کی وجہ سے میں اس کی مثالیں پیش نہیں کرسکتا۔

اس لیے عام نگاہیں ان کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکتی تھیں اور بہ مشکل عام طبیعتیں لذت اندوز ہوتی تھیں۔ حضرت کے مختصر سے مختصر رسالے کے لیے بھی سارے علوم سے نہ صرف مناسبت بلکہ مہارت ضروری ہے ان تصانیف کی صحیح قدردانی وہی عالم کرسکتا ہے کہ کسی موضوع میں ان کو مشکلات پیش آئی ہوں اور پورے متعلقات کی چھان بین کر چکا ہو اور تشفی نہ ہوتی ہو۔ پھر حضرت امام العصر کی تالیف کے غور سے مطالعہ کی توفیق ہو اس وقت قدرشناسی و قدردانی کی نوبت آئے گی اور حقائق مطلوبہ کے چہرے سے پردے ہٹتے چلے جائیں گے۔ خالی ذہن غیر مبتلا شخص جس کو کبھی کسی مشکل کی خلش ہی پیش نہ آئی۔ سطحی مضامین وشگفتہ عبارت سے مانوس ہو وہ کبھی قدر نہیں کرسکتا۔

حضرت استاذ محترم مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مرحوم فرماتے تھے کہ حضرت شاہ صاحب کی کتاب ''کشف الستر عن صلاۃ الوتر'' کی قدر اس وقت ہوئی کہ اس مسئلے پر جتنا ذخیرہ حدیث کا مل سکا سب کا مطالعہ کیا پھر رسالہ مذکورہ کو اول سے آخر تک بار بار پڑھا اس کی صحیح قدر ہوئی اب میں اس مختصر تمہیدی مضمون کو امام مسروق بن الاجدع المتوفی ۶۳ھ کے ایک تاریخی کلام پر ختم کرتا ہوں جس کو امام تاریخ ابن سعد نے اپنی کتاب ''الطبقات'' میں ذکر کیا ہے طبقات ابن سعد (جلد۲ صفحہ۱۱)

باسناد صحیح مسروق سے روایت ہے مسروق کوفہ کے کبار تابعین میں سے ہیں۔ مخضرم ہیں یعنی عہد نبوت کو پا چکے ہیں فرماتے ہیں:

لقد جالست اصحاب محمد ﷺ فوجد تهم كالإخاذ فالاخاذ يروى الرجل ، و الاخاذ يروى الرجلين، و الاخاذ يروى العشرة و الاخاذ يروى المائة و الاخاذ لو نزل به اهل الارض لاصدرهم فوجدت عبد الله بن مسعود من ذلك الاخاذ	نبی کریم ﷺ کے صحابۂ کرام کی مثال تالابوں و حوضوں جیسی ہے۔ یعنی چھوٹا و بڑا کوئی تالاب ایک آدمی کی سیرابی کے لیے کافی ہوتا ہے کوئی دو کے لیے کوئی دس کے لیے اور بعض ایسے تالاب ہیں اگر روئے زمین والے سب پینے کے لیے آئیں تو سب سیر ہو کر جائیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کی مثال اسی تالاب کی ہے۔

راقم الحروف کہتا ہے کہ علماء امت کی مثال بھی یہی ہے اور حضرت امام العصر شاہ صاحب کی مثال عبداللہ بن مسعود کی ہے کہ ان کا وجود با مسعو پوری امت کی سیرابی کے لیے کافی تھا۔

اب ان تصانیف کی فہرست پیش کرتا ہوں جو حضرت اپنے قلم حقیقت رقم سے تالیف فرما چکے ہیں۔

امام العصر کی تصانیف:

عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسی علیہ السلام۔

یہ کتاب ۲۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ عقیدۂ حیات مسیح علیہ السلام کے بارے میں قرآن کریم کی کیا ہدایات ہیں۔ اس کی تفصیل ہے اس میں احادیث کا استقصاء واستیفاء نہیں کیا گیا ہے بقدر ضرورت ضمناً احادیث کا ذکر ہے اس لیے اس کا دوسرا نام ہے۔ حیاۃ المسیح بمتن القرآن و الحديث الصحيح ضمنی مسائل کی تحقیقات کئی آ گئی ہیں۔

عقیدہ حدوث عالم۔ عقیدہ ختم نبوت کنایہ حقیقت ہے یا مجازا ذوالقرنین و یاجوج

ماجوج کی تحقیق۔ سدذی القرنین کی تعیین وغیرہ۔ حضرت شیخ عثمانی مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ یہ کتاب حضرت شاہ صاحب کی سب کتابوں میں واضح ومفصل وشگفتہ ہے۔

۲- تحیة الاسلام فی حیاة عیسی علیه السلام

یہ کتاب ۱۵۰ صفحات کی ہے 'عقیدۃ الاسلام'' کی تعلیقات اور اس پر اضافات ہیں ادب وبلاغت کی عجیب وغریب ضمنی تحقیقات آگئی ہیں۔

۳- التصریح بما تواتر فی نزول المسیح

نزول مسیح علیہ السلام کے متعلق احادیث وآثار صحابہ کو اس میں بہت تفتیش ودیدہ ریزی سے جمع کیا گیا ہے جن کی تعداد تقریباً سوتک پہنچ جاتی ہے مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کا اس پر ایک نفیس مقدمہ بھی ہے۔

۴- اکفار الملحدین فی ضروریات الدین

۱۲۸ صفحہ کا ایک عجیب وغریب رسالہ ہے۔ جس میں کفر وایمان کی اصل حقیقت پر روشنی ڈالی گئی اور اصولی طور پر بحث کی گئی ہے کہ مدار ایمان کیا کیا امور ہیں اور کن عقائد واعمال کے انکار سے کفر لازم ہے اور کسی قسم کے عقائد میں تاویل کرنا بھی موجب کفر ہے۔

اسی موضوع پر امت میں سب سے پہلے امام غزالی نے قلم اٹھایا تھا ''فیصل التفرقہ بین الاسلام والزندقہ'' ان کا رسالہ مصر وہندوستان میں عرصہ ہوا کہ شائع ہو چکا ہے۔ اس رسالہ کی عمدہ تحقیقات حضرت شیخ نے چند سطروں میں نقل فرمائی ہیں۔ عصر حاضر میں یہ ایک اہم ترین دینی خدمت تھی۔ وہ حضرت نے پوری فرمادی۔ اس پر سارے علماء دیوبند کی رائیں اس لیے لکھوادی ہیں تاکہ اہل حق جماعت میں اس اہم ترین مسئلہ میں کوئی اختلاف باقی نہ رہے۔

۵-خاتم النبیین

یہ عقیدہ ''ختم نبوت'' میں عجیب رسالہ ہے جو ۶۲ صفحات پر پھیل گیا ہے فارسی زبان میں ہے لیکن دقیق، حضرت کا خاص اسلوب علمی کمالات اور وہبی علوم کے نمونے پورے طور پر جلوہ آرا ہیں۔

حضرت مولانا سید سلیمان صاحب نے بھی ایک دفعہ ایک مکتوب میں تحریر فرمایا تھا کہ بہت دقیق ہے عام لوگ نہیں سمجھ سکتے۔

۶-فصل الخطاب فی مسئلة ام الکتاب

مسئلہ ''فاتحہ خلف الامام'' جو عہد صحابہ سے لے کر آج تک معرکۃ الآراء موضوع رہا ہے۔ اس پر ۱۰۶ صفحات کا محققانہ رسالہ ہے۔ حدیث عبادہ بروایت محمد بن اسحاق کی عجیب وغریب تحقیق کی گئی۔ بڑی تدقیق کے ساتھ اس اہم موضوع کا حق ادا کر دیا گیا ہے۔ لفظ ؟؟؟ کی تحقیق میں ۱۲-۱۳ صفحات پر مشتمل دقیق ترین مضمون آگیا ہے۔ یہ مضمون چونکہ عام دسترس سے بالکل باہر تھا راقم الحروف نے اپنی کتاب معارف السنن شرح ترمذی (مخطوط) میں اس کی جدید اسلوب عصری سے تحلیل تشریح کی ہے اور شگفتہ عربی میں اس کی تسہیل کی کوشش کی ہے۔

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مرحوم کوڈابھیل میں جب یہ مضمون سنایا نہایت محظوظ ہوئے اور بیساختہ فرمایا کہ حق تعالی جزاء خیر عطا فرمائے کہ اس مشکل ترین دقیق وغامض مضمون کی ایسی افصاح کی کہ شاید مقدور میں اس سے زیادہ ممکن نہیں ہے۔

۷-خاتمة الخطاب فی فاتحة الکتاب

مسئلہ ''فاتحہ خلف الامام'' پر فارسی زبان میں لطیف رسالہ ہے بلا مراجعت کتاب دو روز میں محرم ۱۳۲۰ھ میں تالیف فرمایا ہے مسئلہ پر جدید انداز میں استدلال ہے۔

حضرت مولانا شیخ الہندؒ کی اس پر تقریظ بھی ہے۔ حضرت شیخ نے دقت نظر کی خوب داد دی ہے۔

۸-نیل الفرقدین فی مسئلة رفع الیدین

۱۴۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ مسئلہ خلافیۂ نماز میں رکوع سے پہلے اور بعد میں ہاتھوں کو اٹھانے کے موضوع پر نہایت عجیب انداز میں تحقیق فرمائی ہے اور نہایت انصاف سے محققانہ انداز میں یہ ثابت فرمایا ہے کہ مسئلہ میں اختلاف عہد صحابہ سے ہے اور اس میں اولویت کا اختلاف ہے جائز ناجائز کا اختلاف نہیں۔ ضمنی طور پر بہت نفیس مباحث آگئے ہیں۔

۹-بسط الیدین لنیل الفرقدین

سابق الذکر موضوع پر ۶۴ صفحہ کا رسالہ ہے یہ رسالہ سابق نیل الفرقدین کا تکملہ ہے اس موضوع پر قدماء محدثین سے لے کر متاخرین اور عصر حاضر تک بہت کچھ خامہ فرسائی ہو چکی ہے اس پائے مال موضوع پر ایسے محققانہ اسلوب میں جدید استدلالات دقیق استنباطات پیش کرنا یہ

حضرت شاہ صاحب ہی کا حصہ ہے۔ الشیخ الامام محمد زاہد الکوثری اپنی کتاب ''تانیب الخطیب فیما ساقہ لی ترجمہ ابی حنیفہ من الاکاذیب ص ۱۸۴ میں رقم طراز ہیں:

و هذا البحث ای رفع الیدین طویل الذیل الفت فیه کتب خاصة من الجانبین و من احسن ما الف فی هذا الباب نیل الفرقدین و بسط الیدین کلاهما لمولانا العلامة الحبر البحر محمد انورشاه الکشمیری وهو جمع فی کتابیه اللباب فشفی و کفی	رفع الیدین کے موضوع پر جانبین سے مخصوص کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن اس موضوع پر بہترین کتابیں علامہ حبر و بحر مولانا محمد انورشاہ صاحب کشمیری کی دو کتابیں ہیں۔ نیل الفرقدین وبسط الیدین جن میں سارا لب لباب آگیا ہے اور شافی وکافی ہے

درحقیقت صحیح قدردانی ایسے محققین ہی کر سکتے ہیں۔

۱۰- کشف الستر عن صلاة الوتر

مسئلہ ''وتر'' کے بارے میں امت میں جو اختلافات چلے آئے ہیں، کل خلافیات سولہ سترہ تک پہنچ جاتے ہیں ان میں جو مشکل ترین وجوہ ہیں ان کی ایسی تحقیق و فیصلہ کن تدقیق فرمائی ہے کہ کسی منصف مزاج کو مجال انکار باقی نہیں رہتا رسالہ ۹۸ صفحوں میں تمام ہوا۔ دوسرے ایڈیشن میں بمقدار ایک ثلث تعلیقات کا اضافہ فرمایا ہے مسئلہ آمین بالجہر، وضع الیدین علی الصدور وغیرہ مسائل کی تشفی کن تحقیق فرمائی گئی ہے۔ شروع میں خطبہ کے بعد ایک فصیح و بلیغ عربی کا قصیدہ جو نہایت ہی موثر اور رقت انگیز ہے ہر حیثیت سے قابل دید ہے۔

۱۱- ضرب الخاتم علی حدوث العالم

''حدوث عالم''، علم کلام و فلسفہ کا معرکۃ الآراء موضوع ہے متکلمین و فلاسفۂ اسلام نے سیر حاصل بحثیں کی ہیں۔ مستقل رسائل کا موضوع بحث رہا ہے شیخ جلال الدین دوانی نے بھی اس پر ایک رسالہ ''الزوراء'' کے نام سے تصنیف کیا ہے حضرت شیخ رحمۃ اللہ نے اس سنگلاخ وادی میں قدم رکھا ہے اور الہیات وطبیعات اور قدیم وجدید فلسفہ کی رو سے اتنی کثرت سے دلائل و براہین قائم کیے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے اور ''حدوث عالم'' کا مسئلہ نہ صرف یقینی بلکہ بدیہی بن جاتا ہے لیکن افسوس کہ حضرت نے ان براہین و دلائل و شواہد کو چار سو شعر میں

منظوم پیش کیا ہے ظاہر ہے کہ شعر کا دامن تفصیلات سے خالی رہتا ہے لیکن اُس کے ایضاح وحل کے لیے ہزاروں حوالے کتب متعلقہ کے دیدیئے گئے جن میں صدر شیرازی کی ''اسفار اربعہ'' فرید وجدی، دبستانی کے دائرۃ المعارف خصوصیت رکھتی ہیں راقم الحروف نے حضرت کے حکم سے متعلقہ حوالہ جات تقریباً ایک سو صفحات میں بڑی عرق ریزی سے جمع کئے تھے جس سے حضرت بے حد مسرور تھے اور میری اس ناچیز خدمت کو ایک دفعہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے سامنے بہت سراہا تھا۔ فرماتے تھے کہ اصل موضوع تو ''اثبات باری'' تھا۔ لیکن عنوان میں ایک قسم کی شناخت تھی۔ اس لیے ''حدوث عالم'' کا عنوان تجویز کیا اور آخر میں دونوں کا مفاد ایک نکلتا ہے۔

۲امرقاۃ الطارم لحدوث العالم

سابق الذکر موضوع پر ۶۲ صفحات میں رسالہ ہے۔ رسالہ کیا ہے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے اس رسالہ میں ادلہ و براہین کے استقصاء کا ارادہ نہیں فرمایا۔ بلکہ یہ ''ضرب الخاتم'' کے لیے مقدمات وتشریح وتفسیر کا کام دیتا ہے نظائر وشواہد موضوع پر اتنے پیش کیے ہیں کہ عقلی برہان سے پہلے ذوق و وجدان فیصلہ کر لیتا ہے۔ ترکی کے سابق شیخ الاسلام مصطفےٰ صبری جو قاہرہ میں جلاوطنی کے بعد مقیم تھے اور رد مادیین ودہریین میں نہایت ہی متخصص جلیل القدر عالم تھے۔ ترکی و عربی میں اس موضوع پر متعدد کتابیں تالیف فرما چکے تھے۔

۱۳۵۷ھ مطابق ۱۹۳۸ء میں یہ رسالہ ان کو راقم الحروف نے دیا تھا مطالعہ فرمانے کے بعد اتنے متاثر ہوئے اور فرمایا کہ میں نہیں جانتا تھا کہ فلسفہ وکلام کے دقائق کا اس انداز سے سمجھنے والا اب بھی کوئی دنیا میں زندہ ہے اور پھر فرمایا:

انی افضل هذه الزریقات علی جمیع المادة الذاخره فی هذا الموضوع و انی افضلها علی هذه الاسفار الاربعة للصدر الشیرازی یعنی جتنا کچھ آج تک اس موضوع پر لکھا جا چکا ہے اس رسالہ کو اس سب پر ترجیح دیتا ہوں اور اس اسفار اربعہ (جو آپ کے سامنے رکھی ہوئی تھی) اتنی بڑی کتاب پر اس رسالہ کو ترجیح دیتا ہوں۔ وہ اس وقت ''القول الفیصل'' کے نام سے رد دہریین میں ایک مبسوط کتاب تالیف فرما رہے تھے۔ اس میں اس رسالہ سے بہت نقول لیے اور اس کتاب میں اس رسالہ کی بڑی

تعریف کی۔

ایک حصہ اس کا طبع ہو چکا ہے نہ معلوم یہ عبارت اس حصہ میں آ گئی یا نہیں ضمناً اس رسالہ میں کلام وتصوف الٰہیات وطبیعات کے بہت سے حقائق کا فیصلہ فرمایا گیا ہے۔

۱۳-ازالة الرین فی الذب عن قرة العینین

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی مشہور کتاب قرۃ العینین فی تفصیل الشیخین کا حیدر آباد دکن میں کسی شیعی مزاج عالم نے رد لکھا تھا۔ حضرت امام العصر نے شاہ دہلوی کی تائید میں اس کی تردید لکھی۔ نہایت عمدہ کتاب ہے ۹۶ صفحات میں پھیل گئی ہے۔ اس میں قال المولی المؤلف کہہ کر شاہ دہلوی کی عبارت نقل فرماتے ہیں قال المعترض سے تردید کرنے والے کی عبارت اور اقوال سے اس کی تردید فرماتے ہیں اس کتاب کا ایک نسخہ مجھے کشمیر میں ملا تھا ابتداء سے ۸ صفحے غائب ہیں۔ اس لیے نام مجھے نہ معلوم ہو سکا اور سوء اتفاق سے حضرت شیخ سے پوچھنے کی نوبت نہ آئی ''ازالۃ الرین'' میرا تجویز شدہ نام برائے نام ہے

۱۴-سھم الغیب فی کبد اھل الریب

تاریخی نام-**تسی سھم الغیب**"

ہندوستان کی سرزمین جہاں بدقسمتی سے بہت سے بدعات اور عقائد شرکیہ میں سادہ لوح مسلمانوں میں رائج ہو گئے ہیں۔

ایک ان میں سے ''علم غیب'' کا عقیدہ ہے اور سید احمد رضا خاں صاحب بریلوی اور ان کے اتباع نے اس کو علمی رنگ میں پیش کیا اور ایک عرصہ تک ہندوستان یہ میں موضوع بحث رہا ایک شخص بریلوی نے اس میں ایک لکھا اور اہل حق کے مسلک کے خلاف اپنے نامۂ عمل اور نامۂ قرطاس کو سیاہ کیا اور اپنا نام عبدالحمید دہلوی ظاہر کیا۔ حضرت شیخ کا قیام اس زمانہ میں دہلی تھا۔ آپ نے جواب ترکی بہ ترکی عبدالمجید بریلوی کے نام منسوب کر کے اس کا جواب شائع فرمایا۔ رسالہ کے آخر میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور حضرت مولانا شیخ الہند محمود الحسن دیوبندی رحمہما اللہ کے مناقب میں عربی میں ایک قصیدہ ہے رسالہ کی زبان حضرت شیخ کے عام تصنیفی مذاق کے خلاف اردو ہے۔

یہ چودہ تصانیف تو امام العصر...... شاہ صاحب کی وہ ہیں کہ اپنے قلم سے تالیف فرما چکے ہیں۔

امام العصر حضرت شاہ صاحب کی دوسری قسم کی مصنفات:

دوسری قسم کی وہ تصنیفات ہیں کہ آپ کی یادداشتوں سے مرتب کی گئی ہیں۔اس کا ذکر کرنا بھی میرے خیال میں ضروری ہے۔

ا-مشکلات القرآن

قرآن کریم کی جن آیات کریمہ کو مشکل خیال فرمایا تھا۔خواہ وہ اشکال تاریخی اعتبار سے ہو یا کلامی حیثیت سے۔سائنس کی رو سے ہو یا کسی عقلی پہلو سے یا علوم عربیت و بلاغت کی جہت سے ہو ان پر یادداشت مرتب فرمائی تھی۔اگر کہیں اس پر عمدہ بحث کی گئی ہے۔اس کو نقل فرمایا۔یا حوالہ دیا اور نہیں تو خود غور وفکر کے بعد جو حل سانح ہوا تحریر میں لایا گیا یہ یادداشت بشکل مسودات مختلف اوراق میں موجود تھی مجلس علمی ڈابھیل نے مرتب کر کے اسے شائع کیا اور راقم الحروف نے مجلس علمی کی خواہش پر ''یتیمۃ البیان'' کے نام سے ۴۰ صفحہ کا اس کا مبسوط مقدمہ لکھا ہے اصل کتاب ۲۸۷ صفحات پر ختم ہوئی۔قرآنی علوم اور قرآنی معارف کا نہایت بیش قیمت گنجینہ ہے۔اگر جدید اسلوب میں اس کو پھیلایا گیا تو ایک ہزار صفحات میں کہیں جا کر کتاب ختم ہوگی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ قرآن کریم کے متعلق کچھ اور مسودات بھی نکل آئے تھے۔جن کی زیور طبع سے آراستہ ہونے کی نوبت ابھی نہیں آئی۔

۲-خرینۃ الاسرار

یہ ایک رسالہ ہے جس میں کچھ اوراد و ادعیہ کچھ مجربات داز کار وغیرہ جمع کیے گئے ہیں۔یہ سب علامہ دمیری کی کتاب ''حیاۃ الحیوان'' کے اقتباسات ہیں۔کہیں کہیں حضرت شاہ کی طرف سے اضافات بھی ہیں۔ یہ رسالہ حضرت کے قدیمی مسودات جو کشمیر میں تھے ان میں دستیاب ہوا تھا۔مجلس علمی ڈابھیل نے اس نام سے شائع کیا۔

۳-فیض الباری بشرح صحیح البخاری

یہ حضرت شاہ صاحب کے درس صحیح بخاری کی املائی شرح ہے۔جس کو حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی مہاجر مدینہ نے کئی سال کی محنت وعرق ریزی کے بعد فصیح و بلیغ عربی زبان میں مرتب کیا ہے۔ یہ حضرت امام العصر کے علوم و کمالات کی سچی تصویر پیش کرتی ہے جہاں حافظ شیخ

الاسلام بدرالدین عینی اور قاضی القضاۃ حافظ ابن حجر عسقلانی جیسے بلند پایہ محقق شارحین عاجز آ گئے ہیں۔ وہاں شیخ کے خصائص وکمالات جلوہ آرا نظر آئیں گے۔ زیادہ تر اعتنا انہی معارف حدیث کا کیا گیا۔ جہاں شارحین ساکت نظر آتے ہیں حضرت شیخ کے آخری عمر کے مجرب علوم واذواق خصوصی احساسات وعلمی خصوصیات دقت نظر وتحقیقی معیار کے نمونے اہل علم ویاران نکتہ داں کے لیے صلائے عام دے رہے ہیں۔ یہ چار ضخیم جلد کا بحر بیکراں مصر میں آب وتاب سے شائع ہوا ہے۔ قرآن و حدیث فلسفہ وکلام ومعانی وبلاغت وغیرہ کے نہایت بیش بہا ابحاث سے مالا مال ہے۔ اس پر راقم الحروف اور حضرت جامع ومرتب کے قلم سے دو مبسوط مقدمے ہیں ۸۰ صفحات پر مشتمل ہیں، عام عبارت نہایت شگفتہ وسلیس ہے۔ بعض بعض مقامات میں خاصی ادبی لطافت ہے۔

۴-العرف الشذی بشرح جامع الترمذی

یہ حضرت شاہ صاحب کی درس جامع ترمذی کی املائی شرح ہے جس کو جناب مولانا محمد چراغ صاحب ساکن ضلع گجرات نے بوقت درس قلم بند کیا ہے اور زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہے اورا س کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہوا ہے جامع ترمذی کے مشکلات احادیث احکام پر محققانہ کلام ہر موضوع پر عمدہ ترین کبار امت کے نقول اور حضرت کی خصوصی تحقیقات کا ذخیرہ ہے۔ طلبہ حدیث اور اساتذۂ حدیث پر عموماً اور جامع ترمذی کے پڑھانے والوں پر خصوصاً اس کتاب کا بڑا احسان ہے۔

۵-انوار المحمود فی شرح سنن ابی داؤد

یہ سنن ابی داؤد کے درس کی املائی تقریر وشرح ہے جس کو مولانا محمد صدیق صاحب نجیب آبادی مرحوم نے جمع کر کے شائع کیا ہے کل دو جلدوں میں ہے مرتب جامع نے بہت سی کتابوں کی اصلی نقول کو مراجعت کر کے لفظ بلفظ درج کر دیا ہے کتاب کے تسمیہ میں حضرت شاہ صاحب اور ان کے شیخ حضرت شیخ الہند کے نام کی تلمیح کی گئی ہے۔

۶-صحیح مسلم کی املائی شرح

سنا ہے کہ ہمارے محترم دوست فاضل گرامی جناب مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی نے صحیح مسلم کے درس کی تقریر قلم بند فرمائی تھی یہ اب تک نہ طبع ہوئی نہ راقم الحروف کو دیکھنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔

۷-بحاشیہ سنن ابن ماجہ

جناب محترم مولانا سید محمد ادریس صاحب سکروڈوی سے سنا تھا کہ آپ نے سنن ابن ماجہ پر کتاب کے حواشی و ہوامش پر تعلیقات اپنے قلم سے لکھی تھیں۔ راقم الحروف کو اس کے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

یوں تو حضرت نے جن کتابوں پر تعلیقات لکھی ہیں۔ اگر استقصاء کیا جائے تو متعدد کتابیں نکل آئیں گی۔

الاشباہ والنظائر'' جو ابن نجیم کی فقہ میں مشہور کتاب ہے۔ اس پر تعلیقات حضرت کے قلم سے خود میں نے کشمیر میں دیکھی ہے۔

یہ کل اکتیس کتابیں ہوئیں جن سے حضرت امام العصر کے کمالات کے کچھ پہلو نمایاں ہو سکتے ہیں کتاب کی پوری حقیقت اس وقت منکشف ہوتی ہے کہ کتاب کے مضامین یا خصوصیات کا واضح تعارف کراتا اور جن مشکل ابحاث میں حضرت کے کمالات نظر آرہے ہیں۔ ان کی تفصیلات سامنے آتیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ کسی مقالے کے لیے موزوں نہیں تفصیلی تبصرہ اور علوم و معارف کے نمونے پیش کرنے کے لیے ایک مستقل تالیف کی ضرورت ہے۔

راقم الحروف کی کتاب ''نفحۃ العنبر'' میں جو حضرت کی حیات طیبہ کے چند نسخے ہیں۔ اس میں کچھ تفصیلات ناظرین کو ہاتھ آئیں گی۔ تالیفات کے متعلق جو کچھ وہاں لکھا ہے اگر اس کی تشریح ہی کی جائے تو اس مقالہ سے کہیں زیادہ ہوگا۔ اس وقت عجلت وارتجال میں چند سطریں لکھنے کی توفیق ہوئی حضرت امام العصر کے کمالات کا کوئی گوشہ بھی لیا جائے تو تفصیل کے لیے داستان کی ضرورت ہے اور جی چاہتا ہے کہ قلم اپنی جولانیاں دکھلاتا رہے۔

مدحتک جهدی بالذی انت اهله　　　فقصر عما صالح فیک من جهدی

میں نے چاہا کہ جس تعریف کے مستحق ہیں۔ اتنی تعریف کرسکوں لیکن میری کوشش ناکام رہی۔

فما کل مافیه من الخیر قلته　　　ولا کل مافیه یقول الذی بعدی

جو کمالات ان میں ہیں نہ میں کہہ سکا اور نہ میرے بعد آنے والا کہہ سکے گا۔

●○●

میرے سب سے بڑے استاذ

حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ

شیخ الاسلام، سرتاج محدثین، حضرت علامہ محمد انور شاہ صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کی سیرت اور کمالات وخصوصیات پر قلم اُٹھانا آسان نہیں ہے۔ جب کبھی حضرت الاستاد کے متعلق کچھ کہنے کا خیال آتا ہے ابوالطیب متنبی کا یہ شعر یاد آجاتا ہے انہوں نے اپنے ممدوح سیف الدولہ کی تعریف میں کہا تھا۔

مضت الدهور وما اتين بمثله

ولقد اتى فعجزن عن نظرائه

زمانے کی کتنی ہی گردشیں گزر گئیں مگر یہ گردشیں میرے ممدوح جیسا نہ لاسکیں اور اب وہ ممدوح آگیا تو اسکی نظیر پیش کرنے سے عاجز ودرماندہ ہیں۔

عرب کے اس مشہور ومقبول شاعر نے تو اپنے ممدوح کی مدح سرائی میں یقیناً مبالغہ سے کام لیا تھا اور درباری شاعروں کو اس طرح کے مبالغوں سے کام لینا ہی پڑتا ہے لیکن حضرت الاستاد کی ذات والاصفات پر اس کا ایک ایک حرف صادق آتا ہے اور اس میں ذرہ بھر شاعرانہ مبالغہ نہیں/ کاش! شاعر نے یہ شعر حضرت الاستاد کی تعریف میں کہا ہوتا۔

(۲) حضرت الاستاد کی ایک غیر معمولی بلکہ بے مثال خصوصیت یہ ہے کہ وہ محدث ہی

نہیں تھے بڑے بڑے محدثین کو دیکھا گیا ہے کہ وہ اپنے میدان کے شہسوار ہوتے ہیں مگر دوسرے علوم وفنون سے زیادہ مناسبت نہیں رکھتے یا ان سے کم ان میں مہارت نہیں رکھتے۔ مثلاً محدث شہید ابوبکر محمد بن خزیمہ نیشاپوری (م ۳۱۱ھ) کہ علم حدیث کے بحر ذخار تھے انکی صحیح حدیث نادر ترین سرمایہ ہے اور صدیوں کے انتظار واشتیاق کے بعد اب اسکی تین جلدیں شائع ہوئی ہیں مگر اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی نا قابل ہے کہ وہ علم اصول وعقائد سے زیادہ لگاؤ نہیں رکھتے تھے، اسی لئے انکی کتاب ''التوحید'' پر علماء اصول نے تنقیدیں کی ہیں یا ایسے ہی دوسرے بڑے بڑے محدثین گزرے ہیں جو علم فروع وفقہ میں کمزور تھے بعض محدثین کا پایہ علم معقول وفلسفہ میں کمزور تھا/ بعض فن اسماء الرجال کے ذوق نہ تھے/ اس لئے انکی حدیثی تالیفات میں حد درجہ ضعیف احادیث بھی موجود ہیں۔ اس کے برخلاف حضرت الاستاد کی شان یہ تھی کہ وہ اگر ایک طرف جلیل القدر محدث تھے تو دوسری طرف تفسیر، فقہ، اصول فقہ، تصوف/ معانی وبیان، ادب وبلاغت تاریخ وفلسفہ وتاریخ، فلسفہ ومنطق ہیئت قدیم وجدید، وغیرہ سب ہی علوم وفنون میں محققانہ اور ناقدانہ بصیرت رکھتے تھے اسی وجہ سے ان کا درس حدیث تحقیق آثار ومتون حدیث بحث ورجال واجتہاد اور دوسرے علوم وفنون کے مہمات مسائل پر سیر حاصل تبصروں کے باعث جامعیت کا ایک عجیب وغریب نمونہ ہوگیا تھا جن خوش قسمتوں کو حضرت کے درس میں شرکت کی سعادت ملی ہے وہی آپ کے علوم ومعارف کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں اسکو کسی مختصر تحریر میں سمجھنا آسان نہیں ہے۔

(۳) علم حدیث کا تمام تر مدار حفظ متون حدیث ومعرفت رجال حدیث پر ہے اسی لئے حضرت الاستاد ہر حدیث پر کلام کے وقت اس کے تمام طرق ومتون کو جمع فرما کر بحث کیا کرتے تھے اور اس کے ساتھ رجال ورواۃ حدیث کی تحقیق ضروری سمجھتے تھے اور اس بارے میں جن محدثین سے فرو گذاشتیں ہوئی ہیں یا انہوں نے تنگ نظری سے کام لیا ہے ان پر کڑی تنقید فرمایا کرتے تھے۔

دوسری اہم چیز جس پر حضرت زور دیا کرتے تھے، یہ تھی کہ احادیث سے فروعی مسائل استنباط کرتے تھے جن حضرات نے فقہی رائے قائم کر کے حدیث سے تائید لینے کی کوشش کی اسکی بھی سخت تردید کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ حدیث سے فقہ کی طرف آنا چاہئے نہ کہ فقہ سے حدیث کی طرف، اسی اصول پر حضرت بہت سے مسائل میں محدثین وفقہاء پر نقد کیا کرتے تھے، درس بخاری شریف میں اس امر کو بھی خاص طور سے نمایاں فرمایا کرتے تھے کہ امام بخاریؒ نے صرف اپنی فقہی رائے کی موافقت والی حدیثیں جمع کی ہیں۔ دوسری فقہی آراء اور انکی موید احادیث کو چھوڑ دیا

ہے برخلاف اس کے امام ترمذی، ابوداؤداور مسلم وغیرہ نے دوسری آراء کے موافق ومویداحادیث کو بھی درج کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ صحیح بخاری میں نہ صرف حنفیہ بلکہ مالکیہ شافعیہ وحنابلہ کے خلاف بھی کا فی ذخیرہ موجود ہےاوردوسری کتب حدیث میں ہر مسلک کے موافق ومخالف حدیثیں ملتی ہیں۔

(۴)اختلافی مسائل میں وسعت نظر کے ساتھ انتہائی رواداری حضرت مرحوم کی خصوصیت تھی اور حضرت اس امر کی سعی بلیغ فرماتے تھے کہ اختلاف کی نوعیت کوسبک اور ہلکا کر کے سامنے لایا جائے ،اس کی ایک نمایاں مثال رفع یدین کا مسئلہ ہے۔جس پر ہمیشہ سے بحثیں ہوتی رہی ہیں اور بعض فقہاء احناف نے اسکومکروہ لکھا ہے مگر حضرت کی نظر میں یہ سب نادرست اور حد سے تجاوز تھا، آپ نے حافظ ابو بکر جصاص رازی حنفی کی احکام القرآن سے عدم کراہت ثابت کی اور فرمایا کہ اس بارے میں یہ نقل سب سے زیادہ قابل اعتماد ہے، دوسرا حوالہ برہان شرح مواھب الرحمٰن کا دیا کرتے تھے جو فقہ حنفی کی مستند ومفید کتاب ہے اور دوسرے اکابر علماء مذاہب سے بھی یہی تصریحات نقل کرتے کہ اختلاف صرف اوّلیت وافضلیّت میں ہے/ مثلا علامہ ابن عبدالبر مالکی سے اور علامہ ابن تیمیہ وابن القیم حنبلی وغیرہ سے امام بخاری کے رسالہ رفع یدین کا ذکر کر کے فرمایا کرتے تھے کہ انہوں نے اپنی عادت کے مطابق دوسرے نقطۂ نظر کوگرانے کے لئے یہ بھی دعوی کر دیا ہے کہ صحابہ کرامؓ سے ترک رفع ثابت نہیں ہے/ حالانکہ خود انکے تلمیذ رشید امام ترمذی نے ہی اس دعوی کی تغلیط کر دی ہے انہوں نے کہا کہ ترک رفع کے قائل بھی بہت سے اہل علم اصحاب نبی وتابعین تھے اور یہی مسلک سفیان واہل کوفہ کا ہے،

حضرت شاہ صاحبؒ نے اس مسئلہ کی تحقیق فرماتے ہوئے کئی جگہ حافظ ابن حجرؒ کی فرو گذاشتیں بھی پیش کی ہیں/ اس تنقیح کے بعد ترک رفع کی احادیث پر بحث کرتے ہوئے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث جس کو عام محدثین اثر موقوف سے آگے نہیں بڑھنے دیتے تھے/ حضرت الاستاد نے اس کی وہ سند مہیا کی کہ محدثین کو حیرت میں ڈال دیا، ظاہر ہے جس مسئلہ پر امام بخاریؒ، حافظ ابن حجرؒ ایسے ماہرین فن نے پورے جماؤ کے ساتھ تحقیق کا حق ادا کیا اس پر حضرتؒ کی تنقیحات وتحقیقات اور محدثانہ نقد وجرح شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے اور یہی حال اخفاء اور جھر آمین ،قرأت فاتحہ خلف الامام وغیرہ نزاعی مسائل میں تحقیق کا ہے۔

(۵) حضرت الاستادؒ کی عادت مبارک یہ تھی کہ وہ تحقیق و بحث کے وقت اقدار رجال کی بہت رعایت فرماتے تھے مثلا اوپر ہی کے مسئلہ میں آپ نے فقہ حنفی کی مشہور کتب بدائع ،کبیری

وغیرہ کے قول کراہیت رفع یدین کو مرجوح اور محقق جصّاص (م ۳۷۰ھ) کے قول کو راجح قرار دیا اور فرمایا کہ جصّاص چوتھی صدی کے ہیں اور محقق شہیر علامہ کرخی حنفی (م ۳۴۰ھ) کے تلمیذ ہیں/ علامہ کرخی محدث امام طحاوی (م ۳۲۱ھ) کے معاصر تھے لہذا جصّاص کا مرتبہ صاحب بدائع وکبیری سے بلند ہے اگر چہ کبیری سے صاحب بدائع کا مرتبہ بہت بلند ہے/ ایسے ہی شمس الائمہ حلوانی (م ۴۴۸ھ) کے اقوال کو بعد کے فقہاء صاحب منیہ وشارح حلبی وغیرہ کی تنقیح وتحقیق پر ترجیح دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ شمس الائمہ کا مرتبہ ان حضرات سے بلند ہے۔

تراویح کی بیس رکعتوں کے مؤکدہ ہونے کے بارے میں فقہائے حنفیہ کے بہت سے اقوال منقول ہیں اور ان پر لمبی لمبی بحثیں چھیڑی ہیں/ مگر حضرت شیخ ابن الہمام کی فتح القدیر کے قول کو ترجیح دیتے تھے کہ آٹھ رکعات مؤکدہ باقی بارہ مستحب کے درجہ میں ہیں/ یہ تمام بحثیں تفصیل کی طالب ہیں، میں نے صرف اشارات پر اکتفا کیا ہے/ منشأ یہ ہے کہ حضرت الاستاد پر محققانہ ومحدثانہ رنگ غالب تھا اور اس کے ساتھ وہ محدثین وفقہاء کے مرتبوں اور درجوں کا بھی خاص طور سے لحاظ فرماتے تھے۔

(۶) آپ کا پسندیدہ معمول حدیث کی شرح حدیث سے کرنا تھا، تاویل کے طریقہ کو ناپسند کرتے تھے، چنانچہ حدیث قلتین وغیرہ کی شرح وتحقیق اسی اصول پر فرماتے تھے اور جو تاویلیں دوسری صریح حدیثوں کے خلاف ہوتی تھیں ان کو بے تکلف رد فرمادیتے تھے۔

(۷) حضرت الاستاد کو فتح الباری کے مباحث

علم اصول و عقائد اور مسائل کلام میں بھی حضرت الاستاد کا تبحر بے مثال تھا اس فن میں امام بیہقیؒ کی کتاب الاسماء والصّفات بڑے پایہ کی مستند کتاب مانی گئی ہے تاہم اس کے بعض تسامحات پر علامہ کوثریؒ نے حواشی لکھ کر احقاق حق اور دقّت نظر کے کمالات دکھلائے ہیں اسی طرح صحیح بخاری کی کتاب التوحید کے بہت سے موقعوں پر حضرت الاستاد کے افادات بھی تحقیقی شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں/ افسوس ہے کہ حضرتؒ کے درس بخاری شریف کے کلامی افادات پوری طرح قلم بند نہیں ہو سکے پھر بھی ان کا کچھ نمونہ انوار المحمود شرح ابی داؤد میں دیکھا جا سکتا ہے۔

پر مکمل عبور تھا اسی لئے حافظ ابن حجرؒ کی فروگذاشتوں پر بے ڈھڑک تنقید کیا کرتے تھے، اسی کے ساتھ علامہ عینی حنفی کے بعض تعقبات میں شدت اور نوک جھونک بھی پسند نہ تھی، چنانچہ ایک دفعہ عالم خواب میں ان سے ملاقات ہوئی تو اس کا شکوہ کیا جس پر علامہ عینی نے جواب دیا کہ یہ بات ان سے (یعنی حافظ ابن حجر سے) بھی کہہ دو مطلب یہ تھا کہ اول زیادتی ان سے ہوئی ہے مجھے مدافعت کرنی پڑتی ہے۔

(۸) آپ فن اسماء الرجال کے بھی امام تھے اور ناموں کی تصحیح اور عام الفاظ کی تصحیح کا بھی غیر معمولی اہتمام فرماتے تھے مثلاً ابن منیرؒ کی صحت اور فرماتے تھے کہ میں نے بڑے بڑے مؤرخین کو یہ نام غلط پڑھتے سنا ہے وہ منیرؒ کی جگہ منیرؒ پڑھتے تھے۔

(۹) فن حدیث میں علل حدیث کی معرفت بھی نہایت اہم اور ضروری ہے/ بعض محدثین کا حافظہ بہت قوی، اسناد و اسماء الرجال پر عبور، الفاظ حدیث کے فروق پر بھی نظر کامل ہوتی ہے مگر علل حدیث پر انکی نظر گہری نہیں ہوتی اور پوشیدہ علتوں پر انکی گرفت نہیں ہوتی۔ یہ بھی ایک محدث کے لئے بڑا نقص ہے حضرت الاستاد میں خدا کے فضل سے یہ کمی بھی نہیں تھی۔

(۱۰) حضرتؒ فرماتے تھے کہ امام اعظم کے علوم کو امام محمدؒ نے مدوّن کر کے پھیلایا تھا۔ امام طحاوی نے ان علوم کو مدلل اور مبرھن کیا اور میں نے ان دلائل و براہین کے لئے شواہد و مؤیدات جمع کرنے میں اپنے عزیز اوقات صرف کئے ہیں اور اتنا ذخیرہ جمع کر دیا ہے کہ آج تک کسی نے نہیں کیا تھا تین بکس میری یادداشتوں کے اسی پر ہیں۔

(۱۱) علم اصول و عقائد اور مسائل کلام میں بھی حضرت الاستاد کا تبحر بے مثال تھا اس فن میں امام بیہقیؒ کی کتاب الاسماء والصّفات بڑے پایہ کی مستند کتاب مانی گئی ہے تاہم اس کے بعض تسامحات پر علامہ کوثریؒ نے حواشی لکھ کر احقاق حق اور دقّت نظر کے کمالات دکھلائے ہیں اسی طرح صحیح بخاری کی کتاب التوحید کے بہت سے موقعوں پر حضرت الاستاد کے افادات بھی تحقیقی شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں/ افسوس ہے کہ حضرتؒ کے درس بخاری شریف کے کلامی افادات پوری طرح قلم بند نہیں ہو سکے پھر بھی ان کا کچھ نمونہ انوار المحمود شرح ابی داؤد میں دیکھا جا سکتا ہے۔

(۱۲) حضرت الاستاد کی علمی زندگی کا ایک بڑا کارنامہ ہر فن کے مشکل مسائل کا حل کرنا تھا جس کے لئے ہر وقت فکر و جستجو کیا کرتے تھے اسی ذیل میں مشکلات القران بھی آتی تھیں آپ نے عمدہ تفاسیر اور قوی احادیث و آثار کی روشنی میں قرآن مجید کی حل مشکلات کی نشاندہی فرما کر امت مرحومہ پر

احسان عظیم فرمایا ہے اس میں قصۂ ہاروت و ماروت، واقعہ حضرت داؤد علیہ السلام وحقیقت یاجوج وماجوج وغیرہ لائق مطالعہ ہیں۔اور سورہ والنجم میں رویت باری تعالیٰ کا مسئلہ بھی ہے "مشکلات القرآن" شائع ہو چکی ہے جو حضرات تالیفی کام کرتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اکثر شارحین مسائل مشکلہ کا ذکر نہیں کرتے کیونکہ ان کو حل نہیں کر سکے/حضرت الاستاد کا ذوق ہی یہ تھا کہ جن مشکلات کے حل کی طرف دوسروں نے توجہ نہیں کی ان سے ضرور تعرض کریں اور کافی وشافی جوابات مہیا کریں۔

(۱۳) مولوی محمد علی صاحب لاہوری کی تفسیر قرآن اور ترجمۂ بخاری اردو کی تلبیسات پر مطلع ہو کر اپنے شاگردوں سے فرمایا کرتے تھے کہ اردو تحریر کی زیادہ سے زیادہ مشق کریں۔صحیح ترجمہ وتفسیر کے درس کو بھی عام کرنے کا مشورہ دیا کرتے تھے، یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اردو لکھنے کو معیوب سمجھا تھا اب افسوس کرتا ہوں، مولانا آزاد کی تفسیر ترجمان القرآن شائع ہوئی تو بہت خوشی کا اظہار فرمایا اور فرمایا یہ تفسیر انجیل کے طرز پر لکھی گئی ہے اور حضرت شیخ الہندؒ نے ترجمۂ قرآن کے ساتھ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے تفسیری فوائد شائع ہوئے تو آپکی مسرت دیکھنے کے قابل تھی آپ نے ان تفسیری فوائد کی تحریر کے دوران مولانا کی بڑی امداد بھی کی تھی اور برابر مشورے دیا کرتے تھے۔

(۱۴) حضرت الاستاذ فقہ کو اصعب الفنون فرمایا کرتے تھے اور اسکی خوب خوب وضاحت کیا کرتے تھے بعض مرتبہ یہ بھی فرمایا کہ میری ہر فن میں اپنی رائے ہے مگر فقہ میں نہیں۔شیخ ابن ہمام کو اصول فقہ میں اعلیٰ درجہ کا متقن بلکہ امام مانتے تھے لیکن حدیث میں نہیں۔حدیث میں شیخ جمال الدین زیلعی کے زیادہ قائل تھے/حضرت گنگوہیؒ کو فقیہ النفس فرمایا کرتے تھے۔اور بعض خصوصیات میں انکو شامی پر ترجیح دیتے تھے، حنفی فقہ کی مشہور کتاب بدائع الصنائع کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ یہ کتاب فقیہ النفس بنانے والی ہے۔

(۱۵) حضرت الاستاذ کی عادت تھی کہ جس فن کا جو مسئلہ ہوتا اسکی پوری تحقیق فرمایا کرتے تھے۔

(۱۶) شیخ اکبر محی الدین ابن عربی اور علامہ ابن تیمیہ سے یکساں احترام کا تعلق حضرت الاستاذ کی لاجواب خصوصیت تھی۔

(۱۷) حضرت کو علوم ظاہری کے علاوہ علوم باطنی میں بھی کمال حاصل تھا لیکن انتہائی اخفاء کی وجہ سے ان کا یہ کمال ظاہر نہیں ہوتا تھا اس میں دوسری وجوہ کے علاوہ شاید عام مشائخ

طریقت کی یورشوں کا بھی دخل تھا۔

(۱۸) ہیئت قدیم کی نسبت سے ہیئت جدید کو اسلام سے زیادہ قریب سمجھتے تھے اور دونوں پر آپ کو کامل عبور تھا۔

(۱۹) پشاور کے خطبۂ صدارت جمعیۃ علماءِ ہند میں دارالاسلام، دارالحرب اور دارالامن کی تحقیق اپنی انداز کی نرالی تحقیق ہے اور دوسرے ملکی و ملی مسائل پر جو کچھ ارشادات فرمائے ہیں وہ آپکی سیاسی بصیرت پر شاہد عدل ہیں۔

(۲۰) مجتہدانہ نظر رکھنے کے باوجود آپ پختہ حنفی تھے اور کوشش کرتے تھے کہ حنفیہ کے اس مسلک کی دلپذیر وضاحت کریں جو اقرب الی الحدیث ہے۔

ہم عصروں اور رفیقوں کے ساتھ بہترین سلوک کے عادی تھے ایک زمانہ میں مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے ساتھ چند مسائل کا اختلاف پیش آیا تھا جس سے کچھ باھمی رنجش بھی پیدا ھو گئی تھی ان کو مکّہ معظمہ خط لکھ کر معذرت چاھی اور لکھا کہ غلط فھمیوں کے تحت آپ کے خلاف کچھ کہا تھا اسکو معاف کریں۔

(۲۱) ایک دفعہ میرے سامنے ایک بڑے حنبلی عالم سے فرمایا کہ امام اعظمؒ کا اس لئے مقلد نہیں ہوں کہ ان کو سب سے بڑا عالم مانتا ہوں بلکہ اس لئے ہوں کہ انکا مسلک بھی حدیث کے مطابق ہے اور میرے بڑے بھی حنفی تھے۔ حضرت کے زمانۂ صدارت دارالعلوم دیوبند میں ایک مشہور مصری عالم محدث علی حنبلی جو صحیحین کے حافظ تھے مصر سے سورت وراندیر آئے پھر دیوبند بھی پہنچے اور حضرت الاستاد کے درس بخاری شریف میں کئی روز تک شرکت کی، اثناء درس میں سوالات بھی کرتے رہے اور حضرت جوابات دیتے رہے اور آپ نے پورا درس ان کی رعایت سے عربی میں ہی دیا تھا، اسکے بعد علامہ مصری نے کہا کہ میں نے عرب ممالک کا سفر کیا اور بڑے بڑے محدثین سے ملا اور انکے ساتھ حدیثی مباحث کئے ہیں خود مصر میں کئی سال حدیث کا درس دیا ہے لیکن میں نے اب تک اس شان کا محدث نہیں دیکھا جو امام بخاری/ حافظ ابن حجر/ علامہ ابن تیمیہ، ابن حزم وشوکانی وغیرہ کے نظریات پر تنقیدی نظر ومحاکمہ کرسکتا ہو اور ان حضرات کی جلالت قدر کا پورا لحاظ رکھ کر بحث وتحقیق کا حق ادا کر سکے/ میں نے ان کو ہر طرح بند کر نے کی سعی کی لیکن انکے استحضار علوم، تیقظ، حفظ واتقان، ذکاوت وحسن نظر سے حیران ہوگیا۔ علامہ

موصوف نے دارالعلوم میں تین ہفتے قیام کیا اور حضرت الاستاد سے برابر استفادہ کرتے رہے اور سند حدیث بھی حاصل کی یہ بھی کہہ دیا کہ اگر میں حلف اُٹھالوں کہ شاہ صاحب امام ابوحنیفہؒ سے زیادہ علم رکھتے ہیں تو مجھے امید ہے کہ حانث نہ ہوں گا حضرت شاہ صاحبؒ کو یہ جملہ کسی نے پہنچایا تو بہت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ ہمیں امام صاحب کے مدارک اجتہاد تک قطعا رسائی نہیں ہے امام اعظمؒ کا اتباع میرے لئے وجہ فخر ہے۔

(۲۲) حضرت الاستادؒ معقول وفلسفہ میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے ابطال جزءِ لایتجزی فلسفہ کا عام مسئلہ ہے تمام فلاسفہ اس کے ابطال پر متفق ہیں/ حضرت نے فلاسفہ کے اس دعوی کی اس وقت دھجیاں اُڑائی تھیں جب کسی نے ایٹمی توانائی کا نام بھی نہیں سنا تھا، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

(۲۳) درس بخاری شریف میں نہ صرف علوم حدیث پر کلام فرماتے تھے بلکہ دوسرے اہم مسائل پر بھی سیر حاصل بحث کرتے تھے اس طرح سے مجموعی اعتبار سے آپ سے قبل کسی کا یہ جامع طریقہ درس نہیں رہا ہے۔

(۲۴) جہاں تک فنون حدیث کا تعلق ہے میرے خیال میں حضرت الاستادؒ کا اتقان او روسعت نظر علامہ شیخ جلال الدین سیوطیؒ سے بڑھ کر تھی۔

(۲۵) حافظ ابن حجر کی کمزوریوں کی نشاندہی درس بخاری میں خاص طور سے فرمایا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ حنفیہ کے موافق احادیث کو اپنے مواقع سے ہٹا کر ادھر اُدھر چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔

(۲۶) عربی کے بے شمار اشعار یاد تھے اور ان سے جا بجا استدلال فرمایا کرتے تھے خود بھی عربی وفارسی کے بلند پایہ شاعر تھے آپکی بہت سی نظمیں اور نعتیں مشہور ومعروف اور مقبول ہیں ضرب الخاتم علی حدوث العالم آپکی فنی حذاقت کی زندہ مثال ہے/ ڈاکٹر علامہ مرحوم نے بھی اس سے استفادہ کیا ہے۔

(۲۷) حضرت الاستادؒ کے علمی وعملی کمالات کی جامعیت کے لئے یہ سند سب سے بڑی ہے کہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ نے آپ ہی کو صدارت دارالعلوم دیوبند کے لئے اپنا قائم مقام اور نائب نامزد کیا تھا اس سے حضرت کے نور باطن کا اندازہ ہوتا ہے۔

(۲۸) حضرت کے ذاتی اوصاف وکمالات بھی بلند پایہ تھے اور ان کمالات واوصاف میں علم کی گہرائی اور گیرائی اور قناعت وخود داری کا بہت بڑا درجہ تھا۔

(۲۹) چہرہ انور پر عجیب طرح کا نور برستا تھا گفتار، رفتار، کردار سب ہی اسوہ نبویؐ کے قالب میں ڈھلے ہوئے تھے۔

(۳۰) تواضع وانکساری اس درجہ تھا کہ اسکی نظیر مشکل سے ملے گی دارالعلوم دیوبند کے تاریخی اختلافات کے زمانہ میں جب حضرت مولانا سید احمدؒ کو حضرت الاستاد کی جگہ لایا گیا تو طلبہ کا بے حد اصرار تھا کہ خانقاہ کی مسجد میں بخاری شریف کا درس دیا کریں لیکن حضرت شاہ صاحبؒ اس کے لئے کسی طرح رضامند نہیں ہوئے/ جب بہت ہی اصرار کیا گیا تو فرمایا کہ حدیث کی کوئی چھوٹی کتاب پڑھادوں گا بخاری نہیں/ اس سے حضرت کے وسعت ظرف اور وسیع القلبی کا بھی اندازہ ہوسکتا ہے۔

(۳۱) حضرت الاستاد کی مجلس غیبت وعیب گوئی سے پاک ہوتی تھی اس بارے میں بہت ہی محتاط تھے سخت سے سخت آزمائش کے موقعہ پر بھی اسی اصول پر قائم رہتے تھے/ بارہا دیکھا گیا ہے مجمع بیٹھا ہوا ہے اور کسی نے کسی کے متعلق کوئی ایسی بات کہی جو حضرت کی رائے میں غیبت کی حدود میں آتی تھی تو حسبنا اللہ کہہ کر مجمع سے اٹھ جاتے تھے۔

(۳۲) اپنے ہم عصروں اور رفیقوں کے ساتھ بہترین سلوک کے عادی تھے ایک زمانہ میں مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے ساتھ چند مسائل کا اختلاف پیش آیا تھا جس سے کچھ باہمی رنجش بھی پیدا ہوگئی تھی ان کو مکہ معظمہ خط لکھ کر معذرت چاہی اور لکھا کہ غلط فہمیوں کے تحت آپ کے خلاف کچھ کہا تھا اسکو معاف کریں۔

(۳۳) حق وصداقت کی راہ سے سرموانحراف پر قادر نہ تھے/ اختلاف دیوبند کے زمانہ میں سخت سے سخت آزمائشوں سے گذرے اور جسمانی وروحانی اذیتیں برداشت کیں مگر کلمۂ حق سے روگردانی نہیں کی۔

(۳۴) اپنے بڑوں کے احترام واکرام میں غیر معمولی اہتمام فرماتے تھے میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب قدس سرہ سے خاص تعلق تھا سفر میں انکو امیر بناتے اور ادب واحترام حد سے زیادہ فرماتے تھے۔

(۳۵) آپ کے ادب واحترام کی شان اکابر تک ہی محدود نہ تھی بلکہ درس حدیث کے لئے دارالحدیث تشریف لے جاتے تھے تو حدیث کے ادب کے خیال سے پہلے وضو فرماتے جس میں خاص طور سے مسواک خوب کرتے تھے اور حالانکہ تمباکو اور پان کی بہت عادت تھی مگر دوران درس میں جو بعض اوقات کئی کئی گھنٹوں کا ہوتا تھا پان نہیں کھاتے تھے۔

(۳۶) میں ہمیشہ آزاد رہا ہوں یہاں تک کہ فقہی مسائل میں بھی آزادی کی طرف مائل تھا اور اگر حضرت الاستاذؒ سے تلمذ واستفادہ کا موقعہ نہ ملتا تو شاید حنفی نہ رہتا، خدا کا شکر ہے کہ انکے فیض صحبت سے اپنے جہل کا یقین ہو گیا، میں نے قلت فرصت و ناسازی طبع کے باوجود کوشش کی کہ حضرتؒ الاستاد کے فضائل و کمالات کا تھوڑا سا عکس پیش کر دوں مگر ظاہر ہے کہ یہ حضرتؒ کے کمالات و خصائص کا عشر عشیر بھی نہیں ہے، ع گل تواں گفت و لے چیدن نیست۔

(۳۷) حضرت الاستاد کی زندگی کا ایک نہایت اہم کارنامہ فتنۂ قادیانیت کا سدّ باب ہے یہ فتنہ آپ کے زمانے میں جس قوت و شدت سے رونما ہوا اور برٹش سامراج کی نصرت و حمایت سے پروان چڑھا پھر بانیٔ فتنہ غلام مرزا احمد قادیانی نے جو دلائل اپنی صداقت کے لئے پیش کئے ان سے علماء وقت کا بھی مرعوب ہو جانا ایسے حالات تھے کہ حق و باطل میں امتیاز دشوار ہو گیا تھا، حضرت نے اس بارے میں اپنی تمام تر توجہات مرکوز کر دیں اور علماء امت کو اس فتنہ کے مہیب خطرات سے آگاہ کیا قادیانی دلائل کے دجل و فریب کو عالم آشکارا کیا، اسلام کے بنیادی عقائد کو مستحکم دلائل کے ساتھ پیش کیا، ختم نبوت اور حیات و نزول مسیح علیہ السلام کو قطعی دلائل عقلیہ و نقلیہ سے ثابت کیا۔ اکفار الملحدین، عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسی علیہ السلام اور التصریح بما تواتر فی نزول المسیح میں قرآن وحدیث کے علاوہ نقول کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع کر دیا کہ رہتی دنیا تک ان مسائل میں اضافہ کی ضرورت پیش نہ آئے گی آپ کی یہ تمام تالیفات اسلامی ممالک میں گئیں جن سے وہاں کے علماء و عوام بھی متاثر و مستفید ہوئے اور الحمد اللہ آج پوری دنیائے اسلام قادیانیت کو خالص زیغ و الحاد تسلیم کرنے پر متحد و متفق ہو گئی ہے۔

مسئلہ ختم نبوت پر آپکی ایک گراں مایہ تالیف خاتم النبیّین ہے جو آپ نے تقریباً عالم نزع میں تالیف فرمائی تھی یہی آپکی آخری علمی و تحقیقی کاوش ہے جو آپ نے فارسی زبان میں خاص طور پر اپنے وطن کشمیر کے لئے فرمائی تھی۔

(۳۸) تحقیق مسائل میں حضرت الاستاذؒ کا معیار نہایت اعلیٰ وارفع تھا، حضرت کسی بھی اہم مسئلہ کی تحقیق کے وقت قرآن وسنت کے بعد ۱۳ سو سال کے اکابر ملّت کے فیصلوں پر نظر ڈالتے تھے اور ان کے مراتب کے لحاظ سے ان کے فیصلوں کی قدر و قیمت قائم کرتے تھے، تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ لٹریچر جو میسر ہو سکتا تھا وہ آپ کے سامنے تھا، ان کے فیصلوں کو صحیح طور سے سمجھنے میں بھی اگر کسی سے کوتاہی ہوئی ہے تو وہ بھی نظر میں تھی اور اس کی نشاندہی فرما کر تصحیح کرتے

تھے یہی تحقیق کا طریقہ ہم نے اپنے قریبی دور کے محقق علامہ کوثری کا بھی دیکھا ہے۔

(۳۹) حضرت الاستاد کے وسعت مطالعہ کی شان بھی عجیب تھی خود فرماتے تھے کہ اب بعض کتابیں نئی طبع ہو کر مصر وغیرہ سے آتی ہیں کئی کئی جلدوں کا مطالعہ کرتا ہوں تو بہت کم کوئی بات حاصل ہوتی ہے تقریباً ساری مطبوعات کا مطالعہ فرما چکے تھے اور اس شان سے کہ ان کے مضامین صفحہ وسطر تک کے حوالہ کے ساتھ دسیوں برس تک آپ کے حافظہ میں موجود رہتے تھے کیونکہ کثرت مطالعہ کے ساتھ حافظہ بھی بے نظیر تھا۔

(۴۰) حضرتؒ کو کسی بھی محقق کی اگر کوئی چیز زیادہ کھٹکتی تھی تو وہ اس کا تفرد ہوتا تھا، حضرتؒ کا نہایت پسندیدہ اور فطری وذوق سلیم یہ تھا کہ جمہور امت اور سلف کے خلاف کوئی بات اختیار نہ کی جائے اور اس معیار سے اگر وہ کسی بھی بڑے شخص کا تفرد ملاحظہ فرماتے تو اسکی نشاندہی اور نقد ضرور فرماتے تھے/ حتی کہ اپنے اساتذہ واکابر کی بھی ایسی کوئی بات ہوئی تو نرم انداز میں اس سے اختلاف کا اظہار ضرور فرمادیا کرتے تھے اگر بہ نظر انصاف دیکھا جائے تو حضرت کی ایک یہی خوبی دوسری سب خوبیوں سے فائق تھی۔

اب اپنی گذارشات کو ان سطروں پر ختم کرتا ہوں۔

محترم شیخ محمد عبداللہ کی ہدایت پر آل جموں وکشمیر مسلم اوقاف ٹرسٹ نے اس سیمینار کا اہتمام کر کے بہت بڑا کام کیا ہے/ حضرت الاستاد علامہ محمد انور شاہؒ کی ذات گرامی کشمیر ہی کے لئے نہیں پورے ملک بلکہ پورے دنیائے اسلام کے لئے مایہ صد ناز ہستی تھی/ ایسا جامع کمالات صدیوں میں پیدا ہوتا ہے/ میرے خیال میں حافظ ابن حجر عسقلانی کے بعد سے اتنا بڑا محدث جس کی نظر حدیث اور اس سے متعلق فنون پر اتنی وسیع اور عمیق ہو نہیں آیا تھا/ علامہ زاہد الکوثری کے بیانات اس سلسلہ میں لائق مطالعہ ہیں/ جیسے جیسے وقت گذرے گا اور علم وتحقیق کے قدم آگے بڑھیں گے اندازہ ہوگا کہ اوقاف اسلامیہ نے یہ کتنی عظیم الشان علمی خدمت کی ہے/ اس مرحلہ پر میں شیخ صاحب اور ان کے رفقاء کار کو مبارکباد دیتا ہوں۔

وادی لولاب کو سلام جس نے ایسے عدیم المثال محدث کی اپنی آغوش میں پرورش کی حضرت الاستادؒ کی کوئی یادگار انکے شایان شان سوپور یا سری نگر یا کسی دوسرے مناسب مقام پر قائم ہونی چاہیے۔ دارالعلوم دیوبند میں بھی حضرت الاستادؒ کے نام پر کوئی ٹھوس یادگار قائم ہونی ضروری ہے۔

علامہ انور شاہ کشمیریؒ

مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصرؒ

خطۂ کشمیر اپنی حسین وگل فروش وادیوں، بہار بہ دامن کوہساروں/ باصرہ نواز مناظر، خوبصورت چمنستانوں، دل نواز لالہ زاروں، اپنی اونچی اونچی سبزہ فروش پہاڑیوں اور اپنی گہری گہری ترائیوں کے اعتبار ہی سے زمین پر قدرت کی کاریگری اور صناعی کا یک بے مثال نمونہ نہیں، نہ صرف یہ کہ وہاں قدم قدم پر لالہ وگل کے خزانے بکھرے پڑے ہیں۔ وہاں کا ہر ذرہ حسن فطرت کا ایک دلآویز شاہکار ہے، زمین کے سینے پر مچل مچل کر چلتے اور بہتے ہوئے سرد و شیریں چشمے، دراز قد اور سڈول جسم کے محبوبوں اور نازنینوں کی طرح تن کر کھڑے ہوئے چنار کے درخت، شراب جوانی کی تندی اور مستی میں بہک بہک کر جھومتے رہنے والے سیب اور خوبانی کے پیڑ/ آسمان کی بلندیوں کو بار بار چھوتی رہنے والی پہاڑیوں، حد نظر تک پھیلی ہوئی سبزہ ولالہ و شگوفوں کی چادریں، قدرتی چشموں، بلند آہنگ آبشاروں اور پہاڑوں کی چوٹیوں سے تیزی کے ساتھ نیچے آتے ہوئے دریاؤں کے کنارے پر بیٹھی ہوئی حسین دوشیزاؤں کی آنکھوں میں چمکتی ہوئی نیک دلی کی معصومیت ان کی پیشانیوں کی چاندنی، زلفوں میں بسی ہوئی نکہت، گیسوئے عنبری میں پڑے ہوئے شکن اور ان کے شباب تازہ و جمال کامل کی مسکراتی ہوئی بہار/ پھولوں اور میوؤں کی فراوانی، موسم کی خوشگواری، زمین کی قوت نموہوا کی تازگی اور لطافت، پانی کی ٹھنڈک اور غذا کی خوش ذائقی اپنا کوئی جواب نہیں رکھتی۔ نہ صرف یہ کہ وہاں سرد و خنک راتوں میں دور دور تک بچھے ہوئے سبزے کے مخملیں فرشوں پر چاند کی روشنی وہ لطف دیتی ہے کہ سبحان اللہ! پہاڑوں کے پیچھے

ڈوبتے ہوئے سورج کا نظارہ ہنستے ہوئے پھولوں، شرمائی ہوئی کلیوں اور شریر وشوخ شگوفوں کے درمیان ایک عجیب کیفیت پیدا کرتا ہے، بلکہ یہ حقیقت ہے کہ لالہ وگل سے معمور اس جنت بے نظیر میں روح زخیزی اور شخصیت آفرینی کی ایک خاص صلاحیت بھی ہے۔

یہ بتانے کی بات نہیں کہ آب وہوا کی خوشگواری، موسم کا اعتدال، مناظر کی رنگارنگی، پھلوں اور میوے کے قسم قسم کے ذائقے صرف انسان کے ظاہری حسن و جمال ہی میں اضافہ نہیں کرتے اور صرف وہ انسان کی تندرستی، اور صحت جسمانی کے لئے ہی کارآمد نہیں بلکہ وہ صحت مند دماغ، تندرست ذہن، علمی مذاق رکھنے والی طبیعتیں/ شاعرانہ مذاق اور صناعی وفنکاری کی صلاحیتوں کو پیدا کرنے، بڑھانے اور نشو ونما دینے میں بھی پوری اعانت کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر کی سرزمین پر حسن فطرت کے آغوش میں علم وکمال نے آنکھ کھولی، قدرتی چشموں کا ٹھنڈا پانی پی کر شاعری اور ادب نے آغوں آغوں کرتے ہوئے صاف بولنا شروع کیا۔ بادصبا کے بار بار آتے ہوئے جھونکھوں سے حکمت ودانائی کے لب بستہ غنچے کھل پڑے اور رنگ برنگ پھولوں، ننھی ننھی کلیوں، چھوٹے پودوں اور مہوشان سیم تن کی رگ جسم سے بھی زیادہ باریک شاخوں کی ہم نشینی سے ذکاوت اور ذہانت بے جلا پائی شعراء وادباء میں غنی کاشمیری، علامہ اقبال، خواجہ عزیز لکھنوی، آغا حشر کاشمیری، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، پنڈت رتن ناتھ سرشار، آنند نارائن ملا، مومن خاں مومن، ایم اسلم، مشہور افسانہ نگار کرشن چندر۔ چراغ حسن حسرت نیاز کاشمیری، ظہیر کاشمیری، میر غلام رسول نازکی، علامہ حسین میر کاشمیری، منشی محمد الدین فوق، ارباب سیاست وحکمت میں پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو۔ ڈاکٹر محمد عالم، ڈاکٹر کچلو/ سر تیج بہادر سپرو، شیخ محمد عبداللہ نواب سر سلیم اللہ اور نواب خواجہ حبیب اللہ آف ڈھاکہ/ مولانا محمد سعید مسعودی، مرحوم بخشی غلام محمد/ مرحوم خواجہ غلام محمد صادق اور سیاسی وزیر اعلیٰ کشمیر سید میر قاسم۔ حضرات اہل علم وکمال میں حضرت سید محمد انور شاہ اور ان کے خاندان کے اور بہت سے علماء نسل اور وطن کے اعتبار سے کمشیر سے قریبی تعلق رکھتے ہیں، آج کی صحبت میں ہم کشمیر کے مایہ ناز فرزند اور عالم اسلام کی مشہور شخصیت، حضرت الاستاذ الامام مولانا سید انور شاہ صاحب کاشمیریؒ کا مختصر تعارف کرا رہے ہیں۔

حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ کا تعلق کشمیر کے ایک قدیم الایام خاندان سے ہے

جس کے مورث اعلیٰ بغداد سے پہلے ملتان آئے اور ملتان سے لاہور پہنچے اور لاہور سے کشمیر کی رنگینیوں اور فطری خوبصورتیوں نے انہیں اپنی طرف کھینچ لیا۔ اور یہ خاندان مستقل حیثیت سے کشمیر میں بس گیا۔ مولانا انور شاہؒ کے خاندان میں علم و فضل اور حکمت و دانائی کے جوہر قدرتی حق کے طور پر تقسیم ہوتے رہے ہیں۔ ان کے آبا و اجداد کی بارہ نسلیں علوم عصریہ میں ممتاز اور عوام و خواص کی عقیدت و محبت کا مرجع بنی رہیں/ علاقہ لولاب کی تحصیل بارہ مولا کا یک خاص گاؤں دودھوان ان کا مقام پیدائش ہے/ ان کے والد مرحوم کا اسم گرامی مولانا محمد معظم شاہ تھا، جن کے ہزاروں مرید اس علاقہ میں موجود ہیں ۱۲۹۲ء میں حضرت مولانا انور شاہ کی پیدائش ہوئی، ذہانت و ذکاوت، علم و فضل ان کے گھر کی دولتیں تھیں، لیکن پانچ سال ہی کی عمر میں بڑی توجہ اور نگرانی کے ساتھ ان کی تعلیم شروع کرائی گئی، آٹھ سال کی عمر میں بڑی توجہ اور نگرانی کے ساتھ ان کی تعلیم شروع کرائی گئی، آٹھ سال کی عمر میں انہوں نے اپنے والد ماجد سے فارسی اور عربی کی کافی تعلیم حاصل کر لی۔ پھر اپنے شوق سے علاقہ ہزارہ کے پہاڑی علاقہ میں چلے گئے اور وہاں وقت کے مشہور و مستند علماء سے استفادہ کیا، ابھی ان کی عمر صرف سولہ سترہ سال کی تھی، لیکن وسعت مطالعہ، علمی تبحر، قوت حافظہ، دقیقہ رسی، نکتہ طرازی اور ذہانت و ذکاوت میں وہ اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ ان کی ابتدائی زندگی کے حالات ہی نے بتا دیا کہ وہ قریبی عرصہ میں ایک مشہور عالم، دینی، رہنما اور مذہبی قائد کی حیثیت سے دور دور تک شہرت پائیں گے۔ ۱۳۰۸ء میں آپ ہزارہ سے نکل کر پنجاب ہوتے ہوئے یوپی کے مشہور دینی مرکز دارالعلوم دیوبند میں تشریف لائے۔ یہاں اس وقت ہندستان کے مشہور زمانہ عالم حضرت مولانا شیخ الہند دیوبندی، حدیث و تفسیر کے اعلیٰ استاذ کی حیثیت سے دارالعلوم میں موجود تھے۔

حضرت مولانا انور شاہؒ نے انہی کے درس میں شرکت فرمائی، طالب علمانہ حیثیت سے صرف دو سال یہاں آپ کا قیام رہا۔ اور دیوبند سے فارغ ہو کر آپ گنگوہ ضلع سہارنپور میں اس وقت کے مشہور شیخ محدث حضرت مولانا رشید احمد صاحب کے یہاں حاضر ہوئے ان سے باطنی علوم کا استفادہ کیا گنگوہ سے آپ دہلی چلے گئے۔ وہاں اپنے رفیق خاص مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی کی شرکت کار سے کشمیری دروازہ کے باہر مدرسہ امینیہ کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا جو آج تک نہایت وسیع پیمانہ پر علمی خدمات میں مصروف ہے، دہلی میں کئی سال کے قیام کے بعد آپ

واپس کشمیر تشریف لے آئے۔ یہاں خواجگان بارہ مولا، خصوصاً خواجہ عبدالصمد مرحوم اور خواجہ امیر الدین کے اصرار پر مدرسہ فیض عام کے نام سے ایک علمی درسگاہ کی داغ بیل ڈالی اور کئی سال تک اس درس گاہ میں حدیث و تفسیر کا درس دیا۔ کشمیر کے اس عرصہ قیام میں آپ چند مشاہیر کے ساتھ حج بیت اللہ اور زیارت نبوی (زادہا اللہ شرفاً و تعظیماً) کے لئے تشریف لے گئے۔ حجاز سے مصر و شام کا سفر اختیار کیا۔ اور ان بلاد اسلامیہ کے تمام علماء و فضلاء سے ملاقاتیں ہوئیں۔

بڑے بڑے کتب خانوں میں ایک عرصہ تک نوادرات علمی کا مطالعہ کرتے رہے حضرت مولانا انور شاہ حیرت انگیز قوت حافظہ کے مالک تھے۔ ان کے متعلق عام طور سے پر یہ مشہور ہے اور حق یہ ہے کہ اس شہرت میں ذرہ برابر بھی کوئی مبالغہ نہیں کہ ضخیم سے ضخیم کتابوں کو وہ صرف ایک مرتبہ مطالعہ فرماتے اور ان کے سارے مضامین، بقید، صفحہ و سطر انہیں برسہا برس تک محفوظ رہتے۔ یہی وجہ ہے کہ علمی تبحر اور وسعت مطالعہ میں وہ اپنے وقت میں بے نظیر انسان اور یگانہ روزگار عالم تسلیم کئے گئے۔ بلاد اسلامیہ کے کتب خانوں سے آپ نے خود فائدہ اٹھایا اور مصنفین اسلام کا گراں بہا علمی ذخیرہ آپ کے سینے میں منتقل ہوگیا/ اس سفر میں جن علماء سے آپ کی ملاقات ہوئی وہ آپ کے علمی کمالات کے گرویدہ ہوگئے۔ اور سب نے انہیں روایات حدیث کی سندات مرحمت فرمائیں/ جن میں انہیں حضرت العلامۃ الجلیل الاستاذ اور حضرت العالم الکبیر کے معزز القاب سے خطاب کیا گیا، ہندستان آئے تو آپ کے استاذ حضرت شیخ الہند اپنی مشہور سیاسی تحریک ''ریشمی خطوط کی سازش'' کے سلسلہ میں حجاز جانے کے لئے تیار تھے اور چاہتے تھے کہ دیوبند میں ان کی علمی ذمہ داریاں حضرت مولانا محمد انور شاہؒ قبول فرمالیں، باوجودیکہ حضرت شیخ الہندؒ صاحب کے دوسرے ممتاز شاگرد مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا سجاد بہاریؒ بھی اس وقت موجود تھے، مگر استاد کی علمی جانشینی کا فخر مولانا انور شاہؒ کو حاصل ہوا اور آپ استاد کی ایماء وارشاد پر ایشیا کی مشہور علمی جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ دیوبند کے امیر الجماعہ مقرر ہوئے۔ کم از کم بیس سال تک آپ نے درالعلوم میں قیام فرمایا، یہاں حدیث و تفسیر اور دوسرے علوم فنون کی انتہائی کتابیں آپ کے زیر درس رہیں۔ آپ علمی حلقوں میں ایک ''چلتا پھرتا کتب خانہ'' کے نام سے مشہور تھے۔ انگریزی داں حضرات علوم عربیہ و دینیہ کے شائق بڑے بڑے علماء و فضلاء کالجوں کے پروفیسر آپ کی خدمت میں حاضر

ہوتے اور ان سے علمی رہنمائی حاصل کرتے۔ آپ کی قوت حافظہ کا یہ عالم تھا کہ کبھی کسی علمی سوال کے جواب میں کتب دیکھ کر جواب دینے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ دیوبند میں آپ کا وجود اسلامی علم و حکمت کی گہرائی اور بیکرانیوں کا ایک حیرت انگریز نمونہ تھا، نہ صرف ہندوستان بلکہ دوسرے ممالک کے اہل علم آپ کے پاس آتے اور گوہر مراد سے اپنا دامن بھر کر لے جاتے تھے۔ ایشیا کے مشہور حکیم و شاعر علامہ اقبال کو حضرت مولانا سید انور شاہ سے نیاز مندانہ خصوصیت حاصل تھی اور اقبال کے اکثر علمی افکار و نظریات علامہ انور شاہ کے فیضان نظر کا کرشمہ تھے۔ علامہ اقبال مولانا انور شاہ کو اپنا روحانی رہنما تسلیم کرتے تھے، مدارس اور یونیورسٹی میں علامہ اقبال نے جو تحریری خطبات دیئے اور اب جو انگریزی اور اردو میں چھپ کر شائع ہو چکے ہیں ان کے شروع میں علامہ اقبال نے اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے تمام دینی علوم میں براہ راست مولانا انور شاہ سے فائدہ اٹھایا ہے۔ علامہ اقبال ہمیشہ مولانا انور شاہ کے سامنے ادب و احترام کے ساتھ بیٹھے تھے، ایک عرصہ تک وہ اس کی کوشش کرتے رہے کہ مولانا انور شاہ کو دیوبند سے لاہور بلالیں اور لاہور میں ایک عظیم الشان اسلامی جامعہ قائم کی جائے/ جس کے شیخ الجامعہ اور استاذ خاص مولانا انور شاہ ہوں۔ مولانا ابوالکلام وقت کے کسی عالم فاضل سے اتنے متاثر نہیں تھے جتنے مولانا انور شاہ سے، بار بار انہوں نے اپنی نجی مجلسوں میں مولانا انور شاہ کی بے نظیر علمی استعداد کا اعتراف کیا، مولانا سید سلیمان ندوی نے مولانا انور شاہ کے انتقال پر ''وفیات'' کے سلسلہ میں اپنے رسالہ معارف میں جو مضمون لکھا تھا اس کا ایک خاص جملہ قریب قریب یوں تھا کہ:۔

وہ علم کے ایک ناپیدا کنار دریا کی حیثیت رکھتے تھے، مگر ایسا دریا جس کی سطح بالکل ساکن ہوا وراس کے اندر موتی و جواہر پٹے پڑے ہوں۔

رئیس الاحرار مولانا محمد علی، مولانا انور شاہ سے خاص عقیدت رکھتے تھے، جب سامنے آتے تو جھک کر ملتے اور ان کی مجلس میں کان لگا کر سنتے علی ہذاالقیاس ڈاکٹر انصاری مرحوم، مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا حسین احمد صاحب مدنی، مولانا اشرف علی صاحب تھانوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولوی عبدالماجد دریابادی۔ مولانا ظفر علی خاں اور بلاداسلامیہ کے علماء میں سید رشید رضا مرحوم، علامہ زاہد کوثری/ مجیب الدین الخطیب، ڈاکٹر طہ حسین وغیرہ آپ کے علمی کمالات کے ثناخواں تھے۔

مصر کے مشہور عالم سید رشید رضا ۱۳۳۰ھ میں دیو بند تشریف لائے یہاں ایک جلسہ میں آپ نے عربی زبان میں مولانا انور شاہ کی تقریر سنی تو فرمایا کہ میں اگر ہندوستان کے سفر میں دیو بند نہ آتا تو ہندستان سے مایوس لوٹتا/ پھر مصر واپس جا کر اپنے مشہور رسالہ ''المنار'' میں مولانا انور شاہ کے علم وفضل پر مستقل مضامین لکھے۔ حضرت مولانا انور شاہ تقریباً ۲۰ سال تک دار العلوم دیو بند میں درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کا کام کرتے رہے، اخیر عمر میں ۶ سال ہندستان کی ایک مشہور اسلامی درس گاہ میں آپ کا قیام رہا یہاں آپ نے ایک علمی ادارہ قائم فرمایا تھا جو اب تک علمی تصانیف کو بہترین طباعت واشاعت کے ساتھ چھاپنے کا کام کر رہا ہے اس ادارہ سے خود حضرت شاہ صاحبؒ اور دوسرے بزرگوں کی نادر الوجود کتابیں چھپ کر مصر وشام اور ٹرکی وعراق تک پہنچ چکی ہیں/ مولانا انور شاہ کے شاگردوں کا حلقہ تقریباً چار ہزار افراد پر مشتمل ہے۔ جن میں مولانا مناظر حسن گیلانی، مولانا بدر عالم میرٹھی، مولانا حفظ الرحمٰن سہواروی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی سابق پرنسل مدرسہ عالیہ کلکتہ، مولانا اعزاز علی ناظم تعلیمات دار العلوم دیو بند، مولانا منظور نعمانی ایڈیٹر رسالہ 'الفرقان' شمس العلماء علامہ تاجو رنجیب آبادی، مولانا محمد یوسف بنوری استاجامعہ ڈابھیل، مولانا محمد میاں صاحب سابق ناظم جمعیۃ علماء ہند، مولانا قاری محمد طیب مہتمم دار العلوم دیو بند، مولانا مفتی محمد شفیع دیو بندی، مولانا محمد ادریس کاندھلوی شارح مشکوۃ شریف، خواجہ عبد الحی فاروقی استاذ جامعہ طبیہ دہلی، قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی، مولانا حامد الانصاری غازی، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی نا ظم ندوۃ المصنفین دہلی، مولانا فخر الدین صاحب صدر جامعہ شاہی مراد آباد، مولانا کریم بخش صاحب صدر شعبۂ عربی گورنمنٹ کالج لاہور، مولانا انوار الحق العلوی پروفیسر اورینٹل کالج لا ہور، مولانا یعقوب الرحمٰن عثمانی لکچرار عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد، حضرت مولانا حضرت محمد مولانا یوسف میر واعظ کشمیر، مولانا میر شاہ صاحب کشمیری، مولانا سید محمد ادریس سکھروڈوی، مولانا محمد صدیق نجیب آبادی، مولانا شاہ عبد القادر رائے پوری، مولانا شائق احمد عثمانی ایڈیٹر ''عصر جدید'' مولانا مفتی محمود احمد نانوتوی، مولانا عبد الوحید صدیقی ایڈیٹر نئی دنیا دہلی، قابل ذکر ہیں۔

حضرت شاہ صاحب کو سیاسیات سے بھی گہرا تعلق تھا، جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس پشاور منعقدہ ۱۳۴۵ھ کی آپ نے صدارت فرمائی اور عالمانہ خطبہ ارشاد فرمایا، جمعیۃ علماء ہند کے آپ

ہمیشہ ہمدرد اور سرپرست رہے/ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حفظ الرحمٰن مولانا عبدالحنان ہزاروی، مولانا غلام غوث سرحدی آپ کے خاص شاگردوں میں سے تھے اور آپ ہی کے ارشاد پر یہ حضرات سیاسیات میں شریک ہوئے۔

تحریک حریت کشمیر سے بھی حضرت ممدوح کو خاص دلچسپی تھی، جب کبھی آپ اپنے وطن کشمیر تشریف لاتے تو اس تحریک آزادی کے علمبرداروں سے اپنی ہمدردی اور وابستگی کا اظہار فرماتے، مولانا محمد سعید صاحب مسعودی سابق ممبر پارلیمنٹ آپ ہی کے خاندان کے ایک ممتاز فرد ہیں اور مولانا محمد سعید مسعودی کے واسطے سے قائد کشمیر شیخ محمد عبداللہ نے بھی ایک دفعہ حضرت مرحوم سے خط و کتابت فرمائی تھی۔

حضرت شاہ صاحب نے کئی سال مرض بواسیر میں مبتلا رہ کر ۳ رصفر ۱۳۵۲ھ مطابق ۱۹۳۳ء کو دیوبند میں انتقال فرمایا، آپ کے انتقال پر سارے ملک میں ماتم کیا گیا، بلاد اسلامیہ کے مذہبی اور دینی مراکز نے بھی آپ وفات کے صدمہ کو محسوس کیا، ملکی اخبارات میں دیر تک آپ کے حالات زندگی اور آپ کے علم وفضل پر تبصرے شائع ہوتے رہے، کشمیر میں آپ کا خاندان ابھی تک موجود ہے حضرت شاہ صاحب عربی وفارسی کے بلند پایہ شاعر بھی تھے/ آپ کا بہت سا کلام شائع ہو چکا ہے۔

عادت وخصلت کے لحاظ سے وہ بہت متقی، دیانتدار، بلند نظر، منکر المزاج اور تنہائی پسند انسان تھے۔ نگارستان کشمیر کے مصنف نے لکھا ہے کہ بے حد قلیل النوم اور قلیل الغذا تھے، ان کی طبیعت کا تحمل، فطری نیکی اور پختہ کردار قابل قدر اور دوسروں کے لئے قابل عمل تھے، بہت سی ریاستوں اور بڑی بڑی انگریزی یونیورسیٹوں نے انھیں بار بار بڑے بڑے مشاہروں پر اپنے یہا ں بلانے کی سرگرم سعی کی مگر انھوں نے کبھی بڑی تنخواہ کا لالچ نہیں کیا۔ نظام حیدرآباد ان کے خاص قدرداں تھے، والی ریاست بھوپال نے انھیں اپنی ریاست میں بلایا مگر یہ حصول منفعت کے لئے کبھی ان ریاستوں میں نہیں گئے اور نہ ان رؤسا کا تقرب پسند کیا۔ کشمیر جنت نظیر کو بجا طور پر یہ فخر ہو سکتا ہے کہ اس دور آخر کا سب سے بڑا محدث، عالم اور فاضل اسکے فردوسی لالہ زاروں اور خوبصور ت مرغزاروں کا ایک تر و تازہ پھول تھا۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی

عہد آفرین شخصیت

مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ

حضرت الاستاذ مولانا محمد انور شاہ الکشمیریؒ اس صدی میں آیۃ من آیات اللہ اور حجۃ من حجج الھیۃ تھے/ اپنے علم وفضل، وسعت مطالعہ/ دقت نظر/ غیر معمولی قوت حافظہ واتقان علم کے باعث عبقری یا GENIUS تھے/ آپ کے اوصاف وکمالات پر ارباب علم ونظر نے بہت کچھ لکھا ہے/ لیکن حق یہ ہے کہ حق اب بھی ادا نہ ہوا، ایک بڑے سے بڑے انسان کی عظمت کا دارومدار اس بات پر ہوتا ہے کہ اس نے کسی عہد جدید کی تخلیق کی یا نہیں اور اگر کی تو کس حد تک ؟ انگریزی میں اس کو HISTORY یا EPOCH MAKING کہتے ہیں، آیئے ہم اسی حیثیت سے شاہ صاحبؒ کی شخصیت کا جایزہ لیں۔

شاہ صاحبؒ کا زمانہ وہ تھا جب کہ غیر منقسم ہندوستان میں بڑے بڑے علماء اور مدارس عربیہ تھے لیکن ان مدارس میں حدیث کی تعلیم اس طرح پر ہوتی تھی گویا حدیث فقہ کے تابع تھی، مدرس کی تقریر زیادہ تر احادیث سے اپنے فقہی مسلک کی تائید اور دوسرے فقہی مسلک کی تردید پر مشتمل ہوتی تھی، نہ اسانید وطرق کا اہتمام ہوتا تھا اور نہ اسماء الرجال کا، علماء کا حال عموماً یہ تھا کہ یک فنی ہوتے تھے، اگر کسی کو حدیث وتفسیر سے اشتغال ہے تو شعر وادب میں زیادہ درخور نہیں، اگر شعر وادب میں کمال حاصل ہے تو منطق وفلسفہ سے بے بہرہ ہیں/ اگر یہ سب کچھ بھی ہے تو فقہ سے مناسبت نہیں اور اگر ہے بھی تو معلومات صرف اپنے فقہی مسلک کے احکام اور ان کے دلائل و

براہین تک محدود ہیں/ دوسرے فقہی مسالک اوران کے مأخذ پر نگاہ نہ ہوتی تھی، مطالعہ درسیات اوران کے شروح وحواشی تک محدود ہوتا تھا مخطوطات کی دنیا ان کی دسترس سے باہر تھی ان کے مطالعہ اور تحقیق وتفحیص کا کوئی ذوق نہ تھا۔

اس عالم میں حضرت الاستاذ العلام مسند درس پر جلوہ افروز ہوئے درس حدیث میں حسب ذیل چند در چند نمایاں تبدیلیاں نمایاں ہوئیں۔

(۱) آپ اسانید وطرق، متون کی صحت کا اور راویوں کے حالات کی تحقیق وتلاش پر بہت زور دیتے تھے/ اوراس کا اتنا اہتمام تھا کہ ناموں کے صحیح تلفظ کا بھی خیال رکھتے تھے/ مثلاً کثیر زبیر ایسے نام ہیں جن کا تلفظ کئی طریقوں سے ہوسکتا ہے حضرت کے پورے ذخیرۂ اسماء الرجال میں یہ معلوم تھا کہ اس کا تلفظ کہاں کیا ہے؟ اور کہاں کیا؟ اپنی تحقیق پر اتنا اعتماد تھا کہ جو کچھ فرماتے تھے پورے حزم ویقین کے ساتھ فرماتے تھے/ چنانچہ زبیر نام کے سینکڑوں راوی ہیں لیکن آپ نے ایک مرتبہ درس بخاری میں فرمایا صرف حدیث ام رفاعہ میں عبدالرحمان بن زَبیر ہے اس کے علاوہ اور جہاں کہیں یہ نام آیا ہے وہاں زبیر ہے نہ کہ زَبیر اسی طرح ایک مرتبہ آپ نے فرمایا فلاں فلاں موقعہ پر کَثیر پڑھنا چاہیئے اور فلاں فلاں جگہ کُثیر اور اتنی جگہ، ظاہر ہے اس درجہ نازک معاملات میں پوری قطعیت اور حزم ویقین کے ساتھ وہی شخص ایک فیصلہ کن بات کہہ سکتا ہے جس نے کمال ژرف نگاری سے احادیث اور اسماء الرجال کے پورے ذخیرہ کو کھنگال ڈالا ہو۔

(۲) اسماء کے صحیح تلفظ کے بعد راویوں کے جرم وتعدیل کا معاملہ آتا ہے اس سلسلہ میں حضرت الاستاذ کا معمول یہ تھا کہ کتب اسماء الرجال میں کسی راوی کی جرم وتعدیل میں جو کچھ لکھا ہوتا تھا صرف اُسی پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ خود اس کے حالات کا سراغ لگا کر اوراس کے محامد و مثالب اوراس کے وجوہ واسباب کا تجزیہ وتحلیل کرکے اس کے متعلق اپنی آزاد رائے قائم کرتے تھے/ چنانچہ ارباب نظر کو معلوم ہے کہ واقدی اور ابن اسحاق دونوں محدثین میں کتنے بدنام ہیں امام شافعی تو اول الذکر کو جھوٹ کی پوٹ "مطیۃ الکذب" کہتے ہیں/ لیکن شاہ صاحبؒ فرماتے تھے کہ واقدی کی عمر زیادہ ہوگئی تھی/ حافظہ کمزور ہوگیا تھا اوراس پر یہ ہوا کہ ان کی بیاض جس میں احادیث درج تھی ضائع ہوگئی/ اس بناء پر اب وہ محض اپنی یادداشت سے جو روایت کرتے تھے اس میں اختلاط اور تلبیس پیدا ہوجاتی تھی پھر فرمایا کہ حدیث میں وہ ثقہ اور متقن نہ ہوں لیکن مغازی میں ان کی امامت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، اس طرح ابن اسحاق کی نسبت آپکی رائے تھی کہ وہ محدثین

کے نزدیک مقبول نہیں ہیں لیکن بحیثیت مؤرخ کے ان کا مرتبہ ومقام مسلم ہے/ اگر کسی کتاب میں نام غلط چھپا ہوتا تھا تو اس کی تصحیح کرتے اور اس پر متنبہ فرماتے تھے چنانچہ تخریج زیلعی میں ایک جگہ راوی کا نام زحمویہ بالزاء المعجمہ چھپ گیا ہے تو آپ نے فرمایا یہ کاتب کا سہو ہے ورنہ اصل نام راء مہملہ کے ساتھ حمویہ ہے۔ العرف الشذی ص ۱۱۵۔

(۳) راویوں کے ناموں کی تصحیح اور ان کے اسباب جرح وتعدیل کی تحقیق کی طرح ایک حدیث جتنے اسانید وطرق سے مروی ہوتی تھیں/ حضرت شاہ صاحب ان سب پر بالاستیعاب الگ الگ کلام کرتے اور ان کا مرتبہ ومقام متعین فرماتے تھے/ یہی حال متون حدیث کا تھا/ ایک متن کے جتنے ٹکڑے ہوتے آپ ان سب کو جمع کرتے اور ایک ہی متن میں الفاظ میں جورد و بدل ہوتا اس کی مکمل نشاندہی کرتے تھے/ اس طرح ایک حدیث چھن چھنا کر سامنے آجاتی تھی اور اب وہ اس قابل ہوجاتی تھی کہ اس سے متعلقہ فقہی مسئلہ کے استنباط واستخراج کے وقت اس کی صحیح پوزیشن متعین کی جاسکے اس سلسلہ میں محدثین وفقہاء سے اگر بھول چوک ہوجاتی تھی تو آپ اس کی طرف بھی اشارہ کرتے جاتے تھے/ چنانچہ آپ کی ترمذی اور بخاری کی درسی تقریریں جن کو آپ کے لائق وفائق تلامذہ نے مرتب ومدون کرکے شائع کردیا ہے اس طرح کی مثالوں سے بھری پڑی ہیں۔

(۴) چونکہ احادیث اس پیغمبر برحق کے ارشادات وفرمودات کا مجموعہ ہیں/ جس نے خود اپنے متعلق فرمایا تھا **اوتیت جوامع الکلم وانا افصح العرب و العجم** اس بنا پر کلام نبوی کو کماحقہ سمجھنے کے لئے عربی لغت، اسکے محاورات وضروب الامثال مختلف اسالیب بیان اور فن معانی وبیان وبلاغت میں درک وادراک وبنوع ومہارت کی ضرورت ہے، حضرت شاہ صاحبؒ کو ان تمام چیزوں کا فطری اور بہت اعلی ذوق تھا/ چنانچہ درس میں آپ ان مسائل پر بھی کثرت سے کلام کرتے تھے اور اس دیدہ وردی اور فنی بصیرت کے ساتھ کہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا سعد الدین تفتازانی یا عبدالقاہر جرجانی زینت مسند درس ہیں۔

(۵) قرآن مجید اور احادیث میں کثرت سے ائمہ قدیمہ اور مختلف تاریخی واقعات وحوادث کا ذکر آیا ہے/ حضرت شاہ صاحبؒ ان پر سے سرسری نہیں گذرے تھے بلکہ اپنی عادت کے مطابق کتب قدیمہ اور قدیم مآخذ کی روشنی میں ان میں سے ایک ایک چیز کی تاریخی وجغرافیائی تحقیق کرتے اور اسے بیان فرماتے تھے/ اسی طرح بخاری میں فلسفہ اور علم کلام کے سینکڑوں مسائل پھیلے ہوئے ہیں، جب وہ آتے تو اس وقت حضرت الاستاذ کی روانی طبع دیدنی ہوتی تھی، معلوم ہوتا تھا،

الشعریؔ اور ابن رشد کی روح قلب انوری انوری میں بول رہی ہے/ حضرت الاستاذ مروجہ اصطلاح میں خطیب یا مقرر نہیں تھے، جو بات بھی کہتے جچی تلی کہتے اور جو مضمون بھی بیان فرماتے اسے ناپ تول کر بیان فرماتے تھے/ اس میں حشو و زوائد نہیں ہوتا تھا/ وہ اعادہ و تکرار کے نقص سے پاک اور سرتاسر مواد اور معلومات سے پر ہوتا تھا، پھر کوئی بات بھی بغیر سند اور تحقیق کے نہیں ہوتی تھی/ زیر بحث و گفتگو موضوع کا ہر جز مدلل اور مبرہن ہوتا تھا یہاں تک کہ درمیان میں موضوع کی خشکی دور کرنے کے لئے آپ کبھی ظرافت یا بذلہ سنجی کا مظاہرہ بھی فرماتے تو اسمیں شعر و ادب یا کسی قصہ اور کہانی کی چاشنی ہوتی تھی، حضرت شاہ صاحب کا کلام صحیح معنے میں اطناب ممل اور ایجاز مخل سے دور قل و دل کا نمونہ ہوتا تھا، جو عین بلاغت ہے، بعض اوقات سوچتا ہوں تو خیال گذرتا ہے کہ حضرت الاستاذ کا یہ مخصوص طرز کلام اس لئے تھا کہ آپ سیرۃً وصورۃً فضایل و شمائل نبی کے پیکر تھے، یہاں تک کہ شمائل ترمذی میں آنحضرت ﷺ کی رفتار کے متعلق مذکور ہے۔ کانما ینحدر من صبب یعنی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا آپ اونچائی پر سے اتر رہے ہیں/ حضرت شاہ صاحبؒ جب اپنے کمرہ سے یا مسجد یا درسگاہ تشریف لاتے تھے تو میں ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہتا تھا کیونکہ مجھے اس رفتار میں طرز خرام نبویؐ کا عکس نظر آتا تھا/ سیرت نبویؐ کے ساتھ اس طبعی مماثلت کا یہ اثر حضرت الاستاد کے طرز کلام میں نظر آتا تھا، آنحضرت ﷺ کی تقریر مختصر مگر To The point ہوتی تھی اور کثرت کلام آپ کو سخت ناپسند تھی ارشاد ہوا: ان ابغضکم الی الثرثارون المنقیھون المتشدقون حضرت شاہ صاحبؒ کا بھی طبعاً اسی پر عمل تھا۔

حضرت شاہ صاحب کی طبیعت بے حد متجسس، متفحص اور تحقیق پسند تھی/ ہر چیز جس سے واسطہ پڑتا اس کی حقیقت و ماہیت کو معلوم کرنے کی کوشش کرتے تھے، ایک مرتبہ کشمیر کے خصی مرغ کا ذکر آ گیا تو اس کی دسیوں قسمیں اور ان کے خواص بیان کر دئے/ کسی پھل یا کسی حیوان کا ذکر آیا اور اس پر فوراً ایک لیکچر دے دیا/ معلوم ہوتا تھا کہ علم النباتات (Botny) اور علم الحیوانات (zoology) جن پر متقدمین عرب کی کافی تصنیفات ہیں وہ بھی مطالعہ سے گذر چکی تھیں / ذہانت و فطانت خداداد کے ساتھ حافظہ اس بلا کا تھا کہ جو کچھ پڑھ لیا یا معلوم کر لیا حافظہ میں جم گیا اور نسیان و ذہول سے محفوظ ہو گیا، اسی بنا پر جتنا بھی علم تھا ہر وقت متحضر تھا طبیعت ذرا ادھر متوجہ ہوئی اور معلوماتکا چشمہ ابلنے لگا/ سائنس ہمارے زمانہ میں فطرت کی نیرنگی کا عجیب و غریب مظاہرہ ہے/ اس نے کائنات کا رخ بدل دیا اور انسان کی فکر و نظر میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہے/

اس بناء پر کیونکر ممکن تھا کہ حضرت الاستاذ کی طبع وقاد و متجسس کو اس طرف توجہ نہ ہوتی، آپ انگریزی یا کوئی اور مغربی زبان نہیں جانتے تھے/ لیکن عربی میں کس چیز کی کمی ہے سائنس کے باوا آدم آئزک نیوٹن (izac newton) کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہو چکا ہے اور سائنس پر کچھ اور کتابیں بھی عربی میں چھپی ہیں/ حضرت شاہ صاحبؒ نے ان سب کتابوں کو منگوایا انہیں بکمال توجہ پڑھا اور ان کتابوں کے مضامین پر اس درجہ حاوی ہوگئے کہ عصر کے بعد سائنس کا باقاعدہ درس دینا شروع کردیا جس میں مولانا بدر عالم/ مولانا محمد حفظ الرحمٰن اور مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی شریک ہوتے تھے/ ساتھ ہی علامہ جوہر طنطاوی کی دس بارہ جلدوں میں تفسیر جواھر القران جو سائنس کے مختلف علوم وفنون سے بھری پڑی ہیں اس کو از اول تا آخر حرفا حرفا پڑھا اور جیسا کہ فرمایا کرتے تھے اس سے متاثر ہوئے تو اب سائنس کی معلومات اور اس کے دقیق مباحث و مطالب کے علم میں او روسعت پیدا ہوگئی/ فرق صرف یہ رہ گیا کہ حضرت الاستاذ کا سائنس کا علم جو کچھ بھی تھا (Theoritical) تھا/ کسی تجربہ گاہ یا لیبارٹری کے میسر نہ ہونے کے باعث اسکا عملی تجربہ (practical experience) نہ کرسکے تھے/ لیکن اس نظری علم میں ایسی مہارت بہم پہونچائی تھی کہ سائنس کے اساتذہ اور طلباء اس کا اعتراف کرتے تھے/ چنانچہ مولانا بدر عالم صاحبؒ کے بھانجے سید محمد عقیل صاحب جو علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے فرسٹ کلاس اور نہایت قابل بی، ایس، سی، (B.S.C) تھے انہوں نے خود مجھ سے بیان کیا کہ ایک مرتبہ وہ دیوبند آئے اور حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر ایتھر جس کو عربی میں اثیر کہتے ہیں اسکے متعلق چند سوالات کئے تو حضرت شاہ صاحبؒ نے ان سوالات کے جواب میں جو تقریر کی سید محمد عقیل کہتے تھے کہ وہ ایسی جامع اور مدلل تھی کہ ہماری یونیورسٹی کا ایک سائنس کا پروفیسر اتنا ہی کچھ کہہ سکتا تھا۔

ایک اور واقعہ سنئے غالباً ۱۹۲۷ء میں حضرت شاہ صاحب جمعیت علماء ہند کی ایک سالانہ کانفرنس کی صدارت کے لئے پشاور تشریف لے جارہے تھے/ لاہور راستہ میں تھا ٹرین کافی دیر یہاں ٹھہرتی تھی اس موقع پر حضرت شاہ صاحبؒ سے ملاقات کے لئے لاہور کے جو حضرات اسٹیشن پر تشریف لائے ان میں ایک صاحب مولانا سید محمد طلحہ ٹونکی بھی تھے/ موصوف اورنیٹل کالج میں عربی کے استاد تھے/ جو حضرات ان سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ موصوف نہایت ذہین وطباع اور علوم جدیدہ کے بڑے رسیا تھے/ لاہور میں ہر مضمون کے استاد اور پروفیسر موجود تھے وہ ان سے استفادہ کرتے رہتے تھے، میں ان دنوں میں لاہور میں ہی تھا/ مولانا سید محمد طلحہ صاحب مجھ سے

بڑی محبت کرتے تھے اتفاق ایسا ہوا کہ اسٹیشن نہ جا سکا تھا/ دوسرے دن مولانا سے ملاقات ہوئی تو اپنے خاص انداز میں کچھ مٹک کر اور کچھ (WRITING) کہنے لگے/ ارے بھئی! مولوی انور شاہ تو عالم یا علامہ نہیں، وہ تو علم کے پہاڑ ہیں پہاڑ، میں نے ان سے کشش (GRAVITY) کے متعلق سوال کیا۔

توانہوں نے وہی کہا جس کو میں سائنس کے پروفیسروں سے یہاں سنتا رہا ہوں۔

ابن خلدون کا نظریہ ہے کہ جو شخص جتنا بڑا عالم ہوگا اسی تناسب سے شاعر کم درجہ کا ہوگا اسکے برخلاف حضرت شاہ صاحبؒ کا حال یہ تھا کہ بااین ہمہ استغراق وانہماک فی العلم کے وہ عربی اور فارسی کے بلند پایہ شاعر بھی تھے عربی میں آپ کو ابوالعلاء معری اور فارسی میں خاقانی کا ہمرنگ کہا جا سکتا ہے۔

یہ جو کچھ عرض کیا گیا سخت حیرت واستعجاب سے سنا جائے گا اور واقعہ یہ ہے کہ جس شخص کو حضرت الاستاد سے کسب فیض کی سعادت حاصل نہیں ہوئی وہ اندازہ کر ہی نہیں سکتا کہ اللہ تعالی نے آپ کے وجود مسعود کی شکل میں اپنی کتنی بڑی نشانی اور محبت اہل علم پر ظاہر کی تھی/ حضرت شاہ صاحبؒ نے تصنیف وتالیف کو کبھی اپنا مستقل مشغلہ نہیں بنایا کیونکہ خوب سے خوب تر کی تلاش وجستجو کے باعث مطالعہ میں اس درجہ استغراق وانہماک تھا کہ کسی اور طرف طبیعت متوجہ ہی نہیں ہوتی تھی/ علاوہ ازیں طبعاً اس درجہ فروتن اور منکسر المزاج تھے کہ کبھی اپنی ہستی کو کچھ جانا ہی نہیں/ وہ تو اللہ نے اور ارباب علم کی خوش قسمتی تھی کہ حضرت شاہ صاحبؒ کی ترمذی و بخاری کی درسی تحریروں کو بعض فاضل اساتذہ نے قلم بند کر لیا اور انہیں شائع کر کے وقف افادہ عام وخاص کر دیا/ ان کے علاوہ خود حضرت شاہ صاحبؒ نے بعض وقتی اور ہنگامی حالات سے چند رسالے اور کتابیں زیور تصنیف سے آراستہ کیں ان کے علاوہ حضرت شاہ صاحبؒ کی بعض قیمتی اور بلند پایہ تحقیق پر مشتمل چند یادداشتیں تھیں انکو بھی آپکے بعض ارشد تلامذہ نے بعینہ اپنی شروح اور حواشی کے ساتھ طبع کر کے عام کر دیا/ پھر بعض رسالے ایسے بھی ہیں جنمیں حضرت نے خود اپنے ذاتی شوق اور جذبہ سے تصنیف کئے بس لے دے کے یہ حضرت الاستاد کا تصنیفی سرمایہ آپ کی وجاہت علمی کے پیش نظر یہ اگر چہ کوئی بڑا سرمایہ نہیں ہے لیکن اس میں علوم وفنون نقلیہ وعقلیہ کے وہ انمول خزانے ہیں جو ارباب علم وتحقیق کے لئے ہمیشہ سرمہ نور نظر اور حرز جان بنے رہیں گے/ چنانچہ عالم اسلام کے وہ اکابر علم وتحقیق جن کو براہ راست حضرت شاہ صاحبؒ کی صحبت حاصل نہیں ہوئی وہ ان کی چند تصنیفات اور علمی افادات کو پڑھ کر ہی اسیر دام گیسوئے انوری ہو گئے/ علامہ زاہد کوثری نہایت بلند پایہ اور محقق مصر کے ہیں انہوں نے حضرت الاستاد کے

دو رسالے لکھے تو اپنی تصنیف ''تانیب الخطیب'' میں لکھا ''رفع یدین کے موضوع پر جانبین سے خاص خاص کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن اس موضوع پر علامہ بحر و بر مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ نے جو دو کتابیں نیل الفرقدین و بسط الیدین کے تعلق سے لکھی ہیں ان میں سب کا لب لباب آ گیا ہے اور یہ موضوع بحث پر شافی و کافی ہیں۔'' (الانور ص ۳۳۹)

حدوث عالم فلسفہ و علم الکلام کا معرکۃ الآراء مسئلہ ہے/ حضرت شاہ صاحبؒ نے اس پر دو رسالے تالیف کئے ہیں ایک ''ضرب الخاتم علیٰ حدوث العالم'' اور دوسرا ''مرقاۃ الطارم لحدوث العالم'' پہلا رسالہ چار سو اشعار پر مشتمل ہے ان چار سو اشعار میں کتنے حوالے ہیں؟ اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ حضرت شاہ صاحب کے تلمیذ رشید مولانا محمد یوسف بنوریؒ ان حوالوں کو جمع کرنے بیٹھے تو ایک سو صفحات میں آئے دوسرے رسالہ کی نسبت مولانا محمد یوسف بنوری لکھتے ہیں:

''ترکی کے سابق شیخ الاسلام مصطفےٰ صبری جو رد مادیین و دہریین نہایت متخصص عالم تھے، میں نے ۱۹۳۸ء میں قاہرہ میں ان کو یہ رسالہ دیا تو اسے پڑھکر فرمایا میں نہیں جانتا تھا کہ فلسفہ و کلام کے سقائق کا اس انداز سے سمجھنے :الا اب بھی دنیا میں کوئی زندہ ہے/ پھر فرمایا:

جتنا کچھ آج تک اس موضوع پر لکھا جا چکا ہے اس رسالہ کو اس سب پر ترجیح دیتا ہوں او راسفار اربعہ پر بھی اس رسالہ کو ترجیح دیتا ہوں (الانور بحوالہ حیات انور ص ۳۴)

علامہ سید رشید رضا صاحب المنار قاہرہ جو عالم اسلام کے نامور عالم اور محقق ہیں دیوبند آئے وہاں حضرت شاہ صاحبؒ کی فی البدیہہ عربی میں مسلک دیوبند پر تقریر سن کر انہوں نے کیا اثر لیا اور حضرت الاستاد کے متعلق کیا لکھا؟ وہ اس قدر مشہور واقعہ ہے اور اتنے لوگوں نے اس کو لکھا ہے کہ اسے یہاں نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے/ شیخ عبدالفتاح ابو غدہ نامور عالم اور مصنف ہیں وہ حضرت شاہ صاحبؒ کی کتابوں سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کی دو کتابیں اپنے مقدمہ کے ساتھ بڑے اہتمام سے دمشق سے شائع کر چکے ہیں/ اور غالباً ابھی اور کتابیں چھاپنے کا بھی پروگرام ہے۔

یہ بیرونی افاضل تو وہ ہیں جنہوں نے حضرت شاہ صاحبؒ کے ایک دو رسالے دیکھے یا ایک تقریر سنی اور ایک رائے قائم کر لی اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ جو علماء اور فضلاء خود برصغیر ہند و پاک کے باشندے تھے اور اس بنا پر اس کو حضرت شاہ صاحبؒ کی ذات سے براہ راست استفادہ کا موقع تھا ان کی کیا رائے ہوگی؟ اگر چہ علامہ ذہبی کے بقول علماء کے لئے معاصرت فتنہ عظیم ہے/ تاہم حضرت شاہ صاحبؒ کی شخصیت کی تاثیر کا یہ عالم ہے کہ اپنے اور پرائے سب ہی آپ کی

عظمت وجلالت علم کے کھلے دل سے معترف ہیں/ چنانچہ حضرت الاستاد مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ نے فتح الملہم فی شرح المسلم اور فوائد القرآن میں جگہ جگہ حضرت شاہ صاحبؒ سے استفادہ کیا اور مسئلہ متعلقہ میں آپ کی رائے کو متقدمین علماء کی رائے پر ترجیح دی ہے/ مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانویؒ حضرت شاہ صاحب کو امام غزالی و رازی کا ہم پلہ قرار دیتے ہیں/ مولانا سید دسلیمان ندوی کے نزدیک حضرت شاہ صاحب علم کے ایک ایسے سمندر ہیں جس کی تھاہ ہی نہیں ہے/ مولانا عبیداللہ سندھی نے ایک مرتبہ فرمایا:

> ''جو شخص یہ قسم کھائے کہ مولانا انور شاہ اس زمانے کے بے نظیر عالم ہیں تو وہ اپنی قسم میں حانث نہیں ہوگا/ مولانا حسین احمد صاحب مدنی نے فرمایا: میں ایسے حضرات کو جانتا ہوں جنہیں بخاری اور مسلم از بر تھے لیکن حضرت مولانا انور شاہ کے علاوہ کسی ایسے عالم دین سے واقف نہیں ہوں جس کے سینہ میں پورا کتب خانہ ہی محفوظ ہو'' مولانا ابراہیم میر صاحب سیالکوٹی جماعت اہلحدیث کے امام اور بلند پایہ عالم تھے آپ نے فرمایا: ''اگر مجسم علم دیکھنا ہو تو مولانا انور شاہ کو دیکھو'' یہ حال تو علماء کا تھا جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں علامہ اقبالؒ سے بڑھ کر اور کون ہوسکتا ہے/ علامہ کو حضرت شاہ صاحب جو غایت درجہ کی عقیدت وارادت تھی اسے دنیا جانتی ہے/ بیان کرنیکی ضرورت نہیں/ خود حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے تھے ''مجھ سے جو ح استفادہ ڈاکٹر اقبالؒ نے کیا ہے کسی عالم نے نہیں کیا۔''

ایک شخصیت کی تعمیر میں غزارت علم وفن کے باوصف اس کے اخلاق، سیرت اور کردار کا بھی بہت بڑا دخل ہوتا ہے آیئے اب اس حیثیت سے بھی اس شخصیت کا جائزہ لیں۔ حضرت شاہ صاحب طبعا نہایت غیور وخوددار مگر بے انتہا حلیم وبردبار، متواضع اور سراپا انکسار وپیکر ایثار تھے/ علمی بحث وتمحیص میں وہ اپنی پوری جلالت شان کے ساتھ ابھرتے اور حافظ ابن حجر، علامہ ابن تیمیہ، ابن قیم اور امام نووی وغیرہم پر جب موقع ہوتا تھا تنقید کرتے تھے/ لیکن لب ولہجہ ہمیشہ نہایت شستہ اور نہایت مہذب رکھتے تھے۔ کبھی کوئی بات غیر سنجیدہ اور غیر مہذب زبان سے نہیں نکلتی تھی/ مخالف سے مخالف کا یہی ادب واحترام ملحوظ رکھتے اور اس کے علمی مرتبہ ومقام کا اعتراف برملا کرتے تھے/ وسعت علم نے وسعت نظر اور عالی حوصلگی پیدا کی تھی/ مولویانہ کٹ حجتی، خوردہ گیری، سخن پروری اور سخن سازی کا دور تک کہیں نام ونشان نہ تھا/ جوابات فرماتے کھلے دل ودماغ سے ایمانداری اور دیانت سے فرماتے تھے/ چنانچہ حضرت الاستاد نے اگر چہ فقہ حنفی کی نہایت عظیم الشان اور ٹھوس خدمت انجام دی ہے لیکن اس میں کبھی دھاندلی اور سخن پروری کو راہ نہیں

دی بلکہ اگر کہیں کمزوری نظر آئی ہے تو بے تکلف اس کی نشاندہی فرمائی ہے/ اختلافی معاملات ومسائل میں آپ کا مسلک نہایت معتدل اور متوازن تھا اتباع سنت کا بڑا خیال اور لحاظ رکھتے تھے/ چنانچہ ایک مرتبہ ہم لوگوں سے فرمایا کہ کبھی کبھی رفع یدین بھی کر لیا کرو تا کہ سنت پر عمل ہو جائے اسی طرح ایک مرتبہ ارشاد ہوا کہ نفل نماز کھڑے ہو کر پڑھنا افضل ہے/ لیکن کبھی کبھی بیٹھ کر بھی پڑھ لیا کرو/ کیونکہ حضو ﷺ نے دونوں طرح کی نماز پڑھی ہے، تراویح کی نسبت فرمایا کہ کبھی کبھی اسے ناغہ کر دینا اور کبھی آٹھ کبھی بارہ رکعات بھی پڑھنا چاہئے کیونکہ حضو ﷺ کا معمول یہی تھا، فیاض اور دریادل اس درجہ تھے کہ قلیل آمدنی کے باوجود کبھی کوئی سائل ان کے در سے محروم نہیں لوٹا اور جہاں تک میں نے دیکھا ہے کبھی انہوں نے کسی سائل کو ایک روپیہ سے کم نہیں دیا، رہی خاکساری، فروتنی اور انکساری اس کے متعلق میں کیا عرض کروں، صرف ایک واقعہ سناتا ہوں اس پر قیاس کر لیجئے ایک مرتبہ امرت سر تشریف لے گئے وہاں محمد صادق صاحب کشمیری نام کے ایک مشہور بیرسٹر بھی رہتے تھے/ ان کو حضرت شاہ صاحبؒ سے بڑی عقیدت تھی اس لئے وہ خدمت میں حاضر تو ہو گئے لیکن حضرت شاہ صاحبؒ کے سامنے بیٹھے ہوئے ان کو اپنی مغربی وضع قطع اور ہیئت پر شرمندگی ہو رہی تھی اور جھینپے جھینپے بیٹھے تھے/ حضرت شاہ صاحبؒ نے اسے تاڑ لیا اور فرمایا، بیرسٹر صاحب آپ کیوں اس بات پر شرمندہ ہو رہے ہیں کہ میری داڑھی اتنی بڑی ہے اور وضع پارسایانہ ہے اور آپ کی داڑھی مونچھ صاف ہے اور ہیئت فرنگیانہ ہے؟ کیونکہ فعل اگر چہ ہمارا مختلف مگر غرض ایک ہے اور وہ ہے روٹی، اگر آپ بیرسٹر ہو کر میری وضع اختیار کر لیں تو آپ کو بیرسٹری کی روٹی نہ دے اسی طرح اگر میں آپ کی وضع قطع اختیار کروں تو مجھے لولویت کے نام سے روٹی نہ ملے، پس جب ہم دونوں کی غرضی ایک ہی ہے تو آپ کیوں شرمندہ ہوں/ غور کیجئے کمال انکساری کے ساتھ حضرت شاہ صاحبؒ نے امت اسلامیہ پر کس درجہ بھرپور مگر حسرت ناک طنز کیا ہے۔

قابل رحم ہے اس شخص کی رسوائی بھی　　پردہ پردہ ہی میں کم بخت جو رسوا ہو جائے

ایک عہد آفریں شخصیت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ملک وقوم میں ایسے افراد پیدا کرے جو اس کے مشن اور اسکے کام کو دنیا میں فروغ دیں اور علم وفن کے کارواں کو آگے بڑھنے میں مدد دیں/ جب اس پہلو سے ہم دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے نہایت لائق وفاضل تلامذہ جس کثرت سے اور جس نوعیت کے پیدا کئے اس زمانہ میں کسی نے پیدا نہیں کئے/ میں نام لینے کا عادی نہیں ہوں اور اگر نام گناؤں بھی تو کس کس کے/ دو چار دس بیس ہوں تو انہیں شمار کیا جا سکتا ہے/ جہاں قطار اندر قطار ہوں ان کی گنتی کون کرے. بس یہ سمجھ لیجئے کہ آج تک

ہندوستان اور پاکستان اور بعض دوسرے ملکوں میں بھی دیوبند سے تعلق رکھنے والے پرانی نسل کے جو حضرات درس افتاءٗ تصنیف و تالیف، ارشاد و ہدایت وعظ و تبلیغ صحافت قومی وملی خدمات کے میدانوں میں نمایاں کام کررہے ہیں اور ان میں کتنے ہیں جو خدا کو پیارے ہو گئے/ یہ سب گلشن انوری کے خوشہ چین اور حضرت شاہ صاحبؒ کے صحبت یافتہ ہیں ان حضرات نے علم و فن کے لالہ زار اگائے اور اسلامی ثقافت کے ہر شعبہ میں گل و گلزار پیدا کئے ہیں۔ اوپر جو کچھ عرض کیا گیا اس سے صاف طور پر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ الدہلویؒ کی طرح حضرت الاستاد العلام مولانا محمد انور شاہ الکشمیری کی شخصیت بے شبہ ایک عہد آفریں شخصیت تھی، آپ نے علوم اسلامیہ اور خصوصاً فن حدیث کے درس و تعلیم میں ایک انقلاب عظیم پیدا کیا، علماء میں ذوق تحقیق و تدقیق پیدا کیا، ان کو استنباط و استخراج مسائل میں ایک وسیع نقطہ نظر عطا فرمایا، اپنے علم و فضل اور ہر فن میں اپنی مجتہدانہ آراء سے اپنے زمانہ کے علماء و فضلا اور دوسرے ارباب علم و دانش کو متاثر کیا اور ایک نسل ایسی پیدا کی جس نے زمانے کے معیار علمی و خدمت ملی کا رنگ بدل دیا، ایک عہد آفریں شخصیت کی یہی خصوصیات ہوتی ہیں اور بے شک و شبہ حضرت شاہ صاحب کی عظیم شخصیت ان تمام خصوصیات اور اوصاف و کمالات کی جامع اتم تھی۔

آفاقہا گردیدہ ام مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوبان دیدہ ام اما تو چیزے دیگری

آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے علم و فضل کا ابر کرم عالم اسلام کے ہر گوشہ اور ہر خطہ پر برسا اس بناء پر آپ کی شخصیت بین الاقوامی ہے لیکن کشمیر جنت نظیر کی سرزمین کو آپ کے مولد و منشاء ہونے کا فخر حاصل ہے وہ کسی مقام کو نہیں۔ علامہ اقبالؒ اور حضرت شاہ صاحبؒ یہ دونوں معدن کشمیر کے وہ کوہ نور ہیرے ہیں جنہوں نے اس سرزمین لالہ و گل کی کلاہ افتخار میں چار چاند لگائے ہیں/ انگریزوں کا زمانہ غلامی کا زمانہ تھا اس لئے کشمیر کے ورثہ علمی و ثقافتی نذر تغافل رہا لیکن اب جب کہ ہم آزاد ہیں ہمیں اپنے اس ورثہ کا جائزہ لیکر اس کی خاطر خواہ قدردانی کا ثبوت دینا چاہئے جیسا کہ دنیا کے سب ملک اور ہندوستان کی مختلف ریاستیں کررہی ہیں/ کشمیر یونیورسٹی میں ''اقبال پروفیسر کی چیئر'' پیدا کرکے اس راہ میں نہایت مستحسن اور ضروری اقدام کیا گیا ہے تو کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ اسی طرح کا اقدام کشمیر یونیورسٹی میں عربی یا اسلامیات کی ایک چیئر حضرت شاہ صاحب کے نام پر یا ''مولانا انور شاہ اکاڈمی'' کے نام سے ایک اکاڈمی قائم کی جائے۔

●●
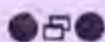
حضرت علّامہ کشمیریؒ

ایک مربی کی حیثیت سے

(مولانا عبداللہ جاوید۔ ایڈیٹر مرکز۔ دیوبند)

اسلام میں تعلیم وتربیت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے/ جو والدین اپنی اولاد کی صحیح تربیت کرتے ہیں ان کے لئے آخرت کے اجر وثواب کی بشارتیں موجود ہیں/ بچہ کی اولین تربیت گاہ ماں کی گود اور گھر کا ماحول ہے جہاں بچہ ذہنی وفکری نشو ونما حاصل کرتا ہے/ گھر کا ماحول اگر صحیح دینی شعور سے محروم ہو تو بچہ کا مستقبل خطرے میں پڑ سکتا ہے/ گھر کے باہر بچے کی تربیت کی ذمہ داری تعلیم گاہ پر ہوتی ہے/ اس مرکز تربیت سے بچہ اخلاق وکردار کی توانائی، علم وفکر کی پختگی اور مستقبل کی روشنی لیکر نکلتا ہے تعلیم گاہ یا مدرسہ کا یہ مفہوم انتہائی محدود ہے کہ اس کا مقصد طالب علم کو محض چند مقررہ کتابیں پڑھا کر رخصت کر دینا ہے/ حقیقت یہ ہے کہ ایک استاذ ایک وقت تک اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش نہیں سمجھا جا سکتا جب تک کے وہ اپنے شاگرد کی بہتر علمی اور اخلاقی رہنمائی کا حق ادا نہ کرے/ قرآن کریم میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے دو وصف بیان کے گئے ایک تو یہ کہ آپ اپنے صحابہ کا تزکیہ نفس کرتے ہیں اور دوسرا وصف یہ ہے کہ آپ ا نہیں کتاب کا علم اور حکمت کی باتیں سکھلاتے ہیں/ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے تعلیم اور تزکیہ دونوں ایک دوسرے کے ردیف ہیں/ بلکہ الہامی طریقۂ بیان میں تزکیہ کا ذکر پہلے ہے. جس سے تعلیم پر اس کی فضیلت کا اندازہ ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ علم جس کے ساتھ عمل کی طاقت نہ ہو غیر مفید ہے اور وہ عمل جسے علم کی رہنمائی حاصل نہ ہو بہت سے مفاسد کا سبب بن سکتا ہے۔

دار العلوم دیوبند ایک درسگاہ ضرور ہے، مگر اس کی شہرت اور بین الاقوامی سطح پر اس کی عظمت کا راز یہ ہے کہ یہ ادارہ اپنے قیام کے روز اول سے ایک ایسی تربیت گاہ بھی رہا ہے جہاں طالب علم نہ صرف علم کا رسوخ حاصل کر سکتا ہے بلکہ اسے کردار وعمل کی پختگی بھی نصیب ہوتی ہے/

طلباء کیساتھ شفقت ومحبت، ان کے مستقبل کی فکران کی تربیت واصلاح کا خیال یہ سب وہ عناصر ہیں جو دارالعلوم کے ماحول میں رچ بس گئے ہیں، یہاں سے نکلنے والا طالب علم آسمانی علم کا روشنی ستارہ ہوتا ہے، جہاں جاتا ہے اپنی ضیاباریوں سے پوراماحول روشن کرتا ہے۔

بانی دارالعلوم حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اپنی معرکۃ الاراء کتاب ''آب حیات'' میں لکھا ہے کہ بعض شخصیتیں جامع الکمالات ہوتی ہیں لیکن ان میں کوئی ایک کمال اتنا غالب اور ایسا نمایاں ہو جاتا ہے کہ دوسرے سب کمالات نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں/ حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ بھی ایسے ہی جامع الکمالات لوگوں میں سے تھے/ بلاشبہ ایک محدث کی حیثیت سے انہیں بین الاقوامی اعتبار اور وقار ملا ہے مگر وہ صرف ایک محدث ہی نہیں تھے/ بلکہ دوسرے علوم میں بھی انہیں وہی رسوخ حاصل تھا جو علم حدیث میں ملا تھا/ منطق اور فلسفے کی بات جانے دیجئے یہ فنون عربی مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں اوران پر عبور حاصل کرنا کچھ زیادہ حیرت انگیز نہیں کہا جاسکتا/ لیکن انہوں نے کچھ ایسے علوم میں بھی امتیاز حاصل کرلیا تھا جن کی بساط الٹ چکی تھی اور جن کے ماہرین خال خال ہی ملا کرتے تھے/ شاہ صاحبؒ کا ایک اور کمال یہ تھا کہ وہ بہترین مربی تھے/ ماہرین تعلیم وتربیت نے جتنی خصوصیات اساتذہ کی متعین کی ہیں وہ سب ان میں موجود تھیں یہی وجہ ہے کہ شاہ صاحبؒ کے بیشتر تلامذہ کا اپنے وقت کے ممتاز علماء میں شمار ہوتا ہے/ کوئی تصنیف وتالیف کے میدان میں بے پناہ شہرت رکھتا ہے۔ کوئی میدان خطابت کا شہسوار ہے/ کسی شخص کو تدریس کا خاص ملکہ ہے اور اپنی اس خصوصیت کی بناء پر مرجع علماء بنا ہوا ہے/ شاہ صاحب کے جتنے رنگ تھے ان کا پرتو انکے شاگردوں میں موجود ہے۔

استاذ یا مربی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے تلامذہ کے ساتھ حقیقی اولاد کا سلوک کرے اوران کی تربیت یہ سمجھ کر کرے کہ وہ اپنے جگر پاروں کی تربیت کر رہا ہے/ سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ صحابہ سے ارشاد فرمایا۔

انما انا لکم بمنز لتہ الو لد عنمکم میں تمہارے والد کی طرح ہوں تمہیں سکھلاتا ہوں، حضرت علامہ کشمیریؒ اس قول نبوی کی صحیح تصویر تھے/ اپنے تلامذہ کے ساتھ ان کا تعلق باپ اور بیٹے کے تعلق سے کہیں زیادہ مضبوط ومستحکم تھا/ انہیں اپنے تلامذہ اور متعلقین کی علمی تربیت اور انکے اعمال واخلاق کو شریعت وسنت کے سانچے میں ڈھالنے پر خاص توجہ تھی/ چنانچہ

دارالعلوم کی مدرسی کے ابتدائی دور میں اور پھر صدر مدرسی کے زمانہ میں آپ کے ممتاز تلامذہ مولانا میرک شاہ کشمیریؒ مولانا محمد یوسف/ شاہ میر واعظ کشمیرؒ/ مولانا تاجور نجیب آبادیؒ/ مولانا فخر الدین مراد آبادی/ مولانا اعزاز علی صاحبؒ، مولانا مفتی محمد شفیع عثمانیؒ مولانا قاری محمد طیب صاحب/ مولانا حفظ الرحمان سہوہاروی/ مولانا مفتی عتیق الرحمان عثمانیؒ / مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ، مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ اور دوسرے سینکڑوں شاگرد آپ کی تربیت اور علمی رہنمائی سے مستفید ہوئے۔ ذہین اور ہونہار طلبہ پر نہ صرف درس کے دوران خاص طور پر متوجہ رہتے تھے بلکہ درس کے علاوہ اوقات میں بھی ان کی خیر گیری اور ہمت افزائی فرماتے رہتے/ فراغتِ تعلیم کے بعد کوشش ہوتی کہ ہونہار اور لائق طلبہ کو اپنے پاس روک لیں اور انہیں علم دین کی خدمت میں لگا دیں/ چنانچہ مولانا مناظر احسن گیلانی کو فراغت کے بعد دارالعلوم دیوبند کے ماہانہ رسالوں الرشید اور القاسم کے ادارہ تحریر سے منسلک کیا اور اس رشتہ سے تحریر و تصنیف کی راہ دکھلائی اپنے اس قابل اور ہونہار شاگرد کی جولانیٔ طبع کو دیکھتے ہوئے حضرت شاہ صاحبؒ نے انہیں دارالعلوم میں تدریس کا موقع بھی عنایت فرمایا/ دارالعلوم میں تنخواہوں کا معیار معمولی تھا اور اکثر مدرسین و ملازمین فکر معاش میں مبتلا رہتے تھے/ مولانا مناظر احسن گیلانی نے تنخواہ کی قلت کا عذر کیا اور اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوشی کی اجازت چاہی، حضرت مولانا حبیب الرحمان عثمانی کا دور اہتمام تھا/ یہ درخواست جب ذمہ داروں کی نظر سے گذری تو حضرت شاہ صاحبؒ سے مشورہ ہوا، حضرت شاہ صاحبؒ نے درخواست کی نہ صرف پرزور شفارش کی بلکہ اپنے شاگرد کی صلاحیتوں کو سراہا بھی اور معقول تنخواہ پر انہیں دارالعلوم میں رکھنے کی کوشش کی، مولانا شائق عثمانی اور مولانا تاجور نجیب آبادی سے علمی موضوعات پر مضامین لکھوائے، خود ملاحظہ کئے، اصلاح و نظرِ ثانی کے بعد انہیں الرشید اور القاسم میں شائع کرایا، ان دونوں حضرات کی تحریر و تصنیف کی ابتداء حضرت شاہ صاحبؒ کی نگرانی میں ہوئی، مولانا محمد یوسف میر واعظ کشمیرؒ نے کشمیری زبان میں قرآن پاک کا جو بے نظیر ترجمہ اپنے قیامِ پاکستان کے دوران کیا تھا وہ دراصل حضرت شاہ صاحبؒ ہی کے حکم کی تعمیل ہے، حضرت شاہ صاحبؒ کی خواہش تھی کہ کشمیری زبان میں قرآنِ پاک کا کوئی عمدہ ترجمہ ہو، میر واعظ کشمیر مرحوم نے اپنے استاذ کی اس خواہش کو عملی شکل دی۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی تربیت کا یہ خاص انداز تھا کہ اپنے شاگردوں کو ان کے ذوقِ طبع کے مطابق کام تفویض فرماتے، کسی کو تصنیف و تالیف سے دلچسپی ہوتی تو اسے اس میدان میں لگا دیتے، کسی کو تدریس کا ذوق ہوتا تو اسے تدریس کے مواقع مہیا فرماتے، کسی شاگرد میں خطابت سے مناسبت دیکھتے تو اس کی جولانیٔ طبع کے لئے مہمیز ثابت ہوتے، چنانچہ حضرت مولانا محمد طیب صاحب میں خطابت کا ذوق دیکھا تو انہیں اپنے ساتھ جلسوں اور تقریروں میں لے جانے لگے، بیس بائیس برس کی عمر میں قادیان کا سفر کرایا اور وہاں قادیانی نبوّت کے خلاف اس نوعمر شاگرد کی تقریر بھی ہوتی مولانا سیّد محمد میاں دیوبندیؒ کو تدریس سے دلچسپی تھی، بہار کے ایک مدرسہ میں ایک معیاری مدرّس کی ضرورت پیش آئی تو انہیں وہاں بھیج دیا، مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوری کو مناظروں سے خاص شغف تھا، اگر چہ آپ شاہ صاحب کے باقاعدہ شاگرد نہ تھے مگر حلقۂ مستفیدین میں آپ کا شمار ہوتا تھا، مولانا چاند پوری نے حضرت شاہ صاحبؒ کی رہنمائی میں متعدد معرکے سر کئے اور رئیس المناظرین کہلائے۔

دیوبند کے زمانۂ قیام میں حضرت شاہ صاحبؒ کی خواہش پر مولانا حبیب الرحمن عثمانیؒ نے بڑے پیمانے پر مطبعِ قاسمی قائم کیا، حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنی نگرانی میں متعدد کتابیں لکھوا کر طبع کرائیں، چنانچہ شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا اعزاز علی امروہویؒ سے حماسہ، نفحۃ الیمن، متنبی، کنز الدقائق وغیرہ درسی کتابوں پر عربی میں حواشی لکھوائے، اور ان کا حرف بحرف مطالعہ کیا اور اصلاح و نظرِ ثانی کے بعد ان کتابوں کی اشاعت کا نظم فرمایا۔ مولانا میرک شاہ صاحب کشمیریؒ نے ''محیط الدائرۃ'' کے نام سے فنِ عروض پر ایک قیمتی کتاب تصنیف فرمائی۔ مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ نے کلامی موضوعات پر متعدد کتابیں لکھیں۔ مفتی محمد شفیع عثمانیؒ نے فقہی مسائل پر رسالے لکھے، آپ کی معرکۃ الآراء کتاب ''ختم النبوۃ'' دراصل شاہ صاحب کی علمی رہنمائی اور خاص توجہات کا نتیجہ ہے۔ مولانا مرتضےٰ حسن چاند پوری اور مولانا بدرِ عالم صاحب مہاجر مدنی نے ختم نبوّت، عقیدۂ حیاتِ مسیح اور نزولِ مسیح کے مسئلہ پر ٹھوس علمی کتابیں لکھیں، اس زمانے میں خود آپ نے کئی گرانقدر کتابیں تصنیف فرمائیں۔ مولانا حفظ الرحمن صاحبؒ سے سیرت پر ایک ایسی کتاب لکھوائی جو مدارس کے نصاب میں داخل کی جاسکے اور نوخیز طالب علموں کے لئے مفید ہو، عقیدۂ ختم نبوت پر ایک ڈیڑھ سال کے عرصہ میں تقریباً تیس سے زیادہ

بلند پایہ کتابیں حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے عزیز شاگردوں سے لکھوائیں اور خود ملاحظہ فرما کر شائع کیں۔ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی گرانقدر کتاب ''الدین القیم'' کا نقشِ اوّل حضرت شاہ صاحبؒ کی رہنمائی میں لکھا گیا۔

۱۳۴۵ھ میں بعض انتظامی نوعیت کے اختلافات کے بعد جب آپ دارالعلوم سے علیٰحدہ ہوئے اور اپنے تلامذہ کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ گجرات کے شہر ڈابھیل میں فروکش ہوئے تو وہاں بھی آپ نے نشر واشاعت اور تصنیف وتالیف کے لئے مجلسِ علمی کے نام سے ایک عظیم ادارہ قائم کیا، افسوس ہے کہ یہ ادارہ اپنے پرانے معیار پر قائم نہیں رہ سکا ہے، حضرت کے ایماء پر ان کے خاص متعلقین نے ایک بڑی رقم اس ادارے کی تعمیر پر خرچ کی، خود آپ ہی کی زندگی میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی "التفہیمات الالٰہیہ "، "الخیر الکثیر "اور "البدور البازغہ "خوبصورت ٹائپ پر شائع ہوئیں، خود آپ کی بھی کئی کتابیں اس ادارے نے شائع کیں، حضرت شاہ صاحب کے انتقال کے بعد جو کتابیں مجلسِ علمی سے چھپیں ان میں فیض الباری، مشکلات القرآن، اور نصب الرایہ اہم ہیں، فیض الباری امام بخاریؒ کی جامع صحیح پر آپ کے امالی کا مجموعہ ہے جو مولانا بدرِ عالم مہاجر مدنیؒ نے عربی میں لکھے تھے، فیض الباری چار ضخیم جلدوں میں ہے، اور اس پر لائق مولانا کے گرانقدر حواشی بھی ہیں، مشکلات القرآن آپ کے تفسیری افادات کا مجموعہ ہے، حضرت کے شاگرد اور داماد جناب مولانا سیّد احمد رضا صاحب بجنوریؒ نے یہ مجموعہ ترتیب دیا اور مولانا محمد یوسف بنوریؒ کے ایک طویل مقدّمے کے ساتھ اس کی اشاعت عمل میں آئی، زیلعی کی نصب الرأیہ نقد کی مشہور کتاب ہدایہ کی احادیث کی تخریج پر مشتمل ہے، مولانا محمد یوسف نے اسے مرتب کیا ہے۔

حضرت مولانا شبّیر احمد عثمانیؒ تقریباً معاصر تھے باقاعدہ شاگرد نہ تھے، مگر حضرت شاہ صاحبؒ سے جس قدر استفادہ آپ نے کیا ہے شاید ہی کسی دوسری شخصیّت کو اس کا موقع ملا ہو، "فتح الملہم " کی تالیف کے دوران آپ نے بار بار استفادہ کیا، اسکے نمونے اس کتاب میں جگہ جگہ ملتے ہیں، جہاں وہ حضرت شاہ صاحبؒ کا بڑے احترام اور عقیدت کے ساتھ نام لے کر افادات درج کرتے ہیں، بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ مولانا عثمانیؒ حضرت شاہ صاحبؒ سے تحریری استفسار فرماتے او رحضرتؒ تحریر ہی میں جواب عنایت فرماتے، مولانا عثمانی نے فرطِ عقیدت میں تحریریں من وعن

اپنی کتابوں میں درج کردی ہیں، تفسیرِ قرآن کے سلسلہ میں جب علامہ عثمانی حضرت داؤد علیہ السلام کے واقعے سے گذرے تو وہاں زبردست اشکال پیدا ہوا، عصمتِ انبیاء کا نازک مسئلہ تھا تمام متداول اور مستند تفاسیر میں واقعہ کی صحیح توجیہہ تلاش کی مگر ناکام رہے، حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور اشکال پیش کیا، شاہ صاحب نے حدیث کی کسی کتاب کا حوالہ دے کر فرمایا کہ فلاں روایت سے یہ اشکال رفع ہوسکتا ہے، اور واقعی روایت مل گئی جس سے تمام تر اعتراضات کافور ہوگئے، یہ علمی تبحر تھا کہ نہ صرف تلامذہ اور معاصرین آپ کی رائے وقیع اور آخری سمجھتے تھے بلکہ اکابر علماء تک آپ پر اعتماد کرتے تھے، حضرت شیخ الہندؒ ہمیشہ اپنے عزیز شاگرد کی رائے کو ترجیح دیا کرتے تھے، حکیم الامت حضرت تھانویؒ مشکل مسائل میں حضرت شاہ صاحبؒ کا نقطۂ نظر دریافت فرمایا کرتے تھے، مشہور محدّث مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ نے بذل المجہود کی تصنیف کے دوران بارہا آپ سے رجوع کیا، علاّمہ شوق احسن نیمویؒ کی آثار السنن پر آپ کے استدراکات اس کا ثبوت ہیں کہ نوعمری ہی میں آپ کی شہرت اور مقبولیت دارالعلوم کی حدود سے تجاوز کرگئی تھی۔

علمی اعانت میں کبھی بخل نہ تھا، اکثر و بیشتر مدرّسین آپ کے پاس حاضر ہوتے اور مشکل مقامات آپ سے پوچھ پوچھ کر حل کرتے، نئے مدرّسین خاص طور سے آپ کی مدد کے محتاج رہتے، حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ اپنی معین المدرّسی کے دور میں بلکہ بعد میں بھی جب کسی مقام پر الجھتے بلا تکلّف شاہ صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوجاتے، کبھی ایسا ہوتا کہ رات کے آخری حصّہ میں مطالعہ کے لئے بیٹھے اور الجھ گئے، اتنا صبر کہاں کہ صبح کا انتظار کرلیں، فوراً اٹھے اور شاہ صاحبؒ کے کمرے کے دروازہ پر دستک دی، شاہ صاحبؒ نے دروازہ کھولا، مسکراتے ہوئے استقبال کیا، سوال کا جواب دیا اور دروازہ بند کرلیا، جو تلامذہ اور اہلِ علم تحریری، تصنیفی یا تدریسی کاموں میں لگے ہوئے تھے ان سے خوش رہتے، اور انہیں سالہا سال کا جمع کردہ اپنا گرانقدر تحقیقی سرمایہ بلا تکلّف سپرد فرمادیتے، حضرت شیخ الادبؒ کو جب دارالعلوم میں پہلی مرتبہ ابنِ ماجہ شریف کا درس سپرد کیا گیا تو انہوں نے حدیث کی اس اہم کتاب کے درس سے معذوری ظاہر کی اور اس ذمہ داری کی کماحقۂ ادائیگی سے اظہارِ عجز کیا، اس صورت میں جبکہ ابنِ ماجہ کے حواشی برائے نام ہیں، یہ کام واقعی مشکل تھا، شاہ صاحبؒ نے فوراً ہی اپنا لکھا ہوا حاشیہ مولانا اعزاز علی صاحبؒ کے

سپرد کردیا کہ اس سے استفادہ کرو، یہ قیمتی حاشیہ دوچار سال ہوئے کراچی سے نور محمد اصح المطابع نے شائع کیا ہے، مولانا اعزاز علی صاحبؒ حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد تھے، مگر آپ نے کئی کتابیں حضرت شاہ صاحبؒ سے سبقاً سبقاً پڑھی ہیں۔

دورانِ درس اور درس کے علاوہ اوقات میں آپ اپنے شاگردوں کو اسباق میں حاضری اور مطالعہ وتکرار کی ہدایت فرماتے تھے، کبھی ترغیب سے کام لیتے، اور کبھی ترہیب سے، تعلیمی امور میں اصل ترغیب ہی ہے، بقولِ ابنِ خلدون طالبِ علم پر سختی اس کی تعلیم کے لئے مضر ہے، اس طرح وہ شرحِ صدر اور انبساط کے ساتھ تعلیم میں مشغول نہیں رہ سکتا، صوفیاء کا عام خیال بھی یہی ہے کہ تربیت کے دوران سختی متعلّم کے اخلاق پر اثر انداز ہوتی ہے، شاہ صاحبؒ کے سامنے تربیت کے یہ مسلّمہ اصول تھے اور سرکارِ دوعالم ﷺ کی سیرت کا ایک ایک حرف ان کے دل ودماغ پر نقش تھا، صحابۂ کرام کے ساتھ آپ کا رویہ انتہائی نرم اور مشفقانہ تھا تاہم سختی کی نظیریں بھی موجود ہیں، بسا اوقات تربیت کے لئے مناسب سختی کی بھی ضرورت ہوتی ہے، روایات میں ہے کہ کبھی کبھی سرکارِ دوعالم صلّی اللہ علیہ وسلم اس قدر خفا ہو جاتے کہ آپؐ کے دونوں رخسارِ مبارک غصّہ سے دہکنے لگتے، بعض اوقات ناراض ہو کر بولنا چھوڑ دیتے، وہ بچّہ جو دس سال کا ہو جائے، اور نماز کی طرف مائل نہ ہو اس کے لئے شریعت نے ضرب کا حکم دیا ہے، شاہ صاحبؒ بہت کم خفا ہوتے لیکن کبھی کبھی انکی خفگی اتنی بڑھ جاتی کہ شاگرد کو درس گاہ سے اٹھا بھی دیتے تھے، عام طور پر یہ سزا پڑھنے کے معاملہ میں دی جاتی، ایک مرتبہ کسی طالبِ علم نے کتاب کی عبارت پڑھی رُواۃ کے ناموں میں وہ غلطی سے شِعَبی کے بجائے شُعْبی پڑھ گیا، آپ نے نام کی تصحیح فرمائی، طالبِ علم نے دوبارہ غلطی کی پھر اصلاح فرمائی، تیسری مرتبہ جب یہ نام سند میں گذرا تو وہ طالبِ علم پھر غلطی پر رہا، غلطی اور اس پر اصرار، معاملہ سنگین تھا، خفا ہو کر اسے درسگاہ سے باہر نکال دیا اور فرمایا جو لوگ اتنے ناقص الاستعداد، کج فہم اور غبی ہوں کہ روزمرّہ آنے والے راویوں کے صحیح ناموں سے بھی واقف نہ ہوں اور بتلانے پر سمجھنے کی اہلیت سے محروم ہوں انھیں دورۂ حدیث میں شرکت کی اجازت نہیں ہے، دورانِ درس اگر کوئی طالبِ علم سوال کرتا تو اس سے بہت خوش ہوتے، اور نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ اس کے سوال کا جواب عنایت فرماتے، خواہش یہ رہتی کہ اپنے تلامذہ کو زیادہ سے زیادہ معلومات بہم پہنچادیں، درس۔

ذوق تفسیری

قاضی زین العابدین صاحب سجاد میرٹھیؒ

کتاب اللہ العظیم قرآن کریم کی جلالت وعظمت کے پیش نظر اس کے فہم وتفہیم اور تاویل وتفسیر کے آداب شروط پر علماء محققین نے مفصل گفتگو کی ہے (حافظ عمادالدین بن کثیر دمشقی۔ جلال الدین سیوطی۔ حافظ ابن تیمیہ، حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی، علامہ عبدہ المصری وغیرہم نے اپنے اپنے انداز میں داد تحقیق دی ہے) ماحصل یہ ہے کہ قرآن کریم جہاں تک ایمان کی تازگی، نصیحت پذیری، اقوام سابقہ کے واقعات سے عبرت اندوزی اور دینی ودنیوی فلاح وصلاح کے بنیادی اصول سے واقفیت سے تعلق ہے، وہ ایک آسان کتاب ہے اس کے صفحات ہر طالب حق کے لئے آئینہ رشد وہدایت ہیں/ یہی منشاء ہے اس ارشاد کا۔ ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر اور ہم نے قرآن کو نصیحت پذیری کے لئے آسان بنایا تو کیا ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا؟

لیکن جہاں تک قرآن کریم کے مقاصد عالیہ کو سمجھنے انکے اسرار وحکم سے واقفیت حاصل کرنے، اس سے احکام شرعیہ کو مستنبط کرنے اور زندگی کے ہر پہلو سے متعلق تفصیلی رہنمائی حاصل کرنے کا تعلق ہے علامہ سیوطی صاحب الاتقان نے پندرہ علوم میں مہارت شرط قرار دی ہے تاہم چند شرائط ضروری ہیں، پہلی شرط یہ ہے کہ عربی زبان کا صحیح ذوق ہو علوم ادبیہ پر گہری نظر ہو/ محاسن زبان واسالیب بیان کا اداشناس ہو کسی بھی زبان کے اُدباء وبلغاء کے کلام سے استفادہ کے لئے یہ بنیادی شرط ہے/ اقبال وغالب کے کلام کا مطالعہ بھی اس کے بغیر ممکن نہیں اس کلام کا کیا ذکر ہے

جس کے معانی کی طرح اس کے الفاظ بھی معجزانہ ہوں۔

(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ صاحب کتاب، مہبط وحی، رسول خداﷺ کی سنت سنیہ پر گہری نظر ہو۔ اس لئے کہ جب اللہ تعالی اپنے کسی مقدس بندہ کو رسالت کے لئے انتخاب فرماتا ہے تو اسے اپنے بھیجے ہوئے پیغام کو سمجھنے اور سمجھانے کی صلاحیت عطا فرماتا ہے۔

وما انزلنا علیک الکتاب الا لتبین لھم الذی اختلفوا فیہ

اے پیغمبر! ہم نے آپ پر یہ کتاب اسی لئے اتاری ہے تاکہ جن باتوں میں لوگوں میں اختلاف ہے آپ ان کی وضاحت کریں۔

پیغمبر کو اللہ تعالی کی طرف سے ایک خاص فہم عطا ہوتی ہے جس سے وہ کتاب اللہ کی تبین وتوضیح کرتا ہے وہ بھی وحی ہوتی ہے مگر غیر متلو، حافظ ابن حجرؒ امام شافعیؒ کے حوالے سے فرماتے ہیں۔

"والسنة ایضا تنزل علیہ بالوحی کماینزل القران الاانھالا یتلی کما یتلی القران (تفسیر ابن کثیر۔ مقدمہ مطبوعہ مصر)

یہی نہیں بلکہ اس کی زندگی کو حق شناسی اور خدا پرستی کے سانچہ میں ڈالکر امت کے لئے اسوہ اور نمونہ بنایا جاتا ہے۔

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنة.

تمہارے لئے اللہ کے پیغمبر کی ذات میں بہتر نمونہ زندگی ہے۔

پھر پیغمبر خداﷺ کے اقوال واعمال سے قطع نظر کر کے وحی الہی اور پیغام خداوندی سے کس طرح استفادہ کیا جاسکتا ہے/ دنیوی حکومتوں میں بھی کسی ملک کے سربراہ کے فرمان اور گورنمنٹ کی پالیسی کی وضاحت کے سلسلہ میں، اس ملک کے سفیر کا بیان ہی ذمہ دارانہ حیثیت رکھتا ہے اور اسی پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔

بہر حال قرآن کی تفسیر وتشریح کے لئے صاحب قرآنﷺ کی سنت سنیہ پر گہری نظر ضروری ہے/ اسی کے ساتھ اس مقدس گروہ کے اقوال وآثار پر بھی نظر ہونی چاہئے جس نے دبستان نبوت میں براہ راست پیغمبر خدا سے تعلیم حاصل کی اور جنہوں نے اس معاشرہ کی تشکیل کی جو قرآنی رنگ میں رنگا ہوا تھا علامہ ابن خلدون مقدمہ میں لکھتے ہیں:

وکان النبیﷺ یبین المجمل ویمیز الناسخ و

المنسوخ ويعرفه اصحابه فعرفوه وعرفوا سبب نزول
الايات و مقتضے الحال منها منقولا عنه (مقدمہ ابن
خلدون ۳۸۳ مطبوعہ مصر)

(۳) تیسری شرط ''تقوی'' ہے تقوی کے معنے ہیں اللہ تعالی سے ڈرنا اور اس کے نتیجہ میں ان باتوں سے احتراز کرنا جو اس کی ناراضی کا سبب ہو سکتی ہیں۔ تقوی کا ابتدائی درجہ یہ ہے کہ بندہ کے دل میں خدا کا ڈر ہو اور درجہ کمال یہ ہے کہ خوف خدا کے سبب نہ صرف ممنوعات شرعیہ کو چھوڑ دے بلکہ بعض ان مباحات سے بھی دستبردار ہو جائے جن کے متعلق اندیشہ ہو کہ وہ موصل الی المعاصی ہو سکتی ہیں۔

امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

ویتم ذالک بترک بعض المباحات لما روی الحلال بیّن
والحرام بیّن والحرام بین وبینهما مشتبهات ومن وقع
حول الحمی فحقیق ان یقع فیه(مفردات امام المرغب)

اس کی تکمیل بعض مباحات کے ترک سے ہوتی ہے کیونکہ پیغمبر ﷺ سے روایت ہے آپ نے فرمایا حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی اور ان دونوں کے درمیان مشتبہ چیزیں ہیں (لہذا بڑی احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ) جو شخص محفوظ چراگاہ کے آس پاس اپنے جانور چرائے گا وہ اسمیں داخل ہو سکتا ہے۔

پھر جس طرح تقوی کے مدارج ہیں اسی طرح ہدایت کے بھی درجات ہیں قرآنی ہدایت کا ابتدائی درجہ حاصل کرنے کے لئے تقوی کا ابتدائی درجہ ضروری ہے/ چنانچہ فرمایا گیا ھدی للمتقین (راہ بتاتی ہے ڈر والوں کو)

حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے مذکوہ بالا ترجمہ فرما کر بہت سے شبہات کو ختم فرما دیا، ظاہر ہے کہ جس کے دل میں خوف خدا نہ ہوگا وہ خدا کی کتاب سے کیا فائدہ اٹھا سکتا ہے؟

البتہ ہدایت کے اعلیٰ درجہ تک وصول تقوی کے اعلیٰ درجہ کے حصول پر منحصر ہے/ اس لئے معارف قرآنی سے کما حقہ، وہی بہرہ اندوز ہو سکتا ہے جسے تقوی کا اعلی درجہ حاصل ہو، لہذا مفسر قرآن کے لئے ضروری ہے کہ وہ متقی بھی ہو اس کا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ تفسیر قرآنی میں وہ خواہش

نفسانی کا پیرو نہ ہو سکے گا اور اس کی تفسیر، تفسیر بالرائے نہ ہوگی۔

(۴) یہ تینوں صفات جن کا ذکر کیا گیا اکتسابی ہیں، ان کے علاوہ ایک صفت اور بھی ہے جس کا تعلق محض اللہ تعالی کی موہبت وکرم سے ہے/ جس طرح پیغمبر خدا کو خدا کی طرف سے ایک خاص فہم اور ایک مخصوص بصیرت نبوت عطا ہوتی ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے بعض نیک نہاد اور پاک باز بندوں کو بھی اس نور بصیرت کا کچھ حصہ ملتا ہے اگر چہ اس کے لئے تقوی شرط ہے مگر علت نہیں/ یعنی ضروری نہیں کہ جو متقی ہو اسے یہ نور بصیرت بھی عطا ہو۔ علامہ سیوطی فرماتے ہیں:

علم الموهبة وهو علم يورثه الله تعالى لمن عمل بما علم ورثه واليه الا شارة بحديث من عمل بما علم الله تعالى علم مالم يعلم(الاتقان ۲ / ۱۸۱ مطبوعه ازهريه مصر)

یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام میں بعض صغیر السن صحابہ کو اس حصہ خداوندی کا حصہ ان حضرت سے زیادہ مل گیا جو مقابلۃً صحبت رسول اللہ ﷺ سے زیادہ مستفید ہوئے تھے/ چانچہ حضرت عبداللہ ابن عباس جو اصاغر صحابہ میں تھے قرآن فہمی میں امتیازی مقام رکھتے تھے حضرت عمر جیسے جلیل القدر صحابی تفسیر قرآن میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے اور عبداللہ بن مسعودؓ جیسے فاضل صحابی کا قول تھا کہ:

نعم ترجمان القران عبدالله بن عباس

اس کا سبب پیغمبر خدا ﷺ کی دعاء بھی تھی۔

اسی طرح ہندوستان میں حضرت الامام الحجۃ شاہ ولی اللہ الدہلویؒ کا خانوادہ یوں تو سب کا سب ''ایں خانہ ہمہ آفتاب است'' کا مصداق تھا مگر یہ امر مسلم ہے کہ اللہ تعالی نے فہم قرآن کے باب میں حضرت شاہ عبدالقادر کو جو بصیرت خصوصی عطا فرمائی تھی اسمیں ان کا کوئی شریک وسہیم نہ تھا۔

اس تفصیل کے بعد میں یہ عرض کروں گا کہ حضرت الامام علامہ انور شاہ کشمیریؒ میں یہ تمام صفات بدرجہ کمال پائی جاتی تھیں، عربی تقریر وتحریر اور نظم ونثر پر قدرت میں وہ مصر وشام کے ادباء کے ہم پلہ تھے، ان کی عربی زبان میں برجستہ تقریری ان کی عربی تصنیفات ان کے بلند پایہ عربی قصائد ادب عربی ہیں، ان کے کمال اور ان کے اعلی لسانی ذوق کے شاہد عادل ہیں

۱۳۲۰ھ میں علامہ رشید رضا مصری مدیر المنار کی دیوبند تشریف آوری پر حضرت شاہ

صاحبؒ نے علماء دیوبند کی درس حدیث کی خصوصیات پر جو محدثانہ ومحققانہ برجستہ عربی تقریر ارشاد فرمائی اس کو سن کر سننے والے حیران رہ گئے اور علامہ رشید رضا کا تو حال یہ تھا کہ بار بار کرسی سے اٹھتے تھے اور فرماتے تھے:

"ما رایت مثل ھذا الرجل قط " (نظام تعلیم وتربیت از مولانا مناظر احسن گیلانی) حضرت شاہ صاحبؒ کے ارتجالاً شعر کہنے کا خود راقم الحروف کو ذاتی تجربہ ہے ۱۹۲۹ء کا ہنگامہ خیز دور تھا حضرت والا دولت کدے پر بیرونی ومقامی اصحاب کے مجمع میں گھرے بیٹھے تھے کچھ اخبار نویس ہنگامہ دیوبند سے متعلق آپ کا بیان لے رہے تھے/ کشمیر کے ایک مہمان بھی حضرت سے مصروف گفتگو تھے، عین اس وقت یہ ظلوم وجہول بڑھا اور حضرت کے سامنے اپنا ایک تازہ قصیدہ جسے اخبار میں چھپوانا تھا پیش کر دیا/ حضرت نے اس بیبا کی اور بے ادبی پر تنبیہ کے بجائے قلم ہاتھ میں لیکر فوراً مصرعے کے مصرعے تبدیل فرما دئے یہ اصلاح شدہ قصیدہ میرے پاس محفوظ ہے۔

جہاں تک سنت رسول ﷺ کا تعلق ہے اس سلسلہ میں کچھ کہنا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے کم از کم آپ کے زمانے میں اور اس کے بعد پورے عالم اسلام میں اس شان کا محدث پیدا نہیں ہوا/ علماء ہند ہوں یا فضلائے مصر وشام وحجاز یہ سب ہی کا متفقہ فیصلہ ہے۔ علامہ رشید رضا کے فضل وکمال سے وہ لوگ واقف ہیں جنہوں نے آپ کی مرتبہ تفسیر المنار کا مطالعہ کیا ہے/ ان کا اعتراف اوپر گذر چکا ہے/ ایک دوسرے عالم اسلام کے عہد حاضر کے فاضل علامہ زاھد الکوثری نے حضرت شاہ صاحب کی بعض تصنیفات کا مطالعہ کرنے کے بعد فرمایا:

"احادیث سے دقیق مسائل کے استنباط میں شیخ ابن ہمام صاحب فتح القدیر کے بعد ایسا محدث وعالم امت میں نہیں گزرا"

تیسری شرط تقوی تھی/ اس سلسلہ میں ماضی قریب کے ایک جلیل القدر بزرگ مرشدنا حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کا ایک ارشاد نقل کرنا کافی ہے۔ آپ نے فرمایا:

"ایک دفعہ سنہری مسجد مدرسہ امینیہ میں گیا تو دیکھا کہ حضرت حجرہ میں دروازہ بند کئے ذکر جہری میں مصروف ہیں آپ اس زمانہ میں جوان العمر ہی تھے آپ کا دستور تھا کہ بازار تشریف لے جاتے تو سر پر رومال ڈال کر آنکھوں کے سامنے

پردہ کر لیتے کہ مبادا کسی غیر محرم پر نظر پڑ جائے۔"

چوتھی شرط موہبت خداوندی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب اللہ تعالیٰ کے اس انعام سے بھی بہرہ اندوز تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تفسیر قرآن کریم اگر چہ آپ کا موضوع نہ تھا مگر احادیث پر گفتگو فرماتے ہوئے ضمناً یا بخاری شریف کی کتاب التفسیر سے گزرتے ہوئے جہاں کہیں جو کچھ آپ نے تفسیر قرآن کریم کے سلسلہ میں فرما دیا ہے وہ قول فیصل اور حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اب میں اس سے قبل کہ حضرت علامہ کے تفسیری افادات میں سے چند درر غرر آپ کے سامنے پیش کروں ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں:

یہ بات امر واقعہ ہے کہ علوم قرآنیہ پر وسیع نظر کے باوجود حضرت شاہ صاحب حافظ قرآن نہ تھے، مولانا مناظر احسن گیلانی نے لکھا ہے کہ میں نے حضرت شاہ صاحب سے عرض کیا: حضرت آپ کا حافظہ تو قرآن کریم کو چند دنوں میں حفظ کر سکتا تھا پھر کیا بات ہے (کہ آپ نے قرآن حفظ نہ کیا) حضرت شاہ صاحب نے جواب دیا "قسمت بخت واللہ اعلم،، مولانا گیلانی نے اس بیان کو ڈاکٹر رضوان اللہ صاحب ریڈر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے بھی اپنے مقالہ میں نقل کیا ہے۔ مولانا گیلانی کو حضرت شاہ صاحبؒ نے یہی جواب دیا ہوگا۔ مگر میں نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں اپنے دوست مولوی جمیل الدین صاحب میرٹھی (حال ریٹائرڈ رجسٹرار جامعہ عباسیہ بہاولپور) سے سنا کہ کسی نے حضرت شاہ صاحب سے یہی سوال کیا تو آپ نے فرمایا "بچپن میں تو والدین نے اس طرف متوجہ نہ کیا اب یہ ممکن نہ رہا۔ اس لئے کہ قرآن کریم کی جو آیت پڑھتا ہوں معارفِ قرآنیہ کا ایک طوفان سا اُمڈ آتا ہے۔ الفاظ ذہن سے نکل جاتے ہیں اور معانی و مطالب کی وادیوں میں گم ہو جاتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اصل بات یہی تھی تاہم جہاں تک اپنی معلومات ہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ کو قرآن کریم پر بڑی دسترس حاصل تھی۔ مجھے ایک واقعہ یاد ہے کہ قادیانیوں نے میرٹھ کنٹونمنٹ کی ایک مسجد پر قبضہ کرنا چاہا مسلمانوں نے مزاحمت کی۔ حکومت نے تصفیہ کے لئے نواب اسماعیل خاں مرحوم کو ثالث مقرر کر دیا صورت مناظرہ کی سی پیدا ہو گئی۔ قادیانی مولوی نے کہا ہم غیر آباد مسجد کو آباد کرنا چاہتے ہیں اور یہ لوگ ہمیں روکتے ہیں۔ پھر قرآنِ کریم کی یہ آیت پڑھی:

ومن اظلم ممن منع مساجد اللہ ان یذکر فیھا اسمه وسعیٰ فی خرابھا

(اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہوسکتا ہے جس نے اللہ کی مسجدوں میں اس کا ذکر کرنے سے روکا اور ان کو اجاڑنے کی کوشش کی)

حضرت شاہ صاحب نے برجستہ جواب دیا:

ومن اظلم ممن افتریٰ علی الله کذبااو قال اوحی الیّ ولم یوح الیه شیئی.

(اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہوسکتا ہے جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان باندھے یا کہے کہ مجھ پر وحی اتری ہے حالانکہ اس پر قطعاً وحی نہیں اتری۔)

اب میں اپنے موضوع پر آتا ہوں اور حضرت شاہ صاحب کے تفسیری ذوق کے چند نمونے آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں:

قرآن کریم میں سورہ حج میں فرمایا گیا ہے:

وما ارسلنا من قبلک من رسول ولا نبی الا اذا تمنی القی الشیطان فی امنیته فینسخ الله ما یلقی الشیطان ثم یحکم الله ایاته والله علیم حکیم ۵

یہ آیۃ مہمات آیات میں سے ہے مفسرین قدیم وجدید نے اس کی تفسیر میں اپنے اپنے ذوق کے مطابق نکتہ سنجیاں کی ہیں مدار بحث یہ امور ہیں کہ تمنی کے معنے آرزو کرنا ہے یا پڑھنا، امنیة سے آرزو اور خواہش مراد ہے یا کلام، القاء الشیطان سے شیطان کی وسوسہ اندازی مراد ہے یا دخل اندازی یا مزاحمت اور آیات کے احکام سے کیا مقصود ہے؟

قاضی بیضاویؒ نے تین اقوال اس کی تفسیر میں نقل کئے ہیں جن میں سے دو میں غرانیق سے لیا ہے اس قصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ قریش کی مجلس میں بیٹھے اور آپ نے ان کو سورہ النجم سنائی تو افرأیتم اللّٰت والعزی ومنوۃ الثالثة الاخری کے بعد آپ کی زبان مبارک سے سبقت لسانی سے یہ الفاظ نکل گئے تلک الغرانیق العلی یا شیطان نے آپ کی آواز میں آواز ملا کر کہدئے۔

یہ قصہ روایت کے اعتبار سے ساقط الاعتبار اور مفہوم کے لحاظ سے مردود ہے اگر اسے صحیح تسلیم کر لیا جائے تو صاحب وحی کی عظمت الٰہی کی حجیت مجروح ومشکوک ہو کر رہ جاتی ہے حالانکہ سارے دین کی بنیاد انہی پر ہے/ علامہ قسطلانی نے لکھا ہے کہ اس کی سند میں مختلف ائمہ نے

طعن کیا ہے یہاں تک ابن اسحاق امام سیرۃ نے کہہ دیا ہے کہ یہ زندیقوں کا گھڑا ہوا ہے اور خود قاضی صاحب نے بھی لکھ دیا ہے کہ کسی صاحب صحیح محدث نے اس کا ذکر نہیں کیا/ قاضی صاحب کے تیسرے قول کا جسے انہوں نے مرجح قرار دیا ہے خلاصہ یہ ہے کہ ہر رسول اور نبی کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا کہ جب اس نے کوئی آرزو کی تو شیطان اس کی آرزو میں وہ باتیں ڈال دیتا تھا جن سے وہ دنیا میں الجھ جائے (اذا زور فی نفسه ما یهواه القی الشیطان فی تشهیه ما یوجب اشتغاله بالدنیا) پھر اللہ تعالیٰ اس القاء شیطان کو نابود کر دیتا تھا اس تفسیر میں انہوں نے تمنی سے آرزو کرنا امنیۃ سے آرزو اور القاء الشیطان سے شیطان کا اس میں آمیزش کرنا مراد لیا ہے۔

یہ تفسیر اگر چہ عصمت نبوت کی قادح نہیں مگر عظمت نبوت کے منافی ہے علامہ جلال الدین محلی اور حافظ عماد الدین ابن کثیرؒ نے بھی ان ہزلیات کا اپنی تفسیروں میں ذکر کر دیا ہے اگر چہ حافظ صاحب نے بعد میں فرما دیا:

ولکنها من طریق کلهامرسلة ولم ارهامسندةمن وجه صحیح (تفسیر ابن کثیر ج ۳/ ۲۲۹)

مشہور مفسرین و مترجمین ہند میں سے کسی نے اپنے ترجمہ وتفسیر کی بنیاد ان لغویات پر نہیں رکھی۔ اب میں اختصار کے ساتھ پہلے چند بزرگوں کے ترجمے اور مختصر طور پر تشریحی جملے پیش کروں گا پھر حضرت علامہ کشمیریؒ کی پسندیدہ تفسیر بیان کروں گا۔

(۱) حضرت امام الہند شاہ ولی اللہ الدہلوی اس آیہ کے ذیل میں لکھتے ہیں:

''ونہ فرستادیم پیش از تو ہیچ فرستادہ ونہ ہیچ صاحب وحی الا چوں آرزوے بخاطر بست بیفگند شیطان چیزے در آرزوے وے/ پس دور می کند خدا انچہ شیطان انداختہ است باز محکم می کند خدا آیات خود را و خدا دانا و باحکمت است'' اس پر حاشیہ ہے/ مثلاً آں حضرت ﷺ بخواب دیدند کہ ہجرت کردہ اند بزمینے کہ نخل بسیار دارد۔ پس وہم بجانب یمامہ و ہجر رفت و در نفس الامر مدینہ بود الخ'' مذکورہ بالا تفسیر میں القاء الشیطان سے مراد یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کوئی خواب دیکھتے تھے تو کبھی کبھی اپنی طبیعت کے میلان کی بناء پر اس کی تعبیر میں مقام یا وقت کے تعین میں مسامحت ہو جاتی تھی پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کے ذریعہ یا اس واقعہ کے ظہور کے ذریعہ اس مسامحت کو دور فرما دیا جاتا تھا۔

آپ کے فرزند ارجمند حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ فرماتے ہیں:

(۲) اور جو رسول بھیجا ہم نے تجھ سے پہلے یا نبی، سو جب لگا خیال باندھنے شیطان نے ملا دیا اس کے خیال میں/ پھر اللہ ہٹاتا ہے شیطان کا ملایا پھر پکی کرتا ہے اپنی باتیں اور اللہ سب خبر رکھتا ہے حکمتوں والا۔

حضرت شاہ صاحبؒ فوائد میں رقمطراز ہیں:

نبی کو ایک حکم آتا ہے اس میں ہرگز تفاوت نہیں اور ایک اپنے دل کا خیلل اس میں جیسے اور آدمی کبھی خیال ٹھیک پڑا کبھی نہ پڑا جیسے حضرت، نے خواب میں دیکھا کہ مدینہ سے مکہ گئے عمرہ کیا خیال آیا کہ شاید اب کے برس ٹھیک پڑا اگلے برس یا وعدہ ہوا کافروں پر غلبہ ہوگا خیال آیا اب کے لڑائی میں/ اسمیں نہ ہوا/ پھر اللہ بتا دیتا ہے کہ جتنا حکم تھا اس میں تفاوت نہیں۔ مقصد دونوں بزرگوں کا ایک ہی ہے مگر الجھن یہ پیدا ہوتی ہے کہ کیا نبی کی وحی میں (اگر چہ وہ خواب ہی کی صورت میں ہو) غلط خیال کی آمیزش ہو سکتی ہے اور نبی اس خیال کی بنیاد پر کوئی ایسا اہم اقدام کر سکتا ہے جیسا کہ واقعہ حدیبیہ میں کیا گیا۔

(۳) حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ ترجمہ فرماتے ہیں:

"ہم نے آپ سے قبل کوئی رسول اور کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا جس کو یہ قصہ پیش نہ آیا ہو کہ جب اس نے کچھ پڑھا شیطان نے اس کے پڑھنے میں شبہ ڈالا/ پھر اللہ تعالیٰ شیطان کے ڈالے ہوئے شبہات کو نیست و نابود کر دیتا ہے پھر اللہ تعالیٰ اپنی آیات کو زیادہ مضبوط کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ خوب علم والا حکمت والا ہے۔"

حضرت تھانوی نے تمنی کو بمعنی قراۃ لیا ہے جو اس کے مجازی معنی ہیں اور امنیة کو بمعنی متلو لیکر اس سے آیات متشابہت مراد لی ہے/ اور القاء الشیطان کی وسوسہ اندازی اور احکام آیات سے آیات محکمات کی تنزیل۔

(۴) مفسر عصر حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے بھی اپنے فوائد القرآن میں اسی موقف کو اختیار فرما کر اس کی مزید وضاحت فرمائی ہے آپ لکھتے ہیں:

"احقر کے نزدیک بہترین اور سہل ترین تفسیر وہ ہے جس کی مختصر اصل سلف سے منقول ہے یعنے تمنی کو بمعنی قراۃ و تلاوت یا تحدیث کے اور امینة کو بمعنی "متلو یا حدیث" کے لیا جائے مطلب یہ ہے کہ قدیم سے یہ عادت رہی ہے کہ جب کوئی نبی یا رسول کوئی بات بیان کرتا یا اللہ کی آیات پڑھ کر سناتا ہے شیطان اس کی بیان کی ہوئی بات یا آیت میں طرح طرح کے شبہات ڈالتا

ہے/ یعنی بعض باتوں کے متعلق بہت لوگوں کے دلوں میں وسوسہ اندازی کر کے شکوک وشبہات پیدا کر دیتا ہے/ مثلاً نبی نے آیہ حرمت علیکم المیتۃ پڑھ کر سنائی شیطان نے شبہ ڈالا کہ دیکھو اپنا مارا ہوا تو حلال اور اللہ کا مارا ہوا حرام کہتے ہیں/ اس القاء شیطانی کے ابطال ورد میں پیغمبر علیہ السلام اللہ تعالی کی وہ آیات سناتے ہیں جو بالکل صاف اور محکم ہوں اور ایسی پکی باتیں بتاتے ہیں جن کو سن کر شک وشبہ کی قطعاً گنجائش نہ رہے/ گویا متشابہات کی ظاہری سطح کو دیکھ کر شیطان جو اغوا کرتا ہے آیات محکمات اس کی جڑ کاٹ دیتی ہیں/ جنہیں سنکر شکوک وشبہات کافور ہو جاتے ہیں۔''

یہ تفسیر وتوضیح سادہ اور واضح ہے مگر اس میں بھی خلجان یہ پیدا ہوتا ہے کہ انداز کلام سے متبادر ہوتا ہے کہ ہر نبی اور رسول کے ساتھ یہ صورت پیش آئی کہ جب اس نے آیات متشابہت اپنی قوم کو سنائیں تو شیطان نے ان میں شکوک وشبہات پیدا کئے/ پھر اللہ تعالی نے آیات محکمات نازل فرما کر ان شبہات کو دور فرما دیا/ حالانکہ ہر نبی کے لئے صاحب کتاب ہونا بھی ضروری نہیں۔

نیز یہ بھی واقعہ ہے کہ تمنی کے حقیقی معنی آرزو کرنا ہی ہیں قرأۃ کے معنی ہیں اس کا استعمال مجازی ہے۔ جیسا کہ امام راغب کی تشریح سے مستفاد ہوتا ہے۔

(۵) اب میں اس تفصیل کو مختصر کر کے حضرت الامام الکشمیری ؒ کی اختیار فرمودہ تفسیر پیش کرتا ہوں آپ فرماتے ہیں:

''انبیاء کرام کی تمنی سے مراد وہ آرزو ہے جو ان کے دلوں میں اپنی امتوں کے ایمان کے بارے میں پیدا ہوتی ہے کہ کاش سب ہی ایمان لے آتے اور القاء الشیطان سے مراد شیطان کا ان کی امت کے لوگوں کو اغوا کرنا اور ایمان کے راستہ سے ان کو روکنا ہے/ جس کے نتیجہ میں وہ ان کی آرزو کے مطابق ایمان قبول نہیں کرتے اور یہ ایک بلیغ محاورہ ہے کہا جاتا ہے فلان القی فی امنیتی یعنی فلاں میرے اور میری آرزو کے درمیان حائل ہو گیا اس کے بعد اللہ تبارک وتعالی جو اسے منظور ہوتا ہے کرتا ہے جن کی تقدیر میں ایمان لانا ہوتا ہے ایمان لاتے ہیں اور شیطان ان کے معاملہ میں کامیاب نہیں ہوتا لیکن جن کے۔ لئے بدبختی مقدر ہو چکی ہوتی ہے وہ اس کے حال میں پھنس جاتے ہیں اور کافر بن جاتے ہیں یہی معنی ہیں۔'' فینسخ اللہ مایلقی الشیطان ثم یحکم اللہ ایاتہ کے۔''

(اماَ وجہ الایہ فاقول ان تمنی الانبیاء علیھم السلام عبارۃ عما

تتحدث به انفسهم فی حق ایمان اممهم انهم لو امنو اکلهم والقاء الشیطن فیها عبارۃ عن اغوائه ایاهم وصدِّهم عن سبیل الایمان فلایو منون حسب امنیتهم وهذہ محاورۃ بلیغة یقال فلان القی فی امنیتی ای حال بینی وبینها ثم الله یفعل فیهم ماهو فاعل، فیومن من قدر لهم الایمان ولا ینحج فیهم اللّعین واما من قدرت له الشقاوۃ فیتبعونه فیکفرون وهو معنی قوله فینسخ الله ما یلقی الشیطان ثم یحکم الله ایاته. (فیض الباری، ج۴،ص۲۰۹

اس تفسیر کا ماخذ صاحب تبریز کی تشریح ہے جیسا کہ حضرت مولانا بدر عالم نے اس طرف اشارہ کیا ہے/ اس صورت میں حضرت علامہ کشمیری کی تفسیر کی توضیح یہ ہوگی۔

ہر پیغمبر غایت شفقت امت کی بناء پر یہ تمنا لے کر اٹھتا ہے کہ میری ساری قوم میری دعوت اصلاح وہدایت کو قبول کرے/ مگر شیطان اس کی اس تمنا کو ناکام بنانے کے لئے قوم کے دلوں میں طرح طرح کی وسوسہ اندازیاں کرتا ہے اور ان کو راہ ہدایت سے روکنے کے لئے/ ہر کوشش عمل میں لاتا ہے/ یہ وسوسے یوں تو سب ہی کے دلوں میں ڈالے جاتے ہیں مگر جن کے دل روگی ہوتے ہیں/ سنّت الٰہی کے مطابق ان کے دلوں میں یہ وسوسہ سے پھولتے پھلتے ہیں اور آخر میں انہیں کافر بنا کر چھوڑتے ہیں اور جن کے دلوں میں قبول حق کی صلاحیت موجود ہوتی ہے اللہ تعالیٰ ان کے دلوں سے ان فتنہ کی جڑوں کو اکھاڑ کر پھینکتا ہے اور اپنی آیات کی صداقت اور دین کی حقانیت کو ان پر آشکارا کر کے ایمان ویقین کی دولت سے ان کو مالا مال کر دیتا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی اس تفسیر کی بناء پر تمنی کے حقیقی معنی ترک کر کے مجازی معنی مراد لینے کی ضرورت پیش نہیں آتی نہ آیت کے عموم میں خلل پڑتا ہے اور نہ کوئی ایسی بات مفہوم ہوتی ہے جو عصمت نبی یا عظمت نبوت کے خلاف ہو۔

حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ نے بھی حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے سے اتفاق کیا ہے اور قریب قریب وہی بات کہی ہے جو حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمائی ان کا ترجمہ یہ ہے:

"اور اے پیغمبر! ہم نے تجھ سے پہلے جتنے رسول اور جتنے نبی بھیجے، سب کے ساتھ یہ معاملہ ضرور پیش آیا کہ جوں ہی انہوں نے اصلاح وسعادت کی آواز کی شیطان نے ان کی آرزو میں کوئی نہ کوئی فتنہ کی بات ڈال دی اور پھر اللہ نے اس کی وسوسہ اندازیوں کا اثر مٹایا اور اپنی نشانیوں کو اور زیادہ مضبوط کر دیا۔ وہ سب کچھ جاننے والا (اپنے سارے کاموں میں) حکمت والا ہے"

واضح رہے کہ ترجمان القرآن حصہ دوم کے مقدمہ میں اس کی تاریخ تکمیل ترتیب،۱۲اپریل ۱۹۳۶ءمندرج ہے اور حضرت شاہ صاحبؒ کی تاریخ وفات اس سے تین سال قبل ۲۹ مئی ۱۹۳۳ء ہے۔

اب حضرت علامہ کشمیریؒ کی دوسری نکتہ نخی ملاحظہ ہو۔

سورہ بقرہ میں روزہ کے احکام کے سلسلہ میں فرمایا گیا ہے:

یا ایھا الذین امنو کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون o ایاما معدددات فمن کان منکم مریضا او علی سفر فعدة من ایام اخر ط وعلی الذین یطیقو نه ففدیة طعام مسکین .

حضرت شیخ الہندؒ نے یہ ترجمہ فرمایا ہے:

''اے ایمان والو! فرض کیا گیا تم پر روزہ جیسے فرض کیا گیا تھا تم سے اگلوں پر تاکہ تم پرہیزگار ہو جاؤ چند روز ہیں گنتی کے/ پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا مسافر تو اس پر ان کی گنتی ہے اور دنوں سے اور جن کو طاقت ہے روزہ کی ان کے ذمہ بدلا ہے ایک فقیر کا کھانا''

اس آیہ کا آخری ٹکڑا مفسرین کرام میں زیر بحث رہا ہے/ عام طور پر یہی کہا گیا ہے کہ ابتداء اسلام میں چونکہ روزہ رکھنے کی لوگوں کو عادت نہ تھی اور یہ امر ان پر بہت شاق گذرتا تھا/ اس لئے اس وقت ان کو اجازت دی گئی تھی کہ چاہیں روزہ رکھیں جو بہتر ہے اور چاہیں ایک مسکین کو دو وقت کا کھانا کھلا کر اس کا فدیہ دیدیں/ پھر یہ حکم جب لوگ روزہ کے عادی ہو گئے دوسری آیت **شھر رمضان الذی انزل فیه القران ھدی للناس و بینت من الھدی والفرقان فمن شھد منکم الشھر فلیصمه الخ** سے منسوخ فرمادیا گیا، حضرت شیخ الہندؒ نے بھی اسی قول کے مطابق ترجمہ فرمایا ہے، اگرچہ آپ نے فوائد میں دوسرے قول کا بھی ذکر کیا ہے، مگر اکثر محققین جو نسخ کے دائرہ کو وسیع نہیں کرتے اس آیت کو منسوخ نہیں مانتے انہوں نے اسے محکم قرار دینے کے لئے مختلف توجیہات فرمائی ہیں

(۱) مفسر جلالؒ اور بعض دوسرے مفسرین نے یطیقون سے پہلے حرف نفی لا مقدر مانا ہے یعنے جو لوگ روزہ کی طاقت نہیں رکھتے، ان کے ذمہ فدیہ ہے ایک مسکین کا کھانا۔ اور اس کا محمل شیخ فانی وغیرہ کو قرار دیا ہے۔

مگر جیسا کہ حضرت علامہ کشمیریؒ نے فرمایا ہے:

''یہ بڑی خطرناک توجیہ ہے۔ اس سے کلام خداوندی سے امان اٹھ جاتا ہے/ مثبت اور منفی کے درمیان فرق باقی نہیں رہتا۔ ہر باطل کوش کسی بھی حکم میں لا محذوف مان کر حکم کو ختم کرسکتا ہے۔''

(۲) بعض دوسرے جلیل القدر مفسرین نے اطاقہ میں باب افعال کی خاصیت سلب ماخذ مانی ہے/ اس صورت میں لا مقدر ماننے کی ضرورت باقی نہیں رہتی/ چنانچہ التفسیرات الاحمدیہ میں شمس الائمہ کے حوالہ سے نقل کیا گیا ہے **ان قولہ تعالی یطیقونہ من الاطاقة والماضی اطاق والهمزة فیه للسلب** مگر اس قول میں یہ ضعف ہے کہ خاصیت ابواب سماعی ہیں قیاسی نہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ اپنی مختصر تفسیر فتح الرحمٰن میں **یطیقونہ** کی ضمیر کو فدیہ کی طرف راجع کرتے ہیں اور فدیہ سے صدقۃ الفطر مراد لیتے ہیں یعنی جو لوگ صدقۃ الفطر ادا کرنے کی طاقت رکھتے ہیں ان پر اس کی ادائیگی واجب ہے/ مگر اس صورت میں اضمار قبل الذکر لازم آتا ہے اگر توجیہہ لطیف ہے، حضرت شاہ ولی اللہ دوسری توجیہہ میں **یطیقونہ** کی ضمیر کو آیہ سابقہ **فمن کان منکم مریضا الخ** کے مفہوم کی طرف راجع فرماتے ہیں اور مراد یہ لیتے ہیں کہ جو لوگ حالت مرض وسفر کے روزوں کی قضا کرسکتے تھے مگر انہوں نے اسکی قضا نہ کی یہاں تک کہ دوسرا رمضان آ گیا ان کے ذمہ واجب ہے کہ وہ فدیہ ادا کریں یہ مذہب امام شافعیؒ کا ہے اس صورت میں ایک جملہ مقدر ماننا پڑے گا۔

صاحب ''المنار'' علامہ رشید رضا اپنے استاد علامہ عبدہ مصری سے ایک اور توجیہہ نقل کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ **اطاقہ** کے معنی ہیں کسی کام کو بمشکل کرسکنا اطاقہ قوت وقدرت کے ادنی درجہ پر استعمال ہوتا ہے عرب **اطاق الشیئی** کا استعمال اس صورت میں کرتے ہیں جبکہ اس پر قدرت نہایت ضعیف ہو کہ اس میں مشقت شدیدہ اٹھانی پڑے تو اس صورت میں معنی یہ ہونگے کہ ''جو لوگ روزہ رکھتے ہوئے سخت تکلیف محسوس کرتے ہوں مثلاً شیخ کبیر یا وہ مریض جس کی صحت یابی کی امید باقی نہ رہے تو انہیں اجازت ہے کہ وہ روزہ نہ رکھیں اور اس کے بدلہ میں فدیہ دے دیں (علامہ مصری اس ذیل میں کان کے مزدوروں کو جنہیں کوئلہ وغیرہ کھودنا پڑتا ہے اور اسی نوعیت کے دوسرے سخت جسمانی مشقت کے کام کرنے والوں کو شامل کر لیتے ہیں) (تفسیر المنار ج ۲، ص ۱۵۶)

یہ قول دراصل صاحب کشاف کے کلام سے ماخوذ ہے جیسا کہ حضرت علامہ کشمیریؒ

نے اس کی وضاحت فرمائی ہے اور صحیح بخاری میں مجاہد کی جو روایت حضرت ابن عباس کے متعلق ہے کہ کان یقرأ وعلی الذین یطیقوقونه فدیة طعام مسکین اوراس کی تشریح یحملونه سے کی گئی ہے وہ اس کی مؤید ہے۔

حضرت العلامۃ الاستاد الامام الکشمیریؒ کی رائے اس سلسلہ میں منفرد ہے۔
آپؒ فرماتے ہیں:

ذهب عامة المفسرين الى ان تلك الايات نزلت فى شهر رمضان و عندى لا مساس لها برمضان وانما هى فى الايام البيض وعاشوراء.

فريضة قبل رمضان ولذا قال اياما معدودات فتعبيره با لا يام ادل واصدق على تلك و الايام من رمضان كما يشهد به الذوق الصائب (فمن كان منكم مريضا او على سفر فعدة من ايام اخر) اى من لم يصم تلك الايام لمرض او سفر فعليه ان يقضيها فى غير تلك الايام (وعلى الذين يطيقونه فدية طعام مسكين و فى قرأة يطوقونه وهذا لحكم ايضا يتعلق با لا يام البيض ولا تعلق له بر مضان يدل عليه ما اخر جه ابو داؤد حديث احوال الصلواة والصيام عن معاذ پھر فرماتے هيں :.فهذا نص فى ان تلك الايات فى حق ايام البيض و انما افترض صيام رمضان من قوله (شهر رمضان الذى انزل فيه القران الآيه)ومن ههنا ظهر وجه قوله كما كتب على الذين من قبلكم فان تلك الصيام كانت فى الامم السابقه ايضا بخلاف رمضان و حينئذ لا حاجة الى التاويل فى آية الفداء الخ .

(فیض الباری کتاب الصوم ج ۳، ۱۴۵)

حضرت العلامہ الامام الکشمیریؒ کی رائے کا خلاصہ یہ ہے کہ:

ان آیات (يا ايها الذين امنو كتب عليكم الصيام الخ) کا تعلق ماہ رمضان کے روزوں سے نہیں بلکہ ایام بیض اور عاشوراء کے روزوں سے ہے جو ابتداء اسلام میں فرض تھے/

ان ہی کے متعلق یہ حکم تھا کہ جو شخص مریض ہو یا مسافر وہ دوسرے دنوں میں ان کی قضا کرے اور یہ بھی اجازت تھی کہ جو روزہ کی طاقت رکھتے ہوں وہ بھی روزہ نہ رکھیں اور اس کے بدلہ میں فدیہ ادا کریں بعد میں آیات شھر رمضان الذی انزل فیه القرآن اتریں۔ان سے رمضان کے روزوں کی فرضیت کا حکم ثابت ہوا۔ ایام بیض اور عاشوراء کی فرضیت ختم ہو گئی البتہ اس کا استحباب باقی رہا۔ مریض اور مسافر کا حکم ان آیات میں بھی بتایا گیا کہ وہ ان روزوں کی قضاء دوسرے دنوں میں کرلیا کریں۔ ان ہی پر شیخ کبیر کو قیاس کیا جائے گا/ کیونکہ عذر مشقت دونوں میں مشترک ہے/ اس لئے اجازت افطار ان کو بھی دی جائے گی/ مگر چونکہ ان کا عذر مستقل ہے، اس لئے بجائے قضاء کے فدیہ ادا کرنا کافی ہوگا/ حضرت شاہ صاحب نے اپنی اس رائے پر حدیث معاذ سے جو ابوداء کے باب احوال لصلوات والصیام میں مذکور ہے/ استدلال فرمایا ہے۔ حضرت شاہ صاحب کی اس رائے پر ایاما معدودات کا اطلاق بھی برمحل ہو جاتا ہے/ کیونکہ گنے چنے ان ایام بیض اور عاشورہ ہی کے تھے، کما کتب علی الذین من قبلکم کی تشبیہ بھی صحیح ہو جاتی ہے اس لئے کہ امم سابقہ پر ان ہی دنوں کے روزے فرض تھے/ مریض اور مسافر کے حکم میں تکرار بھی باقی نہیں رہتی/ کیونکہ دونوں کے محل مختلف ہیں اور یطیقونہ کی تاویل کی زحمت سے بھی نجات مل جاتی ہے کہ اسکا تعلق ہی صیام رمضان سے نہیں فل للّٰہ درہ۔

واذ قال ربک للملائکة انی جاعلی فی الارض خلیفة الخ

قرآن کریم میں بدر آفریش عالم کے بیان میں ایک واقعہ کا ذکر فرمایا گیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب خالق کائنات نے دنیا کو آباد کرنا چاہا اور اس مقصد کے لئے خلافت ارضی کا تاج حضرت آدم کے سر پر رکھنا چاہا تو فرشتوں کی مجلس میں اپنے اس ارادہ کا اظہار فرمایا تو فرشتوں نے اپنی عبادت گذاری کا ذکر کر کے دبی زبان سے اس منصب اور اپنی سرفرازی کی خواہش ظاہر کی/ اس پر اللہ تعالی نے حضرت آدم اور فرشتوں کا مقابلہ امتحان کر دیا حضرت آدم کا تفوق اس میں ظاہر ہوا اور خلافت ارضی کا تاج ان کے سر پر رکھ دیا گیا۔

اس سلسلہ میں عام مفسرین نے جن کے ناموں کی تفصیل غیر ضروری ہے/ حضرت آدم کی فضیلت و برتری کا سبب مدار علم کو قرار دیا ہے اور ظاہر آیات سے متبادر بھی یہی ہوتا ہے/ لیکن حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے اس سلسلہ میں بھی منفرد ہے۔

حضرت شاہ صاحب کے ارشاد کا خلاصہ یہ ہے کہ:

میرے نزدیک فرشتوں پر حضرت آدم کی برتری کا سبب علم نہیں بلکہ ان کی طاعت خداوندی اور جذبہ انقیاد تھا/ اس وقت مخلوق کی تین قسمیں تھیں/ حضرت آدم ملائکہ اور ابلیس/ انہی میں سے کوئی مستحق خلافت ہوسکتا تھا/ ابلیس تو اپنے اباو استکبار کی وجہ سے مردود ومطرود ہو گیا۔ ملائکہ نے آدم کے ظاہری احوال یا سابق مخلوق کے فساد فی الارض پر قیاس کر کے حق تعالی کی جناب میں اپنے استحقاق کا مطالبہ کر دیا لیکن چونکہ ان کو اپنی غلطی پر اصرار نہ ہوا اور بعد میں معافی بھی طلب کی اس لئے ان کو معاف کر دیا گیا۔

رہے حضرت آدم علیہ السلام تو وہ ہر موقعہ پر عجز و نیاز اور تذلل وتضرع کا اظہار کرتے رہے حالانکہ وہ بھی اپنی غلطی پر حجت ودلیل کی راہ اختیار کر سکتے تھے یہی وہ عبودیت اور سراپا نیاز مندی واطاعت کا متاع تھا جس کی وجہ سے حضرت آدم مقام فضیلت اور منصب خلافت کے مستحق قرار پائے۔

علم میں امتحان کی صورت جو اللہ تعالی نے اختیار فرمائی تو اس وجہ سے کہ علم ایک وصف ظاہر تھا جس کا معلوم کرنا آسان نہیں تھا، نہ اس لئے کہ وہ مدار فضیلت تھا بخلاف عبودیت کے کہ وہ ایک پوشیدہ صفت تھی اس کو معلوم کرنا مشکل تھا۔ بہر حال اس مجلس کے انعقاد کا مقصد یہ تھا کہ فرما نبردار اور نافرمان کے درمیان امتیاز ہو جائے اسی لئے سجدہ حضرت آدم کو ظاہری صورت میں کر دیا گیا کیونکہ اپنے ہم جنس کی اطاعت زیادہ گراں ہوتی ہے۔ بہر حال یہی فرماں پذیری اور اطاعت مدار خلافت ہے نہ کہ علم اور یہی بنیاد فضیلت تا قیامت باقی رکھی گئی۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی اس رائے کی اہمیت واضح ہے اس لئے کہ میں کا کٹا عبودی ہی ہے نیز کسی کا نائب وہی ہوسکتا ہے جو صدق دل سے اس کے ہر حکم کی تعمیل کے لئے ہر وقت اور ہر حال میں تیار رہے/ پھر جبکہ مخلوق کو پیدا ہی اس لئے کیا گیا کہ وہ خالق کی اطاعت کا فرض ادا کرے تو خلیفہ کے لئے اس مقصد کی تکمیل اور بھی ضروری تھی۔

دراصل علم بھی ایک عمدہ نعمت ہے لیکن وہ بالذات مقصد عمل یعنی اطاعت خداوندی ہی ہے جو علم اس مقصد کا حامل نہ ہو وہ ضلال وبال ہے۔

یہ چند مثالیں حضرت علامہ کشمیریؒ کی قرآن فہمی اور تفسیر نکتہ سنجی کو سمجھنے کے لئے دلیل راہ بن سکتی ہیں اور آپ کے گلستان فضل وکمال میں سے چند پھولوں کی حیثیت رکھتی ہیں جنہیں بغیر کسی انتخاب کے چن لیا گیا ہے واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

●□●
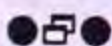
الشیخ الانور

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ

کمالات بشری کتنے بھی ہوں انہیں اصولاً سمیٹا جائے تو وہ صرف دو نوعوں میں سمٹ آتے ہیں جو عالم بشریت کو حق تعالی کی طرف سے عطاء کئے گئے ہیں ایک کمالات علمی اور ایک کمالات عملی، ان ہی دو سے انسان کی انسانیت اور ان کی ساری خوبیاں وابستہ ہیں۔ نہ جاہل انسان کا کوئی وقار دلوں میں قائم ہوتا ہے نہ بے عمل انسان ہی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، گویا انسانیت کے پرکھنے کی یہی کسوٹی ہے کہ اس کے علم اور عمل کے آئینہ میں اسے دیکھا جائے۔

گو یہ بھی انسان کا ایک طبعی وطیرہ ہے کہ اگر کسی انسان پر علمی اور فکری قوتیں غالب ہوتی ہیں تو عملی قوت جوش زن نہیں ہوتی، بلکہ ایک حد تک سست اور کمزور رہتی ہے اور فرائض وواجبات کو چھوڑ کر تطوعات اور تنفلات کا زیادہ ابھار نہیں ہوتا، بلکہ علمی سوچ بچار ہی اس کی جگہ لے لیتی ہے لیکن اس کے برعکس جو عملی میدان میں آگے بڑھے ہوئے ہوتے ہیں ان کے اوقات علمی اور فکری سوچ بچار کے لئے فارغ نہیں رہتے اور وہ ہمہ وقت علمی تدبر اور فکری سوچ بچار ہی میں منہمک رہتے ہیں، اس فطرت کا جب کہ وہ انسان کا ایک بشری خاصہ ہے، شریعت نے بھی اعتبار کیا ہے جن روایات میں یہ فرمایا گیا ہے کہ عالم کے لئے علم عبادۃ سے زیادہ افضل ہے، اور بقول حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کے کہ عالم کے لئے افضل یہی ہے کہ وہ نوافل اور تطوعات کی کثرت کے بجائے علمی تدبر اور فکری بصیرت ہی کو متحرک رکھے تو اس قسم کی روایات اسی زیادت علم پر محمول کی گئی ہیں کہ یہی علمی فطرت کا قدرتی تقاضا تھا اور جو لوگ عمل عبادت کے دلدادہ ہیں اور اس سلسلہ سے ان کی علمی بصیرت کم یا کالعدم ہوتی ہے تو ایسی ہی روایات جن میں عمل کی مختلف نوعیتوں پر زور دیا گیا ہے کہ لوگ زہد وعبادت میں وقت لگائیں اور اپنی عملی قوتوں سے کام لیں۔ وہ اس عملی فطرت پر محمول ہونگی جو اہل عمل کی فطرت کا

طبعی تقاضا ہے۔ کسی نے حضرت اقدس مولانا تھانوی کو لکھا کہ فلاں واقعہ دیکھ کر میں آپ کے کشف کا قائل ہو گیا ہوں۔ حضرت نے جواباً تحریر فرمایا کہ یہ محض آپ کا حسن ظن ہے، مجھے کبھی کشف نہیں ہوا بلکہ ہو بھی نہیں سکتا وجہ یہ تحریر فرمائی کہ میری قوت فکر یہ ہر وقت متحرک رہتی ہے اور میں ہمہ وقت علمی کھوج اور سوچ بچار میں لگا رہتا ہوں اور کشف کیلئے یکسوئی اور عمل میں قلبی استغراق ضروری ہے جو مجھے حاصل نہیں اس لیے مجھے نہ صرف یہ کہ کبھی کشف نہیں ہو بلکہ ہو بھی نہیں سکتا، گو حضرت نے تواضعاً ہی یہ تحریر فرمایا ہے لیکن حضرت کے اس مقولہ کا محمل یہی تھا کہ جو لوگ ہمہ وقت عملی نشیب وفراز اور علمی اسرار وغوامض کی کھوج میں لگے رہتے ہیں ان کا رخ عملی قوتوں سے یکسو ہو جاتا ہے چہ جائیکہ عملی کرشموں اور خوارق سے ہمکنار ہو۔ ان کی عبادت ہی فکر وتدبر اور علمی تلاش وجستجو ہو جاتی ہے اور جو لوگ ہمہ وقت زہد وقناعت، طاعت وریاضت اور مجاہدہ وعبادت میں منہمک رہتے ہیں انہیں علمی فکر وتدبر اور حکم واسرار سے گہرا تعلق نہیں رہتا، اسے یوں بھی ادا کیا جا سکتا ہے کہ کشف ان دونوں قسم کے افراد کو ہوتا ہے/ لیکن کشف ہی کی دو قسمیں ہیں/ ایک کشف الٰہی ہے جو علمی قوتوں کی راہ سے ابھرتا ہے اور ایک کشف کونی ہے جو عملی ریاضتوں سے رونما ہوتا ہے، مگر یہ قدرتی بات ہے کہ جو جس کشف کا مورد بنتا ہے اس کا قلب دوسرے کشف کی طرف طبعاً متوجہ ہی نہیں ہوتا، **ماجعل الله لرجل من قلبين في جوفه**۔ لیکن حق تعالیٰ شانہٗ کے بندے ایسے بھی پردۂ دنیا پر نمودار ہوئے اور ہوتے رہے ہیں جن کی جامع فطرت دونوں نوعوں کی طرف یکسانی کے ساتھ دوڑتی ہے جو زہد وریاضت، طاعت وعبادت اور فرائض وتطوعات کے ساتھ ساتھ علم وفکر اور عملی گہرائیوں میں بھی اترے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگر مسائل کے میدان میں انہیں چھیڑا جائے تو وہ علم کا ایک ایسا دریا نظر آتے ہیں جن کا کہیں کنارہ نظر نہ آئے اور عملی میدان آئے تو وہ فرائض وواجبات ہی نہیں سنن ومستحبات اور آداب بھی ان کی گرفت سے باہر نہیں ہوتے اور علم وعمل کے دونوں ہی میدان یکسانی کے ساتھ ان کی جولان گاہ بنے رہتے ہیں۔ ان ہی جامع اور چیدہ ومنتخب قسم کے افراد میں الاستاذ الاکبر علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ بھی ہیں جس کے علم کو دیکھو تو وہ ایک دریائے ناپیدا کنار نظر آتا تھا کہ جس فن اور جس مسئلہ میں گفتگو کی جائے تو یہ محسوس ہوتا تھا کہ شاید انہوں نے ساری عمر اسی مسئلہ کی کھوج میں گذاری ہے اور اس کے مالہٗ وماعلیہ میں بھی عمر لگے رہے ہیں۔ چنانچہ اس مسئلہ کا روایتی اور درایتی، عقلی اور نقلی اور اس کا مالہٗ وماعلیہ اس انداز سے ارشاد فرماتے کہ جیسے اس مسئلہ کے سوا انہیں کسی اور مسئلہ سے سروکار ہی نہیں ہے، پھر نہ صرف دینی فنون کے وہ علوم متداولہ جن کی درس وتدریس اور فکر ومطالعہ ہمہ وقت ان کا مشغلہ تھا بلکہ

------------ زندگی میں محسوس نہ ہوتا تھا حتی کہ علم رمل اور جعفر اور فن نجوم وغیرہ میں بھی تبحر کی وہ شان محسوس ہوتی تھی کہ شاید انہوں نے عمران ہی فنون کی تفتیش میں گذاری ہے، اس پر علمی وقار اور علم کی شانِ رفعت اس شان سے چہرہ پر نمایاں رہتی تھی کہ وہ اس میں تبحر سے کوئی فخر یا تعلی نمایاں ہو نہ اس میں تذبذب یا تذلل کی کوئی شکن بروئے کار آئے۔ حدیث کے درس میں اس شان و وقار سے بیٹھتے تھے جیسے کوئی بادشاہ پوری خود اعتمادی کے ساتھ احکام جاری کر رہا ہے جس میں نہ تذبذب ہے نہ تردد/ نہ حیرانی ہے نہ تحیر۔ درس ترمذی و بخاری میں اس شان وغنا واستغنا اور شان تواضع و فروتنی سے صرف حدیثی بخشیں ہی نہیں آتی تھیں اور حدیث ہی کے دقائق نہیں کھلتے تھے بلکہ فقہ، تفسیر، کلام، اصول، احسان وتصوف میں حتی کہ علم معقولہ فلسفہ و منطق، ریاضی و ہندسہ اور فن طب تک کے مسائل پر بھی اسی تبحر اور تفقہ کی شان سے کلام ہوتا تھا، یہ ناکارہ اور آوارہ درس ترمذی و بخاری میں یہ جامعیت علوم وفنون دیکھ کر تقریر لکھنے کے لئے بیٹھا تو نہایت چوڑی تقطیع کی طویل وعریض کاپی لے کر حاضر ہوتا تھا اور اس کاپی میں پانچ چھ کالم بنا رکھے تھے جس میں ہر کلام کے سرورق پر فنون کے عنوانات ڈال رکھے تھے ایک کالم پر حدیث، ایک پر اسماء رجال، ایک پر تفسیر ایک پر فقہ ایک پر کلام ایک پر احسان وتصوف ایک پر نحو وصرف اور بلاغۃ اور ایک پر علوم فلسفیہ وعقلیہ وغیرہ۔ اس لئے جو مسئلہ جس فن کا آتا اسی کالم میں اس کا اندراج کر لیتا تھا اور بعد میں تقریری صورت میں انہیں ترتیب دے لیتا تھا، افسوس کہ عمر کی ناتجربہ کاری کی وجہ سے یہ کاپی جو ایک ضخیم جلد کی صورت میں مرتب شدہ تھی اور جس میں تحت مسائل موقعہ بموقعہ تمام علوم وفنون کے دقائق اس انداز سے درج شدہ تھے کہ ان تمام فنی مسائل کا ربط اور جوڑ حدیث زیر بحث سے نمایاں ہو جاتا تھا، بعض معتمد قسم لوگوں نے مطالعہ کے لئے مانگی مگر پھر واپس نہ دی اور حیلہ حوالہ کر کے اسے دبا بیٹھے جس کا برسوں مجھے قلق رہا/ مگر میں نے ان صاحب کو بھی کبھی ان علوم سے کچھ متنفع ہوتا ہوا نہ دیکھا بلکہ نفس علم سے مناسبت تک بھی کبھی محسوس نہیں ہوئی۔

بہر حال ایک طرف تو حضرت ممدوح میں علمی فکر وتدبر کی یہ وسعت تھی اور دوسری طرف عملی قدروں میں جزئی عمل کا غلبہ اور وہ بھی اتباع سنت کے ساتھ حتی کہ ان کی پوری زندگی پر یہ اتباع سنت اس درجہ غالب تھا کہ بہت سے مسائل میں ہم حضرت ممدوح کا عمل کا دیکھ کر معلوم کر لیتے تھے، اور بالآخر کتابوں میں مسئلہ وہی نکلتا تھا جو ان کے عمل سے نمایاں ہوتا تھا، گویا علم اور عمل مندمج ہو کر ان کی ذات میں سما گیا تھا، پھر یہ اتباع سنت صرف عبادات ہی کی حد تک محدود نہ تھا بلکہ ان کی عام معاشرتی زندگی پر بھی پوری طرح حاوی تھا/ حتی کہ چال تک سے بھی اتباع سنت کا رنگ جھلکتا ہوا نظر آتا تھا/ جیسا کہ

احادیث نبویؐ میں حضور کی چال کے بارہ میں فرمایا گیا ہے کہ کان یمشی کان تلعا آپ اس قوت وطاقت سے زمین پر قدم رکھتے تھے، جیسے زمین کو کھود ڈالیں گے اور گویا زمین کی تہہ میں اتر رہے ہیں تو یہی نقشہ ان کی چال میں محسوس ہوتا تھا، نگاہیں نیچی ہوتی تھیں اور قدم اس قوت سے زمین پر رکھتے تھے جیسے زمین میں اتر رہے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ گفتگو کے وقت مخاطب کی آنکھ میں آنکھ ڈالکر گفتگو نہیں فرماتے تھے بلکہ کن انکھیوں اور ترچھی نگاہوں سے مخاطب کی طرف متوجہ ہوتے تھے، یہی نقشہ ہم نے حضرت شاہ صاحبؒ کا دیکھا کہ کبھی سامنے والے کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر گفتگو نہیں فرماتے تھے بلکہ گوشۂ چشم سے دیکھ کر مکالمہ فرماتے تھے۔

کھانا برسوں ان کے ساتھ اپنے مکان پر کھایا ہے۔ ہمیشہ اکڑوں بیٹھ کر کھانا کھاتے، روٹی کبھی ایک ہاتھ سے نہیں توڑتے تھے جیسا کہ عام عادت ہے بلکہ ایک ہاتھ میں روٹی لیکر دوسرے ہاتھ سے اس کا ٹکڑا توڑ کر تناول فرماتے تھے۔ بہر حال چال ڈھال، افعال اعمال، عوارض واحوال اور بینائی وشنوائی سب کے سب سنت میں ڈھلے ہوئے تھے۔

ظاہر ہے کہ جس ذاتِ گرامی کے ظواہر افعال اتباع سنت میں ڈھلے ہوئے ہوں یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کے باطن میں سنت کا عمل دخل نہ ہو اور قلب اس سے خالی رہے، ہم دیکھتے تھے کہ اگر کسی شخص نے ان کی مجلس میں کسی کی غیبت یا برائی بیان کرنے کا پرداز ڈالا تو اول وحدت ہی میں فرمادیتے کہ بھائی ہمیں ان باتوں کی فرصت نہیں ہے، کوئی مسئلہ پوچھنا ہو تو پوچھو ورنہ چپ رہو یا چلے جاؤ، اسلئے کبھی بھی ان کی مجلس غیبت سے آلودہ نہیں ہوتی تھی/ ہمہ وقتی شغل مطالعہ کتب تھا اور مطالعہ کتب اس ادب واحترام کے ساتھ کہ جیسے استاد کے سامنے بیٹھے ہیں۔ خود بھی ایک بار فرمایا کہ ہوش سنبھالنے کے بعد سے میں نے آج تک دینیات کی کسی کتاب کا بے وضو مطالعہ نہیں کیا/ کہنے کو بات چھوٹی سی محسوس ہوتی ہے لیکن ان جزئیات پر استقامت ایک عظیم ترین کرامت ہے، جسے وہی شخص انجام دے سکتا ہے جس کے رگ وپے میں اتباع سنت کا رنگ پلا دیا گیا ہو۔ اگر کتاب سامنے ہوتی تھی تو فکر وتدبر اور شرعی سوچ بچار میں استغراق رہتا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے ہمہ وقت حسبنا الله کا کلمہ زبان پر رہتا تھا۔ باوجودیکہ حدیث وتحدیث ہی کا ہمہ وقت غلبہ تھا اور یہی ان کی زندگی کا خاص موضوع تھا لیکن مسائل فقہیہ جب زیر سوال آتے تو نہ صرف یہ کہ مسئلہ ہی برجستہ ارشاد فرماتے تھے بلکہ بیان مسئلہ میں کبھی ہم نے تردد یا تذبذب محسوس نہیں کیا بلکہ ہر مسئلہ میں دوٹوک بات فرماتے اور حکم پوری خود اعتمادی سے ظاہر فرماتے تھے، درس کتب حدیث سامنے میز پر رکھی ہوتی تھیں جب کسی کتاب کا حوالہ

دیتے تو اسی وقت وہ کتاب اٹھا کر کھولتے اور اندازا اتنا صحیح اور تقریباً اتنا قطعی ہو چکا تھا کہ کتاب کھولتے ہی یا وہی صفحہ اول وحدت میں نکل آتا تھا جس سے حوالہ دینا ہوتا تھا یا ایک آدھ ورق پس و پیش الٹ کر وہ صفحہ نکال لیتے تھے۔ حافظہ حق تعالیٰ نے امتیازی اور غیر معمولی عطا فرمایا تھا، ایک دفعہ فرمایا کہ آج میری عمر ۵۰ برس سے زائد کی ہو چکی ہے/ لیکن پانچ سال کی عمر سے اب تک جو مسائل دیکھ چکا یا سن چکا ہوں وہ تقریباً سب ذہن میں محفوظ ہیں/ عمر کا ذکر آنے پر کبھی مذاقاً فرماتے کہ جاہلین! تم نے کبھی پیر نابالغ بھی دیکھا ہے؟ فرماتے کہ وہ میں ہوں کیونکہ اس تک وقت شادی نہیں ہوئی تھی۔

کشمیر سے بنیت ہجرت مکہ مکرمہ جانے کے قصد سے نکلے اور اپنے اساتذہ سے ملنے کے لیے دیوبند اترے/ حضرت شیخ الہندؒ ان کے جوہروں کو جانتے تھے سن کر قدرے قیام کا مشورہ دیا، اور سنن ابوداؤد کا سبق حوالہ فرمایا، اس درس سے حضرت ممدوح کے تبحر، تفقہ اور وقعت علم کا راز فاش ہونا شروع ہوا، یہی زمانہ تھا کہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے حج کا ارادہ فرمایا، اس سفر میں مکہ مکرمہ ہی میں انگریزوں نے گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیا۔ حضرت شیخ نے ارادۂ سفر کے بعد کہہ سن کر انہیں اپنا قائم مقام بنایا اور حدیث کے انتہائی اسباق سپرد فرمائے۔ مشاہرہ کے لیے عرض کیا گیا مگر راضی نہیں ہوئے اور حسبۃً للہ درس کے فرائض انجام دینے شروع کردئے، کامل دس سال اسی طرح گذارے۔ میرے حضرت والد صاحب نے باصرار اس پر راضی کرلیا کہ کھانا ان کے ساتھ کھائیں گے۔ چنانچہ دس سال اسی شان سے گذرے/ میری دادی صاحبہ کبھی کہلاتیں کہ شاہ صاحب کوئی مرغوب طبع چیز ہو تو بے تکلف فرمادیا کریں، تو فرماتے کہ حضرت میں اتنی نعمتیں کھا رہا ہوں کہ اندیشہ ہے کہ میری جنت کی نعمتیں یہیں تو تمام نہیں کی جارہی ہیں، اس دس سال میں حضرت والد ماجد اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمہما اللہ کو یہ خطرہ برابر لاحق رہتا تھا کہ کہیں یہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مکہ مکرمہ کی راہ نہیں لیں۔ اس لیے ان حضرات نے بطور تدبیر ان کی شادی کا پرواز ڈالا، راضی نہیں ہوتے تھے مگر کہہ سن کر مجبور کیا گیا تو راضی ہوگئے اور بھوپال کے ایک سادات کے خاندان سے جو اصل میں گنگوہ کا خاندان تھا رشتہ لگایا گیا اور شادی ہوگئی۔ دلہن ہمارے ہی مکان پر آکر اتری جو سارے گھر میں گھر کی ہی بہو بیٹیوں کی طرح رہتی تھیں۔ لیکن اب حضرت شاہ صاحبؒ کو یہ بار اپنے ذہن میں بوجھ محسوس ہونے لگا اور میرے والد صاحب سے فرمایا کہ حضرت اب میرے لئے کرایہ کے مکان کا بندوبست فرمایا جائے اور بمشکل کہہ سن کر اس پر تیار کرلیا تو ہمارے مکان کے قریب دیوان میں ایک مکان کرایہ پر لیا گیا۔ جس میں بود و باش اختیار فرمائی۔ اس موقعہ پر ذمہ داران دارالعلوم کی طرف سے تنخواہ لینے پر مجبور کیا گیا

توبالآخر اسے قبول فرمالیا اور اس طرح ان کے اک دم چلے جانے کے خطرات رفع ہو گئے پھر تو ان کے علوم کی وہ شہرت ہوئی کہ مدارس کے چیدہ چیدہ اساتذہ بھی کمال فن پیدا کرنے کیلئے دارالعلوم میں بطور طالب علم کے آنے لگے اور حضرت شاہ صاحبؒ کے حلقۂ درس سے مستفید ہونے لگے۔ ادبیت اور علوم عربیت پر قدرت کا یہ عالم تھا کہ بے تکان عربی میں تقریریں فرماتے تھے۔

علامہ رشید رضا مصری مدیر المنار قاہرہ جو شیخ محمد عبدہٗ کے شاگرد رشید تھے، دیوبند آئے اور تقریباً پانچ چھ دن قیام فرمایا۔ ان کے خیر مقدم کا جلسہ ہوا تو حضرت شاہ صاحبؒ نے برجستہ عربی میں تقریر فرمائی تو رشید رضا دنگ تھے اور کہتے تھے کہ عربی زبان باوجود یکہ ہماری مادری زبان ہے لیکن اس پر اتنی قدرت خود ہم بھی محسوس نہیں کرتے جو حضرت شاہ صاحب میں دیکھی اور پھر متعلمانہ انداز میں حضرت کے درس میں بھی شریک ہوئے۔

عربی شاعری میں بھی ید طولی حاصل تھا، دارالعلوم میں جب کبھی انعامی جلسے یا موقر افراد کے آنے پر خیر مقدم کے جلسے ہوتے تھے تو حضرت شاہ صاحب بھی اپنے عربی قصائد سے سامعین کو محو حیرت بنا دیا کرتے تھے، حضرت مولانا حسین احمد صاحبؒ نے ایک بار دارالعلوم کی مسجد میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا جس کے سننے والوں میں یہ ناکارہ بھی شامل تھا کہ میں عربی منطقوں کے مختلف ممالک میں گیا ہوں۔ وہاں کے علماء ومشائخ سے بھی سابقہ رہا ہے۔ لیکن میں نے حضرت شاہ صاحب کا نظیر اور مثیل کہیں نہیں پایا، قسمت میں یہ شرف مقدر تھا کہ ہم جیسے نااہل بھی حضرت شاہ صاحب کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوں۔ چنانچہ ترمذی اور بخاری حضرت ممدوح ہی کے یہاں ہوئی۔ اکثر پیار ومحبت سے طلبہ کو جاہلین کہہ کر خطاب فرمایا کرتے تھے، اگر کوئی طالب علم بے ڈھنگا سوال کرتا تو فرماتے کہ ارے جاہل! تو نہیں جانتا کہ میں اسناد متصل کر دیتا ہوں۔ فرمایا کہ اسناد متصل کرنے کے معنی سمجھا یا نہیں؟ وہ یہ ہیں کہ میں اپنے پاس والے کے تھپڑ ماروں گا وہ اپنے پاس والے کو تھپڑ رسید کریگا اور بالآخر سند تجھ تک پہنچ جائی گی، ششماہی امتحان کے بعد بخاری عصر مغرب کے درمیان ہوتی تھی۔ کبھی کبھی طلبہ سے مزاح فرماتے، مغرب کا وقت آجاتا تو فرماتے کہ جب بھائی شمس الدین نہیں ٹھہرے تو پڑھانے کا لطف ہی کیا باقی رہا، اور یہ کہہ کر کتاب بند کر دیتے، طلبہ سمجھتے کہ شمس الدین صاحب کوئی مہمان ہوں گے جن کا تذکرہ فرمایا، لیکن اشارہ ہوتا تھا غروبِ شمس کی طرف کہ جب بھائی شمس الدین ہی جا رہے ہیں، تو پڑھانے میں کیا جی لگ سکتا ہے، بہر حال درس حدیث ترمذی و بخاری علوم ہی کا نہیں، اخلاق واحوال کا بھی مجموعہ ہوتا تھا۔ اور یوماً فیوماً حضرت شاہ صاحبؒ کی

جامعیت علوم کا دلوں پر سکہ بیٹھا رہتا تھا۔

میں نے اس زمانہ طالب علمی میں ایک عربی قصیدہ بنام نونیۃ الا حاد لکھا جو مشاہیر امت کے نام سے شائع بھی ہو چکا ہے جس میں امت کے ان تمام ممتاز افراد کی فہرست گنائی ہے جو کسی نہ کسی فن میں یکتا گذرے ہیں۔ جیسے حدیث میں امام بخاریؒ، کلام میں ابوالحسن اشعری، نحو میں سیبویہ، فقہ میں ابوحنیفہ وغیرہ۔ اس میں ایک شخصیت کا نام ابوالحسن بھی آیا ہے جو جھوٹ بولنے میں یکتا گذرا ہے۔ مجھے اس کے حالات کی جستجو تھی مگر کسی کتاب میں دستیاب نہیں ہوتے تھے۔ آخر کار ہماری دوڑ حضرت شاہ صاحب کی طرف ہوتی تھی۔ چنانچہ میں حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا کہ ابوالحسن کذاب کے بارے میں کچھ پوچھوں/ یہ حضرت کی عمر کا بالکل اخیر دور تھا اور وفات میں غالباً چند ماہ ہی باقی رہ گئے تھے، ضعف کافی ہو چکا تھا، تو میں نے ابوالحسن کذاب کے بارے میں عرض کیا کہ حضرت مجھے اس کے حالات کسی کتاب میں بھی کذب کے زیر عنوان نہیں ملے، فرمایا، مولوی صاحب آپ نے بھی کمال کر دیا، صفت کذب کیا کوئی مستحسن صفت ہے کہ لوگ اس کا عنوان قائم کر کے کذابین کے حالات قلم بند کر دیتے۔ یہ حالت ادب و تاریخ کی کتابوں میں کہیں نہ کہیں منتشر طور پر مل جائیں گے۔ ورنہ کو ٔ اب الکذاب تھوڑا ہی قائم کرے گا کہ کذابین کی فہرست اس کے نیچے درج کرے، اور یہ فرما کر چھ سات کتابوں کے نام بتلا دئے کہ ابن خلدون میں فلاں جگہ دیکھئے اور ابن خلکان میں فلاں جگہ وغیرہ۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت مجھے تو کتابوں کے یہ اتنے نام بھی یاد نہیں رہیں گے۔ پس حضرت ہی اس کی کوئی مختصر سی سوانح بیان فرما دیں تو میں حضرت کے حوالہ سے ہی سے اسے نقل کر دوں گا۔ اس پر تھوڑے سے تامل کے بعد ابوالحسن کذاب کی سوانح عمری بیان فرمانی شروع کی کہ یہ شخص فلاں سنہ میں پیدا ہوا، اتنی عمر پائی، جھوٹ میں یکتا مانا گیا۔ بڑے بڑے جھوٹ بولے اور مرتے مرتے بھی جھوٹ بول گیا اور لوگوں کو تشویش میں ڈال گیا، اور فلاں سن میں فوت ہوا، میں حیرت سے سن رہا تھا اور یہ سمجھ رہا تھا کہ غالباً ابھی حال میں کہیں اس کی یہ سوانح مطالعہ فرمائی ہوگی، جو اس روانی کے ساتھ اس کی سوانح حیات بیان فرما رہے ہیں اور جرأت کر کے عرض بھی کر دیا کہ شاید حال ہی میں یہ سوانح مطالعہ فرمائی ہوگی، فرمایا، جی نہیں مولوی صاحب تقریباً تیس سال کا عرصہ ہوتا ہے جب میں مصر گیا تھا، تو خدیوی کتب خانہ میں پہنچ گیا اور اتفاق سے ایک رسالہ ابوالحسن کذاب کے حالات پر مشتمل سامنے آ گیا مجھے دلچسپی ہوئی اور میں نے اسی فرصت میں پورا پڑھ لیا، آج آپ کے سوال کرنے پر جب ذہن ادھر منتقل ہوا تو وہ سارا رسالہ ذہن میں متحضر ہو گیا، اور مجھے کہاں فرصت

کہ لوگوں کے جھوٹ یا سچ یا مکروفریب یا چوری ڈکیتی کے واقعات کے مطالعہ میں وقت ضائع کروں۔ ظاہر ہے کہ اس حافظہ کو ایک موہبت ربانی کے سوا اور کیا کہا جائے۔ ورنہ طبعی حافظے اس طرح کے نہیں ہوتے ہیں، بالخصوص آج کے دور میں کہ اگر ڈائری جیب میں پڑی ہوئی نہ ہو، تو صبح کی بات شام کو یاد نہیں رہتی۔ اس لئے یہ حافظہ محض قوت عزیزی کا حافظہ نہیں تھا جو عموماً انسانوں میں بطور طبعی عزیزی کے ودیعت ہوتا ہے بلکہ قوت قدسیہ کا اثر ہوتا تھا جو ذہن کی صفائی اور تشویشات سے بالاتر ہونے کی علامت ہے/ جیسے بعض اہل اللہ کے حالات میں ہے کہ جو بات بھی ان کے کان میں پڑجاتی تھی تو وہ اسے بھولتے نہ تھے۔ اسلئے انہوں نے لوگوں کی باتیں سننے سے گریز کرنا شروع کردیا تھا، کہ جو کچھ سنوں گا وہ دماغ میں محفوظ ہوجائیگا تو مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں اپنے دماغ کو رطب ویابس سے بھرتا رہوں۔ اس میں جتنا بھی ذخیرہ ہو وہ صرف کلام خدا، رسولؐ ہی کا رہے۔ یہی صورت حضرت شاہ صاحبؒ کی بھی تھی کہ وہ ادھوادھو کے قصوں کو کبھی دلچسپی سے نہیں سنتے تھے۔ اور بعض احیان حکماروک دیتے تھے غالباً اس لئے کہ وہ مل ملا کر دماغ میں محفوظ ہوجائیں گے اور پھر تشویش کا باعث بنیں گے۔ جس سے علمی فکرو تدبر میں خلل پڑے گا اس لیے زیادہ سے زیادہ وقت ان کا صرف مطالعہ کتب یا علوم میں فکرو تدبر کرنے ہی میں گذرتا تھا۔

درس کی تقریریں نہایت جامع اور وجیز ہوتی تھیں۔ مواد ہی مواد ہوتا تھا، لفظ آرائی اور تعبیر پیرائی کی ان کے یہاں کوئی قدرو قیمت نہیں تھی عموماً مسئلہ کا لب لباب ہوتا تھا، افسوس ہے کہ ہم ناکاروں نے ان کی اور ان کے جامع جملوں کی قدر نہ پہچانی۔ اب بھی جو جملہ کسی بھی فن کا ذہن میں محفوظ ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ علم کا ایک سمندر ہے جسے کوزے میں بند کردیا گیا ہے۔

تقدیر کے مسئلہ میں ایک دفعہ فرمایا کہ آخرت میں کسی کا معذب ہونا انتقام نہیں ہے محض صورت انتقام ہے۔ وہ حقیقت میں تسبیب وتشمیر ہے۔ اس جملہ سے تمام وہ شبہات دور ہوجاتے ہیں۔ جو مسئلہ جبر وقدر میں پیدا ہوتے ہیں۔ اب اگر اس کی تفصیل کی طرف جایئے تو وہ ایک مستقل کتاب بن سکتی ہے جس کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں۔ فن اصول فقہ میں کتاب وسنت کے عام اور خاص کی بحث آتی ہے، تو میں نے عام کی تعریف پوچھی/ فرمایا کہ ہر صیغی اور لفظی جمع کو عام کہتے ہیں اس سے اصل جمع اور عام کا فرد کھل جاتا ہے کہ حقیقی جمع کو کسی مفرد پر جمع کی علامت لگادینے سے بنتی ہے۔ مادہ مفرد کا ہی رہتا ہے، اضافہ علامت سے جمع بن جاتا ہے جیسے عالم کی جمع عوالم، اور عالم کی جمع علماء زیادہ کی جمع زیادات یا مفرد کی جمع مفردات، یا کلمہ کی جمع کلمات وغیرہ۔ لیکن عام کا لفظ خود ہی ہوجاتا۔ جس پر کسی

بھی علامت جمع کا اضافہ نہیں ہوتا۔ مگر پھر بھی معنی جمع کے دیتا ہے۔ جیسے ما کا کلمہ جس کے معنی ''وہ'' کے ہیں۔ اور عموم رکھتا ہے کہ جو بھی لفظ وہ کا مصداق ہوگا وہ اس کا فرف بن جائے گا۔ مگر اس پر کوئی بھی علامت جمع کی نہیں اور پھر بھی یہی جمع ہے تو اسے کتنے مختصر لفظوں میں بیان فرمایا کہ ہر صیغی اور لفظی جمع کو عام کہتے ہیں۔ صیغہ مفرد کا ہو، معنی کے لحاظ سے بلا علامت جمع وہ جمع ہو یعنی محض لفظ کا ابہام ہی اس میں جمع کے معنی پیدا کر دیتا ہے، اس لیے وہ جمع حقیقی نہیں بلکہ صرف لفظی ہوتا ہے، اس لئے کس قدر جامع، واضح اور مانع تعریف ہے کہ ہر صیغی جمع کو عام کہتے ہیں۔ بہر حال علوم وفنون پر حاوی ہونے کی وجہ سے حقائق وسائل کی بنیادیں ان پر حق تعالی نے منکشف فرمادی تھیں تو لمبے لمبے مسائل کو چھوٹے چھوٹے جامع اور حاوی جملوں سے ادا فرمادیتے تھے۔

یہی صورت حدیث کی تشریحات کی بھی تھی کہ لمبی بحثوں اور اخلاقی مسائل کو معرکوں کو چند اور جامع جملوں میں ادا فرما کر مسئلہ کی بنیاد سمجھا دیتے تھے کہ طالب علم اس پر حاوی ہو کر لمبی بحثیں خود ہی اس جملہ سے نکال لانے پر قادر ہو جاتا تھا، گویا بحث لمبی کر کے اس کا خلاصہ نہیں نکالتے تھے ۔ بلکہ خلاصہ اور ملخص بیان کر کے بھی بحثوں کی استعداد طالب علم میں پیدا فرما دیتے تھے۔ اس لئے دیکھا یہ جاتا تھا کہ ذی استعداد طالب علم ہی ان سے حقیقی استفادہ کر سکتا تھا، ناقص الاستعداد یا بھرتی کا طالب علم زیادہ تر تحیر ہی میں غرق ہو کر رہ جاتا تھا، البتہ علم کی برکت سے محروم نہیں رہتا تھا ۔ بعض دفعہ ایسے ہی قلیل الاستعداد اور غرق حیرت طالب علم کو مزاحاً فرمادیا کرتے تھے۔ **کانھم حمر مستنفرہ** کی قسم سے معلوم ہوتا ہے۔

بہر حال علم یہ تھا جو اضافات علوم پر حاوی تھا اور عمل وہ تھا، جو عمل بالحدیث عمل بالفقہ اور عمل بالقرآن میں غرق تھا اور ہر ہر نقل وحرکت میں اتباع سنت، تدین اور تقوای باطن عیاں نظر آتا تھا، اس علوشان کے ساتھ اپنے اکابر کا ادب واحترام بھی مثالی تھا، میرے حضرت والد صاحبؒ ایک واقعہ کے سلسلہ میں ایک بار اچانک حضرت شاہ صاحبؒ کے مکان پر پہنچ گئے ۔ ابھی مکان تک نہیں پہنچے تھے، کہ کسی نے اطلاع کر دی کہ حضرت مہتمم صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ اسی وقت گھبرا کر چارپائی سے اٹھے اور ننگے پیر دوڑتے ہوئے مکان سے باہر نکل کر ان کا استقبال کیا، گھر میں لائے، حضرت والد صاحب نے اس واقعہ کے سلسلہ میں فرمایا کہ حضرت میرا بھی کوئی حق آپ پر ہے یا نہیں؟ فرمایا حضرت اتنا ہے کہ اگر میری کھال کی جوتیاں بنا کر آپ استعمال فرمادیں گے تو میرے لیے فخر کا باعث ہوگا اور پھر حضرت والد ماجد نے جو فرمایا اس پر **سمعاً و طاعۃ** کہہ کر راضی ہو گئے۔ بہر حال اس علو

مقام کیساتھ یہ تواضع اور فروتنی کسی تقی ونقی ہی میں ہوسکتی ہے۔

فن حدیث میں ابتداءً اختلافی مسائل میں جو حنفیہ شافعیہ وغیرہ میں ہوئے ہیں اور زیب فقہ ہیں۔ رفع اختلاف کا معمول تھا اگر امام شافعیؒ کا مسلک حنفیہ کے خلاف ہوتا تھا، تو حنفیہ کے دلائل بیان کر کے ائمہ حنفیہ کے ایسے اقوال سامنے رکھتے تھے جو مسلک شافعی کے مؤید ہوتے تھے، مقصد اختلاف کو مضمحل دکھلا کر طلباء وعلماء کو ائمہ کی شان میں تقابل کی صورت پیدا کرنے سے بچانا اور تمام ائمہ ہدایت کی حقانیت کو زیادہ سے زیادہ دلوں میں بٹھلانا پیش نظر رہتا تھا۔ لیکن آخری دور میں فرمایا کہ سالہا سال ابوحنیفہؒ کی نمک حرامی کی ہے۔ اب آخر عمر میں اس کی جرأت نہیں کر سکتا اور پھر ترجیحی دلائل کو نہایت مضبوطی اور استحکام کے ساتھ بیان فرماتے اور مذہب حنفی کی تائید اور ترجیح پیش نظر رہنے لگی تھی، غالباً اپنے استاد حضرت شیخ الہندؒ کا یہ مقولہ سامنے رہتا تھا کہ ''امام ابوحنیفہ جس مسئلہ میں منفرد ہوتے ہیں اور تمام ائمہ دوسری سمت تو میں بطور خاص اس میں امام صاحب کی تقلید ضرور کرتا ہوں، اور نظر آتا ہے کہ جس مدرک تک امام پہنچے ہیں وہاں تک دوسرے نہیں پہنچے'' یہ تو یاد نہیں کہ یہ مقولہ حضرت شاہ صاحب نے نقل فرمایا ہو، لیکن عمل بہر حال آخری دور میں اسی مقولہ پر تھا، اور اب تطبیق کے بجائے ترجیح پر زیادہ زور دیتے تھے جو بجائے خود عزازت علم اور عمق فہم کی ایک مستقل دلیل ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے علمی احوال پر کلام کرنا، واقعہ یہ ہے کہ ہم جیسے ناکاروں کا کام نہیں ۔ان کے تلامذہ میں مولانا یوسف بنوریؒ اس کے اہل تھے یا اس کام کو سرانجام دینے میں مولانا مفتی شفیع صاحب مرحوم اور مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی مرحوم نے کام کر کے دکھلایا، کہ ان کے علوم کا تحطی کر کے دوسروں کو وہ امانت پہونچائی۔ بالخصوص مولانا محمد یوسف صاحب بنوری مرحوم نے اپنے متعدد مصنفات میں اس امانت کی ادائیگی کا حق ادا فرمادیا ہے۔ اس سیمینار کے سلسلہ میں قلت فرصت، کم ہمتی اور قلیل الاستعدادی کے ساتھ سرسری طور پر یہ چند منتشر اور غیر مربوط خیالات ذہن میں آئے جنہیں بتعمیل ارشاد عزیز محترم مولوی از ہر شاہ ابن حضرت شاہ صاحبؒ سپرد قلم کر دیا ہے، اس لئے کہ یہ حضرت مرحوم کی کوئی علمی یا عملی سوانح ہے کہ وہ ہم جیسوں سے ممکن نہیں بلکہ ان کے تذکورہ کو خواہ وہ حقیر و قلیل ہی ہو محض حصول سعادت و برکت کے لئے بطور خانہ پری کے پیش کر دینے کی جرأت کی ہے۔

●●

حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کا
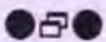
مسلک طریقت

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی

حضرت الامام المحدث انور شاہ کشمیری علیہ الرحمہ جامع کمالات اور یگانۂ روزگار بزرگ تھے، ان میں فقہِ حدیث کا وہ غیر معمولی ملکہ ودیعت ہوا تھا جو کچھ منتخبانِ روزگار ہی کے حصہ میں آتا ہے، اس لئے انہیں فقیہِ محدّث کہا جاتا ہے، لیکن ان کی ایک انفرادی حیثیت یہ بھی ہے کہ وہ فقیہِ صوفی تھے اور حضرت گیسودرازؒ (۸۲۵ھ) نے اپنے ملفوظات میں فرمایا ہے کہ "جوانِ صالح اور فقیہِ صوفی شاذ کالمعدوم" کا حکم رکھتے ہیں۔

اسلامی تاریخ میں کئی طویل دور ایسے بھی آئے ہیں کہ حکومتِ وقت کے زیرِ اثر شریعتِ اسلامیہ اپنے خالص دینوی اور تعزیزی رنگ میں محدود ہوگئی ہے، اس لئے کبھی کبھی فقہاء اور متصوفین کی راہیں الگ الگ نظر آتی ہیں، حتّی کہ شریعت کو علمِ ظاہر اور سلوک وطریقت کو "علمِ باطن" کا نام دیا گیا، گویا شریعت کو Lether of the Lard اور طریقت کو Sprit of the Lard سمجھا جانے لگا، ہر چند کہ یہ اختلاف فرضی تھا اصلی نہیں پھر بھی تاریخ کے اوراق میں ایسے علماء خال خال ہی ملیں گے جنہوں نے ظاہرِ شریعت کے مکمّل احترام کے ساتھ میدانِ سلوک میں بھی یکہ تاری کی ہو، اور اسی طرح برعکس۔

ہندوستان میں تصوّف کی تخم ریزی کرنے والے صوفیائے چشت نے "مقامِ شریعت" کو خوب پہچانا تھا، ان میں اکثر صوفیاء مثلاً حضرت بابا فرید، حضرت نظام الدین، حضرت چراغ دہلی، حضرت گیسودراز، حضرت مخدومِ جہانیان، حضرت سید اشرف سمنانی، حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی اور ان کے فرزندانِ گرامی حضرت شاہ محمد اللہ الٰہ آبادی، حضرت شاہ عضد الدین امروہوی، اور حضرت شاہ عبد الباری وغیرہ نے علومِ ظاہری یعنی معقول ومنقول کی تکمیل اپنے اپنے

زمانے کے رواجی نصاب کے مطابق کی تھی، اجازت وخلافت کے لئے بھی یہ حضرات علمِ شریعت کو ضروری سمجھتے تھے، حضرت مجدّ دالفِ ثانیؒ کے والدِ ماجد حضرت شیخ عبدالاحدؒ نے جب حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ سے ان کے آستانے پر رہنے کی اجازت طلب کی تو شیخ نے فرمایا کہ پہلے علومِ دین وشریعت کے حصول میں ہمت صرف کرو پھر یہاں آنا، کیوں کہ "درویشی، بے علم راچنداں نیست"، انہوں نے شیخ کے کبرِ سن اور ضعیفی کے پیش نظر عرض کیا کہ مجھے ڈر ہے کہ جب میں تحصیلِ علوم سے فارغ ہوکر آؤں تو مبادا یہ گرامی صحبت نہ ملے، ارشاد ہوا کہ اگر میں نہ رہوں تو میرے بیٹے شیخ رکن الدین سے رجوع کرنا، اور آخر یہی ہوا۔

حضرت چراغ دہلیؒ نے اپنے ملفوظات خیر المجالس میں فرمایا ہے کہ پہلی سیڑھی شریعت، دوسری طریقت، تیسری حقیقت، اور یہ اس لئے کہ اگر کوئی مقامِ حقیقت سے گرے گا طریقت میں رہے گا، طریقت سے نیچے آئے گا تو بارے مقام شریعت میں رہے گا، لیکن شریعت سے ساقط ہوا تو سوائے جہنّم کے اس کا ٹھکانہ کہاں ہے؟۔

غرض یہ کہ چشتی سلسلہ کے اکابر صوفیہ نے ہمیشہ ظاہرِ شریعت کی بالادستی اور اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کیا ہے، حضرت نظام الدینؒ نے فرمایا کہ پیر کا عالمِ صحو میں اور عالم کا عالمِ شرع میں ہونا ضروری ہے، تاکہ وہ نامشروع باتوں کا حکم نہ دے، حضرت چراغ دہلوی نے واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ "مسلکِ پیر حجّت لمی شود دلیل از کتاب وسنّت می باید" صوفیاء کی مبارک سیرت کو غور سے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ "ہر گلے رارنگ وبوئے دیگراست"۔ کے مصداق ان میں سے ہرایک کی اپنی شان ہے اور ہر ایک پر نیا حال غالب ہوتا ہے۔

درمحفل اور مستی ہر یک زشرابے ست'' حضرت کشمیریؒ کی سیرت اور سوانح کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے یہ محسوس ہوا کہ بظاہر وہ عالم یا فقیہ، متکلم، محدث یا مفسر، معلم اور مبلغ تھے لیکن ان کا قلب اسرار الٰہی کا گنجینہ انوار حقائق کا ایسا منبع تھا جس پر انہوں نے علم ظاہر کے پردے ڈال رکھے تھے کہ اہل محفل کی نگاہیں خیرہ نہ ہوں شاید العلم حجاب الاکبر کا ایک سامفہوم یہ بھی ہو، وہ یقیناً ایک صوفی صافی، صاحب عرفان اور نسبت عالیہ رکھنے والے سالکین طریقت میں سے تھے۔ عالم اور معلم دنیا میں لاکھوں ہوتے ہیں لیکن امام غزالیؒ کی مانند ان کے علم میں جو خیر وبرکت تھی جو انوار تھے، جو افادہ اور اخلاص اور تاثیر تھی یہ صرف ان کی نسبت عالیہ کا اعجاز ہے۔ غالب کے ایک قطعے کو ذرا سے تصرف کیساتھ پڑھتا ہوں۔

اگر چہ عالمان فیض آثار
زیک جام اندر بزم سخن مست

ولے بابادہ بعضے حریفان
خمار چشم ساقی نیز پیوست

مشو منکر کہ در اطوار این قوم
ورائے علم ہم چیزے دگر ہست

یہ ''خمار چشم ساقی'' اور یہ ''چیز دگر'' انہیں شریعت، طریقت اور حقیقت کے اعلےٰ ترین سرچشموں سے ملی تھی۔

حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کا خاندانی سلسلہ حضرت شیخ مسعود نوریؒ سے ملتا ہے، ابتدا سے گویا سہروردی کرمانی نسبت ہے/ جو ان کے خمیر میں شامل تھی/ پھر انہیں ابتدائے حال میں میاں نظام الدین نقشبندی مجددی کی مختصر صحبت نصیب ہوئی مگر غالباً ان سے کوئی استفادہ نہیں کیا۔

انہوں نے علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد ۱۳۱۴ھ میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوھی علیہ الرحمہ کے ہاتھ پر سلسلہ چشتیہ صابریہ میں بیعت کی اور خلافت سے بھی یقیناً سرفراز ہوئے ہوں گے اگر چہ تذکرۃ الرشید میں جہاں مولانا گنگوہی کے خلفاء ومجازین کا ذکر ہے ان میں مولانا کشمیریؒ کا نام نہیں ملتا لیکن اس کا سبب یہی ہوسکتا ہے کہ آپ نے اس کا اخفاء فرمایا اور مولف تذکرہ کو کسی دوسرے ذریعے سے علم نہ ہوسکا۔ خلیفہ مجاز ہونے کا یہی ثبوت کافی ہے کہ اگر اجازت نہ ہوتی تو خود حضرت مولانا کشمیریؒ کسی سے دست ارادت قبول نہ کرتے، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ السامی کا بیان ہے کہ:

> ''شیخ الہندؒ کے وصال بعد میں نے اور جناب مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ سابق مفتی اعظم پاکستان نے بھی ساتھ ہی ساتھ حضرت ممدوح کی طرف رجوع کیا۔ ہمیں طریق چشتیہ کے مطابق اذکار تلقین فرمائے اور ہم اس میں کھلی تاثیر اور تصرف محسوس کرتے تھے۔''

مولانا کشمیریؒ نے اپنے روحانی احوال کا بہت شدت کے ساتھ اخفاء کیا ہے صرف صاحبان حال ہی ان کے مقامات سنیہ کی رفعتوں کا کچھ ادراک کرسکتے ہیں اس کے باوجود ان کی

شخصیت میں انوار و برکات کا ایسا وفور ہے کہ ہم جیسے عامی اور امی بھی بہت کچھ دیکھ رہے ہیں۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی اپنی شان تھی۔ وہ بھی تصوف میں سرتا سر رنگے ہوئے تھے اور ان پر چشتی نسبت پوری طرح مستولی تھی۔ مگر انہیں ظاہر شریعت کے حفظ و حمایت کا اتنا خیال تھا کہ بعض امور میں انہوں نے اپنے پیر و مرشد شیخ العرب والعجم قطب العالم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے بھی اختلاف کیا اور ان کے فیصلہ ہفت مسئلہ کو قبول نہیں کیا۔ حالانکہ طریقت میں ارادت ''متابعت کاملہ'' کا نام ہے اور اس رمز کو مولانا گنگوہیؒ یقیناً ہم سب سے زیادہ جانتے تھے مگر حاجی صاحبؒ نے ان جزوی اختلافات کے بارے میں فرمایا کہ:

> ''فقیر تو آپ کے سب اقوال کو موافق شرع جانتا ہے اگر چہ مسائل میں موافق نہ سہی اور اس اختلاف کو صحابہ کا اختلاف سمجھتا ہے۔''

حضرت حاجی صاحبؒ نے ابتداء میں شاہ نصیر الدین آفاقی نقشبندی دہلوی سے بیعت کی تھی مگر مجھے اسکا کہیں حوالہ نہیں ملا کہ انہیں نقشبندی سلسلہ میں بھی خلافت ملی تھی، حضرت حاجی صاحبؒ نے جن ہزاروں لاکھوں تشنگانِ معرفت کو اپنے حلقۂ ارادت میں داخل کیا انہیں سلسلۂ چشتیہ صابریہ، قدوسیہ ہادویہ ہی میں بیعت کیا اور جن حضرات کو خلافت عطا فرمائی یا کچھ اوراد و اذکار تلقین کئے وہ بھی سب چشتی سلسلہ ہی کے تھے۔

حضرت کشمیریؒ نے ابتداء میں کچھ اوراد و وظائف سہروردی کرمانی سلسلے کے بھی پڑھے تھے جو انہیں اپنے والدِ ماجد علیہ الرحمہ سے پہونچے تھے، لیکن مولانا گنگوہیؒ نے جو اوراد انہیں تعلیم کئے وہ طریقِ سلف سے ملنے والے خالص چشتی اذکار ہی تھے۔

اختلافی مسائل:

ہندوستان کے علماء احناف میں بعض فروعی مسائل پر جن اختلافات کو افتراق کا سبب بنالیا گیا ہے ان میں حضرت شاہ صاحبؒ کا رویّہ ایسا تھا جو ان کے رتبے کے عالمِ دین کے شایانِ شان کہا جا سکتا ہے، مقدمہ بھاولپور کی شہادت میں قادیانی وکیل نے جرح کرتے ہوئے کہا تھا کہ "علمائے بریلی، علمائے دیوبند پر کفر کا فتویٰ دے رہے ہیں اور علمائے دیوبند علمائے بریلوی پر "حضرت شاہ صاحبؒ نے ارشاد فرمایا تھا کہ "جج صاحب! احقر بطورِ وکیل تمام جماعتِ دیوبند کی جانب سے گذارش کرتا ہے کہ حضرات دیوبند انکی تکفیر نہیں کرتے، اہلِ سنۃ والجماعۃ اور مرزائی

مذہب والوں میں قانون کا اختلاف ہے، علمائے دیوبند اور علمائے بریلی میں واقعات کا اختلاف ہے قانون کا نہیں، چنانچہ فقہائے حنفیہ نے تصریحات فرمائی ہیں کہ اگر کوئی مسلمان کلمۂ کفر کسی شبہ کی بنیاد پر کہتا ہے تو اس کی تکفیر نہ کی جائے گی۔

ان فروعی اختلافی مسائل میں ایک "قیامِ میلاد" کا سوال بھی تھا کہ کچھ لوگ کھڑے ہوکر یا دعاء کے طور پر ہاتھ اٹھا کر حضورِ رسالت مآب ابی وامّی فداہ کی خدمت میں صلوٰۃ وسلام عرض کرتے ہیں، حضرت حاجی امداداللہ صاحب نے تو اس مدح میں یہ فرمایا: "بھائی! مجھے تو اس میں لطف آتا ہے" یعنی نہ جواز کا فتویٰ دیا نہ عدمِ جواز کو قبول کیا، یہیں کشمیر میں کسی نے حضرت شاہ صاحبؒ سے سوال کیا کہ صلوٰۃ وسلام کے وقت ہم اپنے ہاتھوں کو نماز کی طرح ادب سے باندھیں گے یا بصورتِ دعاء دونوں ہاتھ پھیلائیں گے؟ حضرت نے جواباً فرمایا کہ ادب سے ہاتھ باندھو تو عین ادب ہے، پھر مولانا عارف رومیؒ کا یہ شعر زبان پر لائے۔

کردم از عقل سوالے کہ بگو ایمان چیست
عقل در گوشِ دلم گفت کہ ایمان ادب است

خاص کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ادب کا ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے۔

ہزار بار بشویم دہن بمشک و گلاب
ہنوز نامِ تو گفتن کمالِ بے ادبی ست

اور فرمایا کہ اگر کوئی دعاء کی نیت سے ہاتھ اٹھائے تو "الصّلوٰۃ علی النّبی دعاءٌ" یعنی سرورِ کائناتؐ پر درود پڑھنا دعا ہے۔ سید مبارک شاہ گیلانی صاحب کہتے ہیں کہ ارواحِ اولیاء کے استمداد کے بارے میں میرا عقیدہ کچھ مشتبہ تھا، شاہ صاحب سے سوال کیا تو فرمایا: بچہ ہر عمل کا دار ومدار نیت پر ہے "انّما الاعمال بالنیّات اگر عقیدۃً اور حقیقۃً انبیاء واولیاء سے استمداد کیا جائے تو کفر ہے، (الانورص ۶۳۷)

اب میں مولانا کشمیریؒ کے چند احوال واشغال بیان کرتا ہوں جن کا تعلق سلسلۂ چشتیہ صابریہ کی نسبت، عالیہ سے تھا۔

اسمِ ذات اور پاس انفاس:

حضراتِ چشتیہ کا خاص وظیفہ "اسم، ذات" ہے، اس کا دور ایک کروڑ بار ورد کرنے

سے پورا ہوتا ہے اور اس کی خاصیت یہ بتائی جاتی ہے کہ اسمِ "اللہ" قلب پر منقوش ہو جاتا ہے، اسرار، توحید منکشف ہو جاتے ہیں اور ماسویٰ سے قلب کو کسی طرح کی کوئی رغبت نہیں رہتی، اس کے اثر سے سالک صرف لقائے حق کا خواستگار ہو جاتا ہے، اور "وجوهٌ يومئذٍ ناعمة لسعيها راضيةٌ" ایسے ہی مجاہدوں اور مشتاقوں کی شان ہے، یہ ذکر بھی حدیث سے مقتبس ہے "لاتقوم الساعة حتّٰے يقال فی الارض الله الله" حضرت کشمیریؒ نے ایک بار لدھیانہ میں وعظ کرتے ہوئے یہی فرمایا تھا کہ عالم کی روح ذکر اللّٰہ ہے، جبتک اللہ کی یاد قائم رہیگی عالم قائم رہیگا، جب دنیا اللہ کی یاد چھوڑ دے گی تو سمجھ لو کہ کوچ کا وقت آ گیا۔

اس کے بعد انفاس کا ورد ہوتا ہے، اس میں کلمۂ طیبہ کے نفی واثبات کو سانس کی آمد و شد میں بسا لیا جاتا ہے، یہاں تک کہ یہ ایسی عادتِ ثانیہ بن جاتی ہے کہ زندگی بھر سانس کے ساتھ ذکر ہوتا رہتا ہے، حبسِ دم اور پاس انفاس کا طریقہ جوگیوں میں بھی ہے اور اسے ہندوستان کے اکابر صوفیہ نے مفید جان کر اختیار کیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کشمیریؒ سلو کے ابتدائی دور ہی میں اس مرحلے سے گزر گئے تھے، کبھی حضرت وقفے تک خاموشی اختیار کئے رہتے تو آپ کے تنفّس کی منضبط کیفیت سے صاف محسوس ہوتا تھا کہ پاس انفاس کے شغل میں برابر مشغول ہیں۔

مولانا محمد منظور نعمانی کی روایت ہے کہ ایک بار آپ نے فرمایا "اگر کوئی چاہے اور استعداد ہو تو ان شاء اللہ تین دن میں یہ بات پیدا ہو سکتی ہے کہ قلب سے اللہ اللہ کی آواز سنائی دینے لگے، لیکن یہ بھی کچھ نہیں اصل چیز تو بس احسانی کیفیت اور شریعت وسنّت پر استقامت ہے" یہ آخری جملہ خاص طور پر حضرت کشمیریؒ کے ذوق اور مشن کا آئینہ دار ہے۔

احسانی کیفیت کیا ہے؟ ایک حدیث میں اس کی تشریح یوں آئی ہے:

"أن تعبد الله كأنّک تراه فان لم تكن تراه فانه يراک"

یعنی اگر دونوں طرف سے رابطہ قائم ہو جائے تو سبحان اللہ، ورنہ یک طرفہ رابطہ سے ہی عبادت با اخلاص جاری رکھے، جو خدا کو نہ دیکھ کر بھی اس کی عبادت اس طرح کرے گا گویا خدا اسے دیکھ رہا ہے وہ اس حدیث کی رو سے "محسِن" ہے اور قرآن کہتا ہے ان اللّٰه لا يضيع اجر

المحسنین جس نے بے دیکھے اور بے لاگ عبادت اس طرح کرے گا گویا احسان کیا، یہ توقع نہ رکھی کہ اس کا صلہ واقعی کچھ ملے گا بھی یا نہیں، اللہ اس کا صلہ ضائع نہیں کرے گا، وعدۂ الٰہی یہ ہے کہ **هل جزاء الاحسان الا الاحسان** یعنی جس بندے نے صلے کو جانچے پرکھے بغیر ہماری عبادت کی ہوگی اس کی جزاء بھی یہی ہوسکتی ہے کہ اس کی عبادت کو آنکے تولے بغیر اجر دیا جائے۔

میری ناقص رائے میں احسانی کیفیت میں عوض معاوضہ والی بات نہیں ہے بلکہ یک طرفہ اور بے طمع نیکی "طاعت میں تا رہے نہ مئے وانگبیں کی لاگ" الخ، اسی لئے **و قضیٰ ربُّک الّا تعبد الا ایاہُ و بالوالدین احساناً** فرمایا ہے، والدین کے ساتھ احسان کا مطلب بھی یہی ہے کہ ان کی طرف سے اگر اچھا سلوک نہ بھی ہو تب بھی اولاد ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے۔

احسان کے ساتھ دوسری کیفیت حضرت کشمیریؒ نے "استقامت" فرمائی۔ یہ بھی احسان ہی کا دوسرا نام ہے، حضرت نظام الدین اولیاء کے ایک خلیفہ نے عرض کیا کہ خلقِ خدا کرامت کی طلب گار ہوتی ہے تو آپ نے فرمایا:

"الکرامة هی الاستقامة علیٰ باب الغیب"

یہ "**استقامت علیٰ باب الغیب احسان**" نہیں تو اور کیا ہے؟ اس سے منطقی نتیجہ یہی نکلا کہ احسانی کیفیت بجائے خود کرامت ہے۔

مراقبۂ اسمِ ذات:

حضرت کشمیریؒ کی زبانِ مبارک دن بھر درسِ حدیث میں **قال الله** اور **قال الرّسول** کا ورد کرتی تھی، یہ بھی ایک ذکر ہی تھا علی الدّوام ذکر، لیکن مراقبہ کو صوفیہ نے مشاہدہ و معاینہ کی پہلی سیڑھی بتایا ہے، ذکر سے سامعہ اور ناطقہ لطف اندوز ہوتے ہیں، مگر مشاہدہ و فکر کا ذوق مراقبہ میں ہے، حضرت کشمیریؒ جب اپنے حجرے میں تنہا ہوئے تو وہ مشغولیت کا دوسرا ہی عالم ہوتا تھا:

ملنے والو پھر ملے گا وہ ہے عالمِ دیگر میں
میر فقیر کو سکر ہے یعنی مستی کا عالم ہے اب

آپ تہجد کے لئے رات کو دو بجے بیدار ہوجاتے اور فجر کے وقت تک مراقبہ اور پاسِ انفاس میں مشغول رہتے تھے، نمازِ فجر کے بعد سورج کے ایک نیزہ بلند ہونے تک وظیفہ پڑھنے میں مشغول ہوتے اور یہ سب معمولات اسی طرح سلسلۂ چشتیہ صابریہ ہادویہ کے بزرگوں کے بھی رہے ہیں۔

حالتِ مراقبہ اور مشغولی کا بیان آپؒ کے ایک شاگرد نے اس طرح کیا ہے:
"احقر نے بارہا دیکھا کہ اندھیرے کمرے میں مراقبہ فرمارہے ہیں لیکن روشنی ایسی جیسے بجلی کے قمقمے روشن ہوں حالانکہ اس وقت بجلی گل ہوتی تھی"

تعویذ اور ادعیہ:

بزرگانِ طریقہ کی طرح حضرت کشمیریؒ عندالضرورت کسی طالب کو کوئی وظیفہ یا دعاء بھی پڑھنے کے لئے تجویز کرتے تھے، یہ اکثر ماثور دعائیں ہوتی تھی۔ ایک بار حافظ ابوزرعہ کی روایت نقل کی کہ جرجان میں ہزارہا گھر آگ لگنے سے جل گئے اور قرآن بھی جلے مگران میں بعض آیات نہیں جلیں اور ان آیتوں کے لئے فرمایا کہ اگر انہیں لکھ کر کسی برتن میں بند کر کے دکان یا گھر یا سامان میں رکھیں تو حفاظت کے لئے مجرّب ہے۔ اسی طرح کسی لاعلاج مرض کے لئے فرمایا کہ ہر سورت کی آخری آیت پڑھ کر پانی پر دم کریں تو مفید ہے۔

شمائمِ امدادیہ میں حضرت شاہ عبدالباری علیہ الرحمہ کا ایک واقعہ بیان ہوا ہے کہ آپ نے کسی کو یہ الفاظ بطورِ تعویذ لکھ کر دئے تھے، "چل اڑ جاری بھنبھیری ساون آیا" حضرت شاہ صاحبؒ کے بارے میں ایسا ہی چٹکلہ ان کے صاحبزادے مولانا انظر شاہ صاحب نے بیان کیا کہ چیچک کے بخار میں مریض کے کان میں یہ الفاظ کہنے کو فرمایا:

اوراد:

اوراد میں **حسبنا الله و نعم الوکیل** ہمہ وقت زبانِ مبارک پر جاری رہتا تھا، اٹھتے بیٹھتے زبان سے **حسبنا الله** ہی نکلتا تھا، یہ خود آپ کے مقام فردانیت پر پہنچ جانے کی دلیل ہے، ایسی روایات کثرت سے ملتی ہیں اور بحمد للہ ابھی اس کے شاہدین بھی زندہ ہیں کہ آپ ضخیم کتاب سے ایک یا آدھی سطر کا حوالہ بھی حسبنا اللہ کہہ کر نکال لیتے تھے۔

اسی سلسلۂ عالیہ کے بزرگ حضرت شاہ عضد الدین امروہوی (متوفی ۱۱۷۲ھ) کی ایک تصنیف **مقاصد العارفین** فن سلوک میں بے مثل کتاب ہے اور شیخ اکبر کے افکار اور اسلوب کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے، اس میں حضرت شاہ عضد الدینؒ نے اسماء صفات کی تجلّیات سے بھی بحث کی ہے اور تفصیل سے بتایا ہے کہ سالک پر مختلف اسماء کس طرح متجلّی ہوتے ہیں، میرا خیال ہے کہ حضرت کشمیریؒ **حسبنا الله و نعم الوکیل** کے باقاعدہ عامل تھے اور یہ اسماوکیلکی تجلی

تھی یا باصطلاح دیگر اسی اسم کے مؤکل آپ کے تابع تھے، کیوں کہ بعض مواقع پر تو اسی حسبنا اللہ نے بدیہی کرامت دکھادی ہے، (روایات کی نقل سے بخوف طوالت پرہیز کرتا ہوں)

قوّتِ مکاشفہ:

خطرات پر آگاہ ہونے کی قوّت یا کشفی صلاحیت بہت ہی ادنیٰ درجہ ولایت وکرامت کا ہے اور اکابر صوفیہ نے اسے کوئی اہمیّت نہیں دی ہے، حضرت شاہ صاحبؒ جیسے دردی کش میخانۂ شریعت وطریقت کے احوال میں مکاشفات کی مثالیں تلاش کرنا کوئی خاص قابل اعتناء بات نہیں ہے، ذاکر وشاغل اور حق آگاہ درویش پر تو کبھی ایسے لمحات بھی گزرتے ہیں کہ اسے یہ سارا عالم کف دست پر رکھے ہوئے انڈے کی طرح نظر آسکتا ہے۔

کراماتِ امدادیہ میں لکھا ہے کہ ایک صاحب نے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے بیعت کی، ان کے ایک ملنے والے نقشبندی مجدّدی سلسلے کے مجاز تھے اور وہ چاہتے تھے کہ یہ میرے ذریعے سے داخلِ سلسلہ ہوں اس لئے ان کے دل میں سلسلۂ چشتیہ کی طرف سے سستی اعتقاد پیدا کرنا شروع کی اور یہ کہا کہ اس سلسلہ میں سلوک ختم ہی نہیں ہوتا، عمر بھر کشف نہیں حاصل ہوتا کچھ نظر نہیں آتا، مولوی صاحب چونکہ مشائخ کی صحبت میں کم بیٹھے تھے کسی قدر اعتقاد اُست ہوگئے، مولانا تھانوی نے ان کا حال بیان کیا تو حضرت نے ارشاد فرمایا کہ کشف کوئی چیز نہیں لوگوں کو ہوجاتا ہے، کشفِ حقائق اہلِ حقیقت کے نزدیک معتبر ہے۔

جو لوگ حضرت شاہ صاحبؒ کی صحبت کیمیا خاصیت سے بہرہ اندوز ہونے کی سعادت رکھتے ہیں انہوں نے اس قوّت مکاشفہ کے ہزاروں کرشمے دیکھے ہونگے، ایک واقعہ مولانا محمد انور لائل پوری نے لکھا ہے کہ:

"حضرت شاہ صاحبؒ نے آسٹریلین بلڈنگ (لاہور) کی مسجد میں بعد نماز، فجر وعظ فرمایا علماء وفضلاء، عوام وخواص بالخصوص ڈاکٹر محمد اقبالؒ اور انکے ساتھی اہتمام سے حاضر ہوئے تھے، بیان ہوتا تھا، اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو، مالک تعالیٰ سے علاقہ پیدا کرو، غرض حضرتؒ نے خطبہ شروع فرمایا: الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہ ' وعظ کرسی پر بیٹھ کر فرمارہے تھے، احقر کے دل میں وسوسہ سا گذرا کہ مسجد میں تو شاید کرسی بچھانا سوء، ادب ہو، حضرت نے فوراً خطبہ بند کردیا، فرمایا کہ مسجد میں کرسی بچھانا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، چنانچہ مسلم شریف میں روایت ہے کہ ایک سائل کے جواب دینے کے لئے حضورؐ کے لئے مدینہ کے بازار سے کرسی لائی گئی تھی،

راوی کہتا ہے کہ اس کرسی کے پائے سیاہ تھے، غالباً لوہے کے تھے، مصلّٰی کے قریب رکھی گئی حضور نبی کریمؐ نے اس پر بیٹھ کر جوابات دئے۔

یہ فرمایا اور پھر خطبہ شروع فرما کر حضرت نے وعظ کہا، احقر ندامت سے پسینے پسینے ہوگیا، یہ تو "کشفِ قلوب" کا عالم تھا، دوسری نوعیت یعنی "کشفِ قبور" کی مثال بھی سن لیجئے،

جناب سیّد احمد اندرابی کی روایت ہے:

> "خانقاہِ اندرابیہ (واقع سری نگر) میں پہلی مرتبہ غالباً عصر کی نماز پڑھائی، نماز پڑھا کر دعاء کے لئے قوم کی طرف منہ کیا مگر پیٹھ ذرا جنوب کی طرف مائل تھی، تھوڑی ہی دیر کے بعد پوری طرح قوم کی طرف منہ کر کے پشت بقبلہ ہو کر بیٹھ گئے، دعا سے فارغ ہوئے تو حاضرین سے دریافت فرمایا کہ ادھر جنوب کی طرف کون بزرگ مدفون ہیں؟ حاضرین نے عرض کیا کہ کہ سیّد السادات شیخ سید میر محمد میرک اندرابی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار پر انوار ہے، اس کے بعد کبھی اس کی طرف پیٹھ کر کے نہیں بیٹھے۔"

کشفِ حقائق:

مجاہداتِ سلوک کیا ہیں، دقائق، حقائق کی راہوں تک پہنچنے کا وسیلہ ہیں، والـذیـن جاھدوا فینا لنھدینّھم سبلنا —— شاہ صاحبؒ کی پوری زندگی ریاضت اور مجاہدہ تھی، انھوں نے زیادہ تر اپنے مجاہدات کو مخفی رکھا، لیکن فتنۂ قادیانیت کی تردید اور استیصال کے لئے تو وہ ایک مزمن بیماری اور عالمِ ضعیفی کے باوجود باہمّت نوجوانوں کی طرح میدان میں کود پڑے تھے، خدا کے فضل سے جہادِ ظاہری کی فضیلت سے بھی محروم نہ رہے۔

اسرارِ شریعت کچھ بھی ہوا کریں لیکن بحیثیت ایک محدّث، مفتی اور فقیہہ کے ان کا فرض یہ تھا کہ ظاہرِ شریعت کی حمایت وحفاظت کریں، مگر انھوں نے کبھی اہلِ تصوّف کے خلاف کوئی ادنی سا کلمہ بھی استخفاف کا اپنی زبان سے نہیں نکالا، شریعت وطریقت کی ایک بحث مقدمۂ بھاولپور کی گواہی میں سخن گسترانہ طور پر آن پڑی تھی تو آپ نے فرمایا:

"ہم سمجھتے ہیں کہ ظہر قرآن کی مراد وہ ہے جو قواعدِ لغت اور عربیت اور ادالۂ شریعت سے علماء سمجھ لیں اور اس کے تحت میں قسمیں ہیں اور باطنی سے یہ مراد ہے کہ حق تعالٰی اپنے ممتاز بندوں

کوان حقائق سے سرفراز کردے اور بہتوں سے وہ خفی رہ جائیں لیکن ایسا کوئی باطن جو مخالف ظاہر کے ہو اور قواعد شریعت اس کو رد کرتے ہوں مقبول نہ ہوگا اور رد کیا جائے گا اور بعض اوقات باطنیت الحاد تک پہنچا دیگی، حاصلِ کلام یہ ہے کہ ہم مکلف فرمانبردار بندے اپنے مقدر کے موافق ظاہر کی خدمت کریں، اور باطن کو خدا کے سپرد کردیں۔

اسی شہادت میں حضرت کشمیریؒ نے یہ چیلنج بھی کردیا تھا کہ صوفیائے کرام جسے فن حقائق کہتے ہیں (مرزا غلام قادیانی) اس میں سے کسی حقیقت کو صحیح نہیں سمجھ سکا۔ کاش کسی نے ''فن حقا ئق'' کے موضوع پر شاہ صاحب کو چھیڑ دیا ہوتا تو آج کشف المحجوب، رسائل قشیریہ یا عوارف المعا رف جیسی کوئی اور کتاب بھی ہمارے ہاتھوں میں ہوتی۔

توحید وجودی:

چشتی صوفیہ کے سلوک میں۔ ''کشف حقائق'' کا مرتبہ حاصل ہوجائے تو عقیدۂ وحدت وجود پر کامل شرح صدر ہوجانا ہے حضرت حاجی امداداللہ مکی کو مولوی قلندر جلال آبادی نے ابتدء میں ہی بشارت دی تھی کہ تم پر توحید خوب منکشف ہوگی اسی لئے خدا نے ان کا پیوند بھی حضرت شاہ عبدالباری کی خانقاہ سے کردیا جو اپنے مسلک وحدت وجود میں بے مثل تھی اور جہاں عبدالرحمٰن موجود لکھنوی جیسے بزرگ بھی کچھ سیکھنے کے لئے آکر رہتے تھے۔

ہندوستان میں توحید وجودی کا مذاق حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی تصانیف کے سا تھ آیا تھا، آٹھویں صدی ہجری میں فصوص الحکم کی پہلی شرح اسی سرزمین کشمیر میں حضرت میر سید علی ہمدانیؒ (ف ۷۸۶ھ) نے لکھی تھی فارسی شرح کا قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں موجود ہے/ عربی شرح ناپید ہوگئی/ اس کے بعد ہندوستان میں عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں فصوص الحکم اور فتوحات مکیہ کی متعدد شرحیں اور ترجمے ہوئے جن کی تفصیل حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی کی کتاب الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند میں دیکھی جاسکتی ہے۔

سلسلہ عالیہ چشتیہ صابریہ کے بزرگوں میں گلزار ابرار کی روایت کے مطابق سب سے پہلے حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ نے فصوص الحکم لکھی تھی لیکن حضرت شیخ محب اللہ الہ آبادی (ف ۱۰۵۸ھ) تو ہندوستان میں ابن عربیت کے افکار کو عام کرنے میں غیر معملولی رول ادا کیا ہے انھوں نے مسئلہ وحدت الوجود کے وقائق واسرار کو عارفانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ دارا شکوہ بھی اکی

خدمت میں استفادہ کے لئے حاضر ہوتا تھا۔

شاہ صاحبؒ کے سلسلہ کی مختصر تاریخ:

ثانی ابن عربی حضرت شیخ محب اللہ الہ آبادی کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے۔ خلفیہ حضرت شیخ محمدی فیاض اکبر آبادی مولانا رفیع الدین فاروقی شاگرد حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنے تذکرۃ المشائخ میں لکھا تھا کہ شاہ محمدی فیاض علوم ظاہری کے بھی اتنے ہی بڑے عالم تھے/ ورع وتقوی میں انکے مرتبے کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ شیخ محب اللہ نے فرمایا: ''اگر یہ میرے مرید نہ ہوئے ہوتے تو میں خود انکا مرید ہوتا۔''

شاہ محمدی فیاض کا قیام آگرہ میں رہتا تھا اور دارا شکوہ انکی مجلسوں میں شریک ہوتا تھا انہوں نے اپنے مرشد شیخ محب اللہ الہ آبادی کی کتاب تسویہ کی شرح بھی لکھی تھی اسی کی آڑ لیکر اورنگزیب نے انہیں پہلے گوالیار پھر اورنگ آباد کے قلعے میں اسیر کر دیا تھا۔

حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ کشمیری کو بھی محی الدین ابن عربی کی تصانیف سے گہرا لگاؤ تھا۔ ان کے رموز ودقائق کو خوب سمجھتے تھے اور ظاہر شریعت پر ان کا انطباق خوب کرتے تھے، عوام سے تو ان مسائل کو بچا کر رکھتے تھے۔ لیکن اگر علماء اور صاحبان دل کی محفل ہوتی اور مسئلہ وحدت الوجود کا ذکر چھڑ جاتا تو ایسے حقائق ومعارف بیان فرماتے تھے جن سے کچھ اندازہ ہوسکتا تھا کہ خود شاہ صاحبؒ کس مقام پر فائز ہیں بقول شاعر۔

خم کے خم پی گئے مئے منصور
لیک اسکا سا شور و شر نہ کیا

ایک بامسئلہ وحدت وجود ووحدت شہود کی بات چھڑ گئی بس پھر کیا تھا تین دن تک نماز عصر سے وقت عشاء تک برابر اسی موضوع پر کلام کرتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک بحر مواج ہے کہ امڈا چلا آتا ہے۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ نے اپنی بعض نظموں میں مسائل توحید وجودی نظم کئے ہیں یہ نظمیں بھی شاہ صاحبؒ کو ازبر تھیں۔ حضرت حاجی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے چار مسئلوں میں شرح صدر ہے، مسئلہ قدر، مشاجرات صحابہ/ مسئلہ روح اور وحدت الوجود۔ حضرت کے متوسلین کو بھی اس کا کچھ نہ کچھ فیضان ضرور پہنچا ہے۔

شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ (ف۔ ۶۳ھ) کے بارے میں شاہ صاحبؒ فرماتے تھے

حضرت مرزا مظہر جان جاناں نے ان کے دادا سے اپنے روابطِ قلبی پر نظر کر کے انہیں سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ میں بھی اپنی خلافت دی تھی، چنانچہ امروہہ میں مرزا صاحبؒ کے دو خلفاء ہیں، ایک حضرت شاہ ضیف اللہ نقشبندی دوسرے حضرت شاہ عبدالباری چشتیؒ۔

حضرت شاہ عبدالرحیم علاقۂ سرحد کے رہنے والے فاطمی سید تھے، انہوں نے ایک خواب دیکھا کہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر کئے گئے ہیں، اور حضورؐ نے انہیں اپنے پاس بیٹھے ہوئے کسی بزرگ کے سپرد کر دیا ہے، ان بزرگ کا نقشہ ذہن میں محفوظ رہا اور انہیں تلاش کرنیکی تڑپ دل میں شروع ہوئی، احباب سے تذکرہ کیا تو ایک نے کہا کہ میں نے بھی ایسا ہی خواب دیکھا ہے، چنانچہ دونوں اس مرشد کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے، یہ روایت بہت سے مآخذ میں بیان ہوئی ہے مگر رسالۂ درِّ فرید سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دوسرے ساتھی اخوند جان محمد تھے، دونوں لاہور، ملتان، انبالہ، ساڈھورہ، انجلاسہ، سہارنپور، مظفر نگر وغیرہ کی خانقاہوں میں ٹھہرتے ہوئے امروہہ وارد ہوئے تو حضرت شاہ عبدالباری کی خانقاہ میں پہنچے، وہ اس وقت مثنوی مولانا روم کے مطالعے میں تھے، ان کی صورت دیکھتے ہی وہ خواب آنکھوں کے سامنے متمثّل ہو گیا، حضرت شاہ عبدالباریؒ نے شاہ عبدالرحیم فاطمی کو مرید کر لیا اور تکمیلِ سلوک کرانے کے بعد انہیں خلافت بھی دے دی تھی مگر اخوند جان محمد سے اسی وقت فرمایا کہ تمہارا حصہ شاہ غلام علی صاحب کے ہاں ہے، چنانچہ یہ وہاں چلے گئے اور ان سے بیعت ہو کر مجاز ہو گئے پھر ہجرت کر کے مکۂ معظمہ چلے گئے تھے اور جبلِ بوقبیس پر معتکف رہتے تھے۔

اس واقعہ کو راویوں نے خدا جانے کیا کیا گھٹا بڑھا کر بلکہ اکثر حالات میں مسخ کر کے پیش کیا ہے۔ یہاں حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے اسلافِ طریقت کی مختصر تاریخ بیان کرنے سے اصل مقصود بعض شدید طور پر پھیلی ہوئی غلط بیانیوں کی تصحیح کرنا ہے جو ارواحِ ثلاثہ جیسی کتابوں سے عام ہوئی ہیں، مثلاً ان روایات میں یہ کہا گیا ہے مولوی عاشق الٰہی میرٹھی نے تذکرۃ الرشید میں مولانا گنگوہی کے حوالے سے لکھا ہے: دو چار روز کے بعد حاجی عبدالرحیم صاحب حضرت شاہ عبدالباری صاحب سے رخصت ہو کر ایک جگہ اللہ کی یاد میں مصروف ہو گئے، چھ ماہ کے بعد جب شاہ صاحبؒ کی زیارت کو امروہہ حاضر ہوئے تو شاہ صاحب کا وصال ہو گیا تھا، یہ ابھی مجاز بھی نہ ہوئے تھے کہ شیخ کا انتقال ہو گیا۔

مولوی عاشق الٰہی کی روایت ہے کہ پھر حاجی عبدالرحیم صاحب نجلاسہ میں رحم علی شاہ

تحصیل زمانہ کے رواج ومنہاج کے مطابق کی تھی/ اتنا ہی نہیں بلکہ ہندو فلسفہ کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے انہوں نے بھیس بدل کر کئی سال اجودھیا میں قیام کیا اور سنسکرت پڑھی۔ وہ فارسی کے صاحب دیوان شاعر تھے، دیوان تو ضایع ہو گیا، کچھ متفرق اشعار مل جاتے ہیں/ فارسی میں ایک اعلی درجے کی تصنیف ''مقاصد العارفین'' جس کا تذکرہ پہلے کر چکا ہوں ان کی ایک سنسکرت کتاب ست سرور (جس کا ترجمہ بحر الحقیقت ہو سکتا ہے) بھی تھی اس کی ایک جھلک میں نے دیکھی ہے اب یہ ناپید ہو گئی ہے۔

حضرت شاہ عضد الدین صاحبؒ کے ایک خلفیہ ان کے فرزند حضرت شاہ معز الدین عرف میاں موج (ف ۱۱۹۵ھ) تھے اور دوسری خلافت حضرت شاہ عبد الہادی چشتی امروہوی (ف ۱۱۹۰ھ) کو ملی تھی اسکے بعد کئی پشتوں تک یہی سلسلہ رہا کہ ایک خلافت فرزند صلبی کو ملتی رہی دوسری حضرت شاہ عبد الہادی کی الاد کو۔

حضرت شاہ عبد الہادیؒ نسبا صدیقی تھے اور ان کا خاندان عہد سلطنت ہی سے امروہوی میں آباد اور عہدہ قضاء وغیرہ پر سرفراز تھا ان کی رسمی تعلیم زیادہ نہیں ہوئی مگر طریق سلوک کو اپنے مرشد کی رہنمائی میں خوب طے کیا تھا، خود انہوں نے بھی ایک کتاب مقصود الطالبین لکھی تھی جس کا میرے علم میں اب صرف ایک ہی نسخہ باقی ہے اور وہ میرے پاس ہے ان کے حالات وملفوظات پر مشتمل ایک کتاب مفتاح الخزائن ان کے خلیفہ سید نثار علی بخاری و بریلوی صاحب انشائے دلکشا نے لکھی تھی جس کا ایک قلمی نسخہ میرے ذخیرے میں موجود ہے اور ان شا اللہ اسے مع اردو ترجمہ وحواشی شائع کرنے کا ارادہ ہے/ حضرت مرزا مظہر جان جاناں ف (۱۱۹۵ھ) جب سنبھل یا مراد آباد تشریف لے جاتے تو حضرت شاہ عبد الہادی کی خانقاہ میں ضرور قیام فرماتے تھے/ چنانچہ دوبار موضع براہی (پرگنہ سنبھل) میں ان سے ملاقات کرنے تشریف لے گئے اور ایک یا دوبار امروہہ میں بھی خانقاہ ہادویہ میں قیام فرمایا۔

حضرت شاہ عبد الہادی کے ایک ہی فرزند شیخ ظہور اللہ تھے/ لیکن انھوں نے اپنے والد سے تکمیل سلوک نہیں کی تھی بلکہ انکے بیٹے حضرت شاہ عبد الباریؒ نے تربیت روحانی حاصل کی تھی اس لئے حضرت شاہ عبد الہادیؒ نے انہیں اپنی خلافت سے سرفراز فرمایا/ حضرت شاہ عبد الباریؒ کی رسمی تعلیم بھی خوب ہوئی تھی اور سلوک میں تو اپنے وقت کے امام ربانی تھے/ حضرت شاہ عبد الرحمن موحد لکھنوی نے بھی چھ ماہ تک انکی خانقاہ میں قیام کرکے ان سے باطنی فیوض کا اکتساب کیا تھا۔

قادری کے پاس آئے تو ان کے پہنچنے سے پہلے شاہ صاحب کا بھی انتقال ہوگیا، ان سے بھی مجاز نہ ہوئے،، آخر سید احمد صاحب بریلوی جب سہارنپور تشریف لائے تو حضرت حاجی صاحبؒ بھی حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ آپ مجھے اجازت عطا فرمادیں، حضرت سیّد صاحب نے ان کو مجاز فرمایا،،۔

مولوی عاشق الٰہی مرحوم خود اس سلسلے میں بیعت ہیں، ایسی غیر ذمہ دارانہ روایات شاید ہی کسی نے کبھی اپنے بزرگان سلسلہ کے بارے میں لکھی ہوں، میں بجز اس کے کیا کہہ سکتا ہوں کہ قران کا قولِ فیصل موجود ہے،" ان الذین یبایعونک الخ......

گویا حضرت شاہ عبد الباری کی زندگی ہی میں حضرت شاہ عبد الرحیم نے حضرت سید احمد شہیدؒ کے دستِ مبارک پر بیعت کی/ بعد میں کسی نے ان سے اس طرح کا سوال کیا کہ سید صاحب سے بیعت کرنے کے بعد آپ کو کیا ملا؟ تو انھوں نے کہا کہ ''ہمیں نماز پڑھنی آگئی اور روزہ رکھنا آگیا'' گویا شاہ عبد الباریؒ کی خانقاہ میں نماز روزہ تک درست نہ تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت شاہ عبد الباریؒ کا انتقال ۱۲۲۶ھ (۱۸۱۰ء) میں ہوا، اس وقت حضرت شاہ عبد الرحیم فاطمی ان کی خانقاہ میں موجود تھے اور دوسرے بزرگ ضلع ہزارہ کے میر حاتم علی صاحب (ف ۱۲۴۵ھ) تھے، جنہیں چشتی نظامی سلسلے میں حضرت شاہ فخر الدین دہلویؒ سے بھی فیض پہنچا تھا اور حضرت شاہ عبد الباری کی خدمت میں آئے تو پھر زندگی بھر کہیں نہیں گئے، انتقال کے بعد بھی ان کے قدموں میں آسودہ ہیں، انتقال کے وقت ان کے فرزندِ اکبر حضرت شاہ رحمٰن بخش (ف ۱۲۸۰ھ) کی عمر صرف پچیس سال تھی اور انھوں سلوک کی تکمیل نہیں کی تھی، انتقال کے وقت حضرت شاہ عبد الباری نے انہیں اپنے خلیفہ میر حاتم علی صاحب کے سپرد کیا اور کہا کہ جب ان کا سلوک مکمل ہوجائے تو انہیں اجازت دے دینا، چنانچہ خاندانی شجرۂ طریقت میں حضرت شاہ عبد الباری اور ان کے فرزند شاہ رحمٰن بخش کے درمیان میں میر حاتم علی صاحب کا اسمِ گرامی آتا ہے، حضرت شاہ رحمٰن بخش کو جہاد کی بڑی تمنا تھی، اسی نیت سے ایک گھوڑا لے کر پال رکھا تھا اور شہسواری اور شمشیر زنی بھی سیکھی تھی، بڑھاپے میں بھی بصارت زائل ہونے کے باوجود اس نیت سے تھوڑی سی ورزش کر لیا کرتے تھے، کہ جہاد میں حصہ لوں گا، حضرت شاہ عبد الباریؒ کی وفات کے ۱۵، ۱۶ برس کے بعد ۱۲۴۴ھ میں حضرت سید احمد شہیدؒ نے سارے شمالی ہندوستان کی خانقاہوں اور مدارس کو ایک گشتی دعوت نامہ بھیجا اور تحریکِ جہاد میں حصہ لینے کی اپیل کی، اس وقت حضرت شاہ رحمٰن بخش خود جانے کے لئے آمادہ ہوگئے مگر مسترشدین اور دوسرے حضرات نے مشورہ دیا کہ

آپ کے جانے کے بعد خانقاہ بند ہو جائے گی، اور رشد و ہدایت کا جو کام یہاں ہو رہا ہے یہ موقوف ہو جائے گا، شاہ عبدالرحیم فاطمی کو نمایندہ بنا کر بھیج دیجئے، حاجی عبدالرحیم صاحب افغانی تھے/ جسم قوی تھا، فنونِ حرب سے واقف تھے اور تمام عمر تجرّد میں بسر کی تھی، اہل و عیال کا بکھیڑا بھی ان کے ساتھ نہیں تھا، چنانچہ ۲۰، ۲۵ اصحاب نے جہاد میں شرکت کے لئے اپنے نام لکھوائے خانقاہ کی طرف سے پانچ سو روپے کی ایک تھیلی اور بعض دوسرے ہدایا لے کر مجاہدوں کا یہ مختصر سا قافلہ امروہہ روانہ ہوا اور سہارنپور جا کر حضرت سید احمد صاحبؒ کے قافلے سے مل گیا، حضرت شاہ عبد الرحیم فاطمی نے حضرت سید احمد صاحب شہیدؒ سے بیعتِ ارادت نہیں کی تھی، بیعتِ جہاد کی تھی، اس لئے جو لوگ اس بیعت کی بنیاد پر سلسلۂ طریقت قائم کر لیتے ہیں وہ غلطی پر ہیں، اس بیعتِ جہاد کو وہ ''طریقِ محمدٌ'' سے موسوم کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ اس طریقے کی نسبت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بطورِ ظاہرِ شریعت ہے۔

یہاں ضرورۃً اس بات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ حضرت شاہ عبدالباریؒ میرے جدِّ امجد تھے اور ان کے پڑپوتے حضرت شاہ سلیمان احمد علیہ الرحمہ جو علوم ظاہری میں حضرت مولانا احمد حسن محدّث امروہوی کے شاگرد تھے، میرے مربی اور مرشد تھے، اس خاندان کے کتب خانے اور بیاضوں کا کچھ حصہ جو اصلی ذخیرے کا ہزارواں حصہ بھی نہیں ہے، اس نامۂ سیاہ کے پاس محفوظ ہے، اس لئے یہ مختصر تاریخ جو میں نے بیان کی ہے، دوسری تمام روایات کے مقابلے میں اصح اور مستند ترین ہے۔

سیّد صاحبؒ کے قافلے میں شامل ہونے کے بعد اگلے ہی سال ۲۷ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ کو حضرت سید احمد صاحبؒ کے ساتھ ہی بالاکوٹ کے معرکے میں پنجتار کے مقام پر شاہ عبدالرحیم صاحبؒ شہید ہو گئے تھے، انا للہ وانا الیہ راجعون ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء و لکن لا تشعرون

بنا کر دند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

اپنے پیر و مرشد کی وفات کے بعد حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب کا خانقاہ امروہہ میں قیام رہا، البتہ دہلی، مظفر نگر، ساڈھورہ وغیرہ جاتے رہتے تھے۔ اور ان علاقوں میں ان کے مریدین بھی تھے۔ حضرت میاں جی نور محمدؒ (ف ۱۲۵۸ھ) نے ان کی بیعت جہاد سے بہت

پہلے ان سے خلافت واجازت حاصل کر لی تھی۔

حضرت میاں جی نور محمدؒ کو تمام تر تعلیم و تلقین حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب ہی سے ملی اور وہی حضرت شیخ الکل حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ تک پہنچی۔

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتو آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

حاجی صاحبؒ کی ذات اللہ کی شان کبریائی کا ایک آئینہ تھی۔ **"تفضیل بعض علی بعض"**۔ بڑا نازک معاملہ ہے اور ہم جیسے عامیوں کو زیب نہیں دیتا مگر دل یہ کہتا ہے کہ کم سے کم ان دوصدیوں میں حاجی صاحبؒ کی کوئی نظیر کہیں بھی نہیں ملے گی/ یہ صرف حاجی صاحبؒ ہی ہیں جن کی شخصیت کے مرکزی نقطے پر چشتی اور نقشبندی، قادری اور سہروردی، بریلوی اور دیوبندی، عالم اور امی سب جمع ہو گئے ہیں اور چشتی نسبت عالیہ کا رنگ اپنی بھرپور جلوہ سامانیوں کے ساتھ نکھر آیا ہے۔

جن اختلافی امور کو بنیاد بنا کر ہندوستان کے علمائے احناف نے اپنے جداگانہ دبستاں کھول لئے ہیں، حاجی صاحب کی شخصیت اور افکار میں وہ فروعی اختلافات ایسے غائب ہو گئے ہیں جیسے میل کچیل کو دریا بہا کر لے جاتا ہے۔

لیکن مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس صدی کے آغاز سے بعض حضرات نے جن میں ذمہ دار علماء اور اکابر شامل نہیں ہیں۔ البتہ انکے اغماض کا شکوہ ضرور کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے کی نسبت کو ہی "غتر بود" کرنے کی کوشش کی ہے اب زیادہ زور اس بات پر ہے کہ سلسلہ طریقت کو حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی یا حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی یا حضرت سید احمد شہید رحمتہ اللہ علیہم سے جوڑا جائے اور چشتی نسبت کے ساتھ وہ سلوک ہے جو ہمارے بعض ہم وطن قرون وسطیٰ کی تاریخ کے ساتھ کر رہے ہیں۔

اکثر شجروں میں حضرت شاہ عبدالہادیؒ کے بعد نام تک صحیح نہیں یا ان کی ترتیب غلط ہے/ حضرت شاہ صاحب عبدالرحیم فاطمی کے حالات سے تو اتنا تجاہل ہے کہ مولانا غلام رسول مہر نے پوری تحریک جہاد کی تاریخ دوڈھائی ہزار صفحوں میں لکھی مگر شاہ عبدالرحیم صاحبؒ کے حالات میں انہیں دو پیراگراف بھی نہیں مل سکے۔ جناب عبدالرحمان صاحب کوندو نے حال ہی میں ایک قابل ستائش کام کیا ہے کہ حضرت محدث کشمیریؒ کے حالات و کمالات پر ساڑھے سات سو (۷۵۰) سو صفحات کی کتاب الانور مرتب کر دی ہے اس میں حضرت مولانا احمد سعید دہلویؒ کی وہ

امرانگیز تقریر بھی شامل ہے جوانہوں نے حضرت کشمیریؒ کی وفات پر منعقد ہونے والے تعزیتی جلسے میں دہلی کی جامع مسجد میں کی تھی انہوں نے اپنی تقریر میں فرمایا۔

''حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے بعد جس خاندان کو خدمت حدیث کا شرف حاصل ہے وہ شاہ عبدالرحیم کا خاندان ہے اسی خاندان کے بزرگوں میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب، شاہ عبدالعزیز صاحب، شاہ عبدالقادر صاحب/ شاہ اسحٰق صاحب رحمتہ اللہ علیہم اجمعین ہیں/ یہ تمام حضرات اسی مبارک خاندان کے افراد ہیں۔''

دارالعلوم دیوبند کے لوگوں کو جس طرح علم ظاہر اور علم باطن میں حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب کے خاندان سے منسوب کیا جاتا ہے وہ مولنا شاہ عبدالرحیم صاحب دہلوی اور میاں جی نور محمد صاحب جھنجھانوی کی تعلیم کا خلاصہ ہے۔

اس تقریر کے آخری جملوں سے بھی یہی متبادر ہوتا ہے۔

''شاہ صاحب نے جو کچھ کابراعن کابر شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور میاں جی نور محمد صاحب سے حاصل کیا تھا اسکے بیان کو دفتر کے دفتر ناکافی ہیں۔''

اس سے ظاہر ہے کہ میاں جی نور محمدؒ سے پہلے شجرے میں شاہ عبدالرحیمؒ کا جو نام آرہا ہے اسے حضرت مولانا احمد سعید بھی یہ سمجھ رہے ہیں کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیم فاروقی دہلوی مراد ہیں۔ اسی طرح حال ہی میں ایک کتاب تسلسلات امدادیہ شائع ہوئی ہے جس کے سرورق پر لکھا ہے۔

''سلاسل اربعہ کا ایک محققانہ جامع جائزہ'' اور اسکے مصنف ڈاکٹر ماجد علی خاں پی، ایچ' ڈی علیگ ہیں/ اسکے ساتھ بعض اکابر ملت کی تقریظیں بھی ابتداء میں درج کردی گئی ہیں لیکن اس محققانہ جائزہ کا بھی یہ حال ہے کہ لکھتے ہیں:

''بیعت کے بعد جب آپ (یعنی شاہ عبدالرحیم شہید) سہارنپور واپس ہوئے تو شاہ عبدالہادی صاحب کا انتقال ہوگیا پھر آپ نے شاہ عبدالباری صاحب سے رجوع کیا اور نسبت چشتیہ میں مجاز ہوئے/ جب حضرت سید احمد شہید سہارنپور تشریف لائے تو آپ نے ان کے ہاتھ پر بیعت جہاد و طریقت کی اور سلسلہ نقشبندیہ میں اجازت حاصل کی۔''

یہ تفصیلات میں جانے کا وقت نہیں ہے مختصراً یہ عرض کردوں کہ شاہ عبدالہادی صاحب

کے انتقال اور حضرت سید احمد شہید کی سہارنپور میں تشریف آوری کے درمیان صرف ۵۴ سال کا وقفہ ہے اور شہادت کے وقت حضرت شاہ عبدالرحیم کی کل عمر اتنی بھی نہیں تھی۔

خلاصہ کلام:

حضرت کشمیریؒ کی خصوصیات کو اگر ایجاز کے ساتھ بیان کرنا ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ خدا نے انہیں عجیب جامعیت عطا فرمائی تھی۔ انکی شخصیت اور سیرت بوقلموں ہے جس میں صد ہا رنگ ہیں اور ہر رنگ کی چھوٹ دوسرے پر اس طرح پڑ رہی ہے کہ وہ اسکے سہارے سے اور نکھر رہا ہے/ پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ وہ جامع شریعت وطریقت یعنے فقیہہ صوفی تھے دوسرا امتیا زیہ ہے کہ ان کے صدق واخلاص کی وجہ سے اللہ نے ان کے علم میں بڑی خیر وبرکت عطاء فرما ئی تھی انہیں مولانا قاری محمد طیب صاحب، مولانا بدر عالم، مولانا محمد انوری، مولانا محمد شفیع صا حب، مولانا محمد ادریس صاحب، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثانی، سعید احمد اکبر آبادی، مولانا محمد میاں، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اور شاہ وصی اللہ ایسے ایسے تلا مذہ ملے جو بجائے خود ایک ایک ادارہ ہیں! ور جنہوں نے مجلس علمی اور ندوۃ المصنفین جیسے ادا رے قائم کر کے اسلامی علوم ومعارف میں مضامین نو کے انبار لگا دئے ہیں یہ سب دراصل حضر ت کشمیری کی للّٰہیت کا پرتو ہے، تیسرا امتیاز شاہ صاحب کا حسن قبول ہے کہ زندگی میں بھی وہ محبو ب ومحترم رہے/ چنانچہ آج بھی اس شمع انور کے پروانے اسکے نام پر کھنچ کر چلے آئے ہیں/ چو تھی بات یہ کہ شاہ صاحب نے قادیانی فتنہ کے خلاف بھر پور جہاد بالتعلیم کیا/ پانچویں یہ کہ وہ خود بھی حامی شریعت اور متبع سنت تھے اور تلامذہ کی اخلاقی اور روحانی تربیت اور تزکیہ نفس پر ہر وقت نظر رکھتے تھے/ چھٹی یہ کہ اعلی درجے کے صوفیانہ اخلاق یعنی تعلیم توکل، صبر ورضا، ا ستقامت، تواضع، حلم سادگی، انکسار وغیرہ انکی سیرت کے بنیادی عناصر ہیں اور انکی زندگی دوسروں کے لئے مثل اعلی بن گئی ہے/ آخری امتیاز یہ کہ وہ ہمارے دور کے علماء شرع میں نہا یت قوی روحانی نسبت کے مالک تھے اور یہ خالص چشتی نسبت تھی جس کا ایک اجمالی بیان مقا لے کا اصلی موضوع ہے۔

مولانا ندیم الواجدی
ایڈیٹر
ترجمان دیوبند

دارالعلوم دیوبند کا علمی مسلک

علامہ کشمیری کے نقطۂ نظر سے

نصاب تعلیم منزل بہ منزل

نظام تعلیم کی خوبی کا مدار اس پر ہے کہ وہ جمود سے پاک ہو اور تغیر پذیر حالات میں تغیر پذیر تقاضوں کا ساتھ دے سکتا ہو، یہی وجہ ہے کہ نصاب تعلیم اور طریقہ تعلیم میں حالات کے مطابق تبدیلیوں کا تسلسل رہا ہے/ دور اول کے نصاب تعلیم میں قرآن کریم، حدیث/ فقہ اور اشعار عرب کے ضروری اسباق شامل تھے، دوسری صدی ہجری کے وسط میں علوم کا دائرہ وسیع ہوا نصاب میں تفسیر، نحو، صرف، اصول فقہ، لغت اور تاریخ کا اضافہ کیا گیا، پانچویں صدی ہجری میں امام غزالی کے علم کلام کی بنیاد پڑی، فلسفہ یونان کے رد کے لئے منطق اور فلسفۂ وجود میں آئے/ ابن خلدون (۸۰۸ھ) تک یہ نصاب زیر درس رہا، یہ دور علوم معقولہ کے شباب کا دور تھا، دینی علوم کا نفوذ ختم ہو رہا تھا اور لوگ منطق اور فلسفہ کی موشگافیوں میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ اس خطرناک رجحان پر ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں سخت تنقید کی ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے نصاب تعلیم کو اسی دور میں باقاعدگی ملی، میں اگر کسی مصنف کا نام آجاتا کسی عالم کا ذکر چھڑ جاتا تو انکے حالات زندگی ضرور بیان فرماتے، اور اس شخصیت پر اپنا تبصرہ بھی فرمادیتے، فیض الباری میں جابجا اسکے نمونے ملتے ہیں ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن حجر، عینی، ابن عابدین جیسے اساطین علم پر بڑے اعتماد کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار فرمایا کرتے تھے۔

اپنے شاگردوں کو جدید علوم کے مطالعہ کی تلقین فرماتے رہتے تھے شروع میں اردو زبان کی وسعت و ہمہ گیری کے قائل نہ تھے، مگر حضرت تھانویؒ کی تفسیر بیان القرآن کے بعد اندازہ ہوا کہ یہ زبان بھی بڑے بڑے علوم کی متحمل ہوسکتی ہے/ اس تبدیلی کے بعد اپنے تلامذہ کو

مستقل یہ تلقین فرماتے رہے کہ اردو میں لکھنے پڑھنے کی عادت ڈالو/ اکثر تلامذہ کو اردو میں لکھنے کے لئے عنوانات دئے اور ان کے مضامین ضروری اصلاح کے بعد اخبارات ورسائل میں اشاعت کے لئے بھجواتے، قاضی طنطاوی کی تفسیر جواہر القرآن چھپ کر آئی بہت شوق سے مطالعہ کی الطنطاوی نے قرآن پاک کا سائنسی نقطہءنظر سے مطالعہ کیا ہے، بہت سی چیزوں میں اختلاف کے باجود آپ اس کے افادی پہلوؤں کے معترف اور قدر دان تھے/ تلامذہ کو اس کا مطالعہ کرایا اور مشکل مقامات خود سمجھائے۔

شاگردوں سے استاذ کے تعلق اور شیفتگی کا یہ عالم ہو، اور تربیت ورہنمائی کا یہ انداز ہو تو پھر کیسے ممکن ہے ان میں لعل وجواہر پیدا نہ ہوں حضرت شاہ صاحبؒ کی محنت اور تربیتکے لیے ان کی جدوجہد رائیگاں نہیں گئی، ان کے فیضی تربیت سے ایسے علماء وتیار ہوئے جو آسمان علم کے آفتاب وماہتاب بنے اور جنہوں نے علم دین کی بے پناہ خدمات انجام دیں۔

یہاں اسلامی علوم کی تدریس کا آغاز بہت پہلے ہو چکا تھا اور سلاطین نے مدارس کے قیام کی طرف خاص توجہ کی تھی، لیکن ایک مدت تک یہ نظام اپنے تنگنائے سے باہر نہ آسکا، فیروز شاہ تغلق (۷۹۰ھ) پہلا شخص ہے جس نے تعلیم کے مفہوم کو وسعت دی، اس دور کے مدارس میں صرف، نحو، بلاغت، ادب، فقہ، اصول فقہ، حدیث، تفسیر کلام اور منطق کا درس ہوتا تھا۔ حدیث میں امام رضی الدین حسن ابن محمد صنعانی (۶۵۰ھ) کی مشارق الانور پڑھائی جاتی تھی، فقہ اور اصول فقہ خاص مضامین تھے سنکدر رلودھی (۸۹۴ھ) کے دور حکومت میں اگر چہ کثرت سے مدارس قائم ہوئے، طلباء اور مدرسین کے وظائف مقرر کئے گئے، کتب خانوں کا رواج ہوا لیکن سب سے زیادہ نقصان دہ بات یہ ہوئی کے نصاب تعلیم پر منقولات کا تسلط قائم ہو گیا، ملتان کے رذال کے بعد دو معقولی علماء ہندوستان تشریف لائے/ شیخ عبداللہ طلبنی دہلی میں اور شیخ عزیز اللہ طلبنی سنبھل میں فروکش ہوئے/ حکومت کی سرپرستی حاصل رہی اپنے درباری اثرورسوخ سے فائدہ اٹھا کر ان دونوں علماء نے نصاب میں معقولات کی متعدد کتابوں کا اضافہ کیا، مطالع اور مواقف اسی دور میں داخل نصاب ہوئیں/ میر سید شریف کے تلامذہ نے شرح مطالع اور شرح مواقف/ علامہ تفتازانی کے شاگردوں نے مطول، مختصر، تلویح اور شرح عقائد نسفی کو رواج دیا/ اس طرح نصاب میں عقلی علوم زیادہ راہ پا گئے یہی رجحان فتنہ اکبر کی بنیاد بنا، مغل حکمرانوں میں بابر اور ہمایوں تک نصاب میں کوئی

خاص تبدیلی نہیں ہوئی لیکن اکبر نے دین الہی کے نام سے ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی اور تمام مذاہب کی تحقیقات کے لئے مختلف الخیال علماء کو دربار میں جمع کیا/ ان میں مناظرے کرائے، عقلی آزادی علماء سے عوام میں آگئی۔ ملا فتح اللہ شیرازی نے دربار اکبری میں اپنے نفوذ کا فائدہ اٹھایا اور نصاب میں محقق دوانی، میر صدرالدین، میر غیاث الدین، منصور اور مرزان کی کتابوں کو جگہ دلانے کی کوشش کی۔

یہی زمانہ تھا جب حرمین سے واپسی کے بعد شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے مشکوۃ اور مشارق الانور کا درس شروع کیا، یہ ایک روشنی تھی جو اندھیروں کے افق سے طلوع ہوئی۔ جہانگر نے مذہبی تعلیم میں دلچسپی لی مگر معقولیت کا اثر کم نہ کر سکا/ شاہ جہاں نے نومسلموں کے لئے تعلیم کا بند وبست کیا/ اورنگزیب نے فقہ کی تدوین میں علماء کو لگایا اس دور میں تعلیم، سرکاری پابندیوں سے آزاد ہوئی اور لوگوں نے اپنے ذاتی مدارس قائم کئے/ ملا قطب الدین شہید (۱۱۰۳ھ) نے سہالی کو مرکز علم بنا یا/ آپ کے صاحبزادے ملا نظام الدین ایک نئے نصاب تعلیم کے ساتھ یہ مرکزِ علم فرنگی محل لکھنؤ لے گئے، بھی معقولات کے اثر سے آزاد نہ رہ سکا، آپ نے منطق میں صغری، کبری ایساغوجی، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی/ میر قطبی/ سلم العلوم، حکمت میں میبذی، صدرا، شمس بازغہ وغیرہ کتابیں داخل کیں/ بعد میں ملا حسن، حمد اللہ، قاضی مبارک، رسالہ میر زاہد، ملا جلال، بحر العلوم اور ملا مبین بھی پڑھائی جانے لگیں، یہ نصاب اودھ کے مدارس میں پہنچا، فرنگی محل نے معقولات کے غلبہ سے نجات پائی مگر خیر آبادا سیر ہو کر رہ ہو گیا۔ ملا نظام الدین کے ہمعصر حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ (۱۱۷۶ھ) نے اپنا نصاب الگ بنایا اس نصاب میں تعلیم کے مروجہ اسلوب سے انحراف تھا۔

تیرہویں صدی ہجری میں تین مراکز علم معروف تھے۔ دہلی، لکھنو، خیر آباد۔ دہلی میں امام شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۱۷۶ھ) کے نصاب کا اثر تھا اور وہاں حدیث اور تفسیر پر زیادہ توجہ دی جارہی تھی/ لکھنو میں فرنگی محلی علماء کی دلچسپیاں فقہ اور اصول فقہ تک محدود تھیں، خیر آباد کا موضوع منطق اور فلسفہ تھا۔

سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد یہ تینوں مراکز منتشر ہو گئے اور انکی میراث علم دارالعلوم کو پہنچی، چنانچہ دارالعلوم نے اپنے نصاب تعلیم میں ان تینوں مکاتب فکر کی خصوصیات جمع کیں اور ایسا نصاب تیار کیا جسے پڑھ کر طالب علم میں تعمق امعان نظر اور بصیرت پیدا ہوا اور اسے فی الجملہ تمام مروجہ علوم پر دسترس حاصل ہو جائے۔

دارالعلوم اور علم حدیث:

دارالعلوم دیوبند میں علم حدیث کے مطالعے کا اسلوب دوسری درسگاہوں سے مختلف ہے/ یہاں محض حدیث کی تلاوت پر اکتفانہیں کیا جاتا بلکہ یہ کوشش کی جاتی ہیکہ حدیث کے تمام علمی پہلونمایاں ہوجائیں/ متعارض روایات میں تطبیق، ترجیح یا تنسیخ کا عمل ہوتا ہےاراس عمل کے لئے دلائل فراہم کئے جاتے ہیں دوران درس استدلال اور استنباط کے طریقوں پر گفتگو کی جاتی ہے، رجال حدیث زیر بحث آتے ہیں/ روایت کا درجہ متعین کیا جاتا ہے، فقہی احکام بیان کئے جاتے ہیں، ائمہ کے مسالک کی تفصیل سامنے آتی ہےاورآخر میں احناف کا مسلک، دلائل اور وجوہ ترجیح کا ذکر ہوتا ہے۔

حدیث فہمی کا یہ اسلوب دارالعلوم کے درس میں بھی نمایاں ہےاوران کتابوں میں بھی جوحدیث کے موضوع پر علماء دیوبند کے قلم سے نکلی ہیں، یہ ایک معقول اسلوب ہے، ہندوپاک کے بیشتر مدارس میں اس کا اتباع کیا جاتا ہےمگرکچھ ایسے لوگ بھی ہیں جوصحیح معلومات کے فقدان کے باعث اس اسلوب کو ہدف تنقید بناتے ہیں، یہی صورت حال تھی جس سے متاثر ہوکر حضرت مولانا محمدانورشاہ کشمیریؒ نے دارالعلوم دیوبند کے طریقہ حدیث کی وضاحت فرمائی۔

حضرت کشمیریؒ کی عربی تقریر:

۱۳۳۰ھ ہجری میں مصر کے مشہور عالم تفسیر ''المنار'' کے مصنف اور رسالۂ ''المنار'' کے سابق مدیر علامہ سید رشید رضا مرحوم ہندوستان تشریف لائے اس موقع پرآپ دیوبند بھی پہونچے اور دارالعلوم کی علمی سرگرمیوں کا قریب سے مطالعہ کیا، دارالعلوم نے آپ کے اعزاز میں ایک عام جلسہ کا اہتمام بھی کیا، طے شدہ پروگرام کے مطابق حضرت مولانا محمدانورشاہ کشمیریؒ کو استقبالیہ تقریر کرنی تھی مگر بروقت یہ موضوع تبدیل کردیا گیااوردارالعلوم دیوبند کے علمی مسلک پر تقریر ہوئی/ معزز مہمان نے کسی شخص سے دارالعلوم کے طریقہ درس کے سلسلہ میں استفسار کیا تھا، جوجواب انہیں ملااسکی روشنی میں انہوں نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا/ گھر سے جلسہ گاہ تشریف لاتے ہوئے یہ بات حضرت کشمیریؒ کے علم میں آئی وہیں سے تقریر کا موضوع بدلا، یہ تقریر فصیح وبلیغ عربی میں تھی، تقریباً ایک گھنٹہ جاری رہی، اپنے بلند مضامین کے لحاظ سے ایسی تھی کہ سننے

والے حیرت زدہ تھے اور خود معزز مہمان بہت زیادہ متاثر دکھائی دے رہے تھے۔

ولی اللہی فکر سے دارالعلوم کا تعلق:

ضروری تمہید کے بعد حضرت کشمیریؒ نے اپنی جماعت کا سلسلہ نصب بیان فرمایا کہ ہماری یہ جماعت قدیم طریقوں کی پابند ہے، کوئی نئی جماعت نہیں ہے، دینی امور میں ہمارا سلسلہ امام شاہ ولی اللہ دہلوی پر جا کر منتہی ہوتا ہے جو اپنی بلند پایہ تصانیف کی بنا پر دنیا بھر میں شہرت رکھتے ہیں، امام شاہ اللہ دہلویؒ نے دینی علوم اپنے والد محترم حضرت شاہ عبدالرحیمؒ سے حاصل کئے، والد کی وفات کے بعد حرمین شریفین تشریف لے گئے اور وہاں کے مشہور محدث شیخ ابو طاھر کردی کی خدمت میں رہ کر حدیث کا درس لیا اور اس شان سے لیا کہ خود استاد محترم یہ فرمایا کرتے تھے کہ ولی اللہ الفاظ مجھ سے سیکھتے ہیں اور معانی میں ان سے سیکھتا ہوں۔ حرمین سے واپسی کے بعد حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اپنی اصلاحی جدوجہد کا آغاز کیا۔ اللہ نے انہیں بصیرت اور آگہی کے نور سے نوازا تھا۔ یہاں کے حالات کے مطالعہ کے بعد انہوں نے یہ اندازہ لگایا کہ بہت جلد حق و باطل کی کشمکش شروع ہوگی/ دین کے دفاع کے لئے جدوجہد ضروری ہے/سب سے پہلے آپ نے قرآن عزیز کا ترجمہ ''فتح الرحمٰن'' کے نام سے فارسی زبان میں کیا، اس کے بعد موطا امام مالکؒ کی شرح ''مسوی'' تصنیف فرمائی۔

ولی اللہی مکتب فکر اور دارالعلوم کے روابط پر یہ ایک اجمالی گفتگو ہے ہمارے لفظوں میں اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس مکتب فکر کے بانی امام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے انتہائی نازک حالات میں دینی احیاء کے لئے جد جہد کی۔ اور علوم شریعت کو عقل و نقل اور وجدان کا جامع قرار دیا حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی کے اس مکتب فکر سے علماء کا ایک گروہ ایسا پیدا ہوا جس نے اس فکر کی امانت کو جو شاہ ولی اللہ صاحب نے انہیں سپرد کی تھی آگے بڑھانے میں کبھی کوتا ہی نہیں کی/ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے بعد انکے بڑے صاحبزادے حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ (۳۹ ۱۲ھ) اس فکر کے صحیح وارث اور امین قرار پائے/ حضرت شاہ صاحبؒ کے دوسرے صاحبزادوں حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ (۱۲۳۰ھ) اور حضرت شاہ رفیع الدین دہلویؒ (۱۲۳۳ھ) نے بھی اپنے والد ماجد کے افکار کی اشاعت میں حصہ لیا/ حضرت شاہ اعبدلعزیز کی وفات کے بعد یہ ذمہ داری حضرت شاہ محمد اسحاق دہلویؒ (۱۲۶۲ھ) اور شاہ محمد اسمعیل شہیدؒ (۱۲۴۶ھ) نے سنبھالی ان میں ا

اول الذکر حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے نواسے اور ثانی الذکر بھتیجے ہیں حضرت شاہ محمد اسحاق کے شاگردوں میں نامور علماء شامل ہیں خاص طور پر مفتی عنایت احمد کوروی ؒ(۱۲۷۹ھ) نواب قطب الدین دہلوی (۱۲۸۹ھ) مولانا احمد علی محدث سہانپوری ؒ(۱۲۷۹ھ) اور حضرت شاہ عبدالغنی مجددیؒ (۱۲۹۶ھ) کے نام بڑے اہم ہیں/ اول الذکر دونوں حضرات نے اردو زبان میں حدیث کا عام فہم لٹریچر تیار کیا/ حضرت محدث سہارنپوریؒ نے درس وتدریس کے علاوہ فن حدیث کی معیاری کتابوں پر گرانقدر حواشی تحریر فرمائے اور انکے صاف ستھرے ایڈیشن شائع کئے/ حضرت شاہ عبدالغنی مجددیؒ اپنے استاذ محترم حضرت شاہ محمد اسحاق دہلویؒ کی ہجرت کے بعد ان کے جانشین کہلائے/ دیو بند کے بیشتر اکابر آپ ہی کے شاگرد ہیں۔ حضرت الامام مولانا محمد قاسمؒ نانوتوی (۱۲۹۷ھ) حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (۱۳۲۳ھ)، حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ (۱۲۹۷ھ)، حضرت مولانا محمد مظہر نانوتویؒ، (۱۳۰۲ھ)، حضرت مولانا محمد منیر نانوتویؒ)(پیدائش ۱۲۴۶ھ) حضرت مولانا ذوالفقار علی دیوبندی (م ۱۳۲۲ھ) حضرت مولانا فضل الرحمٰن دیوبندی (م ۱۳۲۵ھ)۔ ان حضرات اکابر کا سلسلۂ حدیث حضرت شاہ عبدالغنی مجددیؒ کی وساطت سے ہی حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی تک پہونچتا ہے، یہ تمام حضرات تحریک دیوبند سے وابستہ تھے، بعض نام ان میں ایسے ہیں جو دارالعلوم کی تاسیس میں براہ راست شریک رہے ہیں/ اور حضرت شاہ عبدالعزیز کے فیض یافتوں میں مفتی صدرالدین آزردہؒ (م ۱۲۸۵ھ) اور حضرت مولانا مملوک علی (م ۱۲۶۷ھ) بھی ہیں، دارالعلوم کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم ناتویؒ اور سرپرست ثانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، ان دونوں حضرات سے بھی سلسلہ تلمذ رکھتے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ کی شرح موطا:

امام مالک کی موطا حدیث کی پہلی باقاعدہ کتاب ہے، جسے امت کا تعاون حاصل رہا ہے، حضرت شاہ ولی اللہ اس کتاب کو حدیث کی تمام کتابوں کی اساس اور دوسری کتابوں کو اس کی شروح قرار دیتے ہیں/ اپنے وصیت نامے میں آپ نے اس کے مطالعہ کی تلقین بھی فرمائی ہے/ یہ کتاب آپ نے اپنے تلامذہ کو پڑھائی اور ''مصفی'' اور ''مسوی'' کے نام سے اسکی دو شرحیں بھی لکھیں، حضرت علامہ کشمیری کے خیال میں۔ ''مسوی'' کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں فقہاء کے مذاہب کی وضاحت کے لئے علماء اصول کی اصطلاحات، تحقیق، مناط اور تخریج

مناط سے مدد لی گئی ہے۔

تحقیق مناط یہ ہے کہ شارع کسی خاص امر کے سلسلہ میں کوئی حکم بیان فرمائیں، لیکن اس نوع کے دوسرے مسائل میں اس طرح کا کوئی حکم صراحۃً موجود نہ ہو، اس صورت میں وہ حکم ان مسائل میں بھی متحقق ہوگا اور یہ اس لئے کہ احکامِ شرعیہ عام ہوتے ہیں، علّت جہاں پائی جاتی ہے وہاں حکم ضرور دیا جاتا ہے، چنانچہ حالتِ احرام میں شکار کرنا حرام ہے، اس جرم کے مرتکب کے لئے قرآنِ پاک نے ایک خاص سزا متعیّن کی ہے، وہ سزا یہ ہے کہ دو عادل مسلمان اس شکار کی قیمت لگائیں اور مجرم متعیّنہ قیمت کی ادائیگی کا پابند ہو، یہ حکم کسی خاص جانور کے شکار کے سلسلہ میں نازل ہوا لیکن دوسرے جانوروں کے شکار کا حکم بھی یہی ہے، فقہاء اس عمل کو تحقیقِ مناط سے تعبیر کرتے ہیں، یہ قیاس نہیں ہے کہ اجتہاد کی ضرورت پیش آئے بلکہ عام لوگ بھی اس کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی ایسے حادثہ میں شارع علیہ السّلام کوئی حکم بیان فرمائیں جس میں چند امور جمع ہوں، بعض امور اس حکم کی علت بن سکتے ہوں اور بعض میں اسکی صلاحیت نہ ہو، ان چند امور میں سے حکم شرعی کی صحیح علت دریافت کرنا ہی تحقیقِ مناط ہے، اس کی مثال حضرت ابو ہریرہؓ کی یہ حدیث ہے کہ ایک شخص خدمتِ نبویؐ میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: "یا رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم میں تو مارا گیا! آپؐ نے دریافت فرمایا: کیا بات ہے؟ اس نے عرض کیا کہ میں نے رمضان میں اپنی بیوی سے جماع کر لیا ہے، آپؐ نے دریافت فرمایا: کیا تم غلام آزاد کر سکتے ہو؟ اس نے عرض کیا نہیں"! آپؐ نے دریافت فرمایا کیا دو مہینوں کے مسلسل روزے رکھ سکتے ہو؟ اس نے عرض کیا نہیں"! آپؐ نے دریافت فرمایا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا سکتے ہو؟ اس نے عرض کیا نہیں، حدیث شریف سے ثابت ہوا کہ مذکورہ صورت میں کفارہ واجب ہے، امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ نے کفارہ کے وجوب کی علت فعلِ مفطر کو قرار دیا ہے، چاہے وہ جماع کی صورت میں ہو یا کھانے پینے کی صورت میں، امام شافعی اور امام احمد نے صرف جماع بحالتِ صوم کو وجوبِ کفارہ کی علّت قرار دیا ہے، کھانا پینا اس حکم سے مستثنیٰ ہے، ان دونوں حضرات نے ابو ہریرہؓ کی ایک دوسری حدیث سے استدلال کیا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ جو شخص رمضان المبارک میں بلا کسی شرعی عذر کے روزہ افطار کر لے تو ساری عمر کے روزے بھی اس کی مکافات نہیں کر سکتے، صورتِ استدلال یہ ہے کہ حدیث میں وجوبِ کفارہ کا ذکر نہیں ہے۔

تخریج مناط یہ ہے کہ کسی ایسے حادثہ میں شارع علیہ السلام کی طرف سے کوئی حکم صادر

ہو جس میں کئی امور جمع ہوں اور وہ سب اس حکم کی علت بن سکتے ہوں، مجتہدان میں سے کسی ایک کو مدارِ حکم قرار دیتا ہے، حدیث شریف میں گیہوں، جو، سونا، چاندی، نمک اور کھجور میں سود کی ممانعت ہے، ان چھ چیزوں میں قدر جنس، طعم، ثمنیت، اقتیات وادّ خار کا اجتماع ہے، یہ سب امور ممانعتِ ربا کی علت ہو سکتے ہیں، امام ابوحنیفہ نے قدر اور جنس کو، امام شافعی نے طعم اور ثمنیت کو، امام مالک نے اقتیات وادّ خار کو مدارِ حکم قرار دیا۔

اکابرِ دیو بند کا ذکر:

مناط کی تفصیل کے بعد حضرت کشمیریؒ نے خاندانِ ولی الٰہی اور سلسلۂ دارالعلوم کے اکابر کی خدمات کا ذکر فرمایا، "دیو بند میں ولی اللّٰہی فیوض و برکات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے ذریعہ پہونچے، حضرت نانوتویؒ نے مادیت نواز اور دہریّت پسند فرقوں کے خلاف کتابیں لکھیں، ایسی کتابوں میں آپ نے اسلامی عقائد اور تصوّرات کو معقولات، محسوسات اور مشہودات بنا کر پیش کیا، اس موقع پر حضرت کشمیریؒ نے اپنا وہ مشہور قصیدہ بھی سنایا جو آپ نے حضرت نانوتویؒ کے مناقب میں لکھا تھا، اس قصیدہ کا پہلا شعر یہ ہے:

قفا یا صاحبیَّ علی الدّیارِ

فمِن دأب الشجیِّ هوی ازدیادِ

حضرت مولانا گنگوہیؒ بہت بڑے فقیہہ اور مجتہد تھے، اپنے دور میں مرجعِ علماء رہے، مسائل میں آپ کی رائے وقیع سمجھی جاتی تھی، حضرت نانوتوی کو ہم اصول وکلیات میں اپنا امام سمجھتے ہیں، فروع و جزئیات میں ہمارے مقتدیٰ حضرت گنگوہیؒ ہیں، ان دونوں حضرات کے ذریعہ علم خوب واضح ہو کر سامنے آیا۔

دارالعلوم دیو بند کا طریقۂ حدیث:

یہاں پہونچ کر حضرتِ کشمیریؒ نے اپنے اکابر کے طریقہ حدیث کی وضاحت فرمائی "اکابر دیو بند کا طریقہ حدیث افراط وتفریط سے پاک ہے، یہاں اندازوں کے بجائے علم اور تحقیق پر اعتماد کیا جاتا ہے، فقہ حدیث میں ہم ائمہ اربعہ کے اصولوں سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں، امام مالک نے اہل مدینہ کے عمل کو ترجیح دی ہے، امام شافعی اصح مافی الباب سے استدلال کرتے ہیں،

امام احمد اصح، صحیح، حسن اور معمولی ضعف رکھنے والی روایات بھی قبول کر لیتے، امام ابوحنیفہ ہر درجہ کی روایات قابل استدلال سمجھتے ہیں اور تعارض کی صورت میں ہر روایت کا صحیح مفہوم متعین کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ احناف کے یہاں تاویلات کی کثرت ہے اور شوافع کے یہاں رواۃ پر جروح کی۔

امام بخاریؒ نے امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے اصولوں کے امتزاج سے بخاری مرتب فرمائی وہ اصح مافی الباب روایت کرتے ہیں اور سلف کے عمل کی رعایت بھی کرتے ہیں اسی لئے ان کے یہاں متعارض روایات نہیں ہیں/ کسوف شمس کے سلسلہ میں صرف وہ روایت بخاری میں ہے جس میں دو رکوع کا ذکر ہے/ جبکہ مسلم نے رواۃ کی ثقاہت پر اعتماد کرتے ہوئے دو، تین، چار، پانچ رکوع کی روایات بھی درج کی ہیں وہ روایت جس میں پانچ رکوع کا ذکر ہے وہ حضرت علی پر موقوف ہے ہمارے مشائخ نے اعتدال کی راہ اختیار کی ہے، نہ ان کے یہاں تشدد ہے اور نہ تساہل، جو احادیث متعارض ہیں ان میں جمع کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے اور ایسی توجیہات بیان کی جاتی ہیں جو قابل قبول ہوں۔

استخراج مسائل کی کچھ مثالیں:

حضرت کشمیریؒ نے اپنے اکابر کے طریقہ کی وضاحت کے بعد اعتدال کی مثالیں بھی پیش فرمائی ہیں اور کچھ ایسے مسائل میں دیوبند کے موقف اور طریقہ استدلال کا ذکر کیا جو اختلافی ہیں۔ پانی کی طہارت کے مسئلہ میں اصل روایت قلتین کی ہے، اسکے الفاظ یہ ہیں **اذا بلغ الماء القلتین لم یحمل الخبث**، (اگر پانی دو قلوں کے بقدر ہو جائے تو وہ نجاست کا متحمل نہیں ہوتا) امام شافعی نے اپنے اصول کے مطابق اس حدیث پر عمل کیا اور اس مفہوم کی دوسری روایات ترک کر دیں، ہمارے مشائخ نے اس حدیث کے تمام طرق سامنے رکھ کر فیصلہ فرمایا، ایک روایت میں قلتین او ثلاثا کے الفاظ آئے ہیں۔ اس تنویع سے مفہوم ہوتا ہے کہ منشاء نبوی ﷺ تخمینہ ہے تحدید نہیں اس صورت میں حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ اگر پانی کی مقدار اس قدر ہو تو اس میں ایک طرف کی نجاست کا اثر دوسری طرف نہیں پہونچتا/ حدیث قلتین کے اس مفہوم کی تعیین کے بعد دوسری متعارض روایات بھی اپنے حال پر باقی رہیں جیسے وہ حدیث جس میں سو کر اٹھنے کے بعد پانی میں ہاتھ ڈالنے سے منع کیا گیا ہے، ولوغ کلب کی روایت اور ماء راکد میں پیشاب کی ممانعت کے سلسلہ میں آنے والی روایات بھی تعارض سے بچ جاتی ہیں/ قرات فاتحہ خلف الامام اور رفع

ید ین جیسے معرکۃ الآراء مسائل میں بھی ہمارے اکابر یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔

رفع یدین کے اختلاف کی نوعیت:

رفع یدین کا اختلافی مسئلہ اسلامی فقہ کی تاریخ میں اہم ترین مسئلہ خیال کیا جاتا ہے، اس موضوع پر دونوں طرف کے علماء نے جو کچھ لکھا ہے اسکے مطالعہ سے قاری کی رائے یہ بنتی ہے کہ امام شافعی ترک رع کو بے اصل خیال کرتے ہیں اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک رفع بدعت ہے، ہمارے اکابر میں مبالغہ آمیزی نہیں ہے، وہ مسائل کا واقعیت پسندی کے ساتھ جائزہ لیتے ہیں /حضرت کشمیریؒ کو اللہ نے جس بصیرت سے نوازا تھا اسکا تقاضا یہی تھا کہ وہ اس اختلاف کی نوعیت متعین فرمائیں، اپنی اس تقریر میں آپ نے اسے افضلیت اور استحباب کا اختلاف قرار دیا ۱۳۵۱ھ میں آپ نے نیل الفرقدین فی مسئلہ رفع الیدین کے عنوان سے جو عالمانہ کتاب تصنیف فرمائی اس کی بنیاد اسی جملہ پر اٹھائی گئی ہے۔ حضرت علامہ کشمیریؒ کا نقطہ نظر یہ تھا کہ جن مسائل میں توسع ممکن ہو اس سے گریز نہ کیا جائے/ آپؒ کے نقطہ نظر کی وضاحت۔ ''فیض الباری'' کی اس بحث سے ہوتی جسمیں آپ کے امام و ماموم کے مسلک میں اختلاف کی بنیاد پر نماز کی صحت یا فساد کی وضاحت فرمائی ہے/ بہت سے علماء کی رائے یہ ہے کہ اختلاف مسلک کی صورت میں اقتداء صحیح نہیں ہے جبکہ قاضی ابوبکر جصاص نماز کی صحت کے قائل ہیں، حضرت علامہ کشمیریؒ کے نزدیک یہ ہی مسلک راجح ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ کا ذکر:

آخر میں آپ نے استاذ محترم شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ کا ذکر کیا جو اسوقت بقید حیات تھے، اور جن کے دم سے علم وعمل کی محفلوں کو رونق تھی، آپ نے فرمایا، ہمارے شیخ مولانا محمود الحسن اپنے اساتذہ کے طریقہ پر ہیں، توفیقِ الٰہی سے آپ کو متعارض روایات کی تطبیق اور مشکلات کے حل کا خاص سلیقہ ہے، چنانچہ صلوٰۃِ کسوف کے متعلق روایات کے اختلاف کے سلسلہ میں آپ نے مجھ سے فرمایا کہ آنحضرت ﷺ سے تعداد رکوع ثابت ہے، مگر یہ صرف آپ کے ساتھ خاص ہے امت کو آپ نے وحدت رکوع کی ہدایت فرمائی "صلّوا کا حدث صلوٰۃ صلّیتموھا من المکتوبۃ" (جو فرض نماز تم نے ابھی پڑھی ہے اس جیسی نماز پڑھو) اس حدیث میں صلوٰۃ کسوف کو صبح کی نماز سے تشبیہ دی گئی ہے، شوافع اسے رکعتین کی تشبیہ پر محمول کرتے ہیں،

ہمارے استاذِ محترم کا خیال ہے کہ یہ بدیہی امر کو نظری بنانے کا عمل ہے، آنحضرت ﷺ نے مجمعِ عام میں کسوف کی نماز ادا فرمائی، صرف دو دو رکعتیں پڑھیں اس صورت میں صبح کی نماز سے تشبیہ دینے کی ضرورت نہ تھی۔

تشبیہ کسی خاص مقصد کے لئے دی گئی ہے اور قرائن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تشبیہ کا مقصد اس غلط فہمی کا ازالہ ہے جو تعدّدِ رکوع سے پیدا ہو سکتی ہے۔

حضرت کشمیریؒ اور حنفیت:

حضرت کشمیریؒ نے اپنے اکابر کے جس طریقہ کا ذکر کیا ہے وہ دراصل حنفیت کی تائید و ترجیح سے عبارت ہے، حنفیت کا ذکر کئے بغیر آپ نے یہ بتلایا کہ ہم امام ابوحنیفہ کے اصولوں کو پسند کرتے ہیں اور ان کی فقہ کے پابند ہیں، یہ بات فاضل مقرر نے پوری بصیرت اور پورے اعتماد کے ساتھ کہی، آپ کو زندگی کے چالیس برس فقہ حنفی کی خدمت میں گذارنے کا موقع ملا، ابوداؤد، ترمذی اور بخاری جیسی مہمات کتب کا درس دیا، کئی کتابیں اختلافی مسائل پر سپرد قلم فرمائیں، اپنی طویل خدمات کے حوالے سے ارشاد فرماتے تھے کہ میں نے فقہ حنفی کی بنیاد اتنی مضبوط و مستحکم بنادی ہے کہ آئندہ سو سال تک متزلزل ہونے کی امید نہیں ہے، ایک اور موقع پر یہ ارشاد ہوا کہ مجھے فقہِ حنفی میں ایسا کوئی مسئلہ نہیں ملا جس کے لئے مضبوط دلائل موجود نہ ہوں اور اگر ایسا کوئی مسئلہ ملا بھی تو وہاں دوسرے ائمہ بھی خاموش نظر آتے ہیں، البتہ مسئلہ خمر میں جمہور کے پاس دلائل زیادہ ہیں، مجھے امام ابوحنیفہ کے یہاں ایسی کوئی دلیل نہیں ملی جو جمہور کا جواب بن سکے۔

ایک غلط فہمی:

دارالعلوم دیوبند ولی اللّٰہی مکتبِ فکر کا وارث اور اسکی امانتوں کا امین ہے، دارالعلوم میں حنفیت کی تائید کا جو سلسلہ ہے وہ اس مکتبِ فکر سے انحراف نہیں ہے بلکہ اس کے بانی حضرت شاہ ولی اللہؒ کے نقطۂ نظر کا پرتو ہے۔

حضرت الامام دہلویؒ کے تعلق سے یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ آپ تقلید کے خلاف تھے، حقیقت یہ ہے کہ آپ اپنی زندگی کے کسی بھی موڑ میں تقلید کے مخالف نہیں رہے، آپ نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت "عقد الجید" اور "الانصاف" میں کی ہے، عقد الجید کا خاص موضوع تقلید ہے، ضمناً اجتہاد کے متعلق بعض اہم مباحث بھی آگئے ہیں، ''الانصاف'' میں تقلید کی اہمیت اور ضرورت پر زور دیا گیا ہے، آپ کے والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیم دہلویؒ نے عہدِ عالمگیر میں فتاویٰ

عالمگیری کی ترتیب وتدوین میں حصّہ لیا، حضرت شاہ ولی اللہؒ اپنے والد کے شاگرد ہیں، ۱۱۳۱ھ میں آپ کو حرمین شریفین میں قیام کا موقع ملا، وہاں شیخ ابوطاہر کردی شافعی اور شیخ تاج الدین حنفیؒ کی صحبت میسر رہی، اس ملی جلی صحبت نے شاہ صاحبؒ کے طرزِ فکر کو خاصا متأثر کیا اور وہ فقہِ حنفی کے ساتھ ساتھ فقہِ شافعی کی اہمیت بھی محسوس کرنے لگے، حجاز میں قیام کے دوران شاہ صاحبؒ کا خیال یہ رہا کہ صحاحِ ستہ کی اصل مؤطا امام مالک ہے اور مؤطا حدیث کا پہلا صحیح مجموعہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے قریب تر ہے، اس کتاب کی بنیاد پر جو عالم فتوی دیگا وہ قابل اعتماد ہو گا، چاہے وہ عالم حنفی ہو یا شافعی، اس بنیاد پر انہوں نے شافعی اور حنفی فقہوں میں مطابقت کی کوشش بھی کی، شاہ صاحب کے ذہن میں یہ بات بھی آئی کہ ہر علاقہ ایک خاص فقہ سے مناسبت رکھتا ہے، فقہ حنفی کا مزاج حجاز میں نہیں ہے اور ہندوستان فقہ حنفی سے قریب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ دہلی واپس تشریف لائے تو پھر فقہ حنفی اختیار فرمایا، آپ کی رائے یہ تھی کہ ہندوستان میں ہمیشہ فقہ حنفی رائے رہا ہے، مسلمان اس سے مانوس ہیں، حضرت شاہ صاحب کو اُمتِ مرحومہ کی تنظیم اور شیرازہ بندی کے لئے جدوجہد کا الہام ہوا، اس میں یہ بھی حکم دیا گیا کہ وہ فروعات میں اپنی قوم کی مخالفت نہ کریں، ایک خواب میں آنحضرت ﷺ نے آپؒ نے ارشاد فرمایا کہ فقہ حنفی زیادہ عمدہ طریقہ ہے اور یہ طریقہ اس سنت کے زیادہ قریب ہے جسکی تنقیح وتدوین امام بخاری اور ان کے ساتھیوں کے زمانے میں ہوئی۔ یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ حضرت شاہ ولی اللہ کے اسکول میں حنفیت کو موضوع نہیں بنایا گیا تھا بلکہ وہ عملاً حنفی تھے اور درساً شافعی وحنفی۔ پٹنہ کی خدا بخش لائبریری میں بخاری شریف کا قلمی نسخہ موجود ہے۔ مخطوطہ کے ٹائیٹل پر حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے ایک عزیز شاگرد مولانا چراغ محمد کو اجازتِ حدیث دی ہے وہاں یہ الفاظ ہیں۔ **شافعی درسا وحنفی عملا وتدریسا.** کتاب پر آپ کے صاحبزادے شاہ رفیع الدین کے دستخط ثبت ہیں اور شاہ عالم کی مہر تصدیق بھی "الفرقان" کے ولی اللہ نمبر میں اس کا عکس شایع کیا گیا ہے۔

دارالعلوم میں حدیث کی تدریس:

دارالعلوم نے اپنے قیام کے روز اول سے علم حدیث پر توجہ دی ہے اور اس فن کی تدریس کا ایک اسلوب پیش کیا ہے جو تاریخ تدریس میں جداگانہ نوعیت کا حامل ہے، حضرت الاما م ولی اللہ دہلویؒ نے اپنے اسکول میں حدیث کے درس کے لئے جس طریقہ کی بنیاد ڈالی تھی وہ اس دور کے لئے بڑا اہم تھا، عقلیت کے غلبہ کے نتیجہ میں دینی علوم سے انحراف بڑھتا جارہا تھا ضرورت

اس کی تھی کہ لوگوں میں علمِ حدیث کا ذوق پیدا ہوا اور سنت کی روشنی عام ہو، شاہ عبدالحق محدّث دہلوی ۱۰۵۲ھ کے تراجم حدیث کا اثر موجود تھا مگر وہ زیادہ گہرا اور زیادہ واضح نہیں تھا، حضرت شاہ ولی اللہ نے اس مقصد کے لئے صحاحِ ستہ کی تدریس کا اہتمام کیا، درس کا اسلوب یہ تھا کہ طالبِ علم حدیث کی تلاوت کرتا استاذ سماعت کرتا، اگر کوئی ضروری بات بیان کرنی ہوتی یا کسی غلطی پر ٹوکنا مقصود ہوتا تو درمیان میں روک کر تقریر کردی جاتی یا غلطی کی نشاندہی کے بعد آگے بڑھنے کا حکم دیا جاتا، حدیث کے اس طریقۂ درس کو سرد کا نام دیا گیا ہے، حضرت شاہ ولی اللہ نے انفاس العارفین میں درسِ حدیث کے جو تین طریقے لکھے ہیں ان میں طریقۂ سرد کو پسندیدگی حاصل ہے۔

دارالعلوم میں تدریس کا جو طریقہ رائج ہے اسے دورۂ حدیث کے عنوان سے تعبیر کیا جاتا ہے، یہ طریقہ ولی اللّٰہی طریقۂ درس کی ارتقائی شکل ہے، حضرت شاہ ولی اللہ اور انکے باکمال شاگردوں کی جد و جہد رنگ لائی اور لوگوں نے حدیث کے مطالعہ میں دلچسپی لی، اس صورت میں محض تلاوت کافی نہ تھی بلکہ ضرورت تھی کہ تسلسل کے ساتھ وہ علمی نسل تیار ہوتی رہے جو مرادِ نبوی کا ادراک کر سکے، حدیث اسلامی قانون کا دوسرا بڑا ماٴخذ ہے، فقہی نقطۂ نظر سے اس کا مطالعہ اس ربط کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتا ہے، ولی اللّٰہی مدرسہ رحیمیہ کی طرح یہاں صحاحِ ستہ کے درس پر اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ حدیث کی کچھ اور کتابیں بھی پڑھائی جاتی ہیں، تاکہ طالبِ علم مختلف قسم کے ذوقِ تالیف سے واقف ہو جائے ارور ہر درجہ کی روایات اس کے سامنے آجائیں، دارالعلوم کے اس اسلوب کی ابتدا حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے ہوئی، حضرت نانوتویؒ نے دارالعلوم میں اس طریقۂ درس کی بنیاد رکھی اور حضرت گنگوہیؒ نے اپنی خانقاہ سے اس کا آغاز فرمایا، حضرت گنگوہی کے سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ آپ کی خانقاہ سے جن بزرگوں نے حدیث شریف کی اجازت حاصل کی ہے، ان کی تعداد تین سو سے زائد ہے، ان میں حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ ۱۳۱۷ھ مولانا محمد کاندھلویؒ ۱۳۳۴ھ، مولانا فتح محمد تھانویؒ، مولانا حسین علی نقشبندیؒ (۱۳۶۴) کے نام اہم ہیں، مولانا فتح محمد کے علاوہ تینوں حضرات نے اپنے استاذ کی درسی تقریریں قلم بند کیں، اور انہیں شائع کیا، حضرت نانوتویؒ کے شاگردوں میں حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ (۱۳۰۲)، حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ (۱۳۳۹ھ) حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ (۱۳۱۷ھ)، حضرت مولانا احمد حسن محدّث امروہویؒ (۱۳۳۰ھ) جیسے علماء کے نام ہیں،

دارالعلوم کی تعلیم سے انتظام تک ہر مرحلہ پر ان بزرگوں کے گہرے اثرات ہیں، قدرتی طور پر یہاں وہی اسلوب رائج ہوا جو ان حضرات نے اختیار کیا تھا، بعد میں آنے والوں نے اسے رنگ و نور عطا کیا اور اسے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔

علامہ رشید رضا مصری کا اعتراف:

دوران تقریر آپ بار بار پہلو بدلتے رہے۔ایک مرتبہ آپ نے پوچھا:

یا شیخ! مسئلہ قلتین کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے خیال کی وضاحت فرمائی، مہمان محترم نے دوبارہ سوال کیا۔

اور قرآت خلف الامام کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں:

حضرت شاہ صاحب نے اس سوال کا جواب بھی دیا۔معزز مہمان پر تقریر کا اس قدر تاثر تھا کہ بے ساختہ زبان سے نکلا:

"واللہ ما رأیت مثل ھذا الاستاد"

(بخدا میں نے (اس) استاذ جیسا کوئی شخص نہیں دیکھا)

جوابی تقریر میں مہمان محترم نے طریقہ دیوبند پر اپنی پسندیدگی کا اظہار فرمایا: اور یہ کہہ کر خراج عقیدت پیش کیا: **لو لم ار ھذہ الجامعة العلمیة و مثل ھولاء الاعلام الاحبار لرجعت من الھند حزیناً۔**

(اگر میں اس دارالعلوم کو اور ان عظیم علماء کو نہ دیکھتا تو ہندوستان سے غمگین واپس جاتا۔

مصر واپسی کے بعد آپ نے اپنے جریدہ "المنار" کی اشاعت ماہ شعبان ۱۳۳۰ھ میں دارالعلوم دیوبند کی عظیم خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا کہ "مجھے سب سے زیادہ خوشی ازہر الہند دارالعلوم دیکھ کر ہوئی، افسوس کی بات یہ ہے کہ مصر کے مشہور مصنف جناب احمد الشرباصی نے علامہ رشید رضا کی سوانح عمری میں دیوبند کے سفر اور دارالعلوم میں ان کی بے مثال تقریر کا تذکرہ نہیں کیا جب کہ کتاب میں سفر ہند کا ایک مستقل عنوان ہے۔اور اس میں مصنف نے ہندستان میں علامہ کی متعدد علمی اور دینی سرگرمیوں کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔

●●
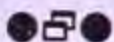
حضرت شاہ صاحبؒ اور ان کی

گراں مایہ تصانیف

عبیدانور شاہ قیصر نبیرۂ ابن انور مولانا ازہر شاہ قیصر

حضرت العلامہ انور شاہ کشمیریؒ کی عبقریت اور آپ کی بے نظیر شخصیت پر نہ معلوم کتنا کچھ لکھا جا چکا اور نہ معلوم کتنے اصحابِ قلم آپ کی حیاتِ پُر انوار پر قلم اٹھانے کی سعادت حاصل کر چکے۔ شب و روز آپ کی شہرت و عظمت کا حلقہ وسیع ہوتا جا رہا ہے اور گردش لیل و نہار کے ساتھ آپ کے فضائل و کمالات کا اعتراف کرنے والے بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔ یہ محض خدا تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ کشمیر کے ایک گمنام اور مفلوک الحال زاہد کو اس نعمت سے سرفراز فرمایا۔

امام کشمیریؒ حد درجہ منکسر المزاج اور فقیر منش انسان تھے۔ وہ ہر موقعہ پر اپنے فضل و کمال کا اخفاء فرماتے اور ہر ایسی چیز سے پہلوتہی کرتے جس میں شہرت و ناموری کا ادنی شائبہ بھی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے کبھی بھی اپنے آپ کو تصنیف و تالیف کے لیے راغب نہیں پایا، آپ کا نظریہ اس سلسلے میں نہایت عجیب و غریب تھا۔ مولانا بدرِ عالم میرٹھیؒ کی روایت ہے:

> ایک مرتبہ ڈابھیل کے زمانہ قیام میں میں نے عرض کیا کہ آپ صاحب اہل و عیال ہیں اگر بخاری شریف کی کوئی شرح یا قرآن مجید کی تفسیر تصنیف فرمائیں تو آپ کے علوم کی حفاظت کے ساتھ آئندہ بچوں کے لیے بھی ان تصانیف سے کچھ انتظام ممکن ہے، اس گزارش پر آپ کا جواب یہ تھا: عمر بھر حدیث بیچ کر گزر اوقات کی مولوی صاحب کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میرے بعد بھی میرا علم فروخت ہوتا رہے"۔ (نقش دوام-ص ۸۵-۸۶)

آپ کی اسی زاہدانہ و فقیرانہ فطرت کا ثمرہ ہے کہ آج آپ کا تصنیفی سرمایہ تعداد کے اعتبار سے کافی کم نظر آتا ہے۔ آپ کی علمی جامعیت و ہمہ گیریت علمی حلقوں میں ضرب المثل بن چکی ہے۔ علوم عقلیہ و نقلیہ کی کون سی راہ ہے جہاں آپ کے نقشِ پا کی اتباع کرنا اہلِ

علم اپنے لیے باعثِ فخر نہیں سمجھتے، اگر آپ لکھنے لکھانے کی روش اختیار کر لیتے تو نہ معلوم آپ کے قلم سے علم و تحقیق کے کیسے کیسے دریا بہتے اور علمی لعل و جواہر سے آراستہ کتنے تاج محل تیار ہوتے۔

آپ کی اکثر تصانیف کسی مصلحت اور کسی فتنہ کے استیصال ہی کے لیے لکھی گئی ہیں، یہ کل انیس کتابیں ہیں۔ ان کا مختصر سا تعارف اس شعر کے ساتھ قارئین کے لئے پیش خدمت ہے:

جو کہہ گئے وہ ٹھہرا ہمارا فن اسرار
جو کہہ نہ پائے نہ جانے وہ کیا چیز ہوتی

(۱) عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ (علیہ السلام)

ملعون قادیانی کی تحریک جس نے ہندوستان میں اسلام کا شیرازہ بکھیرنا شروع کر دیا تھا، اس کے سدباب کے لیے امام کشمیریؒ نے جس جاں فشانی سے کام کیا، ذاتی طور پر نیز اپنے شاگردوں و دیگر اہل علم حضرات کو اس جانب متوجہ کر کے جس طریقہ پر اس فتنۂ عظیم کی روک تھام کی وہ اظہر من الشمس ہے۔ آپ کو من جانب اللہ اس عظیم خدمت کے لیے منتخب فرمایا گیا۔ اس فتنہ پر قدغن لگانے کے لیے آپ نے متعدد کتابیں تصنیف فرمائیں۔ مفتی محمد شفیع صاحب، مولانا ادریس کاندھلوی، مولانا بدرِ عالم میرٹھی، مولانا محمد انوری لائل پوری، مولانا ابوالوفا شاہجہاں پوری وغیرہ جیسے اپنے جلیل القدر شاگردوں کو اس جہادِ اکبر کے لیے میدان میں لا کھڑا کیا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی ساحرانہ خطابت، ظفر علی خاں کی آتشی شاعری، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی ہنگامہ خیزیوں نے انوارِ انوری سے جلا پا کر مرزائیت کے خرمن کو خاکستر کر دیا۔ "عقیدۃ الاسلام" مرزائیت کے خلاف لکھی جانے والی آپ کی سب سے پہلی تصنیف ہے۔ اس کتاب کا موضوع حضرت عیسیٰؑ کا رفع و نزول ہے۔ حیات عیسیٰؑ کے اثبات میں آیاتِ قرآنیہ پر بھرپور کلام فرمایا ہے اور موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔ رفعِ عیسیٰؑ کے بیان میں اس بات پر روشنی ڈالی ہے کہ ایک خاکی انسان کو لوازماتِ بشریہ سے محفوظ فرما کر اسے زمان و مکان کی حدود و قیود سے آزاد کرنا عقلاً و فطرۃً کس طرح ممکن ہے۔ حقیقت عالم اور حدوثِ عالم جیسے اہم موضوعات پر ٹھوس علمی مواد موجود ہے۔ ضمنی طور پر لفظِ توفی، لفظِ موت وغیرہ الفاظ کی تحقیقِ بسیط، استعارہ، کنایہ، تشبیہ وغیرہ مباحث بلاغت کی شرح لطیف اور یاجوج و ماجوج، ذوالقرنین وغیرہ تاریخی عناوین پر نادر اور عجیب و غریب تفصیل مذکور ہے۔

اس اہم رسالہ میں جن کتابوں سے عبارات کو نقل کیا گیا ہے اور جن کتابوں کا حوالہ دیا گیا

ہے ان کی تعداد تین سو تک پہنچتی ہے۔ قرآن کریم، احادیث نبوی، اجماع امت، عقلی دلائل اور سائنٹفک اسلوب کے ساتھ حیات ونزول عیسیٰ کو اس درجہ واضح کیا گیا ہے کہ کسی شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ قرآن پاک کی آیت اِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسٰی اِنِّی مُتَوَفِّیْکَ وَ رَافِعُکَ اِلَیَّ الخ (پ۳ آل عمران) کی تفسیر کرنے کے بعد رقم طراز ہیں: اس موضوع (حیات عیسی) پر مستقل رسالے اور کتابیں شائع ہو چکی ہیں مگر میں اہل علم کو توجہ دلاتا ہوں کہ ہمارے مخدوم علامہ فقید النظیر حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیری اطال اللہ بقاءہٗ نے رسالہ "عقیدۃ الاسلام" میں جو علمی لعل وجواہر ودیعت کیے ہیں ان سے متمتع ہونے کی ہمت کریں۔ میری نظر میں ایسی جامع کتاب اس موضوع پر نہیں لکھی گئی۔ یہ رسالہ رمضان المبارک ۱۳۴۳ھ میں تصنیف فرمایا۔ اس کا ایک نام "حیاۃ المسیح بمتن القرآن و الحدیث الصحیح" بھی ہے، اس کتاب کا اردو ترجمہ بنام حیات ابن مریم جامعہ امام انورؒ سے شائع ہو چکا ہے ترجمہ کی ذمہ داری حضرت مولانا صغیر احمد صاحب پرتاپ گڑھی نے زیر نگرانی حضرت مولانا انظر شاہ صاحبؒ انجام دی۔

(۲) تحیۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ (علیہ السلام) یہ رسالہ اصلاً وہ حواشی ہیں جو "عقیدۃ الاسلام" کے لیے لکھے گئے تھے آپ کی وفات سے ایک سال قبل ۱۳۵۱ھ میں بزمانۂ قیام ڈابھیل مجلسِ علمی ڈابھیل نے شائع کیا۔ حضرت عیسیٰ سے متعلق نادر تحقیقات سے یہ رسالہ معمور ہے۔ نکاتِ قرآن، بلاغت وایجاز کے موضوعات پر فاضلانہ بحث کی گئی ہے۔ یہ رسالہ اپنی گوناگوں صفات کے باوصف امامِ کشمیریؒ کی وسعتِ مطالعہ کا عمدہ مظہر ہے۔ وفیات الاعیان (ابن خلکان)، کتاب العبر (ابن خلدون)، الجمان فی تاریخ الزمان (علامہ عینی) الملل والنحل (ابن حزم) وغیرہ تاریخی کتابوں اور انجیل کے حوالے جابجا موجود ہیں۔

خطبہ کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں: الحمد للہ الذی أبد الحق و شیدہٗ و علیٰ منارہٗ و رفع رأیاتہٗ بحیث صفقت بین آجنحۃ الملئکۃ و نصراً نصارہٗ و الصلوٰۃ و السلام علی نبیّ الھُدیٰ"۔ اس رسالہ میں ضمنی تحقیقات کے ساتھ دوسو اکیس حواشی کا نادر مجموعہ موجود ہے۔ امام کشمیریؒ اپنی اس تصنیف کے بارے میں رقم طراز ہیں: فھذہ حواش...... علقتھا علی رسالتی "عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسی (علیہ السلام)"، وسمیتھا تحیۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ (علیہ السلام) تضمنت تفسیر

آیات في افحام ذلک الملحد العنبد و الشيطان المربد الكاديانی الكدانی المتنبی الكافر عند الأقاضی و الأدانی. الخ

(۳) التصریح بما تواتر فی نزول المسیح

اس رسالہ میں امام کشمیریؒ نے حیات عیسیؑ سے متعلق منتشر احادیث کو یکجا کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ رسالہ مختصر ہے (۴۴ صفحات) مگر اپنی جامعیت کی بناء پر اسلامی کتب کے بے پناہ ذخیرے میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ اس سے قبل اس موضوع پر صاحب نیل الاوطار قاضی شوکانیؒ نے ایک رسالہ بنام التوضیح فیما تواتر في المنتظر و المهدي و المسيح تصنیف فرمایا ہے مگر اس رسالہ میں وہ صرف ۲۹ احادیث ہی جمع فرما سکے جب کہ شاہ صاحبؒ نے اپنے بے نظیر حافظہ اور ہمہ گیر مطالعہ کے باوصف ۷۰ احادیث صحیحہ وحسنہ کو یکجا کر دیا ہے۔ حضرت العلامہ یوسف بنوریؒ رسالہ کی اس خصوصیت کے بارے میں لکھتے ہیں: جمع الشيخ سبعين حديثاً في هذا الباب بين صحاح و حسان و قدزاد قدراً كثيراً على من سلف من الأمة ممن حاولوا فيه التأليف حتى ان القاضی الشوكانی لذيقدر في رسالته التوضيح فيما تواتر في المنتظر و المهدي و المسيح" بأن يجمع أكثر من تسعة و عشرين حديثاً مع سعة اطلاعه و كثرة الذخائر القيمة من كتب الحديث في بلاده. (نفحۃ العنبر ص ۱۱۷)

یہ رسالہ اولاً امامِ کشمیریؒ کے شاگرد رشید مفتی شفیع صاحب عثمانیؒ کے وقیع مقدمہ کے ساتھ ۱۳۴۴ھ میں دارالاشاعت سے شائع ہوا۔ بعد میں شیخ ابوالفتاح ابوغدہؒ نے بیروت سے ایڈٹ کر کے مزید حواشی وتعلیقات کے ساتھ شائع فرمایا۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا زاہد الکوثریؒ اس کو تعویذ کی طرح ہر وقت اپنے پاس رکھتے تھے۔ (حیات انور ص ۱۸۸)

(۴) اکفار الملحدين فی ضروريات الدين

امام کشمیریؒ کی تصنیفات میں یہ کتاب نہایت عظمت کی حامل ہے۔ نصوص قرآن، احادیث نبوی، آثارِ صحابہ، تعامل امت کو اساس بنا کر اسلام اور کفر کے حدود وقیود کی تعیین کی گئی ہے اور ان گوشوں کی خوب تنقیح کر دی گئی ہے جہاں مدت سے بڑے بڑے اہلِ علم حضرات کے لیے لغزش کا موقعہ تھا۔ اس اہم مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ جس طرح مجتہد فیہ مسائل پر تکفیر سخت مذموم ہے۔ اسی طرح ضروریات دین کا انکار کرنے والے شخص کی تکفیر سے پہلوتہی کرنا بھی ایسا ہی برا ہے۔

مرزائیوں کا مسئلہ اہل علم کے یہاں طے شدہ ہے اور ان کے کفر پر علماء اجماع فرما چکے

ہیں مگر بعض دفعہ آدمی کو اشتباہ ہو جاتا ہے کہ وہ افراد جو نماز، روزہ کے پابند ہوں کلام اللہ اور کلمۂ اسلام سے تعلق جوڑتے ہوں ان کی تکفیر کس طرح درست ہو سکتی ہے؟ امام کشمیریؒ نے اس مسئلہ کی وضاحت کے لیے غلام احمد قادیانی کی کتابوں سے تقریباً ۷ ایسے اقتباسات درج کیے ہیں جن سے قادیانی اور اس کے متبعین کی شرعی حیثیت واضح ہو جاتی ہے۔ یہ کتاب چونکہ مرزائیوں کے کفر پر ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے اس لیے امام کشمیریؒ نے اس پر چند ممتاز علماء۔ مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ، مولانا اشرف علی التھانویؒ، مولانا کفایت اللہؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا عزیز الرحمٰنؒ کے تائیدی کلمات بھی لکھوائے ہیں۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نے بھی اس کتاب کے لیے تقریظ لکھی تھی جو علامہ کشمیریؒ تک اس وقت پہنچی جب یہ کتاب شائع ہو چکی تھی۔ اس سے پہلے اکفار الملحدین کے موضوع پر امام غزالیؒ نے فیصل التفرقة بين الاسلام و الزندقة" نامی ایک کتاب تصنیف فرمائی تھی اور دیگر کبار علماء نے بھی اس عنوان پر خامہ فرسائی کی ہے مگر امام کشمیریؒ کا یہ رسالہ بے مثل اور منفرد ہے۔ مولانا عبدالحلیم چشتی رقم طراز ہیں: تکفیر کے موضوع پر جن ائمہ فن نے قلم اٹھایا، ان میں حجۃ الاسلام امام غزالیؒ، ابن حزم، ابن تیمیہ، ابن قیم وغیرہ کے نام سرفہرست ہیں۔ لیکن جیسی جامعیت، استیعاب، مباحث اور تنقیح مناط علامہ کشمیریؒ کے رسالہ اکفار الملحدین میں ہے، ان ائمہ کے یہاں نہیں۔ (علامہ انور شاہ کشمیریؒ: شخصیت اور علمی کمالات۔ ص ۹۵)۔ کتاب ۱۳۵۰ھ میں تصنیف ہوئی۔ مجلس علمی ڈابھیل نے نشر و اشاعت کا نظم کیا۔ بعد میں عبدالفتاح ابوغدہؒ نے دمشق سے نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع کیا۔ اصل کتاب عربی زبان میں ہے۔ مولانا ادریس کاندھلویؒ نے اردو ترجمہ کیا جو مجلس علمی کراچی سے شائع ہو چکا ہے۔ رسالہ کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں: الحمدللّٰہ الذی جعل الحق یعلو ولا یعلی حتی یاخذ من مکافۃ القبول مکافاً فوق السماء الخ.

(۵) خاتم النبیین:

فارسی زبان میں یہ رسالہ اس وقت کی تصنیف ہے جب امامِ کشمیریؒ صاحب فراش اور فتنۂ مرزائیت کی شرانگیزیوں سے سخت کبیدہ خاطر تھے بالخصوص کشمیر میں مرزائیت نے جو منہ زوری پھیلا رکھی تھی وہ آپ کے لیے سخت اضطراب کا باعث تھی۔ اسی بے چینی اور اضطراب کے ابلتے ہوئے دریا سے اس گوہر آبدار کا وجود ہوا ہے اور نظر کو خیرہ کر دینے والے جواہر ولآلی ابھر ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ رسالہ نہایت دقیق ہے اور عوام تو کجا علماء کے لیے اس کی تفہیم جوئے شیر لانے

سے کم نہیں۔ سب سے پہلے ۱۳۵۳ھ میں مجلسِ علمی کراچی سے اشاعت ہوئی۔ دوسری بار ۱۳۷۸ھ میں چھپی اردو میں سب سے پہلا ترجمہ مولانا عزیز الحق صاحب بہاری استاد جامعہ ڈابھیل نے کیا، بعد میں الکشمیریؒ کے شاگرد باختصاص مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے ترجمہ کیا جو صد حسرت اب تک اشاعت کے مرحلہ سے نہیں گزر سکا اور اندازہ یہ ہے کہ اب یہ ترجمہ تقریباً معدوم ہو چکا ہے۔ تیسرا ترجمہ مولانا یوسف بنوریؒ کی تحریک پر مولانا یوسف لدھیانویؒ (کراچی) نے کیا جو پاکستان میں چھپ چکا ہے۔ چوتھا ترجمہ امام کشمیریؒ کے شاگرد عزیز مولانا ایوب صاحب اعظمیؒ کے خلف الرشید مولانا حکیم عزیز الرحمٰن صاحب اعظمیؒ نے کیا جو حضرت مولانا انظر شاہ مسعودیؒ کے پیش لفظ کے ساتھ طبع ہو چکا ہے۔ ادھر چند سال قبل اہل علم کی شدید خواہش کے مطابق اس کتاب کا عربی ترجمہ جامعہ امام انورؒ کے شعبۂ نشر واشاعت سے شائع ہو چکا ہے، تعریب کا کام جامعہ کے استاذ مولانا عبد الرشید صاحب بستوی نے حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب کشمیریؒ کی زیر نگرانی انجام دیا۔

(۲) فصل الخطاب في مسئلة أم الكتاب

قراءۃ خلفِ امام ابتدا ہی سے متنازع فیہ مسئلہ رہا ہے۔ آج تک کوئی ایسا حتمی فیصلہ نہیں ہو پایا جس پر دونوں فریقوں کا اتفاق ہو سکے۔ امام کشمیریؒ کا یہ رسالہ اسی مشہور مسئلہ سے متعلق ہے اور کہنا چاہیے کہ امکان بھر دلائل و براہین کے ذریعہ مذہب احناف کے قابل ترجیح ہونے کو اس قدر واضح کر دیا ہے کہ غیر متعصب نظر و فکر کے ساتھ رسالہ پڑھنے پر مصنفؒ کا ہم خیال ہونا ہی پڑتا ہے اور مسلک احناف کو مرجح قرار دینے کے علاوہ کوئی چارہ باقی نہیں رہتا۔ کتاب نہایت دقیق ہے، اس کی دقت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب یہ کتاب شائع ہوئی تو ناشر نے اشتہار میں یہ اطلاع ارقام کی: ''فصل الخطاب'' فاتحہ خلف الامام کے مسئلہ پر محدثانہ تحقیقات اور عالمانہ مضامین کا فی الحقیقت بے مثل رسالہ جو اکابر محدثین کی تصنیفات کا سچا نمونہ ہے۔ دار العلوم دیوبند کے صدر مدرس حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ نے عربی زبان میں بکمالِ انصاف تحریر فرمایا ہے، بڑے بڑے علماء بھی مشکل سے سمجھتے ہیں، کم استعداد مولوی طلب نہ فرمائیں''۔ یہ رسالہ امامِ کشمیریؒ کی شانِ امامت کا آئینہ دار ہے، آپ کی علمی جلالت سطر سطر سے عیاں ہوتی ہے۔ حدیث عبادۃ بن ثابت کی نہایت عالمانہ تحقیق کی گئی ہے جو شاید ہی اس سے قبل کسی محدث کے یہاں نظر آ سکے۔ لفظِ فصاعداً کی تحقیق ۱۲۔۱۳ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ کتاب کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں:

اللهم لک الحمد حمداً دائماً مع خلودک و لک الحمد حمداً لا منتهی له دون علمک الخ. آخر میں امام کشمیریؒ رقم طراز ھیں: فاعلم انی ما کتبت هذه السطور بقصد الرد علی الشافعية و انما کتبتها ليعلم وجه الحنفية في اختيار الترک، فکنت من المنصتين لا المنازعين الخ

کتاب ۱۳۳۸ھ کی تصنیف ہے جو یونیورسل پرنٹنگ پریس دہلی سے طبع ہوئی۔

(۷) خاتمة الکتاب فی فاتحة الکتاب

فاتحہ خلف الامام پر یہ رسالہ فارسی زبان میں تصنیف کیا گیا ہے۔ رسالہ کب تصنیف ہوا اس سلسلہ میں دو روایات ہیں، حضرت مولانا یوسف بنوریؒ کے بقول یہ رسالہ دار العلوم میں شاہ صاحب کے ابتدائی دور کی تصنیف ہے دیگر سوانح نگاروں نے اسے اس وقت کی تصنیف قرار دیا ہے جب آپ دہلی میں مقیم تھے اور مدرسہ امینیہ میں تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے۔ رسالہ پر حضرت شیخ الہندؒ کی تقریظ موجود ہے۔ آخر میں شاہ صاحب رقم طراز ہیں: ''ایں رسالہ را ۸ محرم ۱۳۲۰ھ بعد نماز فجر شروع کردہ، روز عاشورا بعد نماز ظہر تمام شد''۔

(۸) نیل الفرقدين في مسئلة رفع اليدين

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ رسالہ رفعِ یدین کے مشہور اختلافی مسئلہ سے متعلق ہے رسالہ میں امام کشمیریؒ نے فرمایا ہے کہ یہ مسئلہ فقط افضلیت و اولیت سے متعلق ہے۔ وہ کتاب کے آغاز میں لکھتے ہیں: فهذه نبذة في مسئلة رفع اليدين قبل الرکوع و بعدهٗ و بين السجدتين و بعد الرکعتين و مابدور من النظر و المعنی فيها فی البين، ما قصدت بها اخمال احد الطرفين و لا يستطيعه ذو عينين و انما اردت بها ان بيد کل واحد من الفريقين وجهاً من الوجهين و هما علی الحق من الجانبين الخ آپ نے اس رسالہ میں نہایت غیر جانب داری سے تحقیقی مواد فراہم کیا ہے اور اس حقیقت کو واشگاف کیا ہے کہ اس طرح کے مسائل فی نفسہ کوئی اہمیت نہیں رکھتے، جانبین میں سے کسی کو دوسرے کی تکذیب کا اختیار نہیں ہے۔ امام کشمیریؒ عرض پرداز ہیں: ''فان الصحابةؓ اذا اختلفوا امر فالجانبان حق و صواب و احتمال جانب او اعدامه بنحو لحن في الحجة رقم علی الماء لا غير'' کتاب پانچ فصلوں اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔ ہر فصل میں

بے پناہ کتب کے حوالے موجود ہیں۔ پہلی فصل کے پہلے ہی صفحہ پر پچاس سے زائد کتابوں کا حوالہ دیا گیا ہے۔ علامہ زاہد الکوثریؒ کتاب کی جامعیت کے سلسلے میں لکھتے ہیں: هذا البحث أي رفع اليدين طويل الذيل الفت فيه كتب خاصة من الجانبين و من احسن ماألف في هذا الباب نيل الفرقدين و بسط اليدين كلا هما المولانا العلامة الحبر البحر محمد انور شاه الكشميري و هو جمع في كتبه اللباب فشفى و كفى. (نیل الفرقدین ص۲۔۳، مجلس علمی ڈابھیل۔۱۳۵۰ھ)

(۹) بسط اليدين في نيل الفرقدين :

یہ مختصر رسالہ نیل الفرقدین کا تکملہ ہے۔ قدماء و متاخرین علماء کی آراء و خیالات جو اس باب میں منقول ہیں، نہایت تحقیق و تنقیح کے ساتھ پیش کی گئی ہیں۔ رسالہ میں تقریباً ۱۴۴ حواشی موجود ہیں۔ ۱۳۵۱ھ میں طبع ہوا۔ کل صفحات ۶۴ ہیں، رسالہ کا آغاز ان الفاظ سے ہے، "الحمد للّٰه عدد خلقه وزنة عرشه و رضا نفسه و مداد كلماته . و الصلاة و السلام على رسوله و نبيه محمد و على آله و صحبه و اتباعهم و تبعهم الذين هو اسناد الدين و من رواته و هداته و بعد فانه لما طبعت رسالة "نيل الفرقدين في مسألة رفع اليدين" جعلت على عادتى أحدق احداقى في أوراقها و أقلب أجفانى في أغصانها و أقيد ما يستح من شيء بعد شيء أو يد و ربا لبال مابين الغنيمة و الفيء حتى حصلت عدة أوراق و عدة أسباق" الخ

(۱۰) كشف الستر عن صلاة الوتر.

صلاۃ وتر کا مسئلہ علماء کے مابین ایک معرکۃ الآراء مسئلہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ امام کشمیریؒ نے اس رسالہ میں صلاۃِ وتر سے متعلق تمام ضروری امور کی تنقیح فرمادی ہے۔ مسئلہ آمین بالجہر، وضع الیدین علی الصدر وغیرہ مسائل پر بھی عمدہ کلام فرمایا ہے۔ بظاہر متعارض احادیث و روایات کے درمیان نہایت لطیف تطبیق فرمائی ہے۔ امام کشمیریؒ نے صلاۃ وتر سے متعلق تمام مباحث مثلاً صلاۃ وتر کی شرعی حیثیت، تعداد رکعات اور پھر طریقۂ ادائیگی کے سلسلے میں جو مختلف اور متعارض مسائل منقول ہیں ان کی خوب تحقیق فرمائی ہے۔ کتاب کے خطبہ میں مضمون کتاب کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں "الحمد لله الواحد الأحد الوتر الفرد الصمد الذي لم يلد و لم يولد و لم يكن لهٗ كفوا أحد".

رسالہ ۱۳۴۸ھ میں تصنیف ہوا مگر اشاعت ۱۳۴۹ھ میں ہوئی۔ حضرت العلامہ شبیر احمد عثمانیؒ اس رسالہ کے بارے میں فرماتے ہیں: حضرت شاہ صاحب کی کتاب ''کشف الستر عن صلوٰۃ الوتر'' کی قدر اس وقت ہوئی جب اس مسئلہ پر جتنا ذخیرۂ احادیث مل سکا، سب کا مطالعہ کیا۔ پھر رسالہ مذکور کو اول سے آخر تک بار بار پڑھا اور اس کی صحیح قدر معلوم ہوئی۔ (حیاتِ انور ص ۲۱۴-۲۱۵ جلد دوم)

(۱۱) ضرب الخاتم علی حدوث العالم:

چار سو اشعار پر مشتمل یہ رسالہ امام کشمیریؒ کا وہ شاہکار ہے جسے پڑھ کر ڈاکٹر اقبالؒ نے بے ساختہ یہ الفاظ ادا کیے: ''میں مولانا انور شاہؒ کا رسالہ پڑھ کر دنگ رہ گیا ہوں کہ رات دن قال اللّٰہ و قال الرسولؐ سے واسطہ رکھنے کے باوجود فلسفہ میں بھی ان کو اس درجہ درک و بصیرت اور اس کے مسائل پر اس قدر گہری نگاہ ہے کہ حدوث عالم کے موضوع پر اس رسالہ میں جو کچھ لکھ دیا ہے حق یہ ہے کہ آج یورپ کا بڑے سے بڑا فلسفی بھی اس مسئلہ پر اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتا۔ (حیات انور ج ۱، ص ۱۹۰)

یہ رسالہ عالم کے حدوث و قدم کے موضوع سے متعلق ہے۔ فلسفہ و کلام کے معرکۃ الآراء عناوین پر امام کشمیریؒ کی نکتہ آفرینیاں دیکھ کر آپ کی وسعت مطالعہ کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ آپ نے بلا تخصیص ہر فن سے متعلق چھوٹی بڑی، مطبوعہ وغیرہ مطبوعہ کتابوں کا مطالعہ فرمایا۔ سائنس کی جو کتابیں عربی میں منتقل ہو چکیں تھیں آپ نے ان سے بھی بھر پور استفادہ کیا۔ علامہ کشمیریؒ کے شاگرد خصوصی مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادیؒ کے بقول ''اس کا شاید کم لوگوں کو علم ہوگا کہ حضرت الاستاذ موجودہ سائنس یعنی فزیکس، کیمسٹری اور بیالوجی کا بھی بڑا وسیع مطالعہ رکھتے تھے اور ان علوم میں بھی ان کی نظر مبصرانہ تھی۔ (حیات انور ج ۲، ص ۲)

اس رسالہ میں آپ کو جابجا امام کشمیریؒ کی عبقریت کے نقوش دکھائی دیں گے اور آپ کے بے نظیر مطالعہ کی قندیلیں ہر قدم پر روشن نظر آئیں گی۔ امام کشمیریؒ پر تاعمر اخفائے امر کا غلبہ رہا جس کی بناء پر وہ اپنے اکثر علوم اپنے ساتھ ہی لے کر رخصت ہو گئے۔ مگر آپ کی تصانیف سے آپ کی علمی رفعت کا ادراک ہو جاتا ہے، وہ لاکھ پردہ پوشی کریں حقائق و واقعات ان کی عظمت کو خود ہی بیان کرتے جاتے ہیں۔ اس رسالہ کا وجود یہ قوی احساس دلاتا ہے کہ امام کشمیریؒ فلسفہ و کلام میں بھی نہایت اعلیٰ مقام رکھتے تھے اور اس رسالہ کو پڑھ کر مفتی کفایت اللہ دہلویؒ کے اس شعر کا صحیح

مفہوم سمجھ میں آتا ہے جو آپ نے امام کشمیریؒ کی منقبت میں کہا ہے:

مریغ العلم مقتنص الفنون

لہ کل المزایا کا لمصید

آپ کے ایک شاگرد مدرسہ اسلامیہ ڈابھیل کا بیان دیکھئے: ''اللہ۔ اللہ وہ ڈابھیل کا آخری سال، استاد زماں کی پڑھائی، معقولات کے فاضل طلبہ وہاں پہنچے اور ہر ایک اپنے آپ کو ابن سینا سمجھتا تھا مگر سارا کرّ وفر اس وقت ختم ہوگیا جب حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے معصومانہ انداز میں سفید مونچھوں اور داڑھی کے درمیان عنابی ہونٹوں کو جنبش دیتے ہوئے فرمایا: عالمِ مثال کے متعلق ابنِ سینا نے یہ کہا، غزالی کا نظریہ یہ ہے، ابن عربی یہ کہتے ہیں، رازی کا خیال یہ ہے کہ اور میں یہ کہتا ہوں''۔

نفحۃ العنبر سے علامہ کشمیریؒ کے قولِ منقول کا ترجمہ پڑھئے: ''فلسفۂ قدیم و سائنسِ جدید میں الٰہیات وطبعیات سے متعلق جو کچھ مل سکتا ہے ان سب کو میں نے ان اشعار (ضرب الخاتم) میں سمولیا اس موضوع پر قدیم وجدید ذخیرہ میں کوئی چیز ایسی نہیں جو میری نظر سے نہ گذری ہو بلکہ اس عنوان پر جو مستقل تالیفات ہیں ان کا بھی بنظر غائر مطالعہ کیا مگر افسوس قدیم و جدید میں مجھے کوئی شافی چیز نہیں مل سکی بلکہ مجھے کہنے دیجئے کہ جلال دوانی نے اسی عنوان پر ''الزوراء'' نامی ایک کتاب لکھی لیکن وہ نہایت بے مغز ہے۔ یہ خود میرے افکار ہیں بلکہ مجھے اس دعوے میں بھی تردد نہیں کہ میں کچھ ایسے علوم کی جانب اشارہ کررہا ہوں جو اس سے پہلے کبھی قلم سے نہیں نکلے''۔

(نفحۃ العنبر۔ص ۱۲۵)

(۱۲) مرقاۃ الطارم لحدوث العالم:

یہ رسالہ بھی حدوثِ عالم کے موضوع سے متعلق ہے۔ یہ ضرب الخاتم کے چھ سال بعد طبع ہوا اور ایک درجہ میں اسے ضرب الخاتم کا تکملہ کہا جاسکتا ہے۔ یہی وہ رسالہ ہے جس کے سلسلے میں ڈاکٹر اقبالؒ نے علامہ کشمیریؒ کے ساتھ مراسلت کا سلسلہ شروع کیا۔ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کا بیان دیکھئے:

''علامہ اقبالؒ کے آٹھ آٹھ صفحات کے خطوط شکوک و شبہات سے پُر آتے تھے اور حضرتؒ ان کے شافی جوابات لکھتے۔ (حیات انور، ص ۲۵۱)

علامہ مصطفیٰ صبریؒ نے جب ۱۳۵۷ھ میں اس کتاب کا مطالعہ کیا تو کھلے دل کے ساتھ

اس بات کا اعتراف کیا:

لقد تحيرت من دقة نظر صاحبها و ثلج صدره بهذه العلوم و كان لى رأي في مسئله كلامية ظننت أنى لم أسبق اليه فرأيت أن الشيخ قد سبقني إلى مثلها و إنى أفضل هذه الوريقات على "اسفار الاربعة" للصدر الشيرازى".

علامہ صبریؒ نے اپنی تالیف موقف العقل والعلم میں علامہ کشمیریؒ کی جلالتِ علمی اوران کی شانِ امامت کو خوب سراہا ہے۔ اپنی کتاب القول الفیصل میں انہوں نے مرقاۃ الطارم کی عبارات پر عبارات نقل کی ہیں اور جا بجا حوالے پیش کیے ہیں۔ حقیقت میں ہیرے کی قدر جوہری ہی کیا کرتے ہیں۔ ۱۳۵۱ھ میں یہ رسالہ مجلس علمی ڈابھیل سے شائع ہوا۔

ان مذکورہ کتابوں کے علاوہ آپ کی چند تصانیف اور ہیں۔ جن میں سے بعض کتابیں تو مطبوعہ شکل میں سامنے آچکی ہیں اور بعض ابھی تک طباعت کے مرحلہ سے نہیں گزریں۔ ہم یہاں ان مطبوعہ وغیر مطبوعہ کتابوں کا صرف نام ذکر کر رہے ہیں۔ ان کی تفصیل کے لیے نقشِ دوام اور حیاتِ انور کی جانب رجوع کیا جائے۔

شاہ صاحبؒ کی باقی کتابوں کے نام:

(۱۳) الاتحاف لمذهب الأحناف

(۱۴) ازالة الدين فى المذهب عن قرة العينين.

(۱۵) سهم الغيب في كبد اهل الريب

(۱۶) خزائن الاسرار

(۱۷) تعليقات الاشباه و النظائر ابن نجيم

(۱۸) النور الفائض على نظم الفرائض

(۱۹) مجموعۂ تقاریر بزبان اردو۔

حضرت شاہ صاحبؒ اور ہندوستان کی
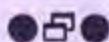
تحریک آزادی

مولانا سید محبوب رضوی دیو بند

کچھ عجیب سا عنوان معلوم ہوتا ہے/ جو شخص سراپا علم وفضل ہو اور جس کے شب و روز درس و تدریس کی مصروفیتوں اور علمی مسائل کی گرہ کشائیوں میں گزرے ہوں/ اسکا خارزار سیاست کی ہنگامہ خیزیوں میں حصہ لینے کی مثال بہت کم ملتی ہے/ علمی و عملی کمالات میں جو چیز حضرت شاہ صاحبؒ کو ان کے معاصرین میں ممتاز کرتی تھی وہ مختلف علوم وفنون میں ان کی جامعیت تھی/ علوم شرعیہ وعقلیہ میں کوئی علم ایسا نہیں جس میں انہیں کمال اور مہارت تامہ حاصل نہ ہو/ ضبط واتقان، وسعت مطالعہ دقت نظر/ جدت فکر/ کثرت معلومات/ ذکاوت وذہانت/ فہم وفراست/ تبحر علم اور استحضار میں وہ بلا مبالغہ اپنی نظیر آپ تھے/ علماء متقدمین ومتاخرین میں ایسی جامع شخصیتیں شاذ ونادر ہی پائی جاتی ہیں/ ایک ہوتا ہے باکمال اور ایک ہوتا ہے جامع الکمالات/ باکمال سے اگر اس کا کمال چھین لیا جائے تو پھر اس کی شخصیت میں کچھ باقی نہیں رہتا مگر جامع کمالات کا کوئی وصف یا کمال اگر اس سے جدا کر لیا جائے تو دوسرے کمالات کے سبب سے اس کی شخصیت پھر بھی ممتاز اور نمایاں رہتی ہے/ شاہ صاحبؒ اس طرح کی گوہر شب چراغ اور جامع کمالات شخصیت تھے/ وہ اگر محدث نہ ہوتے تب بھی بہت کچھ ہوتے اور علم وفن میں ان کا اسم گرامی سرفہرست ہوتا۔

شاہ صاحبؒ نے اپنی اعلی تعلیم کے آخری مراحل دار العلوم میں طے کئے تھے، جہاں ان کے فکر ونظر پر آخری نقوش شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ کی فیضان علمی کے ثبت ہوئے تھے، جنکی تحریک آزادئ ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا ایک روشن اور جلی عنوان ہے/ یہ تحریک ''ریشمی خطوط'' کے نام سے موسوم ہے۔ جس سے ہندوستان کا ہر پڑھا لکھا شخص واقف ہے/ ہندوستان کے نامور عالم اور حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد رشید مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے دار العلوم دیوبند میں اپنے زمانہ طالب علمی کی ایک دلچسپ سرگزشت ''دار العلوم دیوبند میں بیتے ہوئے دن'' کے عنوان سے بیان کی ہے مولانا گیلانی لکھتے ہیں کہ:

ایک دن میں حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور حضرت کے سیاسی مسلک کے بارے میں دریافت کیا جب میں اپنی بات پوری کر چکا تو دیکھا کہ حضرت پر ایک خاص کیفیت طاری ہے/ اپنے استاذ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا، ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرت الاستاذ نے دارالعلوم دیوبند کو کیا درس و تدریس اور تعلیم و تعلم کے لئے قائم کیا تھا؟ جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کی ناکامی کے بعد یہ ارادہ کیا گیا تھا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تا کہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے۔

میں نے اپنے لئے اسی راہ کا انتخاب کیا ہے جس کے لئے حضرت الاستاذ نے دارالعلوم دیوبند قائم کیا تھا (ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، مارچ ۱۹۵۳ء صفحہ ۴۲)

ہندوستان کے لئے آزادی جدوجہد کا یہی وہ شرارہ تھا جو حضرت شیخ الہندؒ کے فیضان تربیت سے شاہ صاحبؒ میں منتقل ہوا اور علوم وفنون میں غایت شغف وانہماک کے باوجود وہ شرارہ رہ رہ کر ابھرتا رہا، ان کی طالبعلمی کا آخری دور جس ماحول میں بسر ہوا تھا اس میں سیاست کے خارزار سے یکسر ان کا دامن کشاں رہنا مشکل تھا/ چنانچہ سیاسی حیثیت سے شاہ صاحبؒ ہمیشہ جمعیۃ علماء ہند میں شامل اور اسکی مجلس عاملہ کے رکن رہے اور اپنے گراں قدر مشوروں سے ہندوستان کی آزادی کے لئے جمعیۃ علماء ہند کی بصیرت افروز رہنمائی فرماتے رہے/ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب مرحوم جمعیۃ علماء ہند کے سالانہ اجلاس کو اس وقت تک کامیاب نہیں سمجھتے تھے جب تک اسمیں شاہ صاحبؒ کی شمولیت نہ ہوا کثر مشورے کے لئے مفتی صاحبؒ دہلی سے دیوبند تشریف لاتے رہتے تھے۔

تحریک شیخ الہندؒ کے نام سے بیسویں صدی عیسوی کے اوائل کا جو برطانوی حکومت کا سرکار ریکارڈ سامنے آیا ہے اس سے بھی شاہ صاحبؒ کی سیاسی سرگرمیوں کی تصدیق ہوتی ہے کہ آل انڈیا نیشنل کانگریس کی جدوجہد آزادی سے پیشتر علماء کی ایک جماعت موجود تھی جس نے ہندوستان کی تحریک آزادی کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا، یہ تحریک حضرت شیخ الہندؒ نے چلائی تھی/ کانگریس کے قائدین ابھی سو کر بھی نہ اٹھے تھے کہ یہ جماعت مسافت کا بڑا حصہ طے کر چکی تھی/ شاہ صاحبؒ کی نسبت مذکورہ بالا سرکاری ریکارڈ میں لکھا ہے کہ:

''مولوی انور شاہ جو مدرسہ دیوبند کے استاد اور نامور عالم ہیں جنگ بلقان کے زمانے میں انہوں نے ''ہلال احمر'' کے لئے چندہ جمع کرنے میں بڑی سرگرمی سے کام لیا، وہ غیر ملکی مال کے بائیکاٹ کے بھی حامی تھے/ مولوی انور شاہ بھی اس سازش میں شریک تھے وہ مولانا محمود حسنؒ

کے ہمراہ حجاز جانے والے تھے۔لیکن مولانا محمود حسنؒ نے اپنے ہندوستان میں قیام کرنے پر با صرار انہیں روک دیا۔(تحریک شیخ الہند حصہ دوم صفحہ ۳۱)

حضرت شیخ الہندؒ کے سامنے تقسیم کار کا یہ وہی طریقہ تھا جو حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے اختیار فرمایا تھا، انہوں نے حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ کو انگریزوں کے خلاف مسلح جدو جہد کے لئے مامور کیا اور شاہ محمد اسحاق دہلویؒ کو درس وتدریس اور تعلم وتعلیم کی مسند تفویض فرمائی تھی/ تا کہ علمی اور سیاسی دونوں محاذوں کو تقویت پہنچتی رہے، برطانوی سامراج کے خلاف یہ اسپرٹ ہمیشہ علماء دیو بند میں بیدار رہی ہے اور انگریزی حکومت کی مخالفت میں دیو بندی علماء کا ایک طبقہ ہمیشہ پیش پیش رہا ہے/ سامراجی استحصال کے خلاف آواز بلند کرنے اور مسلمانوں میں تحریک آزادی کی روح پھونکنے کی پاداش میں علماء دیو بند نے قید وبند کی مصیبتوں کو برداشت کیا ہے اور اس طرح مردانہ وار اس کا مقابلہ کیا ہے کہ راہ حق سے کبھی ان کے قدم نہیں ڈگمگائے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں برادران وطن کے دوش بدوش مسلمانوں کے شریک ہونے کی راہ ہموار کی/ اس زمانے میں مسلمان بحیثیت ایک قوم کے کانگریس میں شریک نہ تھے/ کچھ لوگوں کو شرکت کے جواز میں شبہ تھا اور کچھ لوگوں کا یہ خیال تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں سے بہت کم ہے/ تعلیم اور دولت میں بھی مسلمان ہندوؤں سے پیچھے ہیں۔اس لئے اگر مسلمان کسی متحدہ جماعت میں شریک ہونگے تو ان کی ہستی پامال ہو جائے گی/ اسی خیال کا نتیجہ تھا کہ عرصے تک مسلمانوں کی پالیسی یہ رہی کہ مسلمانوں کو الگ رہ کر جماعتی تنظیم کرنی چاہئے۔

جمعیۃ علماء کے آٹھویں سالانہ اجلاس میں جو دسمبر ۱۹۲۷ء میں حضرت شاہ صاحبؒ کی زیر صدارت پشاور میں منعقد ہوا تھا اس عظیم الشان اور تاریخی اجلاس کے صدر کی حیثیت سے انہوں نے اپنے بصیرت افروز خطاب میں جہاں متعدد اسلامی مسائل پر بحث کی ہے وہیں مسلمانوں کو برادران وطن کے ساتھ شریک کار ہو کر ملکی سیاست میں پوری سرگرمی اور جوش عمل کے ساتھ جدو جہد کرنے کی پر زور تلقین فرمائی ہے اور مسلمانوں کو جرأت مندانہ طور پر تحریک آزادی میں حصہ لینے کی ہدایت کی ہے/ اس سلسلہ میں شاہ صاحبؒ نے آنحضرت ﷺ کے اسوۂ حسنہ سے استدلال کیا ہے اور اس معاہدے سے، جو حضور اکرم ﷺ نے ہجرت کے فوراً بعد مدینہ منورہ کے یہودیوں سے کیا تھا، یہ ثابت کیا ہے کہ ملک کے دفاع کے لئے اگر مسلمان غیر مسلم جماعتوں کے ساتھ مل کر سیاسی جدو جہد میں حصہ لیں گے تو ان کا یہ عمل صرف

سیاسی نوعیت کا نہ ہوگا بلکہ اسلام کے تقاضوں کے مطابق بھی ہوگا، اپنے خطبہ صدارت میں حضرت شاہ صاحبؒ نے اس رہنما اصول کی جانب خاص توجہ دلائی ہے کہ کسی حکومت سے آزادی عطا کئے جانیکی ہرگز توقع نہیں رکھنی چاہیے اس لئے کہ آزادی عطا نہیں کی جاتی بلکہ وہ طاقت سے حاصل کی جاتی ہے۔

معاہدۂ مدینہ کا حوالہ دیتے ہوئے شاہ صاحب نے فرمایا کہ:

''معاہدہ کا یہ موضوع بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کا پورا پورا احترام کرے اور ایک دوسرے کی جان و مال عزت و آبرو پر حملہ آور نہ ہو، ایذا دہی کو حرام سمجھے اور اپنے مذہب پر عمل کرنے میں آزاد ہو/ مگر دوسروں کی دل آزادی نہ کی جائے۔'' (خطبہ صدارت صفحہ ۸)

ہندوستان سے مسلمانوں کے تعلق کی گہرائی کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ہندوستان جس طرح ہندوؤں کا وطن ہے اسی طرح مسلمانوں کا بھی وطن ہے/ ان کے بزرگوں کو ہندوستان آتے ہوئے اور رہتے ہوئے صدیاں گزر گئی ہیں/ ہندوستان کے چپے چپے پر مسلمانوں کے شوکت کے آثار موجود ہیں/ جو زباں حال سے مسلمانوں کی، وطن سے محبت کی شہادت دیتے ہیں مسلمانوں کی موجودہ نسل کا تو خمیر ہی ہندوستان کی آب و گل سے بنا ہے/ اس لئے مسلمانوں کو ہندوستان سے ویسی ہی محبت ہے جیسی کہ ایک سچے محب وطن کو ہونی چاہیئے۔'' (خطبہ صدارت صفحہ ۱۹)

مختلف الخیال لوگوں کو مشورہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

''مختلف العقائد آبادی میں صلح اور نباہ کا ایک ہی راستہ ہے کہ ہر مذہب کے معتقد اپنے مذہبی عقائد و اعمال کی بجا آوری میں آزاد ہوں اور کوئی فریق دوسرے فریق کی آزادی میں خلل انداز نہ ہو لیکن یہ ضروری ہے کہ اپنے اعمال کو اسی انداز سے بجا لائے کہ دوسرے کو تکلیف نہ پہنچے اور اس کے حقوق میں دست اندازی نہ ہو'' (خطبہ صدارت صفحہ ۳۰)

خطبے کے آخر میں حضرت شاہ صاحبؒ نے مسلمانوں کے اجتماعی تقاضوں کا جایزہ لیا ہے/ چنانچہ ہندوستان میں دارالقضاء کے فقدان اور اس کی شرعی حیثیت پر بحث کرتے ہوئے بتایا ہے کہ بہت سے ایسے امور ہیں جن میں شرعی فیصلے کی ضرورت ہے/ اور دارالقضا کے بغیر وہ نافذ اور جائز نہیں ہو سکتے/ نکاح و طلاق اور خلع و میراث کے بہت سے معاملات ہیں جن کے جاری اور نافذ کرنے کے

لئے علماء کے ہاتھوں میں طاقت کا ہونا ضروری ہے اور اس کا واحد حل دار القضا کا قیام ہے۔

شاہ صاحبؒ نے خطبے میں اصلاح رسوم کے عنوان سے ان امور کی جانب بھی توجہ دلائی ہے جن کے مسلم معاشرے میں جڑ پکڑ لینے سے مسلمان معاشی اور اقتصادی پریشانیوں میں گھر گئے ہیں، ان میں شادی اور غمی کی قبیح رسمیں لڑکیوں کی شادی پر تلک لینے کی رسم/ سود پر قرض حاصل کرنا/ اوقاف کی تنظیم وتحفظ اور اوقاف کی آمدنی کا صحیح استعمال وغیرہ امور شامل ہیں۔

غرضیکہ شاہ صاحبؒ کے خطبۂ صدارت میں نہ صرف ملک کے سیاسی مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے بلکہ مسلم معاشرے کے معاشی اور اقتصادی مسئلے پر مسلمانوں کو غور وفکر کی دعوت دی گئی ہے/ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے جو چیزیں ضروری ہوسکتی تھیں ان سب کا پوری بصیرت کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے/ اس لئے شاہ صاحب کا یہ خطبہ ایک بڑی قیمتی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

۱۹۳۰ء میں جب گاندھی جی نے نمک پر لگائے گئے محصول کے خلاف اپنی تحریک شروع کی تو انہیں شاہ صاحبؒ کی رہنمائی سے بڑی مدد ملی تھی/ اس کی تفصیل یہ ہے کہ نمک پر لگائے گئے محصول کے خلاف عوام میں بڑی بے چینی پائی جاتی تھی، اس محصول کو ختم کرانے کے لئے گا ندھی جی نے ایک مستقل تحریک چلائی اور اس کے لئے گجرات کا دورہ شرع کیا، اس دورے کی آخری منزل گجرات کا ڈانڈی نامی گاؤں تھا، اس لئے یہ دورہ ڈانڈی مارچ کے نام سے موسوم ہے/ گاندھی جی نے اس تحریک کا آغاز تو کر دیا تھا مگر ان کی دلی خواہش یہ تھی کہ ان کے اس عمل کے لئے مذہبی اور اخلاقی جواز ہونا چاہیئے، گاندھی جی کا معمول یہ تھا کہ وہ اپنے ہر کام کے لئے ہردے یعنے ضمیر کی آواز کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے جس کو وہ اپنے الفاظ میں "ہردوے کی آواز" سے تعبیر کیا کرتے تھے/ چنانچہ اس موقع پر بھی گاندھی جی ذہنی خلش محسوس کر رہے تھے اور ہردے کی آواز کے منتظر تھے کہ انہیں اخبارات کے ذریعے یہ اطلاع ملی کہ ہندوستان کے ایک ممتاز عالم حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ نے لاہور میں "انجمن خدام الدین" کے سالانہ جلسے میں تقریر کرتے ہوئے پیغمبر اسلام ﷺ کی ایک حدیث بیان کی ہے جس میں تین چیزوں پانی، گھاس، اور نمک کو مباح الاصل بتایا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی حکومت پانی/ گھاس اور نمک پر ٹیکس نہیں لگا سکتی۔

اس زمانے میں شاہ صاحبؒ کا قیام گجرات کے مدرسہ ڈابھیل میں تھا/ گاندھی جی

ڈانڈی کی جانب مارچ کرتے ہوئے جب ڈابھیل کے قریب سے گزرے تو حضرت مولانا حفظ الرحمان صاحب سیوہارویؒ اور مولانا مفتی عتیق الرحمان صاحب عثمانیؒ گاندھی جی سے ملنے اور مارچ میں شریک ہونے کے لئے پہنچے/ گاندھی جی کو معلوم تھا کہ یہ دونوں حضرات شاہ صاحبؒ کے شاگرد ہیں/ گاندھی جی نے انہیں دیکھ کر کہا کہ ''آپ لوگوں کے استاد مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ نے نمک کے متعلق جو حدیث بیان کی ہے آپ اس حدیث کا انگریزی میں ترجمہ کرا کر مجھے دے دیں/ جب یہ حدیث گاندھی جی نے دیکھی تو انہیں بڑی خوشی ہوئی اور بولے کہ میں نے نمک سازی کے لئے جو تحریک شروع کی ہے اسکے لئے میں چاہتا تھا کہ مجھے کوئی روحانی اور باطنی مدد ملنی چاہیئے/ اس کے لئے مجھے بڑی بے چینی تھی/ میرا ہردا اطمینان کی تلاش میں بے چین تھا/ اب مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیری کی بیان کردہ حدیث سے معلوم ہوا کہ میرے اس کام کو پیغمبر اسلام ﷺ کی تائید حاصل ہے اور میرے ساتھ ایک بڑی روحانی اور آسمانی امداد شریک ہے اب مجھے اپنے کام کی سچائی کا پورا یقین ہو گیا ہے۔

گاندھی جی اس کے بعد اس حدیث کا ترجمہ شاہ صاحبؒ کے حوالے سے اپنے انگریزی اور ہندی اخبار ''ینگ انڈیا'' اور ''نوجیون'' کے پہلے صفحے پر شایع کرتے رہے۔

اگرچہ شاہ صاحبؒ کو اپنی علمی اور درس وتدریس کی مصروفیتوں کے سبب سے عملی طور پر سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے اور سیاسی میدان میں تگ وتاز کا موقع نہ مل سکا مگر وہ اپنی دانش وتدبیر اور فکر ونظر سے ہندوستان کے سیاسی قائدین کی ہمیشہ رہنمائی فرماتے رہے، جمعیۃ علماء ہند کے علاوہ مجلس احرار اسلام کے رہنماؤں کو بھی ہمیشہ شاہ صاحب کی فکری بصیرت اور سرپرستی حاصل تھی اور جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے کہ جمعیۃ علماء ہند کے صدر حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب جمعیۃ علمائے ہند کے اجلاسوں کو اس وقت تک کامیاب نہیں سمجھتے تھے جب تک شاہ صاحب شریک نہ ہوں۔

ہندوستان کے نامور مجاہدین آزادی:

مولانا ظفر علی خانؒ	مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ
مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ	چوہدری افضل حقؒ
مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ	مولانا نور الدین بہاریؒ
مولانا عبدالحنان ہزارویؒ	قاضی احسان احمد شجاع آبادیؒ

اجتہاد اور حضرت علامہ کشمیریؒ

مولانا عبدالرشید بستوی
مدرس حدیث شریف، جامعہ امام انور شاہ، دیوبند

اجتہاد کی ضرورت اور ثبوت:

یہ بات بالکل واضح ہے کہ شریعت کے تمام جزئی مسائل کتاب وسنت میں منصوص اور مصرح نہیں ہیں، پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر کہہ ومہہ اپنی کوتاہ عقل اور محدودتر علم کی روشنی میں ان جزئیات کی تخریج اور استنباط کرنے سے قاصر ہے، علاوہ ازیں زندگی کا پہیہ رواں دواں ہے اور یہ عمل صبح قیامت تک جاری رہے گا۔ اس لیے اجتہاد اور کتاب وسنت کے نصوص کی روشنی میں غیر منصوص مسائل کا استنباط واستخراج ایک فطری اور ناگزیر ضرورت ہے، چناں چہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ دونوں سے اجتہاد کی ضرورت وافادیت معلوم ہوتی ہے اور ارشاد بانی ہے:

اذاجاء هم امر من الامن او الخوف اذاعوابه ولو ردوه الى الرسول والى اولى الامر منهم لعلمه الذين ليستبطونه منهم (القرآن)

ترجمہ: اور جب ان عوام الناس کے پاس امن یا خوف کا کوئی امر آتا ہے تو اسے شائع کردیتے ہیں اگر وہ اسے رسول اللہ اور اپنے میں سے اولی الامر (مجتہدین) کی طرف لوٹاتے تو ان میں سے اہل استنباط اس کا حکم معلوم کرلیتے۔

اس آیت سے جہاں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ غیر منصوص اور پیش آمدہ نئی بات رسول خدا اور آپ ﷺ کے بعد اہل استنباط علماء کے سامنے رکھی جائے اور اس کی بابت ان سے دریافت کیا جائے وہیں یہ حقیقت بھی اجاگر ہوتی ہے کہ ہر شخص استنباط کی صلاحیت سے بہرہ ور نہیں ہوتا اور نہ اس میں غیر منصوص امور کی بابت استخراج کی صلاحیت ہوتی ہے۔ امام فخر الدین رازی علیہ الرحمہ اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں لکھتے ہیں:

الا يته دالته على امور: احدها ان فى احكام الحوادث مالا

يعرف بالنص بل بالا ستنباط، ثانيها ان الا ستنباط حجة، وثالثها ان العامي يجب عليه تقليد العلماء في احكام الحوادث (تفسير كبير: ۳/۲۷۳، مطبوعه مصر)

ترجمہ: یہ آیت چند امور پر دلالت کرتی ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ نئے پیش آمدہ امور کا حکم نص سے معلوم نہیں ہو پاتا، بل کہ وہ استنباط سے معلوم ہوتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ استنباط واجتہاد شرعی حجت ہے اور تیسرا یہ کہ نئے پیش آمدہ حالات ومعاملات میں عوام پر اصحاب اجتہاد علماء کی اتباع لازم ہے۔

حضرت معاذ بن جبلؓ کی معروف حدیث، امام ابوداؤد اور امام ترمذی وغیرہ متعدد محدثین نے تخریج کی ہے، جس سے نہ صرف یہ کہ اجتہاد کی اجازت معلوم ہوتی ہے، بل کہ یہ بھی عیاں ہوتا ہے کہ یہ عین منشائے شریعت اور مستحسن امر ہے حضرت معاذ بن جبلؓ فرماتے ہیں:

ان رسول الله ﷺ لما بعثه الى اليمن قال: كيف تقضي اذا عرض لک قضاء قال: اقضي بكتاب الله، قال فان لم تجد في كتاب الله؟ قال: بسنته رسول الله، قال: فان لم تجد في سنته رسول الله؟ قال: اجتهد برأي و لا آلو، قال: فضرب رسول الله ﷺ على صدري و قال: الحمد لله الذي و فق رسول الله لما ير ضى به رسول الله" (الحديث)

ترجمہ: جب اللہ کے رسول اللہ ﷺ نے مجھے یمن بھیجا تو فرمایا اگر کوئی معاملہ تمہارے سامنے آئے تو تم اس کی بابت کس طرح فیصلہ کرو گے؟ میں نے عرض کیا کتاب اللہ سے۔ فرمایا اگر تمہیں اس کا حکم کتاب اللہ میں نہ ملے تو؟ عرض کیا سنت رسول اللہ سے۔ فرمایا اگر سنت رسول اللہ میں بھی نہ ملے تب کیا کرو گے؟ عرض کیا اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھوں گا۔ یہ سن کر آپ ﷺ نے میرے سینہ پر ہاتھ مارا اور فرمایا اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اپنے رسول کے قاصد کو اس امر کی توفیق بخشی جو اس کے رسول کی مرضی کے عین مطابق ہے۔

اجتہاد کے لیے مطلوبہ صلاحیت:

نئے پیش آمدہ معاملات کی بابت شرعی حکم کا استنباط ایک اہم دینی خدمت ہے، تاہم اگر اس کا دروازہ ہر کس نا کس پر کھول دیا جائے تو شریعت بازیچۂ اطفال بن جائے گی، لہٰذا کتاب و سنت کی نصوص، حضرات صحابہ و تابعین کے آثار وارشادات کے تحت بالغ نظر فقہائے امت نے اجتہاد کے لیے کچھ ضروری شرائط طے کیں اور مجتہد کے لیے چند بنیادی صلاحیتوں کا حاصل ہونا ضروری قرار دیا جس کا خلاصہ ذکر کرتے ہوئے حضرت علامہ فخر الاسلام علی بن محمد بزدوی (متوفی ۴۸۲ھ) تحریر فرماتے ہیں:

"اما شرطه بان یحوی علم الکتاب بمعانیه، و علم السنته بطر قها و متونها وو جوه معانیها، وان یعرف وجوه القیاس" (کنز الوصول الی معرفة الاصول: ص ۲۷۸، مطبوعه مصر)

ترجمہ: اجتہاد کی شرط یہ ہے کہ وہ شخص کتاب اللہ کے معانی ومفاہیم کے علم، نیز حدیث نبوی اس کی مختلف سندوں، عبارتوں، معانی کے مختلف احتمالات کے علم کا جامع ہو، نیز اسے قیاس کے بھی مختلف گوشوں کا علم ہو۔

عہد صحابہ میں بھی ہر شخص اجتہاد کی مطلوبہ صلاحیت کا حامل نہ تھا؛ بل کہ اکثر صحابہ کرام وفات نبوی کے بعد بیش تر پیش آمدہ معاملات میں چند ایک صحابہ سے ہی رجوع کرتے اوران کے بتائے ہوئے حکم پر عمل کرتے تھے۔ یہی صورت حال تابعین اور تبع تابعین کے عہد میں بھی باقی رہی اور لوگ مختلف مواقع پر حسب سہولت مختلف فقہاء علماء سے مسئلہ معلوم کر کے اس پر عمل کرتے رہے۔

چار فقہی مسالک میں انحصار:

تاہم مشیت الٰہی کے بموجب ایک وقت گزرنے کے بعد بہت سے فقہاء ومحدثین کے فقہی مکاتب فکر ختم ہوگئے اور صرف چار فقہی مسلک رہ گئے؛ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ لکھتے ہیں:

"ولما اندر ست هذه المذاهب الحقة الا ربعة کان اتباعها اتباعا للسواد الاعظم والخروج عنها خروجها عن السواد الاعظم" (عقد الجید: ص: ۳۸)

ترجمہ: جب یہ برحق مسالک ختم ہو گئے اور صرف چار فقہی مسلک رہ گئے تو ان کی اتباع سواداعظم کی اتباع قرار پائی اور ان سے خروج سواداعظم سے خروج مانا گیا۔

لہٰذا اب ان ہی چار فقہی مسالک کی تقلید و اتباع ضرور قرار پائی اور ان سے خروج بدعت اور دین سے خروج قرار پایا، جیسا کے علامہ ابن حجر مکیؒ شافعی رقم طراز ہیں:

"اما فی زمـانـنـا فقال ائمتنا: لا یجوز تقلید غیر الائمة الاربعة: الشافعیؒ، ومالک، وابی حنیفه، و احمد بن حنبل

ترجمہ: بہر حال ہمارے زمانے میں تو ہمارے ائمہ بالا تفاق فرماتے ہیں کہ ائمہ اربعہ شافعی، مالک، ابوحنیفہ اور احمد بن حنبل کے سوا کسی کی تقلید جائز نہیں۔

آگے ارقام فرماتے ہیں:

"من كـان خـارجـاعـن هـذا الاربـعة فـی هذا الزمان فهو من اهل البدعة و النار" (حوالہ مذکور)

ترجمہ: جو شخص اس زمانے میں ان چاروں مسالک سے باہر ہو وہ بدعتی اور جہنمی ہے۔

حضرت علامہ کشمیریؒ کی علمی شان عبقریت:

حضرت علامہ کشمیریؒ کی قوت حافظہ ضرب المثل، علم نہایت وسیع، مطالعہ بے پناہ اور گہرا، دینی و عصری یا قدیم و جدید کوئی علم ایسا نہ تھا، جس پر علامہ کشمیریؒ کی محققانہ نظر اور وسیع مطالعہ نہ ہو، چنانچہ معروف محقق عالم مولانا مناظر احسن گیلانیؒ فرماتے ہیں:

"اسلامی علوم وفنون کے دائرے کا شاید ہی کوئی علم یا فن ہوگا جس سے شاہ صاحبؒ کو دلچسپی نہ تھی اور ہر ایک علم وفن کے اصولی مسائل کے متعلق کوئی خاص تحقیقی نظر وہ نہ رکھتے ہوں۔ بلکہ عہد حاضر کے کارآمد علوم کے صحیح معلومات کا بھی کافی ذخیرہ ان کے پاس موجود تھا۔ خصوصا ہیئت (اسٹرانومی) کی جدید اصطلاحات کا انھوں نے تحقیقی وتفصیلی مطالعہ کیا تھا"۔

(علامہ انور شاہ کشمیریؒ اپنی ہشت پہلو شخصیت کے آئینے میں، تالیف: مولانا عبدالرشید بستوی، ص:۳۰۷، مطبوعہ دیوبند)

عالم اسلام کے محقق عالم، ترکی کے سابق نائب شیخ الاسلام علامہ زاہد الکوثری مصری نے علامہ کشمیریؒ کی بعض کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ان الفاظ میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا:

"لم يات بعد الشيخ ابن الهمام مثله في استشارة الابحاث النادرة من ثنايا الاحاديث" (التصريح بماتو اتر في نزول المسيح، ص: ٢٦، كلمات من ثناء العلماء الاكابر عليه)

ترجمہ: فتح القدیر کے مصنف حضرت علامہ ابن الہمام کے بعد سے اب تک ایسی کوئی شخصیت نہیں گزری جو احادیث کے ذخیرے سے نادر تحقیقات پیش کرنے میں انور شاہ کی مثال ہو۔ شاعر مشرق ڈاکٹر محمد اقبالؒ حضرت علامہ کشمیریؒ کی علمی جامعیت کے بے حد معترف اور قدر دان تھے۔ علامہ کشمیریؒ کی وفات کے بعد لاہور کے ایک تعزیتی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا: "اسلام کی آخری پانچ سو سالہ تاریخ مولانا انور شاہ کشمیری کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔ ایسا بلند پایہ عالم اور فاضل جلیل اب نہ پیدا ہوگا۔ وہ صرف جامع العلوم قسم کی ایک شخصیت ہی کے مالک نہیں تھے بلکہ عصر حاضر کے دینی تقاضوں پر بھی ان کی پوری نظر تھی۔ جس طرز پر فقہ کی تدوین میرے پیش نظر تھی اس کے لئے مناسب شخصیت ان کے سوا عالم اسلام میں کوئی نہ تھی"۔ (مقدمہ انوار الباری مولفہ مولانا احمد رضا صاحب بجنوریؒ: ۲/۲۴۵، ثنا اکابر و اماثل)

علامہ کشمیری اور اجتہاد:

ان چند نادرۂ روزگار علماء و محققین کی شہادتوں اور بیانات سے حضرت علامہ کشمیریؒ کی علمی جامعیت اور شان عبقریت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، لیکن اس کے باوجود علامہ کشمیریؒ اپنے لئے بھی اجتہاد مطلق یا اجتہاد فی المذہب درست نہیں سمجھتے، اور نہ خود کو اس کا اہل گردانتے تھے۔ بلکہ حیرت ہے کہ وہ ہر علم وفن میں اپنی الگ رائے رکھتے تھے اور جداگانہ تحقیق، مگر فقہ میں وہ کوئی رائے نہیں رکھتے تھے بلکہ امام اعظم ابوحنیفہؒ کے مقلد تھے، چناں چہ ایک بار خود ہی فرمایا:

"الحمد للہ! میں کسی فن میں کسی کا مقلد نہیں ہوں، ہر فن میں میری مستقل رائے ہے، بجز فقہ کے، کہ فقہ میں میں کوئی رائے نہیں رکھتا۔ صرف امام اعظمؒ کا مقلد

ہوں، ہر فن کی اساسی شخصیتوں پر اور ان کے افکار پر میرے تعقبات ہیں، جنہیں میں پیش کروں تو سلیم الفکر ان کا انکار نہیں کریں گے"۔ (نقش دوام، مولفہ حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیریؒ، ص: ۱۴۴، بیعت و خلافت، مطبوعہ دیوبند)

علامہ کشمیریؒ کی مجتہدانہ صلاحیت اور استنباطی بصیرت کی بابت شہادت بھی ملاحظہ کر لیجیے۔ مصر کے مشہور محدث اور بخاری و مسلم کے حافظ اور بلند پایہ عربی ادیب حضرت علامہ علی الحنبلی ہندوستان آئے، دارالعلوم دیوبند میں تین ہفتے قیام کیا، اس دوران حضرت علامہ کشمیری سے برابر استفادہ کرتے رہے، ایک روز طلبہ واساتذہ کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"ولو خلفت انه اعلم من ابی حنیفة لما حنثت" (الانور، از جناب عبدالرحمٰن کو ندو، ص: ۹۷، حضرت شاہ صاحب اور علامہ علی حنبلی)

ترجمہ: اگر میں قسم کھالوں کہ انور شاہ کا علم ابوحنیفہ سے بڑھا ہوا ہے تو حانث نہیں ہوں گا۔

علامہ کشمیری اور توفیق و تطبیق:

جیسا کہ تحریر کیا جا چکا ہے کہ اپنی تمام تر علمی جامعیت کے باوجود وہ فقہ میں سو فیصد امام ابوحنیفہ یا فقہ حنفی کے مقلد تھے۔ تاہم وہ نئے حالات و معاملات سے یکسر آنکھیں بند کئے ہوئے بھی نہ تھے اور نہ ہی حوادث ونوازل کی بابت، کتاب وسنت کی نصوص اور متقدمین ائمہ وفقہاء کی فقہی تصریحات اور اصول کی روشنی میں ان کے شرعی احکام کے استخراج کی ضرورت کے منکر تھے۔ دراصل وہ فی زمانہ اجتہاد کا دروازہ ہر کس و ناکس اور ہر ایک مسئلے میں کھولنے کے روادار نہ تھے۔ علامہ کشمیریؒ نے تاہم جملہ دینی علوم وفنون بالخصوص تفسیر وحدیث کی خدمت کے ساتھ فقہ حنفی کی بھی زبردست خدمت کی۔ لیکن وہ اس حوالے سے لکیر کے فقیر نہ تھے۔ بلکہ ان کی نظر بڑی وسیع اور عمیق تھی۔ علامہ کشمیریؒ کی تالیفات، درسی افادات اور تحقیقات وتفردات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ متعارض احادیث اور ائمہ مجتہدین کے اختلافی مسائل میں دو اصول کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے تھے:

۱۔تطبیق بین الاحادیث المتعارضۃ
۲۔توفیق بین اقوال الائمۃ المختلفۃ
۱۔تطبیق بین الاحادیث المتعارضۃ:
مقالہ کی تنگ دامانی کے سبب،اس ذیل میں صرف اکی مثال ذکر کرنے پر اکتفا کیا جارہا ہے:
''مرد کے لئے اپنا عضو مخصوص پکڑنا اور چھونا ناقص وضو ہے یا نہیں؟ اس کی بابت بظاہر روایات میں تعارض ہے، حضرت بسرہ بنت صفوانؓ کی روایت ہے کہ نبی پاک ﷺ نے فرمایا''من مس ذکرہ فلا یصل حتی یتوضا'' (ترمذی شریف، جلد اول، باب الوضوء من مس الذکر) ترجمہ: جس نے اپنا عضو مخصوص چھوا تو وہ نماز نہ پڑھے، یہاں تک کہ وضو کر لے۔ اس مضمون کی روایات بعض دیگر صحابہ وصحابیات سے بھی مروی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مس ذکر ناقص وضو ہے، جب کہ حضرت قیس بن طلق بن علیؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا''ھل ھوا الابضعتہ منہ او مضغتہ منہ''
(حوالہ ء بالا، باب ترک الوضوء من مس الذکر)
ترجمہ: عضو مخصوص بھی انسان کے جسم کا ایک حصہ ہی ہے، یا فرمایا گوشت کا ایک ٹکڑا ہے۔ کئی ایک صحابہ کرام سے بھی اس مضمون کی روایات وآثار منقول ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مس ذکر ناقض وضو نہیں ہے۔ حضرت علامہ کشمیریؒ نے ان متعارض روایات میں تطبیق دی ہے اور ہر ایک کا الگ محل اور مصداق متعین کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ مس ذکر سے نقض وضو کا حکم خواص امت کے لئے ہے ان کو چاہیے کہ مس ذکر کے بعد وضو کرلیں؛ لیکن یہ حکم عوام کے لیے نہیں ہے ان کے لیے مس ذکر ناقض وضو نہیں۔ فرماتے ہیں کہ ایسی دیگر مثالیں بھی شریعت میں ہیں۔ (ملاحظہ ہو معارف السنن، از مولانا محمد یوسف بنوری، جلد اول، ص:۲۹۵، مطبوعہ کراچی)
۲۔توفیق بین اقوال الائمۃ المختلفۃ:
بہت سے مسائل میں ائمہ مجتہدین کے درمیان شدید قسم کے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ایسے مختلف فیہ مسائل میں فقہ حنفی میں بعض اوقات کئی ایک اقوال نظر آتے ہیں۔ خود امام

ابوحنیفہؒ سے بھی بسااوقات ایک ہی مسئلہ میں ایک سے زیادہ آراء ملتی ہیں اور بعض اوقات ان کے مشہور تلامذہ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کی رائے امام صاحبؒ سے مختلف ہوتی ہے۔ متاخرین فقہائے احناف نے ان مختلف آراء واقوال میں ترجیح کے اصول طے کیے اور کسی قول کو راجح اور کسی کو مرجوح قرار دیا۔ علامہ کشمیریؒ ایسے مسائل میں امام صاحب یا امام ابو یوسفؒ وامام محمدؒ کے اس قول کو ترجیح دیتے ہیں جو دوسرے ائمہ مجتہدین کے اقوال سے قریب تر اور ان کے مطابق ہوں۔ اس کی بھی بے شمار مثالوں میں صرف ایک مثال بیان کرنے پر اکتفاء کیا جارہا ہے:

ظہر کا وقت کب ختم ہوتا ہے اور عصر کا وقت کب شروع ہوتا ہے اس کی بابت ائمہ اربعہ کے درمیان اختلاف ہے۔ امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک مشہور روایت کے مطابق ظہر کا وقت مثل اول تک رہتا ہے، مثل اول کے بعد عصر کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔ یعنی ہر چیز کا سایہ جب سایہ اصلی کو چھوڑ کر اس کے برابر ہو جائے تب تک ظہر کا وقت ہے اور جب اس کے برابر سے بڑھ جائے تو عصر کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔ جب کہ امام ابوحنیفہؒ سے اس کی بابت چار اقوال منقول ہیں:

۱۔ ظہر کا وقت مثلین تک رہتا ہے یعنی جب تک کہ ہر چیز کا سایہ، اس کے دو مثل کے برابر ہو جائے۔ اس کے بعد عصر کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔

۲۔ ظہر کا وقت مثل اوّل سے زیادہ اور مثل ثانی سے پہلے پہلے تک رہتا ہے۔

۳۔ ظہر کا وقت مثل اوّل پر ختم ہو جاتا ہے، مثل اوّل کے بعد مثل ثالث تک کا وقت، وقت مہمل ہے، نہ ظہر کا وقت ہے اور نہ ہی عصر کا۔

۴۔ ظہر کا وقت صرف مثل اوّل تک ہے، اس کے بعد عصر کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔

علامہ کشمیریؒ نے ان اقوال اور ائمہ اربعہ کے اقوال میں اس طرح جمع کیا ہے، فرماتے ہیں کہ پوری تحقیق اور مکمل غور و خوض کے بعد میرے نزدیک یہ بات منقح ہوئی کہ مثل اوّل تک کا وقت نمازِ ظہر کے لیے مخصوص ہے اور مثل ثالث عصر کے لیے خاص ہے، جب کہ مثل ثانی دونوں کے درمیان وقتِ مشترک ہے۔ چنانچہ بعض دیگر فقہا اور امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ بھی متعدد صورتوں میں اسی کے قائل ہیں۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، معارف السنن جلد دوم، بیان التوفیق بین روایات الامام، وتحقیق ثبوت القول باشتراک وقت الظہر عن الائمۃ، ص: ۱۲، ۱۳، مطبوعہ کراچی)

قرآن کریم اور

حضرت علامہ انور کشمیریؒ

مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی، دہلی

حضرت علامہ کشمیریؒ کو خداوند عالم کی طرف سے نقلی اور عقلی علوم میں جو گہری بصیرت اور کمال تبحر عطا کیا گیا تھا اس میں وہ اپنے دور کے رازی غزالی اور ابن حجر سے کم نہیں تھے۔

خصوصیت کے ساتھ حضرت علامہؒ کو تفسیر قرآن میں فہم و بصیرت کا جو وافر حصہ ملا تھا اس میں بھی وہ اپنے دور کی ممتاز علمی شخصیت تھے۔ حضرتؒ کو خدا کے مقدس کلام سے گہرا عشق تھا، اور اگر وہ کسی کتاب کے جلال و جمال کی عظمت سے حد درجہ مرعوب نظر آتے تھے تو وہ کتاب العزیز ہے۔ مولانا مناظر احسن صاحب گیلانیؒ جیسا محدث کشمیری کا صاحب علم و فضل شاگرد اپنے استاد کے بارے میں یہ تاثر رکھتا تھا کہ قرآن عزیز کی غیر معمولی عظمت و جلالت حضرت علامہ کے لئے حجاب بن گئی تھی جس کی وجہ سے مرحوم قرآن پر بے تکلف ہو کر غور و فکر نہیں کر سکتے تھے بلکہ ادب و احترام کے ساتھ حد درجہ محتاط ہو کر توجہ فرماتے تھے۔

قرآن حکیم کے ساتھ آپ کو اس درجہ والہانہ عشق تھا کہ جس وقت آپ قرآن کی تلاوت فرماتے تو اس کے حسن تعبیر پر وجد و شوق میں جھومنے لگتے۔

عمر کے آخر حصہ میں حضرت محدث کشمیریؒ کی توجہ قرآن حکیم کی طرف زیادہ ہو گئی تھی/ آپ فرمایا کرتے تھے کہ مشکلات حدیث سے زیادہ مشکلات قرآن توجہ کے طالب ہیں/ ماہ رمضان المبارک میں آپ کی عادت یہ تھی کہ صبح سے شام تک نہایت غور و فکر کے ساتھ قرآن حکیم کا صرف ایک پارہ تلاوت فرماتے تھے اور اس طرح پورے رمضان میں صرف ایک قرآن پاک ختم ہوتا تھا۔ تفسیر علوم میں اعجاز القرآن کے علم کو بہت مشکل مانا گیا ہے اس سلسلہ میں یہ مقولہ مشہور ہے:

لم یدر اعجاز القران الا الاعرجان احدهما بزفخشر واخر هما بجرجان ۔ اس پر شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے وثالثهما انا یعنے اعجاز قرآن کے دو بڑے

ماہر زمخشری اور جرجانی گذرے ہیں مگران میں تیسرا ہیں ہوں اور یہ حقیقت تھی کہ یہ علم آپ کا وہبی او رلدنی تھا اسی مناسبت سے حضرت علامہ شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلوی کے اردو ترجمہ کے ساتھ خاص شغف رکھتے کیونکہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ کے قول کے مطابق شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ الہامی ہے جو کسی دوسرے انسان کے بس کا کام نہیں چنانچہ حضرت محدثؒ نے ایک سال پورے امضان شاہ عبدالقادر صاحب کے موضح قرآن پر غور وفکر میں گذارا۔

قرآن پاک کے بعض غالی عقیدت مندوں نے قرآن کریم کے بارے میں یہ عقیدہ پھیلا رکھا ہے کہ قرآن میں سب کچھ ہے عربی کا مشہور مقولہ ہے۔

جمیع العلم فی القران لکن

تقاصر عنه افهام الرجال

یعنی قرآن پاک میں تمام علوم موجود ہیں لیکن لوگ اسے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس قسم کی خوش عقیدگی سے قرآن پاک کی عظمت زیادہ ہوتی ہے حالانکہ ایسا نہیں، بلکہ اس طرح سطحی باتوں سے قرآن کریم کے بارے میں غلط فہمیوں کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

مولانا مناظر احسن گیلانی نے لکھا ہے کہ پہلے علماء میں ملاجیون استاد عالم گیر اورنگ زیب جیسے صاحب فضل عالم نے تفسیرات احمدیہ میں یہ لکھ دیا:

فما من شیئی الا یمکن استخراجه من القران

یعنی کوئی چیز ایسی نہیں جس کا قرآن پاک سے استنباط ممکن/نہیں ہر چیز کو قرآن میں سے نکالا جاسکتا ہے۔ اس تفسیر کے محشی نے اس پر مزید اضافہ کرتے ہوئے یہاں تک لکھ دیا کہ جبرو مقابلہ، مساحت، سوت کاتنے، لوہا کوٹنے کپڑا بننے اور کھیتی کرنے کے مسائل بھی قرآن پاک سے نکالے گئے ہیں۔

موجودہ صدی کو سائنس کی صدی کہا جاتا ہے اس صدی میں سائنس کی ترقی سے متاثر ہوکر بعض ایسی تفسیریں بھی لکھی گئیں جنمیں سائنس کے نظریات و اکتشافات کو قرآن پاک سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔

ڈارون کے نظریہ ارتقا کا ثبوت بعض مسلمانوں نے قرآن پاک سے پیش کرنے کی کوشش کی جس طرح بعض عیسائی علماء نے انجیل سے اس نظریہ کی تائید تلاش کی تھی۔ ابھی حال میں پاکستان کے ایک سائنسدان نے جوش عقیدت کے اندر سورۂ یوسف کی آیت قال تزرعون

سبع سنين دابا فما حصدتم فذروہ فی سنبلہ سے غلہ واناج کو محفوظ رکھنے کا کامیاب طریقہ مستنبط کرنے کا دعوی کیا۔ امریکی سائنسداں جب چاند پر اترے تو بعض لوگوں نے قرآن پاک سے چاند پر انسان کے اترنے کا ثبوت پیش کرنا شروع کر دیا۔

حضرت محدث کشمیریؒ تفسیر، حدیث اور فقہ وکلام میں ایک ماہر عالم ہونے کے ساتھ ساتھ قدیم وجدید فلسفہ پر بھی گہری نظر رکھتے تھے/ مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادیؒ نے لکھا ہے کہ ملک کے مشہور فلسفی شاعر ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم نے حضرت محدث کشمیریؒ کے متعلق ایک موقعہ پر فرمایا تھا:

''حدوث عالم پر مولانا انور شاہؒ کا رسالہ پڑھ کر میں دنگ رہ گیا کہ رات دن قال اللہ اور قال الرسول سے واسطہ رکھنے کے باوجود فلسفہ میں بھی ان کو اس درجہ درک و بصیرت ہے۔''

اس کے باوجود حضرت شاہ صاحب اس غالیانہ عقیدت کی پرزور تردید فرمایا کرتے تھے کہ قرآن میں سب کچھ ہے اور اوپر والے شعر کو کسی غبی اور بےوقوف آدمی کا شعر قرار دیا کرتے تھے۔

سنجیدہ علمی حلقوں کی طرف سے اگر چہ اس غلوعقیدت کی کبھی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی لیکن پرزور طریقہ سے اس تصور کی اصلاح شاہ صاحبؒ کے حلقہ درس میں کی جاتی تھی۔ شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ بلاشبہ قرآن میں سب کچھ ہے مگر وہ سب کچھ اس کے موضوع ومقصد کے دائرہ میں ہے۔

قرآن کریم کا مقصد اصلی انسان کو فوز وفلاح کی راہ پر چلانا ہے اور بے شک ایک کامیاب نظام زندگی کے تمام اصول وکلیات مکمل طور پر قرآن پاک میں موجود ہیں اور یہی اس کا مقصد نزول ہے یہ خوش فہم لوگ جس قسم کی آیات سے استدلال کرتے ہیں ان میں سے دو آیتیں حسب ذیل ہیں:

الانعام میں کہا گیا ہے: ولا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین (۵۹)
اور نہ کوئی ہری چیز اور نہ کوئی سوکھی چیز مگر وہ سب کتاب مبین میں موجود ہے۔
النحل میں فرمایا گیا ہے: ونزلنا علیک الکتاب تبیانا لکل شیی (۸۹)
اور اتاری ہم نے تجھ پر کتاب، کھلا بیان ہر چیز کا۔

محققین علماء نے لکھا ہے کہ کتاب مبین سے مراد لوح محفوظ ہے اور لکل شی ء سے مراد قرآن کریم کے مقصد نزول سے متعلق وہ تمام کلیات واصول ہیں جو ایک کامیاب زندگی کی بنیاد ہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ بعض منکرین حدیث کی طرف سے پھیلائی جانے والی اس غلط فہمی کا

بھی پوری طرح رد فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کریم ایک آسان کتاب ہے اور اسکا مطلب وہ لوگ یہ لیتے ہیں کہ قرآن پاک کے مطالب کو سمجھنے کے لئے ہادیٔ قرآن ﷺ کی سنت و سیرت کی کوئی ضرورت نہیں، اس سلسلہ کی مشہور آیت یہ ہے: **ولقد یسر نا القرآن للذکر فھل من مدکر (القمر)** اور ہم نے قرآن کو یاددہانی کے لئے آسان کردیا ہے پس ہے کوئی جو اس سے زیادہ یاددہانی حاصل کرے۔

شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ اس آیت میں قرآن کریم کے آسان ہونے کا مطلب یہ ہے کہ مالک حقیقی کی مرضیات کے مطابق زندگی گزارنے کا جو طریقہ قرآن پاک کے اندر بیان کیا گیا ہے وہ بالکل صاف، روشن اور واضح ہے۔ ایک عربی اپنی عربی دانی سے اور ایک عجمی ترجمہ کی مدد سے عقائد و اعمال اور تمام بنیادی باتیں بآسانی سمجھ سکتا ہے جو فلاح دارین کے لئے ضروری ہیں اگر کوئی شخص قرآن پاک کے حقائق و رموز تک رسائی حاصل کرنا چاہے تو اسے بھی لغت و محاورات اور ہادی اسلام ﷺ کے اقوال و افعال کا صحیح علم حاصل کرنا پڑے گا۔

تفسیر کے بارے میں ایک طبقہ اس قدر روایت پسند واقع ہوا ہے کہ کسی مفہوم و مطلب کی تائید میں جب تک انہیں کوئی تفسیری روایت نہیں ملتی وہ اسے تفسیر بالرائے قرار دیتے ہیں/ حضرت شاہ صاحبؒ اس خیال کی تردید فرمایا کرتے تھے/ فیض الباری میں حضرت شاہ صاحبؒ نے علماء علوم کے براہ راست قرآن کریم پر غور و فکر کرنے کی ترغیب دی ہے/ تا کہ **لا تنقضی عجائبہ** کی صداقت قیامت تک ظاہر ہوتی رہے۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ تفسیر بالرائے وہ تفسیر ہے جو دین کے اساسی تصورات اور متواتر عقائد و اعمال کے خلاف ہو۔ پھر فرماتے ہیں:

من حجر علی العلماء ان لا یرزو ا معانی الکتاب بعد معان فی السیاق والسباق الیٰ حقائق الالفاظ المراعیة عقائد السلف من ذالک تفھم من الکتاب فانھم ھم الذین ینظرون فی عجائبہ یکشفون الاستاد عن وجوہ

اہل علم کو کس نے روکا ہے کہ وہ کتاب اللہ کے معانی و مطالب کو سیاق و سباق الفاظ قرآن کے اقتضاء اور سلف صالحین کے عقیدہ کی رعایت رکھ کر بیان نہ کریں/ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کتاب اللہ میں اہل علم کا حصہ یہی ہے کہ کتاب اللہ کے نئے نئے پہلوؤں پر غور کر کے اس کے پوشیدہ اسرار و رموز سے پردہ اٹھائیں۔

حضرت علامہ کشمیریؒ کا ذوق سخن گوئی

مولانا محمد ابراهیم ، اسلام آباد کشمیر

کامل شعر و ادب انور شہہ کشمیر بود
زاں سبب ما بہر او این محفلی بر پا کنیم
مرد عالم بو د فاضل، بود مرد نکتہ دان
ماز و صف او کمال خویش را انشا کنیم

فارسی زبان کی مشہور کہاوت ہے ''شعر مرا بمدرسہ کے بردند'' اس مقولے کے پیش نظر علماء اور شاعری دو متضاد شے خیال کی گئی ہیں/ غالبا ایسا اس لئے ہے کہ شعروسخن کے متعلق علماء کا نقطۂ نظر قنوطی، خشک اور بے لچک ہے/ علم تقشف اور عبوسیت کا مقتضی ہے جبکہ شعروسخن رندی وسرمستی اور بہت حد تک آزادروی کے خواہاں ہیں/ علماء کی شعروسخن سے منافرت کی ایک وجہ غالبا یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دینی انہماک انہیں اتنی مہلت نہیں دیتا کہ کبھی کبھار کتاب دل کا کھولکر مطالعہ کرسکیں/ فقہی جزئیات اور مسائل میں الجھاؤ کم از کم ذوق سخن کے حق میں رکاوٹ ضرور بن جاتے ہیں/ شاعر ایک خیالی انسان ہوتے ہیں اپنی ایک ایسی خیالی دینا آباد کرتا ہے جو اصلی وحقیقی دنیا سے بدر جہا بہتر اور خوب صورت ہوتی ہے لیکن زندگی کی یہ سمیائی تصور پر علم کے لئے نا قابل برداشت ہے/ وہ تو ظاہر کا دلدادہ ہے اور باطنیت اسے ایک آنکھ نہیں بھاتی علاوہ ازیں علماء کرام قال اللہ وقال الرسول سے اتنی فرصت نہیں پاتے کہ کتاب دل کی طرف توجہ کرسکیں/ اس موقف کے اختیار کرنے کے سلسلے میں غالبًا علماء کے روبرد شعروشاعری کے متعلق قرآنی مذمت بھی رہتی ہوگی/ علامہ اقبالؒ نے اپنے اس مشہور شعر کے ذریعہ۔

نہ فلسفی سے نہ ملا سے ہے غرض مجھ کو
یہ دل کی موت وہ اندیشہ ونظر کا فساد

عالم کو فساد نظر اور اندیشہ کہا تھا/ لیکن میرے خیال میں دل کی موت میں فلسفی اور ملا دونوں شریک ہیں/ دونوں کے جذبات لطیفہ سرد اور بے کیف ہوتے ہیں غالباً اسی حقیقت کے پیش نظر کسی عالم نے کہا تھا۔

ولولا الشعر با لعلماء یزری
لکنت الیو م اشعر من لبید

یعنی اگر شعر وسخن علماء کے لئے معیوب نہ ہوتے تو آج میں لبید سے بھی زیادہ بڑا شاعر ہوتا۔ (لبید سبعہ معلقہ کا سب سے تعلق اور گہرا شاعر ہے)

کیف علماء دین کے شعر وسخن سے منافرت کے جو بھی اسباب ہوں یہ ایک امر وقعی ہے کہ مولانا وبالفضل اولینا حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ اس کلیہ سے ضرور مستثنیٰ تھے/ آپ اگر ایک طرف دور حاضر کے جید عالم دین/ مصنف، مفکر، زاہد ومتقی اور کامیاب مفسر ومحدث اور استاد تھے تو وہیں ذوق سخن بھی استاذ ازل کی طرف سے ساتھ لائے تھے۔

حضرت مولانا انور شاہ صاحب مرحوم نے مذہبی اور دینی علم کی طرح ذوق سخن بھی ورثہ میں پایا تھا، بقول ڈاکٹر قاری رضوان اللہ مولانا کے والد ماجد مولانا معظم اور تین بھائی محمد یاسین شاہ/ مولانا سیف اللہ شاہ اور عبداللہ شاہ فارسی کے اچھے اور قادر الکلام شاعر تھے ایک طرف مولانا کی طبع رسا اور دوسری جانب گھریلو ماحول دونوں مل کر شعر وسخن کے حق میں سونے پر سہاگہ بن گئے/ اسی لئے ہم مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ کو فاضل دینیات وقرآن وحدیث کے ساتھ ساتھ فاضل ادب وشعر بھی پاتے ہیں/ آپ کے یہاں الفاظ کا ذخیرہ وافی وکافی اور ذہن رسا تھا/ مولانا کو قرآنی آیات، احادیث نبوی اور فقہی جزئیات کے ساتھ ساتھ عربی و فارسی زبانوں کے بیشتر اشعار ازبر تھے/ موزونیت طبع کا یہ عالم تھا کہ طویل سے طویل منظومات فی البدیہہ اور بے ساختہ آپ کی زبان گوہر فشاں سے منظوم ہوجایا کرتی تھیں۔

مولانا کی شاعری کا بیشتر حصہ عربی وفارسی میں ہے/ عربی میں طبع رواں کا یہ حال تھا کہ ۱۹۲۷ء میں جب والئی دکن نظام حیدرآباد دہلی تشریف لائے تو مولانا نے پندرہ اشعار کا ایک عربی قصیدہ فی البدیہہ منظوم کردیا، یہ قصیدہ ۲۱ دسمبر ۱۹۲۷ء کے اخبار مہاجر میں دہلی میں شائع ہوا، آپ کا ذوق ادب اور سخن اس قدر شدید تھا کہ بقول مولانا ازہر صاحب ۱۳۴۰ھ میں شیخ الادب مولانا اعزاز علی امروہوی مرحوم نے نادیۃ الادب کے نام سے دارالعلوم دیوبند میں ایک ادبی انجمن قائم کی جس

میں اساتذۂ دارالعلوم دیو بند اور اہل ذوق اپنا کلام بلاغت نظام پیش کرتے تو مولانا بلا استثناء اس محفل کے میر مجلس ہوا کرتے تھے/ خود بھی اشعار قلم بند کرتے اور دیگر اہل ذوق کو بھی ایسا کرنے کی ترغیب دیا کرتے تھے، ایسے بہت کم حضرات ہونگے جو مولانا قاضی زین العابدین سجاد میر ٹھی کے نام سے ناآشنا ہوں/ موصوف علمی حلقوں میں مثنوی مولانا روم اور دیوان حافظ کی اردو شرح کے ذریعہ کافی زیادہ نام پیدا کر چکے ہیں/ مولانا کے زمانے میں قاضی صاحب دارالعلوم دیو بند میں طالب علم تھے/ ان ہی دنوں اتفاق سے مسیح الملک حکیم اجمل خاںؒ دار فنا سے دار بقا کو سدھار گئے تھے/ عالم اسلام خصوصا مسلمانان ہند غم میں ڈوب گئے تھے/ انھوں نے حکیم صاحب کی وفات حسرت آیات پر عربی میں ایک طویل مرثیہ لکھا۔ اس کی اصلاح مولانا انور شاہ صاحبؒ نے کی اور بہت سے اشعار اپنی طرف سے خود بھی داخل کر دئے۔

ایک موقعہ پر قادیان کے مولویوں کی طرف سے اعلان ہوا کہ وہ علماء دیو بند سے عربی زبان میں مناظرو مباحثہ کریں گے/ علماء دوڑ کر حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ کے پاس آئے اور انہیں اس فرقے کے علماء کے مقابلہ پر آنے کی درخواست کی/ مولانا نے ان علماء کا چیلنج نہ صرف قبول کر لیا بلکہ فرط جوش میں آکر کہا کہ یہ مناظرہ نثر میں نہیں بلکہ نظم میں ہوگا، واقعہ کے راوی مولانا محمد انوری لائل پوریؒ رقمطراز ہیں کہ اس فرقے کے علماء سن کر میدان سے ہٹ گئے۔

ذوق سخن کے ساتھ ہزاروں اشعار زبانی یاد تھے جنہیں تقریر و تحریر میں مناسب اور بر جستہ پیش کر دیا کرتے تھے/ زبان و بیان کا حسن دو بالا ہو جاتا تھا، اس پر ترنم غضب کا پایا تھا سوز وگداز جلا تھی ترنم اور حسن آواز کی بدولت شعر شراب دو آتشہ ہو جاتا تھا/ جس میں سے سرور کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی/ ادبی ذوق کے پیش نظر عبارتیں بھی مقفی و مسجع زبان درفشاں سے نکلتی تھیں/ اس چیز کے پیش نظر مولانا نے حریری کی مقامات کے تتبع میں اپنی مقامات لکھی تھی جسمیں کچھ مقامات بے نقط اور کچھ بانقط الفاظ کے تھے/ الفاظ پر عبور اور مہارت کے پیش نظر بیسویں صدی میں مولانا دور اکبری کے مشہور شاعر و عالم فیضی و فیاضی کی یاد تازہ کر دی تھی جس نے قرآن پاک کی بے نقط تفسیر ''سواطع الالہام'' کے عنوان سے لکھ کر اپنی بے مثال عربی دانی کا آج تک سکہ بٹھا رکھا ہے، ایک اندازہ کے مطابق پندرہ ہزار سے زیادہ اشعار موزوں کئے لیکن دستیاب اتنے نہیں ہیں اس تعداد سے گیارہ سو پچپن اشعار عربی کے اور باقی کا تعلق فارسی سے ہے۔

عربی تنظیم کے سلسلے میں اگر چہ مولانا کا رجحان موعظہ و پند، اخلاقیات و دینیات کے

موضوعوں کی طرف ہے/ تاہم طبیعت کا اصلی جوہر نعوت ختم المرسلین میں کھلتا ہے/ اس سلسلہ میں آپ نے ہیئت اور موضوع کے بہت سے قیمتی اور بیش بہا تجربے کئے ہیں اور نئی بحور اور اوزان اختیار کر کے عربی شعر وادب کے دامن کو وسیع کیا ہے کہیں قدیم اساتذہ کا اتباع ملتا ہے خاص طور پر شیخ مصلح الدین سعدی شیرازیؒ کا، چنانچہ مولانا کی ایک نعت شیخ کے اس مشہور ومعروف شعر پر مبنی ہے۔

شفیع مطاع نبی کریم — قسیم جسیم نسیم وسیم

اسی زمین میں مولانا کے اشعار ملاحظہ ہوں۔ (بحر متقارب مقبوض ہے)

صبیح ملیح مطیب الشمیم — غیاث الوری مستغاث الھضیم
مفاض الجبین کبدر مبین — قسیم جسیم نسیم وسیم
احید وحید مجید حمید — وخیر البریا بفضل جسیم
واسری بہ ربہ فی السماء — کنور تجلی بلیل بھیم
واتاہ ما شاءہ من علا — وعزیز حیاۃ قویم
فیا رب صل وسلم علیہ — شفیع مطاع نبی کریم

ترجمہ:

۱- آپ خوب صورت، حسین اور عمدہ خوشبو والے ہیں، مخلوق کی جائے پناہ اور ٹوٹے ہوئے کی فریاد کو پہنچنے والے۔

۲- چودہویں رات کے روشن چاند کی طرح کشادہ پیشانی والے خوبصورت، حسین عمدہ جسم والے اور صاحب نشان۔

۳- یگانہ و یکتا عمدہ اور قابل تعریف اور خدا کی شاندار مہربانی سے تمام مخلوق کے بہتر۔

۴- آپ کا پروردگار آپ کو آسمانوں میں راتوں رات لے گیا اس نور کی طرح جو کالی رات میں چمکے۔

۵- اور اپنی منشا کے مطابق آپ کو بلندی، عزت اور قائم رہنے والی زندگی عطا کی۔

۶- اے پروردگار آپؐ پر درود اور سلام بھیج، کیونکہ آپ سفارش کرنے والے قابل اطاعت عزت والے پیغمبر ہیں۔

لغت مذکور چوبیس اشعار کی ہے اور ہم نے یہاں بطور اختصار صرف چھ اشعار پر اکتفا

کیا ہے ایک اور عربی لغت ۴۷ اشعار پر مشتمل ہے اس میں نبی اکرمؐ کی ذات والاصفات سے جس والہانہ عقیدت ومحبت کا اظہار کیا گیا ہے، وہ بہت کم نعتیہ قصائد میں ملتی ہیں یہاں چند اشعار بطور مشتے نمونہ از خروارے پیش کئے جاتے ہیں ملاحظہ ہوں:۔

برق تالق موھنا بالوادی	فاعتاد قلبی طالع الامجاد
شمس الضحی بدر الدجی صدر العلی	علم الھدی ھو قدوۃ للقادی
ختم النبوۃ والرسالۃ انھا	بدئت بہ ختمت بہ لمعاد
والا فصح الامی اصدق لھجۃ	ممن تکلم با للسا ن الضاد
وافی شھید منذرا و مشیرا	من ربہ با لوعد والایعاد
تدجاء والدنیا علے ظلما تھا	والجھل والیؤس علی اعتاد
فتحت بہ غفلت القلوب وبصرت	عمی العیون بسنۃ وسداد

ثم الصلوۃ مع السلام علے النبی
والہ مع صحبہ الامجاد

ترجمہ:

۱- ہدایت کی بجلی رات کے وقت وادی میں چمکی جس کا میرا دل جو بلندیوں پہ چڑھا ہے عادی ہوگیا۔

۲- آپ چاشت کے سورج ، اندھیروں میں چودھویں رات کے چاند بلندیوں کے صدر ،ہدایت کے جھنڈے اور رہنماؤں کے رہنما ہیں۔

۳- آپ نے نبوت اور رسالت کو ختم کر دیا یقیناً وہ آپ ہی سے شروع ہوئی اور قیامت تک آپ ہی پر ختم ہوگئی۔

۴- باوجود امی ہونے کے بہت بڑے فصیح یعنے اعلی بیان تھے اور ان تمام لوگوں میں حرف ض کا تلفظ کرتے ہیں سب سے زیادہ صادق القول۔

۵- آپ بحیثیت گواہ/ ڈرانے والے اور خوش خبری دینے والے کے اپنے رب کی طرف سے وعدے اور وعید کو پورا کر دیا۔

۶- آپ ایسے وقت تشریف فرما ہوئے جب دنیا تاریکیوں میں مبتلا تھی اور جہالت اور سختی کے باعث لوگ سرکشیوں پر آمادہ تھے۔

۷- پھر درود اور سلام نبی، آپ کی اولاد اور صحابہ کرام پر ہو۔

مولانا کی عربی شاعری میں نعت کے بعد جس موضوع نے خاص طور پر اہمیت حاصل کی ہے وہ فقہی اور دینی مسائل ہیں/ مولانا کا عہد پنجاب میں ایک جدید مذہبی فرقے کی نشو ونما سے لگا کھاتا تھا، پنجاب اور ہندوستان اس وقت مذہبی مباحث کی گرفت میں شدت سے مبتلا تھا ہر طرف سے ختم النبوت کی صدائیں بلند تھیں ایک اچھے اور کامیاب سخن گو کی طرح آپ بھی اپنے ماحول سے دامن نہ چھڑا سکے/ اسی پس منظر میں آپ نے "صدع النقاب عن جساسة الفنجاب" کے عنوان سے ستر اشعار کا ایک قصیدہ قلم بند کیا ہے جس میں ختم نبوت کے مسئلے کو دلائل و براہین سے عالمانہ انداز میں بیان کیا ہے، مذہبی مباحث کے سلسلے میں ایک اور نظم "ضرب الخاتم علی حدوث العالم" لکھی جو چار سو اشعار کی ہے اور جس میں حدوث عالم، وحدت الوجود، اثبات واجب، جعل بسیط اور جعل مرکب سے عالمانہ و فلسفیانہ بحث کی گئی ہے۔

ایک اور صنف سخن جس پر حضرت شاہ صاحب نے خصوصیت کے ساتھ طبع آزمائی کی، مرثیہ ہے، یہ مرثیہ خیالی نہیں عملی ہے/ ۱۳۳۹ھ میں جب حضرت شاہ صاحبؒ کے شفیق استاد شیخ الہند حضرت محمود الحسن دیوبندیؒ کا انتقال پر ملال ہو گیا تو ایک وفادار شاگرد کی حیثیت سے آپ نے شیخ الہندؒ کا فصیح و بلیغ عربی میں ایک دردناک مرثیہ لکھا جو ۷۴ اشعار پر مشتمل ہے، مرتبہ کی خوبی یہ ہے کہ اس سے شیخ الہندؒ کی تاریخ وفات بھی مستفاد ہوتی ہے اس سے حقیقت نگاری اور اس شدید جذبے کا پتہ لگتا ہے جو آپ کو اپنے استاد سے تھا۔

قفابنک من ذکری مزار فند معا
مصیفا ومشتی ثم مرأی و مسمعا
قد اختفه الالطاف عطفا وعطفة
وبورک فیه مربعا ثم مربعا
وان کان مما لیس یشفی ویشتقی
بشیئی ولکن خل عینیک تدمعا
نهضت لأرثی عالما ثم عالما
حدیثا وفقها ثم ما شئت اجمعا
ومولی الوری محمود هم وحمیدهم

ومسندهم فيما روى ثم اسمعا
ولم ارمثل اليوم كم كان باكيا
وما كان دمع القوم دمعا مضيعا
سقى الله مثواة كرامةديمة
وكان غدا الى شافعا ومشفعا

ترجمہ:

۱- اے میرے دوودوستو! ٹھہر جاؤ ہم مزار کی یاد میں آنسو بہالیں/ گرمیوں میں بھی اور سردیوں میں بھی/ غائبانہ بھی اور آنکھوں کے سامنے بھی۔

۲- اس قبر کو الطاف خداوندی نے مہربانی سے چھپالیا ہے اور ہر موسم بہار میں ان میں برکت دی جاتی ہے۔

۳- اگرچہ مرحوم پر یہ غم کسی چیز سے شفا نہیں دے گا تاہم تو اپنی آنکھوں کو آنسو بہاتا چھوڑ دے۔

۴- میں اس لئے اٹھا کہ ایک عالم اور عالم، محدث، فقیہہ اور ان کے علاوہ جو بھی وصف چاہے گا مرثیہ کروں۔

۵- ان کا محمود مخلوق کا آقا اور پسندیدہ تھا/ مسموع اور روایتی چیزوں میں ان کی سند۔

۶- میں نے آج جیسا کوئی دن نہیں دیکھا جس میں کتنے رونے والے تھے اور اس دن رونے والوں کے آنسو بیکار نہیں گئے۔

۷- خدا اس کے ٹھکانے کو سخاوت کی بارش سے سیراب کرے جو کل کو روز قیامت میری شفاعت کرے گا اور یہ شفاعت قبول بھی ہوگی۔

عربی کے بعد فارسی کی نوبت آتی ہے ان کی دستیاب تعداد ۱۳۲۹ اشعار ہے ان میں تین نعتیں اور تین قطعات شامل ہیں/ علاوہ ازیں کچھ تاریخیں بھی ہیں جو مولانا نے بعض جلیل القدر ہستیوں کی وفات حسرت آیات پر لکھی ہیں اور جن سے مادۂ تاریخ وفات نکلتا ہے/ کچھ قصائد عمائدین اسلام کی مدح میں ہیں/ ایک قصیدہ امیر امان اللہ خان والیٔ کابل کی تعریف میں ہے اور ۱۱۵ ابیات پر مشتمل ہے/ کچھ منظومات فقہی و دینی مسائل پر ہیں خاص طور پر علم میراث نے آپ کی طبع شاعرانہ سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے۔

مولانا کے کلام کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ شعر وسخن میں خیال آرائی کے بجائے

واقعیت اور حقیقت نگاری کو پسند کرتے تھے/ ان کے نزدیک شعر دل بہلائی نہیں بلکہ مفید مطلب باتیں کرنے کا نام ہے/ یہی وجہ ہے کہ آپ ان کے یہاں ایسے موضوعات پر طبع آزمائی بکثرت دیکھیں گے جن کی اہمیت سماجی ہے/ حضرت مولینا انور شاہ صاحب بنیادی طور پر عالم دین تھے/ شاعری کی طرف وہ دوسرے درجہ پر آئے تھے/ یہی وجہ ہے کہ آپ ان کے کلام میں ایسے رجحانات پائیں گے جن کی حیثیت مذہبی اور دینی ہے ادیب اور شاعر اپنی فطری اور ذہنی افتاد طبع سے بے نیاز نہیں رہ سکتا/ مولانا بھی اس کلیہ سے مستثنی نہیں ہیں/ آپ کے شاعرانہ کلام میں نثر کی طرح دینیات اور فقہی مسائل کی گہری چھاپ ہے/ یہ بات ان کے آرٹ اور فن کے حق میں زیادہ اچھی ثابت نہ ہوسکی، کیونکہ فقہی جزئیات جس عمدگی سے نثر میں بیان ہوسکتے ہیں، شعر کی قبا ان سب کے لئے کسی قدر تنگ ہے/ شاید مطالعہ کنندگان کو وہ لطف وشیرینی محسوس نہ ہو جو عموماً غزل گو شعراء کے کلام سے ہوتی ہے/ ایسا ہونا ایک فطری امر ہے کیونکہ دینی مسائل اور فقہی جزئیات جام وساقی پیانہ اور صراحی کی گرفت سے یکسر باہر ہیں/ مولانا نے ان مضامین کو شعر وسخن کے قالب میں اس لئے ڈھالا تا کہ یہ واضح کردیا جائے کہ وہ اس میدان کے بھی صحیح اور حقیقی معنوں میں مرد تھے۔

مولانا کی شاعری میں عشق ومحبت کی چاشنی قطعاً نہیں اس کے برعکس شریعت وطریقت کے ٹھوس مسائل کا بیان ہے ہمارے عربی اور فارسی شعراء جو قصائد کے آغاز میں کسی خیالی محبوب اور محبوبہ سے تشبیب یا اظہار عشق کے قائل ہیں اور راس کے بغیر لقمہ نہیں توڑتے ،مولانا روایتی شاعری کی ان جکڑ بندیوں سے قطعاً آزاد ہیں آپ نے عربی وفارسی شعر وادب کی قدیم روایت کو ترک کرکے اپنے لئے ایک نیا راستہ اختیار کیا اور وہ یہ کہ شعر وسخن کے رحمانی جذبے کو بے سود اور لا طایل خیالات میں صرف کرنے کے بجائے مفید مضامین میں لگایا، اسی میں آپ کے فن کی پختگی کا راز ہے/ مولانا نے اپنے کلام کے ذریعہ شاعری کو الفاظ کی مناسبت نشست/ تک بندی اور بے سود قافیہ پیمائی کے بجائے اسے با مقصد بنایا۔ غالباً اسی لئے آپ ان کے یہاں خیالات کے پیچ وخم کے بجائے سیدھا سادا اور فطری لب ولہجہ اور انداز بیان پائیں گے/ آپ نے وزن وقافیے کی قبا میں فقہی مسائل احادیث نبوی، دوست واحباء کے مراثی اور نعوت سرور کائنات علیہ التحیۃ والسلام منظوم کیں اور جو مقصد نثر سے لیا جاتا ہے، نظم سے لے لیا اور اس طرح شعر وسخن کی بنیاد تخیل کے بجائے واقعیت واصلیت پر رکھی۔

مولانا کی نعوت اور فارسی تاریخیں اکثر قدماء کے انداز میں ہیں اور اس طرح ان میں

متبعانہ پہلو زیادہ ہے/ مراثی میں بھی یہی کیفیت نمایاں ہے/ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ کے مرثیے میں ''قفا ںبک من ذکری مزار فندمعا'' کے الفاظ مشہور جاہلی شعراء امراء القیس کی یاددلاتے ہیں جس نے اپنے قصیدہ کا آغاز تقریباً ان ہی الفاظ سے تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ کیا ہے/ بلاشبہ مولانا کے عربی و فارسی کلام میں بالعموم تقلیدی رنگ نمایاں ہے/ تاہم کہیں کہیں جدید خیالات بھی مل جاتے ہیں/ اور اس وقت یقیناً مولانا کی قوت مخترعہ کی داد دینی پڑتی ہے/ چونکہ عربی و فارسی مادری زبان نہ تھی، ادبی مشغلہ اور مصروفیت کی زبان تھی، اس لئے کہیں کہیں الفاظ کی ثقالت ذوق سلیم پر گراں گزرتی ہے/ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ مولانا کا سارا کا سارا کلام اسی ڈھرّے پر چلتا ہے/ بعض مقامات پر عمدہ اور قیمتی خیالات اس طرح چمکتے نظر آتے ہیں جس طرح ریت میں چمکتے ہوئے ذرے۔

بہرکیف اس مختصر سے مقالے کی تحریر سے ہمارا مقصد یہ بتانا نہیں کہ حضرت علامہ انور شاہ صاحبؒ عربی و فارسی شعروسخن میں کس پائے کے شاعر تھے، بلکہ مقصود یہ بتانا ہے کہ باوجود عالم تبحر، محدث، فقیہہ اور مفسر ہونے کے شعروسخن کے کوچے سے بھی نابلد نہ تھے اور جس پر ثبوت ان کا کلام بلاغت نظام ہے۔

ہر بیشہ گماں مبر کہ خالی است
شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

مولانائے مرحوم نے اپنی عربی و فارسی نثر کے ذریعہ گیسوئے علم وادب کو سنوارا اور شعروسخن کے ذریعے بھی اسکی مانگ پٹی کرتے رہے/ جب کبھی ہندوستان میں عربی زبان وادب کی تاریخ لکھی جائے گی اس میں حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری علیہ الرحمۃ کا نام نامی جلی حروف سے تحریر ہوگا سچ ہے۔

لوگ آئیں گے بہت، انور سے ہوں گے کم بہت
جس کے نور علم سے عالم منور ہو گیا

آج بھی ہیں سینہ چاکاں اس کے غم میں چاک
چاک
اہل فن کا گریۂ و زاری مقدر ہو گیا

خوب رو لے دیدہ خونابہ اس کی یاد میں
جس کا ہر ہر لفظ ہر دل میں مصور ہو گیا

آج سونی سی پڑی ہے محفل شعر و ادب
وہ مہ تاباں کس مرقد کا بستر ہوگیا

کیوں نہ ہو کشمیر نازاں مہر عالم تاب پر
جس کے نغموں سے دماغ و دل معطر ہو گیا

آج بھی باطل سہم جاتا ہے اس کے نام سے
حق جب آیا دھر میں باطل مکدر ہو گیا

بعد مردن بھی تیرے نغمات ہی گاتے رہے
حال مجلس کا ترے جانے سے ابتر ہو گیا

آج ابراھیم کیوں نازاں نہ ہو تحریر پر
اس کا ہر ہر شعر اک ماہ منور ہو گیا

اخیر میں نا مناسب نہ ہوگا کہ اگر اس مقالے کا اختتام حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ کے آرٹ اور فن کے سلسلے میں اقبال کے اس شہرۂ آفاق شعر پر کیا جائے:۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پر روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

●□●
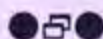
حضرت کشمیری کی سیاسی زندگی

مولانا انظر شاہ کشمیری

اسلام چودہ سو سال سے اس کائنات کا ایک متعارف مذہب، ایک جانا پہچانا دین اور ایک مانوس سرمایہ ایمان ہے اس کی اساسی و دعوتی بنیادوں میں قرآن وحدیث جناب رسول اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ، اصحاب النبی ﷺ کے تابناک کارنامے اور امت کے سربرآوردہ مجاہد طبقہ کی عزیمت پسندانہ عنوانات کی تفصیل طویل تاریخ میں بکھری ہوئی ہے جسے ہر وقت دیکھا اور پڑھا جاسکتا ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ جہاں آخری الہامی کتاب جس کا بنیادی وصف ''لاریب فیه'' ''تنزیل من رب العالمین'' یعنی الصحیفة المنزلة علی سید الکائنات محمد رسول الله ﷺ اس میں نوح وابراہیم، موسیٰ وعیسیٰ، زکریا و یحییٰ اور دوسرے مقدس ترین انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کے حالات عبرت انگریز وعبرت خیز کوائف کے ساتھ ہیں وہیں داؤد وسلیمان علیہما الصلوۃ والسلام کی تاریخ شہنشاہیت، طالوت وذوالقرنین کے جلیل کارناموں کی تفصیل بھی موجود ہے۔ کون داؤد وسلیمان؟ جو پیغمبر ہونے کے ساتھ ایک وسیع ترین حکمرانی کے فرمانروا، طالوت ایک سپہ سالار اور ذوالقرنین ایک عادل ومنصف بادشاہ۔ کیا آج کہا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید نے دین کے محکم و بنیادی خط وخال کو نمایاں کرنے کے ساتھ دنیائے سیاست اساسی اصول کو یکسر نظرانداز کردیا؟ اگر یہ دعویٰ کسی زبان پر آئے یا کوئی قلم اس کی تراوش کرے تو یہ قرآن مجید کو نہ سمجھنے کا سب سے بڑا اعلان ہوگا۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی حیات پاک کا وہ مقدس رخ بھی ہمارے سامنے ہے جس میں آپ ایک عابد وزاہد، مرتاض شب بیدار اور متقی

پاکباز کی حیثیت سے امت کے سامنے آئے اور پھر یہ بھی سامنے ہے کہ زندگی کی سنگلاخ وادی میں ایک باعزیمت قیادت کے ساتھ خدا جانے کتنے معرکے ہیں جن میں آپ نے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ظفر موج فوج کی رہنمائی کی اور شجاعت و بسالت کے نقوش صحیفۂ عالم پر ثبت فرمائے۔ پھر صحابہ کے مجاہدانہ کارنامے بلکہ شہ زور اہل علم کی سیاسی زندگی کے ابھرے ہوئے عنوانات اس امت کے تاریخ ساز مزاج کو سمجھنے و سمجھانے کے لیے کافی ہیں۔ میں آپ کو یہاں ابو حنیفہؒ کو سیاسی زندگی، احمد بن حنبلؒ کا ولولۂ حق، ابن تیمیہؒ کا نعرۂ جہاد کی تفصیل نہیں سناؤں گا سردست اسی داستان کے سرے کو پکڑتا ہوں جس کا تعلق ان ہی پاک طینت علماء سے ہے جو آپ کی اسی ہندوستان کی زمین پر اٹھے، ابھرے اور محمد رسول اللہ ﷺ کے دین سے اپنے غیر مشتبہ ہندوستان کی آخری حدود تک مسلم فاتحین کے باقاعدہ حملوں کا براہ راست تعلق محمود غزنوی علیہ الرحمہ سے ہوتا ہے پھر اس کے بعد کتنے ہی نامور خاندان ہیں جن کی فوجوں کے قدم اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے اس ملک کا گوشہ گوشہ آشنا ہے۔ آج بھی تاریخ میں دیکھا جاسکتا ہے کہ ہر کشور کشا کے ساتھ کبھی اہلِ علم کی جماعت، گاہے علماء ربانی کا ہجوم بلکہ اُن کی نقل و حرکت، زاہد و عُباد کی مخلصانہ جلو میں مسلسل ہوتی رہی لیکن خود اسلام کے تحفظ اس کی صیانت و حفاظت کا مجاہدانہ کارنامہ مجدد الف ثانی علیہ الرحمہ کی عزیمت سے وابستہ ہے۔ مغل حکمرانی کا درمیانی بادشاہ ''اکبر اعظم'' اپنی ذاتی زندگی یا ملکی پالیسی میں کتنا ہی صاف ستھرے دماغ کا انسان اور عمدہ صفات سے متصف ہو اور اس سے قطعاً انکار نہیں کہ ملک کے مختلف طبقات میں ہم آہنگی اور میل وتال پیدا کرنے میں اس کی کوششیں مشکور ہیں مگر اسلام سے مخاصمت و معاندت کا بھیانک کردار اس سے بندھا ہوا ہے وہ اس کی شورش دماغ کا ایک خوفناک پہلو ہے۔ سوال یہ ہے کہ ''اکبر'' اگر مذہبی رواداری کا علم بردرا تھا تو یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اس نے ہندوستان میں اپنی پالیسی سے براہ راست اسلام اور مسلمانوں کو ایک ایسی تباہی سے دوچار کرنا چاہا کہ اگر مجدد ہزارۂ دوم کی ایمانی کوششیں شدید مزاحمت نہ کرتیں تو اس پالیسی کے مہیب اثرات نہایت دوررس ہوتے۔ مجھے مجدد صاحبؒ کے ان تمام جلیل کارناموں کی تفصیل و داستان سنانا نہیں اس روشن باطن و روشن نہاد انسان سے متعلق ہندوستان کی مروج زبانوں میں تفصیلات اس قدر موجود ہیں جس سے اس ہزارۂ دوم کے حق پرست کی پوری زندگی اور روشن کارناموں کا مطالعہ بآسانی ممکن ہے۔

بتانا صرف یہ ہے کہ اکبری الحادوزیغ، شیخ مبارک، فیضی فیاضی، ابوالفضل اور اسی طرز

کے انسانوں کی شورہ پشتیوں اور کج دماغیوں کا موثر و کارآمد علاج یہی خدا کا مقدس بندہ اپنی خانقاہ سے کررہا تھا۔ غالباً ان حقائق سے کچھ پیشانیوں پر ناگواری کی شکنیں ابھر آئیں لیکن کیا کیجیے تاریخ کے ان وثائق کو نہ صفحات سے کھرچا جاسکتا ہے اور نہ ان پر عزیمت کارناموں کو مٹایا جاسکتا ہے۔ دانش وبینش سے تعلق رکھنے والے انسانوں سے یہ بھی سوال ہے کہ ''اکبر'' جس دل ودماغ کا انسان تھا اور جس ڈگر پر وہ کام کررہا تھا تلون مزاجی کی تیرہ وتار کائنات میں اس امکان کو کیوں بعید قرار دیا جاتا ہے کہ اس کی اسلام دشمنی کبھی ختم ہوتی اور وہ کسی دوسرے فرقہ ومذہب کے دشمنی کا رنگ اختیار کرجاتی تو اسلام کے علاوہ کسی دوسرے مذہب فرض کرلیجیے کہ اکثریتی فرقہ کے معتقدات سے اکبری تلاعب دنیا کے لیے پسندیدہ ہوتا؟ ظاہر ہے کہ مختلف مذاہب سے اس کی دلچسپی، متنوع مذاہب کے اجارہ اداروں سے اس کے قریبی روابط، ہر ایک کی بات سُننا اور ہر ایک سے اثر پذیر ہونا جب اس کا خاص مزاج تھا تو کیا یہ ناممکن ہے کہ کوئی چرب زبان اپنی ملمع کاری سے بآسانی اس کو کسی دوسرے رخ پر نہ ڈال لیتا۔

اگر ان ہی زوایا سے ہوشمند طبقہ اکبر کی پوری ذہنیت پر غور کرے تو ٹھیک ان نتائج پر پہنچے گا جن پر راقم السطور پہنچ کر ٹھہر گیا۔ بہر حال مجھے ''اکبر'' پرستوں کے فکر وذہن کو بدلنے اور ان کے ذہنی سانچوں کو توڑ کر نئے سانچوں میں ڈھالنے کی کوئی مہم پیش نظر نہیں جو کچھ قلم پر آگیا وہ ارتجالاً ہے۔

بات تو یہ چل رہی تھی کہ اسلامی تاریخ کے بنیادی عناصر یعنی اہل علم نے اور علمائے ربانی نے ان فتنوں کا مقابلہ کس طرح کیا اور ان کی کاوشیں کیا کچھ رنگ لائیں اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اگر ایک انسانی دل ودماغ امڈتے ہوئے سیلاب اور اچھلتے بڑھتے طوفانوں کا رخ بدل سکتا ہے تو حضرت مجدد ان عہد آفریں شخصیتوں میں ہیں جنھوں نے تاریخ کا دھارا بدلا ہے۔ الملک الجلیل سلطان محی الدین اورنگزیب عالمگیرؒ کا وجود گرامی اور ان کی مؤمنانہ بادشاہی پورے ہندوستان کے لیے خدائے ذوالمنن کا ایک احسان ہے مگر تاریخ کی چیرہ دستیاں کہ حضرت سلطان الجلیل کو ایک نہایت ہی غلط رنگ میں تیرہ باطنوں نے پیش کیا[۱] اور اور آج تک تاریخ کے اطراف وجوانب ان ہی غلط صداؤں کی بازگشت سے معمور ہیں جو ملک میں مختلف فرقوں میں یگانگت و مودت کے رنگین وحسین نغموں کے بجائے زہر چکائی کرنے والے انگریز دل ودماغ کی کاوش تھی۔ اس سے آگے بڑھئے جب یہ مغل حکمرانی ولیکن قلم در کف دشمن است، ابلیس حسین وجمیل ہے یا نہیں اور خواب اس کی یہ حسین جلوہ گری ان ہی طاغوتی قوتوں کا کرشمہ ہے جو اس ظالم کو خوب

حاصل ہیں۔ لیکن حضرت سلطان اورنگزیب عالم گیر علیہ الرحمہ کے ساتھ معاند مؤرخ کے قلم نے واقعتہً یہی بھیانک کام انجام دیا کہ اس خدا پرست بادشاہ کے خدو خال کو بگاڑ کر ظلم پیشہ وستم گیر انسان کی شکل میں ڈھال دیا اور یہ بھی عجیب سانحہ ہے کہ مدتوں سے کوئی اور نہیں خود ہندوستان کے اکثریتی فرقہ کے دانشور و مبصر ہی غلط فہمیوں کے تیرہ و تار بادلوں کو اپنے قلموں سے ہٹا رہے ہیں لیکن گھنگھور گھٹائیں کچھ اس طرح تہ بہ تہ محیط کر دی گئیں کہ فضا صاف ہونے نہیں پاتی۔ **لعل الله يحدث بعد ذالك امرا۔**

حضرت اورنگزیبؒ کے نااہل جانشینوں یا شاطر فرنگی کی شاطرانہ چالوں یا ہندوستان ہی کے نفاق پیشہ ننگ تاریخ انسانوں کی منافقانہ سازشوں کے نتیجہ میں چھن چھنا گئی اور ہندوستان اپنے اقتدار سے محروم ہو کر کلیتہً ایک غیر ملکی اقتدار کے آہنی پنجے میں پہنچ گیا تو صورت حال کی مرثیہ نگاری الامام الشہیر بولی اللہ الدہلوی اور ان کے خانوادہ کے ان ارباب ہمت کے حصہ میں آئی جن کی بلند تاریخ سے صفحات روزگار ہمیشہ جگمگاتے رہیں گے۔ شاہ صاحب کے حساس دل و دماغ اور ان کے علم ریز قلم نے جو کچھ کیا اور لکھا اس کی تفصیلات الحمد اللہ ضائع ہونے نہیں پائیں آج بھی اس عزیمت کے جلی و خفی عنوانات کو دیکھنے والے بسہولت دیکھ سکتے ہیں۔ متصلاً شاہ عبدالعزیز علیہ رحمہ اللہ کی سیادت، حضرت سید احمد شہیدؒ کا سفرِ جہاد، شاہ اسماعیل شہیدؒ کی رفاقت، مولانا عبدالحئیؒ بڑھانویؒ کی ہم نوائی، ایک حقیقت ہے جس کی تردید ممکن نہیں، ایک واقعہ ہے جسے غلط نہیں کہا جاسکتا، اسی خانوادۂ شرافت ونجابت کے خوشہ چینوں میں حضرت حجۃ الاسلام مولانا قاسم النانوتویؒ اور قطب الہند حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی ہیں جنہوں نے دلی کے اسی مدرسہ فکر میں مجاہدانہ زندگی کے طور و طریق کی تعلیم حاصل کی اور جب دلی پر فرنگی تسلط کی بناء پر اس مرکزی شہر میں بیٹھ کر لگائی ہوئی آگ کی چنگاریاں اطراف و جوانب میں پھیلانا ممکن نہ رہیں تو یہ دونوں داعی حق اس امانت کو لے کر ضلع سہارنپور کے مشہور قصبہ ''دیوبند'' میں پہنچ گئے گویا کہ حریت پسندی، استخلاص وطن، غیر ملکی اقتدار کو اکھاڑ پھینکنے کا جذبۂ بے اختیار اچانک دلی کی سرزمین سے دیوبند کی جانب منتقل ہو گیا اور اپنی خاص مساعی جمیلہ کو جن کا تمام تر تعلق ملکی آزادی کا حصول تھا علم و دانش کے حسین نقاب کے تحت جس انداز پر شروع کیا گیا اس کی پوری داستان ''دارالعلوم دیوبند'' سے وابستہ ہے۔ حضرت نانوتوی علیہ الرحمہ نے ایک ہمہ گیر تحریک کی بنیاد نئے تقاضوں کے مطابق جس انداز پر کی اور اس کاروان جہاد کو برابر پیش قدمی کے لیے جو سپہ سالار اعظم دیا اس کا نام نامی ''مولانا محمود

الحسن المعروف بہ شیخ الہند'' ہے علیہ رحمۃ اللہ ورضوانہ۔ فرق اتنا ہے کہ دماغ حضرت نانوتوی کا تھا اور آپ ہی کا فکر لیکن نئے حالات نئے ماحول اور نئی فضا میں حضرت شیخ الہندؒ نے ان آتشیں جذبات کو انگیٹھیوں میں مستور رکھنے کے بجائے شعلے ان دل و دماغ میں بھی منتقل کرنا شروع کردیئے جواب تک فرنگی ظلم واستبداد کی شدید گرفت کی وجہ سے کسی طشت از بام جدوجہد کا تصور نہیں کرسکتے تھے۔ یہ آپ ہی کا کارنامہ ہے کہ آپ کی دامن تربیت سے صرف فخر روزگار دانشمند تیار نہیں ہوئے بلکہ وہ حریت پسندی و جہاد آزادی کے سرفروش قافلہ کے قافلہ سالار بھی تھے۔ مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا کشمیری، مولانا شبیر احمد عثمانی وغیرہ اپنے استاذ کے باغیانہ خیالات وسیاسی افکار سے بقوۃ متاثر تھے۔

برطانوی سی، آئی، ڈی کا مرتبہ ریکارڈ جو حال ہی میں سامنے آیا اس میں صاحب سوانح حضرات شاہ صاحب کو حضرت شیخ الہند کی تحریک کا بنیادی شریک قرار دیا گیا ہے اور جو دارالعلوم کے اساسی محرکات پر مطلع ہے اس کے لیے ان شخصیتوں کی پیداوار اور خاص خیالات کے بارے میں کوئی تعجب کی بھی بات نہیں ہے۔ آپ مجھ ہی سے سن چکے ہیں کہ دارالعلوم درحقیقت ''خانوادۂ ولی اللہی'' کی وہ امانت تھی جسے ''دلی'' کے مکتبۂ فکر سے قریبی روابط رکھنے والوں نے بعض اہم مصالح کے ایک ایسا معسکر تھا جس کی مشین پوری تیزی کے ساتھ برطانوی اقتدار کے خلاف مسلسل پرزے ڈھال رہی تھی یہی نہیں بلکہ ''دیوبند'' کے قرب وجوار اور اس کے مضافات میں جو خانقاہیں تعمیر باطن کا کام کررہی تھیں ثقہ طور پر معلوم ہوا ہے کہ مادیٔ وطن تک ان میں خفیہ بیعت جہاد بھی لی جاتی تھی اور سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائپوری سے بیعت جہاد کرنے والوں میں مولانا حبیب الرحمٰن نومسلم سے اس حقیقت کی تصدیق خود راقم الحروف نے کی اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں باستثنائے ''خانقاہ تھانہ بھون'' ہر خانقاہ میں ان جذبات کی خاص پرورش ونگہداشت کی جاتی جن کا مقصد ''برٹش اقتدار'' کے خلاف ان جذبات پر مبنی تھا کہ ''تخت یا تختہ'' ان سطور سے ہرگز ہرگز یہ نہ سمجھا جائے کہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی دارالعلوم کے خصوصی افکار سے نامانوس تھے۔ چیرہ دستوں نے حضرت کی حیاۃ مبارک ہی میں ان پر منجملہ دوسرے الزامات کے برطانوی حکومت کا ''کاسہ لیس'' ہونے کا بھی ظالمانہ الزام عائد کرنے میں کوئی تامل محسوس نہیں کیا۔ حالانکہ مرحوم کی وہ تصانیف جو قبولیت عام حاصل کرکے گھر گھر پہنچ چکیں اگر صرف ان ہی کی رائلٹی ناشرین سے وصول کی جاتی تو جو کچھ ظلم پیشہ طبقہ انگریز

سے ملنے والی رقم بتا رہا تھا اس سے کئی گنا زائد ہوتی۔ بات یہ کہ مولانا اشرف علی صاحبؒ ایک دیدہ ور عالم ہی نہیں بلکہ خدائے تعالیٰ نے ان کو خاص بصیرت و فراست بھی عطا فرمائی تھی۔ اس لیے ہندوستان کے سیاسی مدو جزر و نشیب و فراز میں وہ ایک مجتہدانہ بصیرت و نقطۂ نظر رکھتے تھے ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کو جس صورت حال سے سابقہ ہے اس کو دیکھ کر مورخ فیصلہ کرے گا کہ مولانا تھانوی اپنے فکر میں مصیب تھے یا خاطی۔ و القصة بطولها.

بہر حال حضرت مولانا انور شاہ کشمیری اگر چہ قید و بند کی صعوبتوں سے محفوظ رہے اور سیاسی زندگی میں کوئی ان کا نمایاں کردار بھی نہیں تاہم حریت پسندوں کے جم غفیر میں انہیں شمار کرنے کی مضبوط بنیادیں موجود ہیں۔ سطور بالا میں برطانوی ریکارڈ سے ایک اہم وو قیع شہادت نظر قارئین کر چکا ہوں اپنے استاذ مولانا محمد جلیل صاحب کیرانوی سے جو حضرت شیخ الہند کے خصوصی خدام میں تھے اور دار العلوم دیوبند کے صف اول کے مدرس۔ یہ واقعہ بکثرت سننے میں آیا کہ حضرت شیخ الہند کی گرفتاری کے بعد جب ہندوستان میں برطانوی پولیس نے دارو گیر کا ہنگامہ برپا کیا تو ایک روز مولانا انور شاہ کشمیری کے بھی رہائشی کمرہ پر دیش پہنچنے والی تھی لیکن قبل از وقت انکشاف کی بناء پر حضرت شاہ صاحب نے اس تمام ریکارڈ کو نظر آتش کر دیا جس پر قبضہ کی صورت میں حضرت شیخ الہند کے باغیانہ عزائم کے مضبوط شواہد فرنگی اقتدار کے ہاتھ آتے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے لکھا ہے کہ حضرت شاہ صاحب اپنے ان جذبات کے مکمل اخفائی کوششوں کے باوجود کبھی کبھی درس میں بے اختیار فرماتے کہ:

"مجھے کچھ نہیں چاہیے بجز ایک چائے کی پیالی دو بسکٹ اور ایک تلوار
جس سے میں اعلاء کلمۃ اللہ کا کام لوں"

طلبہ کا وہ ذہین و فطین طبقہ جو دار العلوم کے اساسی محرکات پر مطلع تھا صاحب سوانح کے اس ایک سطری ارشاد سے اس طوفان کی سمتیں متعین کر لیتا جو آپ کے سینہ میں تلاطم پذیر تھا اور پھر یہ تو سب کو معلوم ہے کہ حضرت شیخ الہند کی اسارت مالٹا کے زمانہ میں آپ کے خاص تلامذہ نے جب جمعیۃ علمائے ہند کو قائم کیا تو آپ کے تمام تلامذہ اس تنظیم سے وابستہ ہو کر ٹھیک ٹھیک اس منہاج پر کام کرنے میں مصروف ہو گئے جو اپنے یگانۂ روزگار استاذ سے بطور امانت ان تک پہنچا تھا چنانچہ حضرت شاہ صاحب نے ہمیشہ جمعیۃ العلماء سے قریبی رابطہ رکھا اس کی ورکنگ کمیٹی کے

اجلاس میں مسلسل شرکت فرمائی اور جہاں کہیں اس کے سالانہ اجلاس ہوتے اس میں التزام سے شرکت فرماتے بلکہ ۱۹۲۷ء میں پشاور میں منعقدہ سالانہ اجلاس برائے جمعیۃ العلماء کی صدارت فرمائی اور ایک طویل خطبۂ صدارت تحریر فرمایا جو خزینۂ علوم ومعارف ہونے کے ساتھ برطانوی ڈپلومیسی پر ایک بھرپور وار ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے خاص مشاغل تعلیم وتدریس، مطالعہ اوران ہی اوصاف میں بے نظیر شہرت کے ساتھ آپ عصری سیاست، اس کے نشیب وفراز، پیچ وخم پر کس قدر مبصرانہ نظر رکھتے ہیں۔ اسی طویل وعریض خطبۂ صدارت سے اہم اقتباسات پیش کرنے کا منصوبہ راقم السطور کے ملحوظ نظر ہے لیکن آپ کی سیاسی زندگی کے شواہد جو کچھ عرض کر چکا ہوں اس میں اس اضافہ کو بھی پیش نظر رکھئے کہ ہندوستان میں اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے لیے برطانوی ڈپلومیسی جس انداز پر کام کر رہی تھی یعنی مختلف خیالات کو نشو ونما اور پھر ان کو امت کے اکثریتی طبقہ سے دست وگریبان کر دینے کی سازش کہ رات ہی رات میں بریلوی افکار کے ایک ذمہ دار کو انگریز نے خفیہ ملاقات میں خدا جانے کیا ہدایات دیں کہ اچانک بریلوی عالم بدعت ومحدثات کا ہندوستان میں سب سے بڑا داعی بن گیا اور پھر بدعت وسنت یا دیوبندیت وبریلویت کی شکل میں جو قیامت بدوش فتنہ شروع ہوا آج تک ہندوستانی مسلمان اس کی گرفت سے اپنے آپ کو آزاد نہیں کرا سکا۔ غلام احمد قادیانی علیہ ماعلیہ کے خیالات اور افکار میں یکا یک انقلاب وتبدیلی کسی بڑی حقیقت کی غمازی کرتی ہے۔ یہی شخص جس کا قلم ابتداء میں نصرانیت کے تار و پود بکھیر رہا تھا اور اسلام کی حقانیت وصداقت پر دلائل بہم پہونچا رہا تھا کس طرح بتدریج مہدویت، ظلی، بروزی نبوت کے مراحل طے کرنے کے بعد صاف صاف نبوت کبری کا مدعی بن گیا اور پھر نصف صدی کے طویل ترین اوقات گزرنے کے باوجود اس النبی الکاذب سے اہل حق کے جو معرکے رہے موجودہ ہندو پاک میں آج تک وہ بھڑکی ہوئی آگ بالکلیہ ٹھنڈی نہیں ہوسکی۔ پھر کوئی شبہ کر سکتا ہے کہ مولوی احمد رضا خاں بریلوی کا تعاقب یا غلام احمد قادیانی کے دعوی نبوت کو شکست وریخت کرنے والا، دیوبندی طبقہ پاسبان سنت ونبوت ہونے کے ساتھ ظاہر سے گزر کر باطن میں برطانوی ڈپلومیسی کی کرشمہ کاریوں کو دیکھ رہا تھا اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے وابستہ افراد خاص اس نقطۂ نظر سے بھی دجل وتلبیس کے ان گھروندوں پر پیہم حملے نہیں کر رہے تھے۔ ہندوستان میں برطانوی پالیسی کی دسیسہ کاریوں پر قلم بے اختیار غم وتاسف کے جذبات سے متاثر

ہو کر کہیں سے کہیں نکل گیا۔ بات تو در حقیقت صاحب سوانح کے اس معرکۃ الآراء خطبہ پر کرنا تھی جو اجلاس جمعیۃ العلماء منعقدہ پشاور ۱۹۲۷ء میں دیا گیا[۱]

حضرت شاہ صاحب نے غالباً ۲۸ عنوانات پر خطبہ میں اہم مسائل پر توجہ فرمائی ہے جس کے نتیجہ میں ۷۸ صفحات پر یہ خطبہ پھیل گیا جسے مرکزی جمعیۃ علماء ہند دہلی نے شائع کیا ہے۔ ابتداء میں تشکر و امتنان کے بیانات کے بعد سب سے پہلے بتایا گیا کہ یہ کل کائنات ایک نظام کے تحت مربوط سلسلہ سے وابستہ ہے۔ عالم رنگ و بو کی موجودہ شکل واضح طور پر بتاتی ہے کہ سلسلۂ کائنات کے پس پردہ کوئی مقتدر ہستی ہے جو اس نظام عالم کو ایک خاص انداز پر چلا رہی ہے۔ پھر ارشاد ہوا کہ:

''صوفیا کے یہاں اس عالم اکبر کی طرح خود انسان بھی ایک عالم ہے جس کا اساسی محرک قلب ہے اور باقی تمام اعضاء اس کے تابع فرماں''۔

اس فاضلانہ گفتگو کے چند اقتباسات نظرِ قارئین ہیں ارشاد ہوا کہ:

''ترک و اختیار کی تمام حرکات پہلے قلب سے اسی طرح صادر ہوتی ہیں جس طرح بادشاہ کی جانب سے اوامر و فرامین شائع ہوتے ہیں پھر قلب کی اس جنبش کا دماغ پر اثر پڑتا ہے اور دماغ اس کی صحیح تصویر اور موزوں نقشہ کھینچتا ہے۔ اس کے بعد اعضاء و جوارح انسانی اس کے امتثال میں مصروف عمل ہو جاتے ہیں''۔

ان بلی ارشادات کو پھر تفصیل میں اس طرح سمجھایا گیا کہ:

''قلب ایک بادشاہ ہے دماغ اس کا وزیر اور اعضاء اس کے خدم وچشم ہیں اس لیے تمام امور انسانیہ کے صلاح و فساد کا مدار قلب پر ہے''۔

استدلال میں جناب رسول اکرم ﷺ کی اس مشہور حدیث کا بھی تذکرہ فرمایا جس میں صلاح و فساد کی تمام تر ذمہ داریاں قلب پر ڈال دی گئی ہیں۔ اس سے آگے بڑھ کر خود اس کائنات کو جسد انسانی کا مشابہ بتاتے ہوئے اس میں بھی قلب و دماغ اور اعضاء کی نشان دہی فرمائی چنانچہ ارشاد ہے:

''اسی طرح شخص اکبر [مجموعۂ عالم] کے لیے بھی قلب، اعضاء، دماغ و جوارح ہیں اس شخص اکبر کا قلب تو وہی ہے جس کو اصطلاح شریعت

میں اولی الامر یا اصحاب حل وعقد سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس کا دماغ
حکماء وعلماء شریعت غرہ میں اعضاء وجوارح عام افراد ہیں"۔

اگر قلب کے صلاح وفساد پر کائنات انسانی کی صحت ودرستگی یا فساد وبگاڑ موقوف تھا تو عالم اکبر کے قلب یعنی علماء کے صلاح وفساد پر خود عالم اکبر کی خوبی و برائی موقوف ہے۔ ان تعبیرات میں جہاں علماء کو ان کے حقیقی فرائض پر متوجہ کیا گیا عوام کو بھی صحیح قیادت کی مکمل اتباع پر توجہ دلائی گئی۔ ذیلاً اس پر بھی بحث کی گئی کہ عالم رنگ وبو میں نظام تشریع کو قائم کرنے کے لیے جس طرح انسانی کاوشیں وحی الٰہی کی رہنمائی کے بغیر ناکام ہیں لیکن خود وحی الٰہی کو قبول کرنے کے لیے ایک صالح ترین طبقہ کی ضرورت ہے۔ عام انسان اخذ وقبول کی صلاحیت قطعاً نہیں رکھتے اگر یہ صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے تو صرف انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے برگزیدہ طبقہ میں ہے۔ یہ بھی ارشاد ہوا کہ سلسلۂ نبوت کی ابتداء حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ہے اور اس کا اختتام خاتم النبیین جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر، موضوع کی مناسبت سے بے اختیار حضرت شاہ صاحب کے قلم مبارک سے قادیانیت کی تردید کے شدید جذبات اس طرح اچھل پڑے کہ:

"البتہ فضائل نبوت میں سے اب بھی بعض چیزیں باقی ہیں جن کو
بعض ملاحدہ نبوت سمجھ کر دھوکا کھائے ہیں اور بعض دجال زراہ تلبیس
خود مدعی نبوت ورسالت بن بیٹھے"۔

مہدی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ظہور، عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نزول جو قرب قیامت میں ضلالت وگمراہی کو قلع وقمع کرنے کے لیے ہوگا اس کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ابد نشان ہے ظہور ونزول بھی نبوت کی حیثیت
سے نہیں بلکہ آپ ہی کے نبوت کے تابع ہو کر آپ کی لائی ہوئی شریعت
کو از سر نو قائم کرنے اور اس کی نشاۃ ثانیہ کے لیے ہوگا"۔

یہاں آپ نے توراۃ میں جو بزبان عبرانی ہے اس کے ایک بشارتی فقرہ کا ذکر کرنے کے بعد مترجمین توراۃ کی ایک بڑی فریب کاری کا پردہ چاک کیا ہے۔ تحریر فرمایا ہے کہ توراۃ میں عبرانی زبان میں موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وصایا میں یہ الفاظ موجود ہیں۔

"نابی مقریخ ماحینح ماموخ باقبملخ الوھخ
الاوتسماعون".

(عبری و عربی کی قریبی مماثلت کی بناء پر ان وصایا کو عربی میں اس طرح پڑھا جائے گا)

"نبی من قربک من اخیک کمثلک و یقیم لک الهلک الیه تسمعون".

(یعنی ایک نبی تیرے قریب سے، تیرے بھائیوں میں سے، تجھ جیسا تیرا خدا تیرے لیے مبعوث کرے گا اس کی سنیو)

لیکن عیسائی مترجم نے مقربخ کا ترجمہ تیرے درمیان سے کر دیا۔ اس مغالطہ کے نتیجہ میں موسیٰ علیہ السلام کی ان بشارتوں کو جناب رسول اکرم ﷺ کی ذات گرامی پر منطبق کرنے میں ممکنہ راہیں مترجمین تورات کی دسیسہ کاری کے نتیجہ میں مسدود [۱] ہو گئیں۔

اسی خطبہ میں آپ نے اس حقیقت کو بھی واضح فرمایا کہ اسلامی قومیت کی بنیاد رابطہ دینی اور اخوت مذہبی ہے اور اسلامی اقوام و امم میں بجز قوم عرب، قوم ترک اور قوم افغان کے جو بحیثیت نسل بھی مسلمان ہیں اور کوئی قوم بحیثیت نسل اسلام میں منحصر نہیں ہے بلکہ ہر ملک کی ہر قوم میں مسلم و غیر مسلم دونوں ہیں اس لیے اسلامی قومیت کا مدار اور اتحاد نسل یا اتحاد [۱] وطن پر نہیں ہو سکتا ہے تو اس صورت میں اسلامی قومیت کی زندگی و بقاء صرف دین و مذہب اور ملت کے احیاء و بقاء میں منحصر ہے۔

اس اساس کے ہاتھ سے نکل جانے پر متوقع طرہ کی نشاندہی کرتے ہوئے ارشاد ہوا کہ

"اگر یہ رابطہ خدانخواستہ درمیان سے اٹھ جائے تو قوم مسلم اسی روز تہ خاک دفن ہو اور من حیث القوم اس کا وجود ہرگز باقی نہیں رہے گا"۔

انڈین نیشنل کانگریس سے سیاسی اتحاد، اشتراک خیال و اشتراک کار کے باوجود درآنحالیکہ یہ اکابر جمعیۃ ہندوستان کی مختلف قوموں میں جہد آزادی کی کامیابی کے لیے ایک مضبوط توافق کے نہ صرف قائل بلکہ اسے عملی حدود میں بروئے کار لانے کے لیے ہمہ تن مصروف تھے لیکن پھر بھی مداہنت حقیقتوں کے بیان میں تلبیس یا کسی ایسی غلط رواداری کے ہرگز مرتکب نہیں ہو سکے جس سے اسلام، مذہب دین اور ملت کو کوئی نقصان پہنچے۔ افسوس ہے کہ ان حقائق کے باوجود مخالفین نے ان پاکیزہ افراد و رجال کو بھی رسوا کرنے یا متہم کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اس دور میں جب کہ ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی پارٹی یعنی انڈین نیشنل کانگریس جو ہندوستان

کے تمام باشندوں کی رہنمائی کی دعویدار تھی اور جس کے سیاسی اسٹیج پر واقعۃً ہندوستان کے تمام قوموں کے سربراہ ونمائندے جمع تھے۔ مجتمع طاقت کو مختلف حصوں بخروں میں تقسیم کرنے اور اس طرح ایک مشترکہ جدو جہد کو کمزور بنانے کے جرم سے کلیۃً احتراز ضروری تھا۔ پھر جمعیۃ العلماء کے قیام اس کی تاسیس کا کیا جواز ہوسکتا تھا۔ حضرت شاہ صاحب نے اسی گوشۂ بحث کو سمیٹتے ہوئے علماء کی اس تنظیم اور عوامی قیادت کے اس جواز کو اپنے الفاظ میں بعض احادیث سے مدلل کرتے ہوئے فرمایا۔

> ''اس اہم مقصد (یعنی رابطۂ دینی واخوت مذہبی کو باقی رکھنے کے لیے) کے انصرام کے لیے علماء کرام نے چند سال سے اپنے دائرہ میں ایک نظام قائم کیا ہے جس کا نام جمعیۃ العلمائے ہند ہے تاکہ موجودہ زمانے کے ابھرتے ہوئے مسائل میں جن کا تعلق سیاسیات، مذہبیات، اخلاقیات، معاشرت وتمدن یا اقتصادیات کسی سے بھی ہو اس میں درپیش حل طلب مسائل کے لیے بحث وتمحیص، تحقیق و تدقیق کے بعد علمائے اسلام جمہور مسلمین کے لیے راہ عمل نکالیں اور صحیح قیادت کا فریضہ انجام دیں چونکہ اسلام کی تعلیم یہی ہے اور شریعت غرّہ کا مقتضے بھی یہی اور اسلام کا نمونۂ عمل بھی اسی کا تقاضا کرتا ہے''۔

اپنے مدعا کی تائید میں مسند طبرانی سے حضرت علی کرم اللہ وجہ کی اس روایت کو بھی پیش فرمایا کہ حضرت علیؓ نے جناب رسول اکرم ﷺ سے عرض کیا کہ ہمارے سامنے اگر کوئی ایسا واقعہ پیش آجائے جس میں کوئی شرعی اجازت یا ممانعت موجود نہ ہو تو پھر ہم کیا کریں؟ آپؐ نے فرمایا علماء اور عبادت گزار حضرات سے مشورہ کیا جائے شخصی رائے پر عمل سے کلیۃً پرہیز کیا جائے۔

چند سال گزرتے ہیں کہ مصر کے ایک اہم اسلامی اجتماع میں اسی طرح کے ایک موضوع پر دوران بحث مولانا یوسف بنوری نے حضرت شاہ صاحب کی پیش کردہ اسی روایت کو سنایا تو موجود مجمع نے بحث کا آخری فیصلہ اسی حدیث کی روشنی میں کیا۔ حجاز کے سفر کے دوران مولانا بنوری راقم السطور سے کہتے تھے کہ اس حدیث پر عام علماء کی نظر نہیں تھی۔ میں نے اس حدیث کے

سراغ میں حضرت شاہ صاحب کا تذکرہ اوران کے تبحر کو بتایا تو اقالیم اسلامی کا یہ کھن اجتماع بے حد متاثر ہوا۔

پیش کردہ اقتباس میں صاحب خطبہ نے دو امور کا تذکرہ فرمایا۔ ایک علمائے ربانی سے مشورہ اور اہل عبادت کو شریک مشورہ رکھنا۔ جس کی دلیل میں طبرانی کی یہی روایت پیش کی گئی۔ دوسرے سلف صالحین کا طریق کار۔ اس ذیل میں دارمی سے حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کا تعامل ذکر ہوا کہ وہ اپنے عہدِ خلافت میں اسی طریق کار کے پابند رہے۔ مرحوم نے ان دلائل سے جمعیۃ العلماء کے وجود اس کے طریق کار کو شرعی نصوص کی روشنی میں واضح کرتے ہوئے جمعیۃ العلماء کی ان خدمات کا مفصل تذکرہ فرمایا ہے جو آپ کے زمانہ تک یہ ملی ادارہ انجام دیتا رہا۔ حضرت شاہ صاحب کے اس خطبہ پر نصف صدی ہونے کو آتی ہے اس پچاس سالہ دور میں الحمدللہ یہ تنظیم اپنے شایان شان اور مقدور بھر ملک وملت کی ضرورت سے غافل نہ رہی ۱۹۴۷ء تک آزادی کی طویل جدوجہد، اس میں جمعیۃ العلماء کا قائدانہ کردار اور ۱۹۴۷ء کے بعد تباہ شدہ وشکستہ دل مسلمانوں کی آبادکاری، ان کے لیے ہندوستان میں باعزت مقام کے لیے جدوجہد، ہولناک فسادات کا پامردی سے مقابلہ، فرقہ واریت کی جڑوں پر مسلسل تیشہ زنی، جائدادوں کی واگزاری، مساجد کا انخلاء، دینی مکاتیب کا قیام، دینی تعلیم کے لیے لٹریچر کی تیاری جمعیۃ العلماء کی وہ خدمات ہیں جن کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ذیلاً خطبہ میں اسی بحث پر گفتگو کرتے ہوئے کہ کیا ملک کی آزادی کے لیے غیر مسلم فرقوں سے اشتراک کار کے لیے کوئی معاہدہ کیا جاسکتا ہے؟ آنحضور ﷺ کا وہ معاہدہ بطور شرعی اساس ذکر کیا ہے جو آپ نے مدینہ منورہ حرسہا اللہ تعالیٰ عن الشرور والفتن کے تحفظ کے لیے یہود سے کیا[1] تھا اور ذیلاً مسلمانوں کا ایفائے عہد، کیے ہوئے معاہدوں کی پاسداری کا طویل تذکرہ کرتے ہوئے معاہدہ کی روح کا خاص تذکرہ فرمایا چنانچہ رقم طراز ہیں (ایسے معاہدہ کا موضوع صرف یہ ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کا پورا پورا احترام کرے اور کوئی کسی کی جان ومال وعزت وآبرو پر حملہ آور نہ ہو، ایذاء دہی کو حرام سمجھے، اپنے مذہب پر عمل کرنے میں آزاد ہو دوسروں کے مذاہب کا احترام کرتے ہوئے ان پر دل آزار حملوں سے خود کو محفوظ رکھے) یہ ہیں وہ اساسی دفعات جو باہمی نفرت، خانہ جنگی اور بدمزگی کو روکنے کے لیے سب سے زیادہ کارآمد ہیں۔ یہ بھی فرمایا کہ:

''مسلمان احکام اسلام اور حدود شریعت بیضاء میں رہتے ہوئے

ایسے معاہدہ کا سب سے پہلے خیر مقدم کریں گے بلکہ اپنے مذہبی
احکام کے بموجب وہ معاہدہ قوم کے جان و مال اور عزت و آبرو کے
محافظ ثابت ہوں گے"۔

تاریخ عالم اس کے شواہد بہم پہونچاتی ہے کہ مسلمانو اپنے دور اقتدار و عہد سطوت و شوکت میں بھی معاہد اقوام کی پوری طرح حفاظت کی اور اس راہ میں بڑی سے بڑی قربانی سے بھی کوئی دریغ نہیں کیا لیکن یہ سب کچھ مذہب کے دائرہ میں محدود رہتے ہوئے ہوا کسی غیر شرعی معاہدہ کو کبھی قبول نہیں کیا گیا۔ مرحوم نے بھی مسلمانوں کے اس کردار کا ان الفاظ میں تذکرہ فرمایا۔

"میں یہ بھی صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اگر کوئی یہ چاہے کہ
مسلمان اپنے مذہبی احکام سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹ کر یا آگے
بڑھ کر کوئی معاہدہ کریں تو یہ ناممکن ہے"۔

صرف یہی نہیں بلکہ

"اگر مسلمانوں کی کوئی جماعت مذہب سے ناواقفیت یا مداہنت کی
وجہ سے ایسا معاہدہ کرلے بھی تو نہ وہ قابل قبول ہوگا اور نہ قدرتی طور
پر اس میں استحکام پیدا ہوسکتا ہے"۔

ظاہر ہے کہ جب مسلمانوں کا ہر قول و فعل رضائے خدا کے لئے اور اسی کی خوشنودی کو حاصل کرنے کے لیے ہے تو ان امور میں کوئی برکت و نورانیت پیدا نہیں ہوسکتی جس کی بنیاد خدائے تعالی کی مصیبت پر اٹھائی گئی ہے۔ آپ نے اس مقصد کے لیے وہ حدیث بھی سنائی جس میں موجود ہے کہ جو شخص خدائے تعالی کو ناراض کر کے لوگوں کو راضی کرنے کی کوشش کرے گا تو خدائے واحد ان ہی لوگوں کو اس کی تباہی و بربادی کا ذریعہ بنادیں گے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد یہ تصور بعض سیاسی جماعتوں نے ہندو عوام کو دینا شروع کیا کہ یہ ملک صرف ہندوؤں کا ہے مسلمان یہاں نہیں رہ سکتے اگر رہنا چاہتے ہیں تو اکثریتی تہذیب میں خود کو ممزوج کر کے۔ ہوش و خرد اور عقل و دانائی سے بیگانگی کے عالم میں ان مہلک نعروں کو فرقہ پرست جماعتوں کی جانب سے مسلسل بلند کیا جارہا تھا اور جن سنگھ کے "گرووالکر" نے اپنی تحریر و تقریر دونوں طاقتوں کو اسی مقصد کے لیے مصروف کردیا۔ حضرت شاہ صاحب نے نصف صدی قبل ان مہمل تخیلات کی جڑوں پر بھرپور حملہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''میں یہاں یہ بھی واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہندوستان جس طرح ہندوؤں کا وطن ہے اسی طرح مسلمانوں کا بھی۔ مسلمانوں کو ہندوستان آئے ہوئے اور یہاں مکمل بود و باش اختیار کیے ہوئے صدیاں گزر گئیں۔ انہوں نے اس ملک پر منصفانہ حکمرانی کی۔ یہاں کے گوشہ گوشہ میں ان کی شوکت و رفعت کے آثار موجودہ ہیں جو اُن کے علم و ہنر اور ان کی بے لوث حب وطن کی شہادت دیتے ہیں۔ ہماری موجود نسل کا خمیر ہندوستان ہی کی آب و گل ہے اور ہماری یہاں مذہبی و تمدنی عظیم الشان یادگاریں ہیں، اربوں روپیوں کی جائدادیں ہیں۔ عالیشان تعمیرات اور وسیع قطعات زمین کے یہاں لاکھوں مسلمان مالک ہیں۔ پھر کیسے کہا جاسکتا ہے کہ ان سب چیزوں کے باوجود یہ ملک صرف غیر مسلموں کا ہے؟ بلاشبہ اکثریت اس بات کا جائزہ لے سکتی ہے کہ یہاں رہنے والے مسلمان اپنے ملک کے وفادار اور حقیقی بہی خواہ ہیں تو جاننا چاہیے کہ اس سلسلہ میں بھی مسلمانوں کے پاس ان کے پیغمبر جلیلؐ کا ایک نمونہ عمل ہے جس سے وطن کی محبت آشکارا اور اپنے ملک سے فطری تعلق کے مضبوط جذبات کا اظہار ہوتا ہے''۔

شاہ صاحبؒ نے اس کا تذکرہ اس طرح فرمایا: ''ہمیں ہندوستان سے ایسی ہی محبت ہے جیسی کہ ایک سچے محب وطن کو ہونی چاہئے۔ ہمارے سامنے آقائے کائنات محمد رسول ﷺ کا یہ اسوۂ حسنہ موجود ہے کہ آپؐ نے کفار کے ظلم و ستم سے مجبور ہو کر بحکم خداوندی جب اپنے محبوب وطن مکہ معظمہ سے ہجرت فرمائی تو ارشاد فرمایا کہ ''اے مکہ خدا کی قسم روئے زمین میں تو مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے اگر تیرے باشندے مجھے نہ نکالتے تو میں تجھے کبھی نہیں چھوڑتا''۔

وطن سے خواہ وہ مالوف ہو یا اختیار کر لیا گیا ہو محبت و تعلق ایسی چیز ہے کہ ایک پیغمبر جلیل بھی جس کا ہر اقدام خدائے تعالیٰ کے ارشاد کے تابع ہوتا ہے اپنے جذبات و میلانات خاطر کو دبا

نہیں سکتا۔ بوقت ہجرت مکہ معظمہ کے لیے اس وداعی محبت آمیز پیغام کو سننے کے بعد مدینہ منورہ سے بڑھتے ہوئے تعلق کو بھی شاہ صاحبؒ ہی کے الفاظ میں سنئے:

''اور جب مدینہ جو دارالہجرۃ تھا آپ کا وطن ثانی بن گیا تھا تو آپؐ نے مدینہ کی ترقی، خوشحالی، آب و ہوا کی خوشگواری، سامان معیشت میں عظیم برکتوں کے لیے مستجاب دعاؤں میں ارشاد فرمایا۔ خدایا مدینہ کو ہمارے قلوب میں ایسا محبوب بنادے جیسا کہ ہم مکہ سے محبت رکھتے ہیں بلکہ مکہ کی محبت سے بھی زائد مدینہ کا تعلق عطا فرما اور مدینہ کی یہ برکات مکہ معظمہ کی برکات سے بھی کئی گنا زائد فرمادے۔ اے اللہ بیشک تیرے بندے ابراہیمؑ نے مکہ اور اہل مکہ کے لیے برکت کی دعائیں کی تھیں اور میں تیرا بندہ و رسول محمدؐ ہوں۔ اہل مدینہ کے لیے وافر برکات کی تجھ سے دعائیں کرتا ہوں ان دعاؤں کو اپنے فضل و رحمت سے قبول فرما''۔

راقم السطور عرض کرتا ہوں کہ مدینہ کی سرسبزی و شادابی خیر و برکت کے لیے زبان نبوت سے ان مقبول دعاؤں کا تکرار امت کو تعلیم دیتا ہے کہ وہ جس جگہ مقیم ہوں وہاں کے خیر خواہ، کردار و عمل، قول و فعل بلکہ اپنی مخلصانہ دواؤں سے بھی رہیں اور یہ کوئی منطق کا جز (اصم نہیں جس کی حقیقت تک رسائی کے لیے پاپڑ بیلنا پڑے۔ صاف بات ہے کہ ملک کی خوبی و فلاح، وہاں کی اچھائی و برائی سے ہر شہری کا سابقہ رہتا ہے۔ اگر ملک ترقی کرے گا اس کی معیشت مستحکم ہوگی، اس کے وسائل وسیع ہوں گے تو اس کے فائدے سب ہی شہریوں کو حاصل ہوں گے اور اگر ملک طرح طرح کے بحران میں مبتلا کر دیا جائے گا تو وہ مضرتیں بھی کسی مخصوص فرقہ کے لیے نہیں بلکہ تمام باشندوں کے لیے ایک عام ابتلاء ہوگا اس لیے کوئی مسلمان شہری اپنے ملک کا کبھی بدخواہ اس کے مفادات کا مخالف نہیں ہوسکتا شاہ صاحب نے بھی اسی خطبہ میں اعلان فرمایا۔

''سید الکونین ﷺ کے جذبات حب وطن یہ ہیں اور ان کے ہوتے ہوئے ناممکن ہے کہ مسلمان سچا مسلمان ہوکر اس جذبۂ حب وطن سے خالی ہو''۔

یہی نہیں بلکہ:

''یہ یقین رکھئے کہ مسلمانوں کے قلوب میں مذکورہ بالا اسوۂ حسنہ کی
بناء پر اپنے ملک ہندوستان کی پوری پوری محبت ہے''۔

ہندو فرقہ پرستوں کا تقسیم ہند سے پہلے اور تقسیم کے بعد یہ اندیشہ ہے کہ جب کبھی ہندوستان پر کسی جانب سے حملہ ہوگا تو مسلمان ملکی مفادات سے غدر کرتے ہوئے حملہ آور کا تعاون اور خفیہ ریشہ دوانیاں کریں گے اس کا جواب یہ عنایت فرمایا:

''رہا یہ خطرہ کہ آزادی کے وقت اگر کسی مسلمان حکومت نے ہندوستان پر حملہ کیا تو مسلمانوں کو رویہ کیا ہوگا؟ بڑی پست خیالی ہے اس کا سیدھا وصاف جواب یہ ہے کہ اگر مسلمان اپنے ہمسایوں سے مطمئن ہوں گے اور ان کے تعدی کا شکار نہ ہوں گے تو مسلمانوں کا رویہ اس وقت وہی ہوگا جو کسی شخص کل اس کے گھر پر حملہ کرنے کی حالت میں ہوتا ہے اگر چہ حملہ آور اس کا ہم قوم اور ہم مذہب ہی ہو بلکہ ایک بات خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ جب مسلمانان ہند حفاظت جان و مال وعزت وآبرو کے ساتھ وقت گزار رہے ہوں اور ان کا غیر مسلم اقوام سے کوئی معاہدۂ امن وصلح بھی ہو تو ان حالات میں کسی مسلمان حکومت کو مذہباً اس کی اجازت نہیں کہ وہ معاہدہ کو توڑے اور اس ملک وقوم پر حملہ آور ہو جس سے مسلمانوں کا کوئی معاہدہ ہے۔ آنحضور ﷺ کی اس سلسلہ میں ہدایات بالکل واضح ہیں''۔

غلام ہندوستان میں تو مسلمانوں کا ہندوستان کے اکثریتی فرقہ سے کوئی ایسا معاہدہ بد قسمتی سے نہیں ہو سکا لیکن تسلیم کے بعد چین وپاکستان کے جارحانہ حملوں کی صورت میں مسلمانان ہند کا کردار اپنے ملک کے لیے ان کا اخلاص، ملک کے دفاع کے لیے ان کی قربانیاں آشکارا ہیں۔ بریگیڈیئر عثمان نے محاذ کشمیر پر جان دی لیکن کسی حملہ سے ہندوستان کو نقصان نہیں پہنچنے دیا۔ غازی پور کے ایک فوجی مسلمان نے محاذ پر پاکستانی حملہ اور ٹینک کو اپنی جان خطرہ میں ڈال کر جس طرح اپنے خون کا آخری قطرہ بھی اپنے ملک کی حفاظت کے لیے صرف کیا وہ مسلمان کی روایتی وفاداری کا ایک تابناک کارنامہ ہے۔ ملک آج تک تین جارح حملہ آوروں کا مقابلہ کر چکا ہے لیکن ایک مثال بھی مسلمانوں کی غداری کی پیش نہیں کی جاسکتی۔ یہ بات پورے فخر اور ذمہ داری سے کہی

جا سکتی ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد ملک کے خلاف کئی سازشوں کا انکشاف ہوا لیکن ان میں کبھی کوئی مسلمان ملوث نہیں تھا وہ وقت بھی گزر چکا کہ اگر پاکستان کئی سازشوں کا انکشاف ہوا لیکن ان میں کبھی کوئی مسلمان ملوث نہیں تھا وہ وقت بھی گزر چکا کہ اگر پاکستان کی جانب سے ہندوستانی مسلمانوں کا قضیہ کہیں اور کسی وقت اٹھایا جاتا تو ہندوستانی مسلمانوں کی سب سے زیادہ ذمہ دار تنظیم جمعیۃ العلماء ہند، پاکستان سے اٹھنے والی اس آواز کو اپنے آہنی پنجوں سے ان کے گلوں ہی میں دبا دیتی۔ ہر سال سعودی عرب موسم حج میں جانے والا مسلمانوں کا وفد پاکستان کے اس پروپیگنڈے کا مکمل جواب دے کر آتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں سے غیر مشتبہ وفاداری کا سرٹیفکٹ مانگتی ہیں۔

بہرحال علامہ نے ان احادیث وفقہی تصریحات کا مفصل ذکر فرمایا ہے جن سے مسلمان دوسری قوموں کے ساتھ اگر معاہدہ کریں تو اس معاہدہ کا احترام دنیا میں موجود تمام مسلمانوں پر یکساں عائد ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں کلکتہ میں ایک اتحاد کانفرنس کی گئی تھی جس میں ''ڈاکٹر مونجے'' اور دوسرے زعماء کی جانب سے ان ہی فرسودہ اعتراضات کو دوہرایا گیا تھا جو عموماً فرقہ پرست مسلمانوں پر کرنے کے عادی ہیں۔ صاحب خطبہ نے ان تمام اعتراضات کے بچے تلے جوابات دیئے ہیں جن میں نصف صدی کی قدامت کے باوجود آج بھی حقائق کی جلوہ گری و تازگی موجود ہے۔ ملک کا یہی وہ دور تھا جب کہ سائمن کمیشن ہندوستان کا دورہ کر رہا تھا اور یہاں کی ذمہ دار پارٹیوں کو اس کی آمد پر کچھ سیاسی حقوق ملنے کی توقع قائم ہو چلی تھی شاہ صاحب نے ان تخیلات پر جمعیۃ کے پلیٹ فارم سے بھرپور حملہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

> ''آزادی عطا نہیں کی جاتی بلکہ وہ طاقت اور ہمت سے حاصل کی جاتی ہے۔ کمیشن آیا اور گیا اور سیاسی اصطلاحات وحقوق کا فریب کارانہ نعرہ برطانوی ڈپلومیسی کا ایک اور امتحان تھا جس میں برطانیہ نے حسب دستور ہندوستانیوں کے جوش آزادی کو اپنی چالاکیوں سے فرو کرنے کے لیے ایک وقتی ہتھیار استعمال کیا تھا''۔

انگریز ہندوستان کے تمام ہی صوبوں و ریاستوں پر اپنی گرفت سخت تر کر رہا تھا لیکن خاص طور پر سرحد کے غیور پٹھانوں کو مغلوب کرنے کے لیے تشدد و استبداد کی کوئی مذموم روایت

ایسی نہ تھی جسے اختیار نہ کیا گیا ہو۔ اس صورت حال سے اس صوبہ کی جسور قوم پریشان تھی آزاد قبائل غیر مسلح ہونے کے باوجود دنیا کی ایک بڑی طاقت اور جدید آلات جنگ سے لیس قوم کا پامردی سے مقابلہ کر رہے تھے۔ سرحد کے بعض علاقوں پر بمباری سے بھی گریز نہیں کیا جاتا تھا اور بے گناہ پٹھانوں کے کشتے کے پشتے لگ رہے تھے۔ یہی حالات تھے جن کی بناء پر ۱۹۲۷ء میں جمعیۃ العلمائے ہند نے اپنا سالانہ اجلاس پیشاور میں رکھا۔ صاحب خطبہ نے بھی اپنے طویل ترین ارشادات کے مفصل تذکرہ کے بعد پٹھانوں اور ان کے صوبے کے ساتھ ایک نار و اسلوک و اسباب کا جائزہ لیا ہے اور اس وقت برطانوی حکومت کی جانب سے اس صوبے کو آئینی اصلاحات و مراعات سے محروم رکھنے کی جو وجوہ و اسباب پیش کیے جا رہے تھے ان کی پادری ہوائی دلائل سے ثابت کی ہے۔ خطبہ کے یہ اجزاء ایسے قیمتی اور اہم معلومات پر مشتمل ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان خانقاہ نشین علماء کی نظر وقتی مسائل پر بھی کس قدر گہری و دبیز ہوتی ہے۔ وہ عام اعداد و شمار خطبہ میں جمع کر دیئے گئے ہیں جو اس اہم مبحث کی روح ہیں۔ اگر خوف طوالت نہ ہوتا تو راقم السطور ان اجزاء کو پیش کرتا تا کہ موصوف کی سیاسی بصیرت اور مومنانہ فراست کے کچھ اچھوتے ثبوت قارئین کے سامنے ہوتے۔ ذیلاً دہلی کی تجویز مفاہمت، سندھ کی علاحدگی، ہندو مہاسبھا کی آہ و زاریاں اور بلاوجہ کے شکوک و شبہات، آزادی کی راہ میں فرقہ وارانہ تنظیموں کی رکاوٹیں، حضرت شاہ صاحب نے ان وقتی و عصری مسائل پر کھل کر گفتگو کی ہے جو بجائے خود قابل مراجعت ہے معلوم ہے کہ مغل سلطنت کے خاتمہ پر انگریز مظالم کے سب سے زیادہ شکار مسلمان ہی رہے ہیں مسلم قوم میں اپنے مذہب سے فطری تعلق، احکام شرعیہ کے تحفظ کا جذبہ، آزادی کے لیے اس کی بے تاب جدوجہد انگریزوں کے لیے تشویش کا موجب تھی۔ ان تاریخی حقائق کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہزاروں علمائے ربانی سولی پر چڑھا دیئے گئے بہت سوں کو دریائے شور بھیج دیا گیا اور ہندوستان کے جیل خانے مسلم زعماء سے بھر دیئے گئے اور ان تمام رعایتوں کو یکسر ختم کر ڈالا جو ایک عدالت پسند حکومت اپنی رعایا کو دیتی ہے۔ مسلمانوں کے پرسنل لا میں بہت سے گوشے ایسے ہیں کہ جہاں مسلمان اپنے مذہب پر عمل کرنے کے لیے ایسے اداروں کا واقعی محتاج ہے۔ جن کے تحت دین کے بعض اہم تقاضوں کی تکمیل ہو۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے اس خطبۂ صدارت میں ان نازک مسائل کو چھیڑتے ہوئے عام مسلمانوں سے دار القضاء شرعی کے قیام، امارت شرعیہ کی تنظیم کے لیے

جدوجہد کا مطالبہ فرمایا۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ:

''سب سے زیادہ اہم مصیبت ہندوستان کے مسلمانوں کی یہ ہے کہ ہندوستان میں دارالقضا شرعی مفقود ہے۔ حالانکہ مذہبی احکام و معاملات میں بہت سے امور ایسے ہیں جن میں قاضی کے شرعی فیصلہ کی ضرورت ہے اور بغیر اس کے فیصلہ نافذ بلکہ جائز العمل نہیں ہوتے۔ نکاح، طلاق، خلع، میراث بہت سے معاملات ہیں جو مسلمانوں کی مذہبی تعلیم وتربیت نہ ہونے اور خواہشات نفسانی کی اتباع کی وجہ سے اس طرح الجھ گئے کہ قوۃ نافذہ کے بغیر ان کا سلجھنا ممکن نہیں۔ علماء ومفتیان دین کا کام صرف حکم شرعی ظاہر کر دینا ہے لیکن اس حکم کو جاری کرنے کی کوئی طاقت ان علماء اور مفتیوں کے ہاتھ میں نہیں ہے''۔

نتیجۃً مسلمان اپنے ان معاملات وخصومات کو ایسی عدالتوں میں لے کر پہنچ رہے ہیں جہاں کے فیصلے نہ شرعاً نافذ اور نہ ان پر عمل صحیح، پھر بہت سے مسائل ایسے بھی ہیں جن میں انگریزوں کا مجوزہ قانون مسلمانوں کی ضرورت کے لیے ناکافی بلکہ منافی واقع ہوا تھا۔ ان حالات میں کسی دارالقضاء شرعی کا قیام مسلمانوں کی سب سے بڑی مذہبی ضرورت تھی۔ حضرت شاہ صاحب نے اس ضرورت کی طرف عامۃ المسلمین کو خاص طور پر متوجہ کیا اور ان کی فرائض کی تذکیر فرمائی۔ بعد میں جمعیۃ العلماء کے اسی مجوزہ پروگرام کے تحت مولانا ابوالمحاسن سجاد نائب امیر شریعہ کی کوششوں سے بہار واڑیسہ میں اس طرح کی امارت شرعیہ کا قیام ہوا جو اس وقت مولانا سید منت اللہ صاحب امیر شریعت کی زیر قیادت ایک منظم ادارے کی شکل میں کام کر رہا ہے۔ تاہم ضرورت ہے کہ اس نظام شرعی کو وسعت دے کر پورے ہندوستان میں بروئے کار لایا جائے تا کہ ناواقفیت کی بناء پر مسلم قوم اپنی مذہبی قوانین پر عمل کرنے سے محروم نہ رہے اور اس طرح مسلمانوں کا وہ بڑا سرمایہ جو باہمی جھگڑوں پر بے دریغ صرف ہو رہا ہے ضائع ہونے سے محفوظ رہ سکے۔ وَالْاَمْرُ بِیَدِ اللّٰہ

ہندوستان میں قضاء شرعی نہ ہونے کی بناء پر اور پھر اس بناء پر کہ جو قانون انگریزی عدالتوں میں ''محمڈن لا'' کے نام سے زیر عمل تھا وہ اس قدر ناقص تھا جس سے اسلامی شریعت کے مقاصد کی توقیر تو کیا ہوتی بلکہ وہ شریعت محمدی کی صریح توہین اور اسلام کے لیے شدید مضر تھا جس کا

ایک خاص نتیجہ مسلمان عورتوں کے فتنۂ ارتداد کی شکل میں رونما ہو رہا تھا وجہ اس کی یہ تھی کہ وہ مسلمان عورتیں جو شوہر کے جور و ستم کا شکار یا خاوند کے مفقود اور لاپتہ ہونے کی وجہ سے شدید پریشانی میں مبتلا تھیں۔ اس کے سوا اور کوئی راہ نجات نہیں پاتی تھیں کہ کسی دوسرے دین سے تعلق پیدا کر کے اپنے لیے کوئی مخلص پیدا کریں اور انگریز کی شہرۂ آفاق چالاکیوں وعیاریوں کے پیش نظر مستبعد بھی نہیں کہ عدالتوں میں نافذ شرع محمدیؐ کو دیدہ و دانستہ ایسی شکل دی گئی ہو کہ واقعی مظلوم عورتیں شوہر کے مظالم سے جب اسلام میں رہتے ہوئے نجات نہ پاسکیں تو وہ ارتداد کی راہ سوچیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے اس عظیم فتنہ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا۔

> ''ایک مسلمان کا مرتد ہو جانا بھی مسلمانوں کے لیے مصیبت کبریٰ ہے۔ بالخصوص عورتوں کا ارتداد معاذ اللہ، معاذ اللہ بڑا مہلک ہوگا۔ خدا نہ کرے کہ عورتوں میں اس قسم کی تحریک سرایت کر جائے۔ ان کی مذہبی ناواقفیت وفطری نقص عقل کیا رنگ لائے اور مسلم قوم کو کس قدر تباہی و بربادی کے قریب ہونا پڑے۔ مسلمانوں کا سب سے بڑا فریضہ اس وقت پر یہ ہے کہ وہ ان بے کس و بے بس مظلوم عورتوں کی گلوخلاصی کا پہلی فرصت میں اہتمام کریں جس کی واحد سبیل ''محکمۂ قضا'' قائم کرنے کی جدوجہد ہے''۔

رہا یہ سوال کہ ہندوستان میں رائج الوقت فقہ حنفی کے ہوتے ہوئے بعض اس کی جزئیات مثلاً لاپتہ شوہر کی بیوی کے بارے میں ایسی ہیں جو موجودہ وقت میں ناقابل عمل میں ممدوح نے ان مشکلات کا ذکر کرنے کے بعد دوسرے فقہاء کے اقوال پر عمل کرنے کی راہ پیش کی یہی وجہ ہے کہ مفقود الزوج کے بارے میں علمائے ہند کے متفقہ فیصلہ سے امام مالک علیہ الرحمہ کے فتوی پر عمل ہوا۔ باوجودیکہ مرحوم کی حنفیت کے بارے میں اور اس فقہی مکتبۂ فکر کی صحت و جامعیت کے پورے وثوق کے ساتھ تطبیق بین الفقہاء کا خاص اہتمام پیش نظر تھا۔ آپ امام ابوحنیفہؒ کے مختلف اقوال میں قول کو زیادہ ترجیح دیتے جو دوسرے ائمہ سے اقرب ہوتا۔ اس کی کچھ مثالیں آپ کی تفردات علمی میں انشاء اللہ پیش کی جائیں گی۔ تاہم آپ نے شدید ضرورت میں کسی دوسرے فقہی مسلک پر عمل کرنے کے مشورہ میں فراخدلی کا مظاہرہ کیا۔

سطور بالا میں عرض کیا گیا تھا کہ امارت شرعیہ کا قیام جو مسلمانوں کی سب سے بڑی مذہبی ضرورت ہے اُسے منظم شکل میں قائم کرنے کا انتظام ہندوستان کے تمام صوبوں میں سے صوبہ بہار کو نصیب ہوا۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے بھی بہار کی اس خصوصیت وانفرادیت کو ان الفاظ سے سراہا۔

> ''ہندوستانی صوبوں میں سے صوبۂ بہار قابل مبارکباد ہے کہ اس نے امارت شرعیہ کا ایک نظام قائم کر رکھا ہے اور اس کے ماتحت بہت سے مفید قومی و مذہبی امور انجام پا رہے ہیں۔ اگر دوسرے صوبے بھی اس فریضہ کی اہمیت کا احساس کریں اور اس کی ادائیگی میں لگ جائیں تو ان کی اجتماعی قوت سے ہر صوبہ کی مقامی حیثیت بھی قوی ہوگی اور ہندوستان میں ایک منظم محکمۂ شرعیہ قائم ہو جائے گا''۔

نصف صدی کے بعد شاہ صاحبؒ کی یہ تمنا و آرزو اس طرح بروئے کار آئی کہ جمعیۃ العلماء امارت شرعیہ اور ازہر الہند دارالعلوم نے اس فریضہ کی جانب توجہ کی اور تینوں ادارے اب جابجا شرعی پنچایت کے نظام کو وسیع اور مضبوط بنیادوں پر پھیلا رہے ہیں۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بہت سی غریب مسلمان بچیاں جو اپنے شوہر کے مظالم سے نیم جاں تھیں اور غربت و ناداری کی بناء پر عدالتوں کے دروازے پر انصاف کے لیے دستک نہیں دے سکتی تھیں۔ ان شرعی پنچایت سے فائدہ اٹھا رہی ہیں لیکن ابھی اس کی ضرورت ہے کہ اس نظام کو ہمہ گیر اور اتنا قوی کر دیا جائے کہ بے بس عورتوں کے لیے نجات پوری طرح ممکن ہو۔ ساتھ ہی اس کی بھی ضرورت ہے کہ علماء و واعظین اپنی وعظ و خطابت میں قضاء شرعی کی اہمیت، اس کی ضرورت و افادیت، مسلمانوں کے جلسوں اور مجمعوں میں بقوت بیان کریں تا کہ وہ ان اداروں سے مکمل فائدہ اٹھا سکیں۔ آخر اسی ہندوستان میں لاکھوں کی رقم اور بڑا سرمایہ سیرت کے جلسوں، مناظرہ بازی، مشاعروں اور تفریحی پرگرام کے لیے خود مسلمان ہی ضائع کر رہے ہیں پھر اگر اس مذہبی وملی مقصد کے لیے عام جلسے کیے جائیں تو بلاشبہ ان کا سرمایہ بلند ترین مصرف میں صرف ہوگا۔

دنیا میں ہر مذہب کا ایک خاص مزاج ہے۔ صیہونت اپنی تخریب کاری، عیاری، مسلم دشمنی کی ایک پوری تاریخ اپنی پشت پر رکھتی ہے۔ نصرانیت اپنی ڈگر سے ہٹ چکی اور اس کی مسخ شدہ شکل وصورت کچھ حدود وقیود رسوم ورواج میں گھر کر رہ گئی۔ اسلام بھی اپنے مذہبی دوائر میں

ایک شستہ وشگفتہ مزاج کا حامل ہے اس مذہب کا بنیادی تقاضہ مذہب کی دعوت کو عام کرنا اس کی اشاعت میں بھرپور حصہ لینا اور تبلیغ کی راہ سے اس آفاقیت کو چھوتا ہے جو اسلام کے رگ و پے میں پیوست ہے، محمد رسول اللہ ﷺ کو **انذر عشیرتک الاقربین** کے حکم کیساتھ **فاصدع بما تومر** کا بھی حکم سنایا گیا تھا بلکہ یہ بھی بتادیا گیا تھا کہ تبلیغ کے فریضہ کی ادائیگی پر رسالت کی ادائیگی موقوف ہے۔ ان ہی احکام کا نتیجہ تھا کہ ایک پیغمبر جلیل نے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر مکہ و مدینہ اور ان کے مضافات میں اسلام کی دعوت اپنے ہی حیات پاک میں عام کردی تھی۔ قرن اول اس شان کے ساتھ ابھرا کہ اسلامی جیوش کا ہر عسکری صرف مجاہد ہی نہیں بلکہ دین کا پرجوش مبلغ و داعی بھی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے زیر قیادت کفر و فساد کی خاک اڑانے کے لیے جو جنگیں لڑی گئیں ان کے مقاصد اعلیٰ وارفع ہونے کے ساتھ مبلغین اسلام کے پاکیزہ جذبات کے آئینہ دار بھی تھے ہر قدم پر بجائے ہوس ملک گیری کے اعلاء کلمۃ اللہ کا جذبۂ بے پناہ اور داعیانہ طور وطریق کا مظاہرہ ہوتا رہا۔ محمد بن قاسم ریگستان سندھ سے واپس ہوا تو وہ تمام جمع کردہ سرمایہ جو آبادی کے تحفظ کے لیے بطور ٹیکس وصول کیا تھا یہ کہہ کر واپس کردیا کہ اب ہم تمہاری حفاظت نہیں کرسکتے تو اس سرمایہ کو لینے کا بھی کوئی جواز نہیں۔ اس فاتح سپہ سالار کی یہ داعیانہ ادا اس قدر دلنشیں تھی کہ سندھ کی مفتوح قوم نے اس کے جانے کے بعد اپنے تخیلات کے مطابق محمد بن قاسم کا مجسمہ تیار کیا اور اس کی پرستش میں لگ گئے۔ عربی تجار اقصائے عالم تک پہنچے تو کاروبار ہی پیش نظر نہ تھا بلکہ اسلام کی دعوت بھی پھیلاتے ہوئے نکل گئے۔ صوفیاء اطراف و جوانب میں پھیل گئے تو اُن کے نفوس قدسیہ، ان کی خانقاہیں، اُن کے "ہوحق" کے نعرے اسلام کے متحرک دعوتی پروگرام کے اجزاء تھے۔ غرضیکہ جب تک مسلمانوں کے پیش نظر اس مذہب کا خاص مزاج رہا اور وہ اس مقصد کی توقیر و تکمیل میں ہمہ تن مشغول رہے دین ان وسعتوں اور آفاقیت سے آشنا رہا جو اس کا مزاج ہے لیکن بدقسمتی سے جب اس جہان گشت طائر اسلام نے جہاں نوردی و صحرا پیمائی کے بجائے آشیاں نشینی اختیار کی تو دین کا دائرہ بھی بتدریج سمٹنے لگا۔ علماء اسلام اپنے اس فریضہ کے احساس کو ہمیشہ دل و دماغ میں لیے رہے اور اس کی ادائیگی میں مستعد بھی لیکن افسوس کہ یہ کام منظم و مرتب انداز میں نہ ہونے کی بناء پر اتنا موثر و شاداب نہ رہا جتنا اسے ہونا چاہیے تھا۔ دارالعلوم دیوبند کے قدیم فاضل مولانا محمد الیاس علیہ الرحمہ جو شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے حلقۂ تلامذہ کے فرد ہیں کمربستہ ہوئے

اور دہلی کی ایک مسجد سے اسکے کام کا پوری توانائی کے ساتھ آغاز کیا۔ مرحوم کی سوز و تڑپ، اخلاص و آگہی، فراست ذہانت نے اس تبلیغی مہم کو عام اور شکار بنا دیا اور مبلغین کی جد و جہد، ان کی تگ و دو، ان کی مخلصانہ کاوشیں یورپ تک جا پہنچیں جمود و تعطل کے حلقے ٹوٹ رہے ہیں، حرکت و عمل ان کی جگہ لے رہی ہے، بے عملی رخصت ہوا چاہتی ہے اور خزاں رسیدہ گلستاں ایک نئی بہار کے لیے سراپائے انتظار ہے۔ جمعیۃ العلمائے ہند اپنے تاسیسی مقاصد کے اعتبار سے صرف ایک سیاسی ادارہ نہیں تھا بلکہ اس کے بانی وہ ربانی علماء تھے جن کا دل و دماغ فریضۂ تبلیغ کی ادائیگی کے احساسات سے معمور تھا وہ خوب جانتے تھے کہ اس پلیٹ فارم کو استخلاص وطن کی جد و جہد کے علاوہ اسلام کی خدمت کا بھی ایک مفید ذریعہ بنایا جائے چنانچہ امام العصر نے اپنے اسی خطبہ میں حلقۂ جمعیت کو اس اہم مقصد کی تکمیل کے لیے متوجہ کرتے ہوئے خاص اس موضوع پر بھی گفتگو فرمائی۔ ارشاد ہوا کہ

> ''مسائل ضروریہ میں سے ایک اہم مسئلہ فریضۂ تبلیغ اسلام اور پیغام توحید و رسالت کا ہے جس کے بغیر بقائے دین متین کسی طرح متصور نہیں''۔

سطور بالا میں مفصل عرض کر چکا ہوں کہ دنیا میں دعوتی دین صرف اسلام ہی ہے جسے خدائے کائنات نے انسانی دنیا کے لیے منتخب فرمایا اور کل عالم کا ایک پسندیدہ مذہب قرار دے کر اس کی اشاعتی ذمہ داریاں محمد رسول اللہ ﷺ سے لے کر قیامت تک قرناً بعد قرنٍ ان پر ڈال دی گئیں جو دین کے اساسی تعلیم اور اس کے نازک تقاضوں کی پوری واقفیت رکھتے ہیں۔

آج اگر چہ دوسرے مذاہب اپنے دعوتی دین ہونے کے دعویدار ہیں لیکن تاریخ و حقائق کی روشنی میں یہ بات نکھر کر سامنے آتی ہے کہ اسلام ہی نے ابتداء میں ایک عالم مذہب ہونے کا اعلان کیا تھا۔ سیدنا موسیٰ و حضرت عیسیٰ جو اس کائنات کے ایک بہت بڑے انسانی ہجوم کے پیغمبر جلیل ہیں وہ بھی کبھی اس کے مدعی نہیں رہے کہ ان کا لایا ہوا مذہب دنیا کا ایک عام مذہب ہے۔ انجیل ہی میں یہ موجود ہے کہ حضرت عیسیٰ تشریف فرما تھے ایک یہود عورت نے حاضر ہو کر آپ سے رہنمائی چاہی تو اس پیغمبر جلیل نے موجود حواریین سے خطاب فرمایا کہ:

> ''میرا کام صرف گم کردۂ راہ اپنے حلقہ کی بھیڑوں کی رہنمائی ہے مجھے دوسرے سے کیا سروکار اگر میں اپنے حلقہ کو چھوڑ کر دوسروں کی

قیادت کرنے لگوں تو اس کی مثال ایسی ہوگی جیسا کہ کوئی باپ اپنی
بھوکی اولاد کے سامنے سے کھانا اٹھا کر دوسروں کو دے ڈالے"۔

اس صاف وصریح اعلان کے بعد خدا جانے یہود اور عیسائی اپنے ادیان کو ایک مشنری دین ثابت کرنے کی کہاں سے کوشش کرتے ہیں۔ بنیاد ظلم اپنی ابتداء میں محدود و مختصر تھی ہر آنے والا اس عمارت کو بھیانک رنگ وروغن دیتا رہا۔ یہود اور عیسائیت تو پھر بھی آسمانی مذہب ہیں حد تو یہ ہے کہ وہ مذاہب جو صرف انسانوں کی دماغی کاوشوں کے آئینہ دار اور خام خیالیوں کے عجوبے ہیں وہ بھی آج دعوت لے کر اقصائے عالم میں گشت کر رہے ہیں۔ صورت حال کے اس مہیب پہلو پر اس سے زیادہ اور کیا عرض کیا جاسکتا ہے

تفو برتو اے چرخ گرداں تفو

امام العصر نے اپنے اس دعوے پر بطور دلیل فرمایا:

"دنیا کے مختلف مذاہب میں حق اور صحیح راہ کی تعلیم ایک ہی مذہب
دے سکتا ہے اور جو مذہب اپنے میں سچائی وراستی رکھتا ہے اس کو یہ حق
حاصل ہے کہ تبلیغ اور پیام حق کا کام انجام دے"۔

ذیلاً موصوف نے اسلام کی ان تمام خوبیوں کو مختصر بیان فرمایا جو اس مذہب کی جامعیت اور انسانی زندگی پر بھر پور احتواء کی آئینہ دار ہیں جن سے یہ واضح ہے کہ یہی مذہب اس کائنات کا حقیقی آخری اور ابدی نشان دین ہے چنانچہ آپ نے ان مذاہب پر جو دعوتی و تبلیغی ہونے کے مدعی ہیں، بچا تلا تبصرہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ مذاہب عالم مذہب بننے کی کوئی صلاحیت نہیں رکھتے فرسودہ روایات بلکہ مہمل خرافات کا ایک مجموعہ ہے جسے دین کا عنوان دیدیا گیا فرمایا:

"نصاریٰ کس چیز کی تبلیغ عالم کے سامنے کریں گے کیا مسئلہ تثلیث کی
جس کا حال یہ ہے کہ آج تک وہ اس کی حقیقت کو خود بھی نہیں سمجھ
سکے۔ خیال یہ ہے کہ دانایان فرنگ نے جو فطرتاً نفع عاجل اور فوری
نتیجہ کے طالب اور خواہشمند ہیں۔ جب یہ دیکھا کہ مفت تین خدا
ملتے ہیں تو انہیں اس کی خریداری میں کوئی تائل نہ ہوا اور کسی پس و
پیش کے بغیر بمصداق "داشتہ آید بکار" خریدار بن گئے ورنہ انہوں

نے جو تفنن طبع اور جولانی اس مسئلہ کی تعبیر میں دکھلائی ہے اور تثلیث کی تنقیح میں وقت صرف کیا ہے اس سے تثلیث کا مسئلہ تو کیا حل ہوتا کچھ بے مغز اور غیر واقعی باتوں کا ایک طومار تیار ہوگیا۔ اگر سامعین میں سے کسی نے مشہور کتاب "العقائد الوثنیہ فی الدیانۃ النصرانیہ" کا مطالعہ کیا ہو تو وہ مطلع ہوگا کہ نصرانیت کے اکثر اصول عقائد بت پرستوں سے مستفاد ہیں بلکہ اس مسئلۂ تثلیث کی تعبیرات تک بت پرستی کے گورکھ دھندے سے مستعار لی گئی ہیں"۔

جو مذہب انسان کی زندگی کے تمام گوشوں و شعبوں میں جچی تلی رہنمائی سے محروم و عاری ہے بلکہ اس کی بنیادی اساس یعنی تثلیثی خرافاتی کائنات مہمل ترین، غیر معقول، تعبیرات میں ژولیدہ ہے اسے کائنات انسانی میں امام مذہب کی حیثیت کیسے دی جاسکتی ہے اس سے آگے بڑھئے تو وہی اناجیل اربعہ جس پر عیسائیت کی خام عمارت کھڑی ہوئی ہے ان کتابوں کی بھی حیثیت یہ ہے کہ نہ ان کا مصنف معلوم، نہ سنِ تصنیف کا علم، نہ مندرجات کے صحت کی ضمانت، نہ ان کی تشریح و تفسیر میں خود عیسائی مترجمین و مصنفین متفق، بقول شاعر۔

وہاں کا ذکر کیا یہاں سر ہی غائب ہے گریباں سے

ادھر اسلام کا یہ عالم ہے کہ قرآن کا ایک ایک لفظ محفوظ، ہر حرف تغیر و تبدل سے مصئون، ختمی مرتبت رسالت مآب ﷺ کی مقدس کتاب زندگی کا ہر صفحہ روشن، آپؐ کے مشاغل و مصروفیات کی تفصیلات مہیا، اکل و شرب، نشست و برخاست، لباس و پوشاک، باہر کی زندگی، خانگی معاملات، اپنوں سے تعلق، غیروں سے روابط، عبادات اور عبدیت کے نقوش سب کچھ اس طرح واضح کہ نہ اُن میں کوئی اخفا، نہ ابہام نہ الجھاؤ، نہ ژولیدگی اور تو اور آپؐ نے اپنی حیات پاک میں جن ایک لاکھ انسانوں کی صحیح تربیت فرما کر انہیں نجوم ہدایت قرار دیا تھا ان کی زندگی بھی آفتاب و قمر سے زیادہ روشن ہے۔ اسلام اور دوسرے مذاہب کے اسی بنیادی فرق پر غور کیجئے اور پھر خود فیصلہ کیجئے کہ عالمی مذہب بننے کا حق کس کو حاصل ہے؟ صاحبِ خطبہ نے عیسائیت کے کھوکھلا پن کو واضح کرنے کے بعد مادہ پرستوں کو بھی آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ اُن کے نظریات کا

مدلل ابطال کرنے کے بعد مادہ پرستی کی جڑیں بلکہ بلا مبالغہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کاٹ کر رکھ دیں۔ خطبہ کے یہ چند صفحات خاصہ کی چیز ہیں اور بجائے خود اہل علم کے لیے مختصر ہونے کے باوجود ہزارہا صفحات کے مطالعہ سے بے نیاز کرنے والا جوہری عنصر۔ بحث کے اختتام پر علمائے اسلام کو حضرت شاہ صاحب نے متوجہ کرتے ہوئے تبلیغ کے اہم فریضہ کی ادائیگی پر پرسوز لب ولہجہ میں کچھ اہم اشارے دیئے ہیں غالباً سطور بالا میں راقم السطور ہی لکھ چکا ہے کہ تبلیغ ایسے اہم فریضہ کی ادائیگی سہل کام نہیں۔ انسانوں کی نفسیات سے واقفیت، عصری تقاضوں پر آگاہی، اصول تبلیغ پر اطلاع، متین ومہذب لب ولہجہ، شستہ وشگفتہ انداز دعوت پر حکمت اسلوب اور آخری بات یہ ہے کہ مبلغ کے کردار وگفتار میں ایک پختہ کارانہ انداز اور قول وعمل کی مطابقت جو بات میں تاثیر، سخن میں دلنوازی، دعوت میں کشش اور تبلیغ میں تاثیر پیدا کرتی ہے مطلوب ہے اگر یہ عناصر بقوۃ موجود ہیں تو تبلیغ کے فریضہ کی ادائیگی باحسن وجوہ ہوسکے گی ورنہ تو یہ کہا جاسکتا ہے اور پورے اخلاص وتاسف کے ساتھ کہ خالی خولی دعوت اسلام کے لیے مفید نہیں بلکہ مضر ہی ہوگی۔ قرآن حکیم نے انبیاء علیہ الصلوۃ والسلام کی بے لوث وبے غرض دعوتی زندگی کے چند باب سنا کر کچھ رہنما اصول فریضۂ تبلیغ کے سلسلہ میں بھی امت کے سامنے پیش کیے ہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے قرآن کریم کے اُن منتخب مقامات کو پیش فرما کر اسلام کے مخلص حلقۂ علماء کو ان ہی امام، تبلیغی آئین وضوابط پر کاربند ہونے کا مشورہ دیا ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اسلام اپنے وطن اول مکہ معظمہ، مدینہ منورہ سے نکلا اور اقصائے عالم میں پہنچا، وہ جہاں تہاں پہنچا اسلامی تعلیمات سے دل ودماغ کی کائنات کو زیروزبر کردیا، اعمال واشغال بدل گئے، زندگیوں میں تبدیلی آئی، انداز فکر بدلا، ذہنیتوں کے سانچوں میں ایک خوشگوار انقلاب برپا ہوا لیکن داخلی اثرات خارجی فضاؤں سے بہرحال متاثر ہوتے ہیں۔ انسان صحت افزاء مقام پر پہنچتا ہے اس کی تندرستی انگڑائی لیتی ہے۔ جسم میں نمو، دماغ میں نشاط، قلب میں بالیدگی، خون میں تازگی روزانہ کے مشاہدے ہیں۔ انہیں صحت افزا مقامات سے ان جگہوں پر منتقل ہوجائے جہاں کی آب وہوا خوشگوار وسازگار نہیں، صحت پر مرتب ہونے والے مذکورہ بالا اثرات ناخوشگوار تبدیلیوں کا رُخ اختیار کرلیں گے۔[1] اس لیے اسلام اپنے مرکزِ اول سے منتقل ہوکر جب اقصائے عالم میں روشناس ہوا تو مسلمانوں کو اس ملک کے اثرات نے بہرحال

متاثر کیا اس میں شک نہیں کہ اسلام سے بڑھ کر کائنات میں کوئی سادگی پسند مذہب نہیں جس میں رسوم و قیودات کا جواز تو درکنار ان کی شدید مخالفت اور سخت نکیر موجود ہے مگر اس کو کیا کیا جائے کہ وہی مسلمان جو دنیا میں امام بنا کر بھیجا گیا تھا خواہی نخواہی مقتدی بن کر رہ گیا اور اپنے ساتھ اسلام کی جانب سے بھی مزاج اسلامی سے نا آشنا حلقوں میں بدگمانیاں پیدا کرنے کا موجب ہوا۔ مسلمان ہندوستان آئے یہاں کی قدیم تہذیب وتمدن پر ان کی چھاپ پڑی لیکن خود ان کا تمدن بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ پیدائش، موت، شادی، ختنہ، محرم، شب برات، بارہ وفات، فلاں کے نام پر حلوہ اور پوریاں، فلاں کے نام کا مرغا، عرس اور قوالیاں تیزی کے ساتھ مسلم معاشرے میں داخل ہو گئیں، غضب بالائے غضب یہ ہوا کہ خود مسلمانوں ہی کا ایک کندۂ ناتراش طبقہ ان ہی مہلک رسوم کے لیے اس طرح مصر ہے کہ ایک صدی گزرنے کے باوجود اہل سنت والجماعت سے اس کی نبرد آزمائی و مقابلہ آرائی ختم نہ ہوئی حالانکہ رسول اکرم ﷺ کے عہد مبارک میں انسانی زندگی کے تمام مراحل سامنے آچکے تھے اور ہر مرحلہ کے لیے آپ کی واضح ہدایات موجود تھیں پھر ان خرافات کو معاشرۂ اسلامی میں داخل کرنے کا کیا جواز تھا؟ کیا جناب اکرم ﷺ کے عہد میں خود آپ کے یہاں اور حضرات صحابہؓ کے یہاں بچوں کی ولادت نہیں ہوتی تھی پھر کوئی بتا سکتا ہے کہ بچے کے کان میں اذان پر لاوؤں کی تقسیم، عقیقہ کے لیے لمبی چوڑی دعوت، ختنوں پر طویل ضیافتوں کا کہیں سراغ ملتا ہے۔ آپؐ ہی نے اپنی لخت جگر و نور نظر خواتین جنت صاحبزادیوں کی شادیاں کیں خود اپنی شادیاں کیں، کیا کسی حدیث میں موجود ہے کہ سہرا باندھا گیا ہو، نوشہ بنایا گیا ہو، بھاری بھرکم جہیز دیا گیا ہو یا نوشہ کی جانب سے کوئی گراں قدر مطالبہ کیا گیا ہو۔ اموات بھی پیش آئیں بلکہ کائنات کا محسن اعظم فداہ روحی ﷺ نے ہی اس عالم فانی کو چھوڑ کر جاودانی عالم کو اختیار فرمایا پھر آپؐ ہی کی وفات پر جس سے بڑھ کر دنیا کا کوئی حادثہ نہیں ہو سکتا۔ تیجہ، دسواں، بیسواں یا چالیسواں اہل بیت یا آپ کے جاں نثار صحابہؓ کی جانب سے کیا گیا؟ دریافت طلب امر یہ ہے کہ العیاذ باللہ کیا اہل بیت یا رسول اکرم ﷺ مقدس صحابہ کی آپ کے ساتھ وفاداری مشکوک تھی یا آپ کے حادثہ وفات پر وہ ملول و محزون نہ تھے۔ رنج وغم اور اس میں صادق خلوص بعد والوں ہی کے لیے مخصوص ہو کر رہ گیا۔ یہ بھی کہہ کر پیچھا نہیں چھڑایا جا سکتا کہ قرن اول کی غربت و مفلسی نے ان کو من مانی کارروائیوں سے محروم رکھا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ اصحاب النبی ﷺ کے جم غفیر

میں بلاشبہ بعض حضرات لکھ پتی سے زیادہ حیثیت رکھتے ہیں بلکہ تاریخ میں یہ بھی موجود ہے کہ بعض اصحاب النبی کے متروکہ اموال میں سونے کے بڑے بڑے ٹکروں کو توڑنے کے لیے ہتھوڑوں سے بھی کام لیا گیا تھا، غلاموں کو آزاد کرنے والی فہرست میں ان اصحاب کا بھی تذکرہ موجود ہے جنہوں نے ہزاروں غلاموں کو خرید کر آزاد کیا ہے لیکن ان کے یہاں بھی شادی، بیاہ، موت و ولادت اور دوسری چیزوں میں ان خرافات کا دور تک نشان نہیں ملتا جنہیں ہندوستان کا مسلمان اختیار کر بیٹھا اور نام نہاد اہل علم کا ایک طبقہ ان کے جواز پر موشگافیوں سے کام لے رہا ہے قصہ مختصر جمعیۃ العلمائے ہند کے تاسیسی مقاصد میں مسلم معاشرہ کی اصلاح، بدعات ومحدثات کے خلاف پر زور جدوجہد ہمیشہ سے داخل رہی ہے۔ شاہ صاحبؒ نے بھی تبلیغ کی اہمیت کے بعد تبلیغ کو صرف نماز روزہ کے دائرہ تک محدود رکھنے کے بجائے معاشرہ کی اصلاح کی حدود تک وسیع کرنے کا پرخلوص مشورہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

> ''میں آپ حضرات کا کچھ وقت اور لوں گا مجھے ان رسوم قبیحہ ومہلکہ کی اصلاح کی طرف بھی آپ کو توجہ دلانا ہے جو مسلمانوں کے معاشرہ میں داخل ہو کر گھن کی طرح اندر ہی اندر انہیں کھائے جا رہی ہیں اور افسوس کہ مسلمانوں کو اس تباہی و بربادی کا احساس بھی نہیں یہ رسوم ہندوستان کے مختلف صوبوں میں مسلمانوں میں موجود ہیں علماء کا فرض ہے کہ ان کو مٹانے میں پوری مستعدی سے متوجہ ہوں اور عامۃ المسلمین کو یہ سمجھائیں کہ وہ خدا اور رسول ہی کی صرف اطاعت کریں، آباء کی رسوم ورواج کے جاہلانہ گھروندوں سے باہر آئیں۔ مسلمانوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ بعض رسمیں تو صاف شریعت اسلامی کی خلاف بغاوت ہیں مثلاً عورتوں کو میراث سے محروم کرنا یہ اتنا بڑا ظلم اور گناہ ہے کہ اس کی سزا سوائے جہنم کے اور کوئی نہیں اور غضب یہ ہے کہ ہندوستان کے بعض صوبوں میں مسلمانوں نے اس کو بطور قانون اختیار کیا ہے۔ میں بتانا چاہتا ہوں کہ ان کا یہ طرز خدا اور رسول کے خلاف کھلا اعلان جنگ ہے''۔

بلاشبہ صاحب خطبہ نے اس پیراگراف میں اہم حقیقت کی طرف متوجہ کیا جاہلیت کے دور میں والدین اپنی بچیوں کو میراث سے محروم کرتے ان کا تخیل یہ تھا کہ میراث کا وہی مستحق ہے جو قومی، ملکی، قبائلی لڑائیوں میں شرکت کرے اور حاصل شدہ مال غنیمت میں حصہ دار رہے۔ صنف نازک یہ کام نہیں کرسکتی تھی اس لیے اپنے خیال کے مطابق اسے میراث کا مستحق ہی نہیں سمجھا گیا اسلام آیا خدا کا کلام نازل ہوا تو جناب رسول اکرم ﷺ نے لڑکیوں کے ساتھ اس کھلے ظلم کو قطعاً حرام قرار دیا۔ ایک حدیث میں ہے کہ سیکھنے اور سکھانے کے قابل تین ہی علم ہیں۔ علم کتاب اللہ، علم احادیث رسول اللہ اور فریضۂ عادلہ، فریضہ عادلہ سے مراد یہی میراث کے حقوق ان کی تفصیلات اور تشریحات کا فن ہے۔ عجیب بات ہے کہ یورپ نے ہزاروں سال لڑکیوں کے ساتھ اس زیادتی کے بعد جب انصاف کی جانب کچھ التفات کیا تو بسلسلۂ میراث اسلام ہی کے احکام وقوانین سے فائدہ اٹھایا۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے ارشاد فرمایا:

> ''علمائے اسلام نے اس علم کا ایسا اہتمام کیا کہ میراث وفرائض مستقل فن بن گیا۔ کتاب ''الفارق بین المخلوق والخالق''۔ جورد نصرانیت میں گراں قدر تصنیف ہے۔ اس میں موجود ہے کہ بعض اوقات یورپ کے لوگوں نے میراث سے متعلق ایشیائی مسلمانوں سے فتوے لیے اور شریعت اسلامی کے مطابق قانون میراث پر عمل کیا۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ جس چیز میں یورپین دانشور اسلام کی طرف رجوع کرتے ہیں خود مسلمان اس سے روگردانی کرتے ہوئے جاہلیت کی جانب لوٹ رہے ہیں اور موحد ہونے کے باوجود شرک پسند معاشرہ کے رواج اور رسوم کو اپنا رہے ہیں''

حضرت مرحوم نے اس ذیل میں امام احمد بن حنبل، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، مستدرک حاکم وغیرہ مجموعۂ احادیث سے ان احادیث کی نشاندہی کی جن میں رسول اکرم ﷺ نے والدین کے ترکہ سے مظلوم لڑکیوں کا شرعی حصہ دلوایا اور یہ بھی بتایا کہ جو والدین تحفظ جائداد کو محفوظ رکھ سکیں گے حالانکہ یہ بھی دنیا میں پیش آچکا کہ ماں باپ نے جن لڑکوں کی خاطر لڑکیوں کو محروم کیا تھا ان ہی لڑکوں نے جائداد، اندوختہ اور جمع کردہ سرمایہ تباہ و برباد کیا، اس لیے اس سلسلہ میں احکام الٰہی ہی عمل کرنے کے قابل ہیں۔ محض اپنے وساوس اور اندیشوں کے تحت اسلامی شریعت سے رو

گردانی وانحراف مثمر وبار آور بھی نہیں پھر اس بدترین رسم کی طرف بھی توجہ دلائی جو بعض صوبوں میں مسلمان معاشرہ میں 'تلک'' کے نام پر قبول عام حاصل کیے ہوئے ہے چنانچہ رقمطراز ہیں:

''کہ یہ رسم تو احکام شرعیہ کے خلاف ہونے کے علاوہ شرافت و انسانیت کے بھی خلاف ہے اور اسلام ومسلمانوں کے لیے موجب عار وننگ ہے کس قدر غضب وظلم کی بات ہے کہ جوان لڑکیوں کو اس لیے روکتے ہیں کہ جب تک ان کے اوپر ایک معتد بہ رقم نہ لے لیں نکاح نہ کریں۔ مظلوم لڑکیوں کی جوانی کا بہترین زمانہ بسا اوقات ان کے اولیاء کی حرص وطمع وظلم وسنگدلی کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے اور وہ بے زبان بے بس پڑی رہتی ہیں۔[1]

اور یہ تو صورت حال کا صرف ایک ہی رخ تھا، اسی ہمارے ظالم معاشرہ میں جو اسلام خلاف بنیادوں پر تشکیل پا رہا ہے۔ بعض صوبے کے مسلمانوں میں ''تلک'' کی اسی رسم نے دوسری اندوہناک صورت اختیار کی۔ یعنی لڑکوں کی جانب سے جہیز میں گراں قیمت اشیاء کا لڑکی والوں سے مطالبہ ہونے لگا۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن، اسکوٹر، کار، بیش قیمت گھڑیاں بلکہ معتد بہ رقم اپنی تعلیم کو باقی رکھنے کے لیے یا کاروبار کی خاطر لڑکی کے والدین سے طلب کی جانے لگی اور اس طرح مردانہ غیرت وحمیت کو بھی کچل کر رکھ دیا۔ قرآن حکیم نے تو صاف وصریح طور پر انفاق کی تمام تر ذمہ داریاں مرد پر ڈالی تھیں لیکن اس ظالم مرد نے قلب موضوع کرتے ہوئے لڑکیوں ہی سے اپنے پر خرچ کرانا شروع کر دیا۔ یوپی کے مشہور شہر ''بجنور'' میں ایک شریف لڑکی کو اپنے ہونے والے شوہر کی تعلیم کو جاری رکھنے کے مطالبہ پر خود بے پردہ ہوکر ملامت کرنا پڑی۔ ''بہار'' میں شادی کے وقت میں لمبے چوڑے مطالبوں کے بعد بھی دولہا پہلی مرتبہ سسرال جاتا ہے اور سسرال کی پوری مجبوری ومقہوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس وقت کوئی ایسا مطالبہ کرتا ہے جس کا ان غریبوں کو پہلے سے احساس تک بھی نہیں تھا اور جس مطالبہ کی تکمیل طوعاً وکرہاً اسی وقت لازم ہوتی ہے۔ کیا یہ اسلام کی تعلیمات کے مطابق ہے اور جانے دیجئے اسلام کو خود اس بربریت کے لیے انسانیت میں کوئی گنجائش ہے؟[1] اسی موجودہ ہندوستان میں آمر بالمعروف ونہی عن المنکر علماء کا طبقہ صدیوں سے ہندوستانی مسلمانوں کو اس ذلت آمیز ومہلک رسم کی قباحت وشناعت پر مسلسل متنبہ کر رہا تھا لیکن ہندوستانی رسوم ورواج کی گرفت اتنی شدید تھی کہ وعظ وتذکیر کی بھرپور کوششوں کے باوجود

اس غیر ایمانی واسلامی رواج سے مسلمان خود کو آزاد نہیں کرا سکا۔ شر اٹھتا ہے تو کبھی اس میں خدائے تعالیٰ خیر کو بھی پنہاں فرماتے ہیں۔ آزاد ہندوستان میں یہ سطور نوک قلم پر ہیں تو تلک رسم وجہیز کی کثرت پر حکومت ہند کے۔

غالباً شاہ صاحب کی زندگی میں صرف لڑکی والے ہی لڑکے سے وصولیابی کرتے، قضیہ پلٹا اور خود لڑکے نے بھی لڑکی کے والدین سے بھاری بھاری مطالبے شروع کردیئے اس لیے حضرت شاہ صاحب کے خطبہ میں رسم ورواج کی یہ دوسری زیادتی وعدوان زیر بحث نہیں آیا۔ سطور بالا میں خطبہ کا جو اقتباس گزرا اس کے ذیل میں آپ نے فقہاء کا یہ متفقہ فیصلہ بھی سنایا:

''اگر عورت کے اولیاء کچھ مال رخصتی کے وقت لیں تو شوہر کو واپس لینے کا شرعاً حق ہے کیونکہ جو کچھ لیا گیا تھا وہ کھلی ہوئی رشوت تھی۔

اس سے آگے آپ نے توجہ دلائی کہ لڑکے میں ریاست وامارت کی تلاش، ننگ انسانیت وشرافت اقدام ہے شرعی نصوص واضح ہیں کہ لڑکے میں دین دیانت، اسلام وایمان، شرافت ومروت، علم وعمل، صحتِ کردار وگفتار مطلوب ہیں۔ یہ بھی بتایا کہ ہندوستان میں بہت سے مفلوک الحال لڑکے موجود ہیں۔ جو اپنی فلاکت کی وجہ سے سسرال کا مطالبہ پورا نہیں کرسکتے اور نتیجۃً لڑکیاں بھی بیٹھی ہوئی ہیں چونکہ ان کے والدین کے طویل مطالبہ پورا کرنے والے امیر لڑکے مہیا نہیں جس کے نتیجہ میں معاشرہ دھیرے دھیرے ایک بھیانک مستقبل کی جانب قدم بڑھا رہا ہے۔ اہل علم کو توجہ دلاتے ہوئے متنبہ فرمایا کہ معاشرہ کی اصلاح اُن کا فرضِ اولین ہے انہیں مسلمان ماحول سے ان رسوم کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے اپنی توانائیاں صرف کردینی چاہئیں۔

شادی میں مہلک رسوم کے ساتھ موت کے واقعہ پر بھی مسلمان ان رواجوں کی ادائیگی میں الجھ کر رہ گئے جن کا اسلام میں کوئی جواز نہیں حالانکہ یہاں بھی محمد رسول اکرم ﷺ کی سادہ، صاف اور واضح ہدایات موجود تھیں لیکن تیجہ، دسواں، بیسواں اور چالیسواں ماحول پر اس طرح مسلط ہوا کہ موت مسلمان گھرانوں میں اپنے ہاتھوں سے خریدی ہوئی ایک بدترین مصیبت بن گئی۔ مولانا تھانویؒ نے لکھا ہے کہ تھانہ بھون کے قریب ایک غریب مسلمان کاشت کار دوڑتا ہوا دیہات میں موجود طبیب کے پاس پہنچا اور حکیم سے بولا کہ اس بار میرے بڈھے باپ کو دوادارو سے ضرور بچالو اگر آئندہ سال مرجائے تو کوئی پرواہ نہ ہوگی۔ طبیب نے وجہ پوچھی تو بتایا کہ وفات

کی صورت میں برادری کو کھانا دینے کے لیے غلہ نہیں آئندہ سال کاشت ہوگی تو غلہ مطلوب مقدار میں جمع کرلیا جائے گا۔یا اسفی ــــــ یہ اسی ایک نوجوان کی ذہنیت تھی جس کے دین و مذہب میں ان خرافات کو ممنوعاتِ شرعیہ میں بقوۃ شمار کیا تھا۔امام بریلویت نے اس اسلام خلاف رجحان کو اپنے قلم و زبان سے جو بھر پور توانائی دی اور جس طرح مسلمانوں کو تباہی کے غار میں دھکیلا کیا عند اللہ اس پر مواخذۃ نہیں ہوگا؟ خود ان ہی امام صاحب نے اپنی وفات کے بعد بہ نیت ایصال ثواب کھانوں کی جو ایک طویل فہرست تیار کی ہے جس میں پھریری دال ماش سے لے کر بریانی تک کا تذکرہ ہے اور ہضم کرنے کے لیے سوڈا واٹر اور ان نعمتوں کو گلے سے اتارنے کے لیے شربت خانہ ساز کی فرمائش! کہنا یہ ہے کہ ہندوستان کے طول و عرض میں بریلویت سے متاثر حلقہ محمد رسول اللہ ﷺ کے لیے ہوئے دین میں کوئی اس کا جواز پاتا ہے؟ لیکن طغیانی عقل و سکرات ہوش کا کسی بقراط و جالینوس کے پاس بھی علاج نہیں بات تو کڑوی ہے اور حق بات ہمیشہ کڑوی ہی ہوتی ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ اس ہندوساتن میں اسلام کی رسوائی کا واحد سبب بدعات و محدثات کا وہ مکتبۂ فکر ہے جس نے سنت کو العیاذ باللہ کچل کر اسلام کے ساتھ نادان دوست نہیں بلکہ کھلے دشمن کا معاملہ کیا ہے بقول شاعر

آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں خنجر کھلا

حضرت شاہ صاحب نے شادی سے متعلق غیر اسلامی رسوم پر اپنا دردِ دل سنانے کے بعد حاضرین کے روبرو غم موت پر رسم و رواج کے الم انگیز حوادث کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

> ''ہماری بدقسمتی کی داستان بہت طویل ہے ہم نے خود اپنے ہی ہاتھوں اپنی شادیوں کو اپنے لیے پھانسی کا پھندا بنا کر رکھا ہے اور غم کی طبعی و وقتی مصیبت کو اس سے زیادہ خطرناک اختیاری و دائمی مصیبتوں سے گھیر رکھا ہے۔ اسراف و فضول خرچی کی انتہاء ہے برادری میں ناک کٹ جانے کے اندیشے سے سودی قرضہ لے کر تباہی و بربادی کو دعوت دی جاتی ہے۔ میں خود بہت سی ایسی مثالیں جانتا ہوں بڑے بڑے صاحب جائداد و ثروت نے اپنی اولاد کی شادی کر کے خود کو نان شبینہ کا بھی محتاج کرلیا اور پھر ان کی ساری عمر

تباہی وفلاکت میں گزری حالانکہ فضول خرچی کو قرآن مجید نے اپنے
بے لاگ انداز میں کار شیطان قرار دیا ہے۔ میں بتا دینا چاہتا ہوں
کہ حق تعالیٰ جل شانہ کو مساجد کے علاوہ دوسری جگہ زینت کا اہتمام
مقصود نہ تھا اگر دوسرے مواقع پر زینت مطلوب ہوتی تو اس کو اصل
اباحت پر نہ چھوڑا جاتا اور عند کل مسجد فرما کر عموم کے مزید اہتمام کو
موکد فرمایا جس سے یہ معلوم ہوا کہ زینت مساجد کے تو حقوق و
آداب میں ہے ورنہ وہ بجائے خود مطلوب نہیں''۔

اس عالمانہ و فاضلانہ دقیق نکتۂ علمی کی جانب توجہ دلا کر موت کے
موقعہ پر بھیانک رسموں کا تذکرہ ان الفاظ میں آیا۔

''ثقہ طور پر معلوم ہوا ہے کہ بعض صوبوں میں یہ دستور ہے کہ میت کی
تجہیز و تکفین سے پہلے اہل بیت کو برادری کی دعوت کا سامان کرنا پڑتا
ہے اور بستی کے مسلمان جب تک میت کے گھر پر سامان ضیافت نہ
دیکھ لیں اس وقت تک جنازہ بھی اٹھانے کے لیے نہیں آتے،
العیاذ باللہ اس سے بڑھ کر خدا اور رسول کی مخالفت کیا ہوگی۔ مسند
امام حنبل میں بروایت جریر بن عبداللہ البجلی موجود ہے کہ حضرات
صحابہ کے زمانہ میں اس طرح کے تمام اعمال کو نوحہ میں شامل سمجھا
جاتا تھا جو شرعاً حرام اور جاہلیت پر عمل ہے۔ حافظ ابن ہمام نے فتح
القدیر میں فقہاء کا فیصلہ درج کرتے ہوئے لکھا ہے:

و یکرہ اتحاذ الضیافة من الطعام من اهل المیت لان الدعوة شرعت فی
السرور لافی الشرور وهی بدعة مستقبحة (اہل میت کا لوگوں کی دعوت کرنا مکروہ تحریمی
ہے، دعوت خوشی کے مواقع پر ہوتی ہے نہ کہ مواقع غم میں۔ یہ ایک شدید بدعت بلکہ مہلک ہے)

بلکہ میں جہاں تک جانتا ہوں شوافع و حنابلہ کا بھی یہی مذہب ہے
البتہ میت کے لیے ایصال ثواب کی نیت سے شرعی حدود میں رہتے
ہوئے بقدر استطاعت صدقہ و خیرات ہر وقت جائز و مستحقین ہے

اس پر کوئی پابندی نہیں میرا اصل مقصد اسراف وفضول خرچی، بلا وجہ کی رسوم ورواج، نمود ونمائش کی خواہش کے لیے زیر بار ہونا اور میانہ روی کو چھوڑنا اس پر نکیر ہے۔ حالانکہ رسول اکرم ﷺ نے میانہ روی کو نبوت کے چوبیس حصوں میں سے ایک اہم حصہ قرار دیا ہے۔ اس مضمون کی حدیث ترمذی شریف میں موجود ہے۔

صاحب خطبہ نے ان مہلک رسوم پر طویل خامہ فرسائی کے بعد اس سودی کاروبار پر خاص توجہ فرمائی جس سے مسلمانوں کی اقتصادی حالت تباہ و برباد ہو کر رہ گئی جیسا کہ سطور بالا میں گزرا یہ سودی قرضے بالعموم شادی بیاہ، موت و پیدائش کی غلط رسوم کی ادائیگی کے لیے کیے جاتے اور اس طرح عمر بھر کے لیے ایک بے درماں مصیبت کو خرید لیا جاتا۔ اسلام میں جن چند گناہوں کو کبائر میں شمار کیا ہے اور جن کی سزا دخول جہنم کے سوا اور کچھ نہیں ان میں سودی کاروبار ہے، سود لینا دینا، سودی کاروبار کی تحریر، اس لین دین میں گواہ بننا، سب امور گناہ کی فہرست میں شامل ہیں۔ راقم السطور کو یاد آتا ہے کہ آج سے ۲۵، ۲۶ سال پہلے مولانا عبدالحی فرنگی محلی کی ایک تصنیف "زجر الشبان و الشیبة عن ارتکاب الغیبة" مطالعہ سے گزری تھی جو کچھ اس کے حوالہ سے لکھ رہا ہوں اپنے حافظہ کی کمزوری کی بناء پر سو فیصدی صحت کا دعویٰ نہیں لیکن امید غالب ہے کہ انشاء اللہ فی الجملہ بات صحیح ہوگی۔ اس میں ایک حدیث موجود ہے کہ ماں کے ساتھ بدکاری میں جتنا گناہ ہے اس سے ستائیس گنا زائد سود لینے دینے میں ہے والعیاذ باللہ۔

اس وعید کی گہرائی و گیرائی پر غور کیجئے نیک و بد اعمال کی حقیقت پر مطلع لسان نبوت وعید کا پیرایۂ بیان اس سے زیادہ مہیب و مدہش کیا اختیار کر سکتی تھی اسلام نے ممانعت کے باوجود سودی کاروبار کو خدا اور اس کے رسول سے اعلان جنگ کے ہموزن گناہ بتایا تو محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے خاندان کے سودی قرضوں کو معاف کر کے امت کو اس راہ کی بہترین تعلیم دی تھی مگر افسوس کہ امت ہی کے معاند طبقہ نے اپنے پیغمبر جلیل کی حکم عدولی کو اس شعبہ میں بھی ترک نہیں کیا۔ ایک ملک سے "مجاہدین" کا طبقہ سروں پر خاص پگڑی، جسم پر نقش ونگار و کشیدہ کاری سے مزین واسکٹیں اور کئی گز کی شلوار پہنے ہوئے ہاتھ میں سونٹا دبائے ہوئے ہندوستان میں داخل ہو گیا اور یہاں سودی قرضوں کو دینا اور بقہر ان کی وصولیابی کے جہاد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگا(۱) اور تو اور ایک

وقت ہندوستان پر ایسا بھی گزرا کہ بعض برخود غلط مسلمانوں نے مسلمانوں کی اقتصادی تباہ حالی کا واحد سبب سودی کاروبار سے ان کا کلیۃً اجتناب و یکسوئی کو قرار دیا اور ایک صاحب نے ''سود مند'' کے نام سے ایک جریدہ کی اشاعت کر کے سود خوری کے سب سے بڑے داعی بن گئے اور دار الحرب میں کفار سے سود لینے کا جواز قاضی ابو یوسف کا فتویٰ اور اس طرح کی چیزیں بکثرت پیش (۲) کی جانے لگیں حالانکہ جس اسلام نے چودہ سو سال قبل اس کی کلی حرمت کا اعلان کیا تھا اس اسلام کے ربانی علماء اور قانون کے شارح اسلام سے کھلی بغاوت کے کیسے مرتکب ہوتے؟ بہر حال حضرت شاہ صاحب نے صورت حال کی تباہی و بربادی پر توجہ دلاتے ہوئے ارشاد فرمایا:

> ''سود کی مثال جذام کے مرض جیسی ہے جو بڑھتا ہی جاتا ہے اور کم نہیں ہونے پاتا۔ حسب قواعد شرعیہ محمدیہ ﷺ سود ایک لعنت ہے جو دینے والے، لینے والے، کھانے والے، کھلانے والے، اس پر گواہ بننے والے اور اس کی تحریر لکھنے والے پر مساوی طور پر تقسیم ہوتی ہے۔ یہ دنیا میں روحانی و اخلاقی جذام ہے اور آخرت میں جہنم کا موجب ہے''۔

بلکہ صاحبِ خطبہ نے بعض اسلامی ریاستوں کی تباہی کا سبب نصاریٰ سے بھاری بھاری رقوم، بطور سود لینا اور عدم ادائیگی کے نتیجہ میں ریاستوں کا ہاتھ سے نکل جانا قرار دیا ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے اس مہلک مرض سے نجات پانے کے لیے جمعیۃ العلماء کو توجہ دلائی کہ وہ اپنے مبلغین کے ذریعہ قریہ قریہ، گاؤں گاؤں مسلمانوں کو سودی کاروبار کی ہلاکت پر مطلع کریں اور خدا اور اس کے رسول سے اعلان جنگ کی تباہی و بربادی ذہن نشین کرائیں۔ بیت المال قائم کیے جائیں اور مسلمانوں کو ان کی حقیقی ضرورتوں میں بطور قرض بلا سود رقم مہیا کی جائیں۔ الحمد اللہ کہ اس تجویز کی سب سے پہلی تکمیل قصبہ دیوبند میں بروئے کار آئی اور یہاں مسلم فنڈ قائم کیا گیا جس کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ ایک حجرہ میں ایک محرر چند رجسٹر لے کر بیٹھ گیا کچھ رؤسا نے اپنی رقوم بطور تعاون یا بطور امانت فنڈ کے سپرد کر دیں۔ دس سال کے عرصہ میں اس مسلم فنڈ نے مادی ترقی کی تو اس اعلیٰ پیمانہ پر کی کہ آج دیوبند میں اس کی ذاتی ایک وسیع ترین خوبصورت مضبوط عمارت ہے۔ اندرونی نظام کسی ترقی یافتہ اعلیٰ بینک سے کم نہیں پندرہ بیس آدمیوں کا عملہ مصروف خدمت اور دس سال کے عرصہ میں ڈیڑھ کروڑ کی رقم اب تک ضرورت مندوں کو دی جا چکی جس سے ہزاروں

مسلمانوں کو رہائش، کاروبار، لین دین اور حوائگی ضرورتوں میں عظیم مدد ملی خود راقم الحروف کا مکان اسی مسلم فنڈ سے حاصل کیے ہوئے قرضہ سے تکمیل کو پہنچا۔

اب سوچئے کہ اگر غریب مسلمان ڈیڑھ کروڑ کی رقم سود پر لیتا تو کتنی بڑی رقم ادائیگی سود میں نکلنے کے باوجود زر اصل بدستور باقی رہتا جس سے ان کی اقتصادیات کا ڈھانچہ شکست و ریخت ہونے کے ساتھ ابدی عذاب کا پیش خیمہ بن جاتا۔ دیوبند کے اس مسلم فنڈ کو دیکھ کر اور اس کی طویل افادیت کا جائزہ لینے کے بعد ہندوستان میں اب تک مختلف مقامات پر تقریباً سو مسلم فنڈ قائم ہو چکے بلاشبہ یہ کارنامہ جو جمعیۃ العلماء کے پروگرام کی ایک تکمیل ہے بانیوں کے لیے ذخیرہ آخرت اور ماشاء اللہ بہترین اجر کا ذریعہ ہوگا۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے اسی خطبہ میں تحفظ اوقات مسلمین پر بھی توجہ دلائی۔ ممالک اسلامیہ کا تو کیا ذکر خود ہندوستان میں کرروڑوں کی جائداد و اوقاف مسلمانوں کی نااہلی سے تباہ و برباد ہو رہے ہیں سینکڑوں خانقاہیں ہزاروں اہل اللہ کی قبور اور ان قبرستانوں کے ساتھ لمبے چوڑے اوقاف ان نااہل مسلمانوں کے قبضہ میں پھنسے ہوئے ہیں جنہیں نہ قرآن کا علم، نہ حدیث سے واقفیت، نہ فقہ کی شدھ بد، نہ مسائل کی معلومات، نہ ان میں دیانت نہ امانت، نہ ثقاہت و متانت، اوقاف کی گراں بار آمدنی کو بے تحاشہ اپنی رنگ رلیوں پر بلکہ عیش کوشیوں پر ضائع کر رہے ہیں اور غرار ہے ہیں۔ مسلمان بادشاہوں نے اپنی عقیدتوں میں ہزاروں اوقاف کیے جن کی آمدنی لاکھوں مسلمانوں کے کاروبار، دینی درسگاہوں اور مساجد کے کام آتی۔ لیکن بدقسمتی سے یہ ایسے ہاتھوں میں الجھے ہوئے ہیں جو حاصل شدہ سرمایہ کلیۃ برباد کرتے ہیں۔ جمعیۃ العلماء کے مقاصد میں ان اوقاف کا تحفظ اور غلط کاروں سے واگزاری بھی ہے اس سلسلہ میں فرمایا:

> ''اس وقت جن مسائل کی طرف مسلمان رہنماؤں کی توجہ ضروری ہے ان میں خاص مسئلہ اوقاف کی صحیح تنظیم کا ہے اس لیے کہ مشاہد ہے اسلامی اوقاف کی کروڑوں روپے کی سالانہ آمدنی صحیح مصارف میں صرف ہونے کے بجائے خودغرض متولیوں کے تنور شکم کی آگ بن رہی ہے یا امور خیر کی جگہ خواہش و معاصی میں بے دریغ صرف کی جا رہی ہے حالانکہ علماء اسلام نے تصریح کی ہے کہ وقف اسلام کی

خصوصیات میں سے ہے جاہلیت میں اس کا نام ونشان نہ تھا"۔

پھر آپ نے وقف کی حقیقت اور اس کے مصارف کی نشاندہی کرتے ہوئے بتایا:

> "وقف کا مطلب یہ ہے کہ واقف اپنی مملوکہ جائداد کو خدائے تعالی کے پاس امانت رکھ دے اور اس کی آمدنی کی مدد سے مسجد کی تعمیر، خانقاہیں، مہمان خانے، مسافر خانے، اسلامی درسگاہیں، پانی کی بہم رسانی پل وغیرہ، غرضیکہ رفاہِ عام کی چیزیں بنائی جاتیں۔ اس فائدہ رسانی کے ساتھ واقف کو مسلسل ثواب بھی پہونچتا رہے گا بلکہ علماء نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ اوقاف کی حفاظت میں نصوص شرعیہ کی حفاظت کی طرح سرگرم رہنا چاہیے"۔

مگر علماء اور ان کی تنظیم نے اوقاف کے سلسلہ میں کسی خاص سرگرمی کا اظہار نہیں کیا نتیجۃً اوقاف ایک ہی نسل کے بعد آنے والی نسل کی ذاتی جائداد بن کر رہ گئے اور متولیوں کی ایسی مملوکہ شئے جس میں کسی دوسرے کو مداخلت کا حق ہی باقی نہ رہا۔ غضب تو یہ ہے کہ ان اوقاف کے حساب کی جانچ بلکہ حساب فہمی کی راہیں بھی بقوۃ مسدود کر دی گئیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے صحیح فرمایا کہ متولیوں کی تبدیلی، سال بسال انتخاب، حساب فہمی اور ان کی ذاتی جائداد بننے سے روکنا نیز اوقاف کا تحفظ، اس سارے مفسد کا واقعی علاج ہے۔ یہ بھی ارشاد ہوا کہ:

> "اوقاف مسلمین ایک مذہبی مسئلہ ہے چونکہ اس میں عبادت وصدقہ کی حیثیت ہے اس لیے یہ مذہبی حیثیت رکھتا ہے اور ضرورت ہے کہ اس کے انتظام میں مسلمان اور ان کے علماء کے سوا کوئی طاقت واصل نہ ہوتا کہ اسلام کے احکام کی مخالفت کا اندیشہ باقی نہ رہے"۔

خدا کا شکر ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد جب ہندو پاکستان کے نام سے دو سلطنتیں وجود پذیر ہوگئیں اور جمعیۃ العلماء کو قدرے فرصت میسر آئی تو اس نے اپنی توجہات اس جانب بھی مبذول کیں۔ پروفیسر ہمایوں کبیر سابق وزیر ہندوستان، یونس سلیم صاحب اور دوسرے حکومتی ارکان نے بھرپور تعاون دیا اور بیشتر اوقاف خودغرض متولیوں کے قبضہ سے واگزار ہوگئے لیکن ابھی ضرورت ہے کہ اس سلسلہ میں مسلسل جدوجہد جاری رکھی جائے تاکہ کروڑوں روپے کی یہ آمدنی مسلمانوں

کی حقیقی ضرورتوں کے لیے صرف ہو۔ **وَالامرُ بِیداللہ**

خاتمۂ کلام پر صاحب خطبہ نے اس سب سے بڑی ضروری کی جانب امت کو متوجہ کیا جس مقصد کی دریافت میں اگر یہ امت اپنا تمام وقت اور اپنی تمام توانائیاں، اپنا علم اور اپنا فہم، اپنی تدبیر و تدبر، ریاستیں اور سلطنتیں، دولت اور امارت، عزت وعروج صرف کرنے کے بعد اس کو حاصل کرلے تو امت کی فلاح اور بقا کی ایسی راہ سامنے آئے جس کے لیے قرآن وحدیث، مذہب ودین اور محمد رسول اکرم ﷺ نے بے پناہ توجہ کی اور دلائی جس کے مسدود ہونے سے یہ امت تباہیوں کے گڑھے اور ہلاکتوں کے غار میں جاپڑی۔ یعنی مسلمانوں کا باہمی اتحاد، تعاون، اتفاق مرکزیت واجتماعیت اور دلی توافق جناب رسول اللہ ﷺ نے اس مقصد جلیل کو حاصل کرنے کے لئے بڑی سعی وکاوش فرمائی اور امت کو امت متحدہ بنانے کے لیے وقت کا سب سے برا یہ گر سمجھایا اور سکھایا مگر اسی موقف کو چھوڑنے پر امت کا شیرازہ جس طرح منتشر ہوا اور جو اس کے تلخ نتائج سامنے آئے اس کی داستاں بڑی دلدوز ہے۔ اس میں شک نہیں کہ امت کو درپیش اس مسئلہ کی اطلاع النبی الصادق نے چودہ سو سال پہلے سنادی تھی کہ یہ امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہوکر رہے گی لیکن اس کے باوجود آپ نے اپنی مقدس حیات کے قیمتی لمحات اس اعلیٰ وارفع مقصد کو حاصل کرنے کے لیے صرف فرمائے۔ آخر روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ انسان بیمار ہوتا ہے حاذق اطباء و ڈاکٹر اس کی موت کی پیشین گوئی کرتے ہیں لیکن پھر بھی نہ مریض اور نہ اس کے اعزہ واقارب اسے مایوس العلاج سمجھتے بلکہ تمام ناکامیوں کے باوجود گئی ہوئی صحت کو حاصل کرنے کے لیے مسلسل تگ ودو جاری رہتی ہے معاشرہ کے کسی فرد پر مسلسل ناکامیوں کا بوجھ، ہمت شکن اور حوصلہ فرسا ہوتا ہے لیکن یاس انگیزیوں کے باوجود وہی فرد اپنی دوڑ دھوپ میں کمی نہیں آنے دیتا۔ پھر یہ بھی دیکھا کہ حرماں نصیبی کی گھٹا ٹوپ اندھیریوں کے پیچھے سے امید کا آفتاب اپنی شعاعیں زمین پر ڈالتا ہے پھر آخر کیا وجہ ہے کہ خاص امت میں پیدا شدہ داخلی انتشار کو ایک ایسا حادثہ سمجھ لیا گیا جس کے علاج اور تدارک کو سب سے بڑی مشکل سمجھا جارہا ہے حالانکہ اگر ایک جانب جناب رسول اکرم ﷺ نے امت کے انتشار وعدم مرکزیت کی پیشن گوئی فرمائی تھی تو دوسری جانب قرآن وحدیث کی نصوص اس مقصد کے حصول کی راہیں بھی ہموار بتائی ہیں اگر یہ مقصد دریافت کرنا اور اس کی بازیافت قطعاً ممکن نہ ہوتی تو حدیث وقرآن میں اس طرح کے اشارے خاکم

بدہن مہمل ہوں گے۔ اس طبیب کے متعلق آپ کیا فیصلہ کریں گے جو مریض کو بازیابی صحت سے مایوس کرنے کے باوجود پھر تدابیر حصول صحت میں بھی مصروف ہے یہی نہ کہ وہ ایک دیوانہ وجنون میں مبتلا طبیب ہے جسے دانش وبینش سے کوئی سروکار نہیں[1]۔ مقصد ان سطور کا اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ اتحادِ امت میں پڑے ہوئے شگاف کو دور کرنے کے لیے امت کے ہر فرد کو بہترین کوششیں بہرحال کرتے رہنا چاہیے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے ان آیات قرآنی و احادیث رسول اکرم ﷺ کا حوالہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

> ان نصوص قرآنیہ و حدیثیہ سے صاف ثابت ہے کہ مسلمانوں کے درمیان اسلام اور ایمان کا ایسا مضبوط رشتہ قائم ہے جس نے تمام مختلف افراد واشخاص کو جسم واحد کے حکم میں کر دیا اور جس قدر یہ تعلق قوی اور مضبوط ہوتا جاتا ہے اسی قدر جسم واحد کے آثار اس پر متفرع ہوتے ہیں"۔

ذیلاً یہ بھی واضح کیا کہ اصل حاکم ایمان و اسلام کو ہونا چاہیے اور پھر اسلامی قومیت کے تمام اعضاء وارکان انہیں کے ماتحت کام کریں اس طرح امت کی شیرازہ بندی بلاشبہ قائم و باقی رہے گی اور اس اتحاد و اتفاق میں کوئی شگاف نہیں پڑ سکے گا جو اسلام مسلمانوں کے درمیان چاہتا ہے اس کے لیے ضرورت ہوگی کہ وہ تمام اخلاق فاضلہ اور اعمال صالحہ اختیار کیے جائیں جو مرکزیت کو وجود میں لانے اور باقی رکھنے کے ضامن ہیں۔ مطلوبہ مقصد کو حاصل کرنے کے بعد اور مقصد وہی جمعیت و اتحاد ہے تو پھر مسلمانوں موجودہ نکبت، ذلت، تب آہی و بربادی سے نکل کر اپنی قدیم رفعت و عروج ترقی و استحکام حاصل کر سکتے ہیں۔ صاحب خطبہ کی بھی بشارت ہے کہ:

> "اگر آج بھی مسلمان ان صفات ایمانیہ کے ساتھ متصف ہوں تو ان کو وہی عروج و ترقی، وہی رفعت و بلندی نصیب ہو جو قرون اولی میں حاصل تھی"۔

فیض روح القدس او باز مدد فرماید
دیگراں نیز کند آنچہ مسیحا می کرد

اختتام خطبہ پر مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ صدر جمعیۃ العلمائے ہند، مولانا احمد سعید

ناظم اعلیٰ جمعیۃ العلمائے ہند کی وقیع خدمات کا کھلے جذبات سے اعتراف کرتے ہوئے ''جمعیۃ'' کے وجود میں روح، بالیدگی اور استحکام کا ہر دو کو ذمہ دار قرار دیا ہے اس طرح یہ طول وطویل خطبہ جو اسی صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور جس کے جا بجا اقتباسات خاکسار نے نظر قارئین کیے اس سے حضرت موصوف کے سیاسی خیالات وافکار اور اس راہ میں بصیرت اور وادیٔ سیاست کی پر پیچ راہوں پر ان کی واقفیت آشکارا ہے۔ یہ خطبہ جمعیۃ العلماء کے صدارتی خطبوں میں اس لحاظ سے بلاشبہ ممتاز و منفرد ہے کہ عام خطبات میں صرف وقتی مسائل کا ذکر و تذکار ہوتا ہے لیکن شاہ صاحب نے جمعیۃ العلماء کے اساسی مقاصد، ملی حقیقت مشکلات کا واقعاتی حل جس عالمانہ وفاضلانہ انداز میں تجویز کیا ہے اس سے دوسرے صدارتی خطبات خالی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس خطبہ کے مضامین کو دلیل کے طور پر بلکہ ایک ماخذ علمی کے انداز میں استعمال کیا گیا اور انشاء اللہ کیا جاتا رہے گا۔ حال ہی میں پاکستان کے مشہور مجلّہ ''الرشید'' نے جو اپنا تاریخی ومثالی دار العلوم دیوبند نمبر شائع کیا ہے اس میں مولانا مفتی محمود[1] سابق وزیر اعلیٰ صوبہ سرحد نے اس خطبہ کے متعلق تحریر فرمایا:

> ''حضرت علامہ انور شاہؒ آپ نے پشاور جمعیۃ العلماء ہند کی عظیم الشان خطبہ میں جو خطبۂ صدارت دیا ہے اور جس میں حضرت شیخ الہند کے مقاصد کی وضاحت اور ترک موالات پر دلائل و براہین کے انبار لگائے ہیں وہ حضرت شاہ صاحب کا مخصوص حصہ ہے''۔

مفتی صاحب ہی نے یہ بھی اطلاع دی ہے کہ حضرت شاہ صاحب ہی کے دلائل کے نتیجہ میں جمعیۃ العلماء نے پشاور میں ''سائمن کمیشن'' کے بائیکاٹ کا متفقہ فیصلہ کیا تھا۔ بہر حال اگرچہ شاہ صاحب نے سیاسیات میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا لیکن اس کے باوجود وہ نظریاتی طور پر جمعیۃ العلماء ہند سے وابستہ اور اپنے استاذ الامام شیخ الہند کی تحریک استخلاص وطن کے باضابطہ رکن تھے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بعض رجال کار کے نمایاں کارنامے منظر عام پر نہیں آئے لیکن کسی بھی گوشہ میں ان لوگوں کی بصیرت، دوررسی اور مال کار پر گہری نظر انہیں عام لوگوں سے ممتاز کرتی ہے ۱۸۵۷ء کے فرنگی استبداد کے استحکام کے بعد ۱۹۴۷ء میں اسی بدیشی اقتدار کو اکھاڑ پھینکا گیا اور انگریز اپنی طاقت کا پشتارہ اٹھا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہندوستان سے رخصت ہوا۔ جس حکومت کے حدودِ اقتدار اس قدر وسیع تھے کہ بقول عام افراد اس کی جہانبانی میں آفتاب

نہیں ڈوبتا تھا'' اور جس کی تدبیر و تدبر، فکر و حزم، مال اندیشی اور عاقبت بینی کی خصوصی صلاحیتیں دنیا میں موجود تمام اقوام میں فائق ہیں۔ وہ ہندوستان سے اپنے اقتدار کے طویل و عریض سلسلہ کو سمیٹنے کے لیے کیوں مجبور ہوا۔ کیا تحریک آزادی کے تابڑ تور حملوں نے اسے اس کے لیے مجبور کر دیا آنجہانی گاندھی جی کے اہنسائی فلسفہ نے اس کو پابر زنجیر بنا ڈالا یا پھر سردار پٹیل کی خاص کوششوں کے نتیجہ میں ''بحریہ'' میں بغاوت کے آثار بلکہ باغیانہ تحریک کے پھیلنے و بڑھنے کے خطرہ نے انگریز کو ہندوستان چھوڑنے کی راہ سجھائی یا پھر ۱۹۳۹ء سے شروع ہونے والی خوفناک جنگ عظیم نے برطانیہ کے اقتصادی و معاشی ڈھانچے کو اس طرح تباہ کیا کہ وہ اپنی گرفت ہندوستان پر کچھ اور عرصہ کے لیے باقی نہیں رکھ سکتا تھا ہمارے اس دور کے اصحاب فکر و ارباب نظر فرنگی اقتدار کے اسباب و زوال پر جب کچھ لکھتے ہیں تو ان کی خیال آفرینیاں مذکور وجوہ سے آگے نہیں جاتیں۔ یہ خاکسار اس سے انکار نہیں کرتا کہ عروج کے بعد زوال کا جو واقعہ پیش آیا ہو سکتا ہے کہ اس کے اسباب وہی ہوں جنہیں آپ کے سامنے ذکر کیا ہے لیکن آپ ایک گوشہ نشین عالم کی اس حقیقت پسندی کا بھی مطالعہ کیجیے جس کی بناء پر انہوں نے ٹھیک اس وقت فرنگی زوال کی پیش گوئی کی تھی جب اس طرف اہل بصیرت متوجہ بھی نہیں تھے اور اپنی اس پیش گوئی کے لیے ایک ایسا استدلال تلاش کیا جس کے واقعاتی ہونے میں ذرا بھی شبہ نہیں۔ شاہ صاحب درس اور عام مجالس میں عموماً فرماتے:

> ''ہمیں یقین ہو گیا ہے کہ انگریز ہندوستان سے نکل جائے گا کیونکہ اس نے قدرتی اشیاء پر بھی ٹیکس عائد کر دیا ہے۔ ہوا پر ٹیکس، فضا پر ٹیکس، نمک پر ٹیکس غرضیکہ جن چیزوں کو قدرت نے آزاد کیا تھا ان پر پابندی قدرت کا کھلا مقابلہ ہے اور قدرت سے مقابلہ کرنے والی طاقتیں بہت زیادہ عرصہ تک باقی نہیں رہتیں''۔

یہ استدلال بہت سوں کو چونکا دینے والا ہوگا لیکن جو ربوبیت اعلیٰ کے مظاہر ان کے لگے بندھے انتظام اور ایک خاص در و بست پر نظر رکھتے ہیں وہ اس کو تسلیم بھی کریں گے اور اس کی ندرت کو سراہیں گے بھی۔ بہر حال اس سے تو انکار نہیں کہ حضرت ممدوح کی شخصیت کا اصل کمال علم و فن کی جلوہ گری و جلوہ نمائی ہے تاہم سیاسی نشیب و فراز میں ایک گہری بصیرت اور حقیقت شناسی کے جوہر سے آپ پوری طرح متصف تھے۔

●●

سیاسی وملی افکار

مولانا فاروق اعظم عاجزؔ قاسمی، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

آٹھ دہائی پہلے ۱۹۲۷ء میں حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے پیش کیے اس خطبے کا اس وقت جائزہ لیا جا رہا ہے جو صرف خطبہ ہی نہیں؛ بلکہ ایک علمی، ادبی اور تاریخی دستاویز ہے۔ جمعیۃ علمائے ہند کے آٹھویں اجلاس عام [پشاور] میں حضرت کشمیریؒ نے اس صدارتی خطبہ کو پیش کیا تھا۔ اصلاً تو اس خطبے کو علامہ نے بزبان فارسی قلم بند کیا تھا؛ لیکن اسے اردو کا خوب صورت لباس مفتی کفایت اللہؒ نے عطا کیا اور ترجمہ ہی نہیں؛ بلکہ ترجمانی کا بھی حق ادا کیا، جو بعد میں مولانا انظر شاہ کشمیری مرحوم کے وقیع مقدمہ کے ساتھ ''خطبۂ صدارت'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوا، اس خطبہ کو اشرف المخلوقات کا تفوق، انسانوں میں مومن کا امتیاز، مومن وغیر مومن کے باہمی ربط وتعلق کے حدود وقیود، سیکولرزم کا صحیح مفہوم، اس وقت کے ہندوستانی اسلامی معاشرہ میں پھیلی ہوئی خرافات اوران کے انسداد کی تدابیر اور انگریزوں کی خطرناک چالبازیوں پر مختصر مگر انتہائی جامع، مکمل اور مدلل انسائیکلوپیڈیا کہنا چاہیے۔

قرآن وحدیث اور دیگر علوم وفنون میں خدا نے علامہ مرحوم کو جو حذاقت ومہارت عطا کی تھی وہ تو مسلم ہے ہی؛ لیکن لوگ انھیں اس زاویے سے کم جانتے ہیں کہ وہ علامۃ الدھر ہونے کے ساتھ عالمی حالات سے بھی گہری واقفیت اور سیاست پر مبصرانہ نظر رکھتے تھے۔ علامہؒ کی اسی عبقریت کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر اقبالؒ نے کہا تھا کہ ''گذشتہ پانچ صدیوں میں اتنا بڑا عالم دنیا میں پیدا نہیں ہوا'' اور شاعر مشرق ہی نے آپ کی وفات کے موقع پر وہ معروف شعر بھی کہا تھا جسے آج ہم ع

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا — والے مصرعے سے جانتے اور گنگناتے ہیں۔

علم میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیو بندیؒ [بانی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی] کے تلمیذ رشید اور خوشہ چیں تو تھے ہی؛ لیکن ان کی سیاسی تحریک ''ریشمی رومال'' کے مضبوط سیاسی عنصر بھی تھے۔ ایک حقیقی شاگرد کے دل میں اگر استاذ کی عظمت ووقعت ہوتی ہے تو استاذ کو بھی اپنے اس شاگرد پر فخر اور مکمل اعتماد ہوتا ہے اور استاذ کے پاس جو بھی سرمایہ ہوتا ہے وہ اپنے چہیتے شاگرد کو وراثت میں دینے کے لیے کوشاں رہتا ہے اور ہونہار شاگرد بھی اس وراثت کی حفاظت اور اس کی روایت کی برقرار رکھنے اور آگے بڑھانے میں سردھڑ کی بازی لگادیتا ہے۔

ایسا ہی کچھ تعلق حضرت شیخ الہندؒ اور محدث عصر علامہ کشمیریؒ کے مابین تھا۔ علامہ موصوف جہاں علوم ومعارف میں اپنے استاذ کے حقیقی جانشین تھے وہیں وراثت میں سیاسی بصیرت بھی ان کے حصہ میں آئی تھی جس کا اندازہ مذکور خطبے سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔

حیرت کی بات ہے کہ ایک شخص خالص علمی ہے، دن رات اسلامی علوم کی چھان بین اور تفحص وجستجو میں گزر رہے ہیں، چال ڈھال، رفتار وگفتار اور نشست وبرخاست سے بظاہر کچھ سمجھ میں نہیں آتا، ان کے اسفار بھی محدود، میلے ٹھیلے سے گریز اور جلسہ جلوس سے بھی بے نیازی؛ یہاں تک کہ چالیس پینتالیس سال تک شادی بیاہ کی الجھنوں سے بچتے رہے، مشغلہ صرف اور صرف علم، بطور خاص اسلامی علوم۔

علامہ مرحوم کے علمی انہماک کے لیے ''اوڑھنا بچھونا'' والا محاورہ بھی اوچھا سا محسوس ہوتا ہے۔ علامہ کا علمی مشغلہ ہمہ وقت ان کا مصاحب رہتا تھا، دیکھنے والے نقل کرتے ہیں بارہا علامہ موصوف کو دیکھا جاتا کہ لوٹا لے کر بیت الخلاء جاتے اور واپس ہوجاتے۔ تحقیق کے بعد معلوم ہوتا کہ راہ چلتے بھی علمی جستجو جاری ہے، راہ چلتے ہوئے کوئی علمی نکتہ سمجھ میں آجاتا تو تمام ضروریات کو ترک کر کے اسی میں مشغول ہوجاتے۔

آج کے پرآشوب حالات کے پیش نظر مذکورہ خطبہ کی عصری معنویت اور اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔ علامہ کی اس شاہکار تحریر کا اگر کوئی گہرائی سے مطالعہ کر کے اس کا تجزیہ کرے تو بجا طور پر اسے یہ کہنا پڑے گا کہ شریعت محمدی اور اسلامی علوم میں جو وسعت وکشادگی ہے اس سے دیگر تمام مذاہب وعلوم خالی ہیں۔

اس دستاویز سے اس بات کا اندازہ لگانا بھی زیادہ مشکل نہیں ہے کہ دنیا والے اپنی تنگ نگاہ میں بظاہر بوریوں پر بیٹھنے والے ان خرقہ پوشوں پر کتنی ہی تنگ نظری کا حکم لگائیں؛ لیکن حقیقی

معنوں میں دنیا کے انتظام وانصرام کی باگ ڈور سبھال کر ترقیوں کے عروج پر اسے پہنچانے کی جو بے پناہ صلاحیت واستعداد ایک اسلامی علوم کے حامل مستخص کے اندر موجود ہے اس سے دوسرے لوگ محروم ہیں۔اس کی شاندار تصویر خلافتِ راشدہ اور خلافتِ راشدہ کے ڈگر پر چلنے والی بعد کی اسلامی حکومت کے آئینہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اب اجمالاً خطبہ مذکور کا جائزہ سپرد قرطاس کیا جارہا ہے۔

ملی نظام:

بغیر نظم وانتظام کے کوئی ملک اور شہر تو دور ایک گھر بھی نہیں چل سکتا ہے۔ عالم کی بزنگیوں اور لوقلمونیوں کے باوجود اس میں نظام ترتیب کا ہونا ضروری ہے؛ ورنہ باہمی ٹکراؤ سے نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔اس خیال کے اظہار کے بعد علامہ موصوف نے مجموعہ عالم کو عالم اکبر ''سے تعبیر کرتے ہوئے اس کو عالم اصغر''یعنی انسان پر منطبق کر کے بتایا کہ جس طرح وجود انسانی کا نظم قلب ودماغ اور جوارح کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا ہے؛ کیونکہ تمام ملکات واخلاق کا حامل ومنبع ''قلب'' ہے اور معارف وعلوم کا حامل دماغ اور تمام اعمال وافعال کے مظاہر جوارح ہیں۔ٹھیک اسی طرح عالم اکبر کے لیے بھی قلب ودماغ اور اعضاء وجوارح ہیں۔اس کا''قلب''اولی الامر یا اصحابِ حل وعقد ہیں،''دماغ''حکما وعلماء اور اس کے اعضاء وجوارح عامہ افراد خلق۔

پھر ان فی الجسد مضغۃ الخ.....والی حدیث ذکر کر کے خلاصہ کے طور پر تحریر فرماتے ہیں:''عالم کی نیرنگیوں اور اس کے نظام کے بارے میں اس مختصر گزارش سے واجب الوجود کی ہستی اور توحید اور خالقیت اور الوہیت کی قوی دلیل سمجھی جاتی ہے نیز اس مسئلے پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے کہ جب مجموعۂ عالم محتاج نظام ہے تو ہماری حیات ملی اور اس کی بقا بھی بغیر کسی نظام کے باقی نہیں رہ سکتی،حقیقت امر یہی ہے کہ منتشر افراد اور پراگندہ اشیاء میں کبھی حسن نہیں ہوتا،حسن ہمیشہ صحیح ہیئت ترکیبی ہی پر موقوف ہے اور نظام کی روح یہ ہے کہ اجزاءِ عمل کو صحیح طور پر تقسیم کیا جائے جو شخص جس جزء کا اہل ہو وہی اس کے سپرد کیا جائے اور وہ اپنی مفوضہ خدمت کو پیش نظر رکھ کر نتیجۂ واحدہ اور مقصد توحید کی طرف گامزن ہو اور ہمیشہ ید اللہ علی الجماعۃ [ترمذی] یعنی خدا کی نصرت جماعت کے ساتھ ہی ہوتی ہے''ہمیشہ اس پر نظر رکھتے''۔[ص ۱۸]

قوم وملت کی درست رہنمائی اور بقاء کے لیے تنظیم کی ضرورت کو سمجھانے کے بعد''جمعیۃ

علماء ہند" کے قیام کا مقصد خود بخود سمجھ میں آجاتا ہے۔اس کے بعد علامہ نے جمیۃ کی قومی وملی خدمات کا ایک اجمالی خاکہ پیش کیا اور مسلمانوں کے مختلف گروہوں میں باہمی مصلحت ورواداری کی راہ ہموار کرنے کے سلسلے میں جمیۃ نے جو اہم اقدامات کیے ان کو روشن ونمایاں کارنامہ قرار دیا۔

چوں کہ یہ وہ زمانہ ہے جب ہندو مسلم دونوں مل کر انگریزوں کے خلاف محاذ آرائی کی کوشش میں لگے ہوئے تھے اس کے باوجود غداروں کی ایک ٹولی ہندو مسلم کے درمیان نفرت کے بیج بونے کا کام کر رہی تھی اور پوری سرگرمیوں کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف نئے نئے مسائل کھڑے کر رہی تھی؛ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے علامہ مرحوم "متحدہ قومیت" پر زور ڈالتے ہوئے دونوں قوموں کے زعما کو مشورہ دیتے ہیں:

"اگر دونوں قوموں کے زعما مل کر کوئی ایسا منصفانہ معاہدہ مرتب کر لیں جو دونوں کے لیے موجب اطمینان ہو اور دونوں قومیں اپنی اپنی جگہ عزت اور آزادی کے ساتھ اپنے اپنے مذہبی فرائض پورے کر سکیں تو اس سے زیادہ ہندوستان کے لیے خوش نصیبی کا اور کیا ذریعہ ہو سکتا ہے"۔[ص۳۱]

مزید فرماتے ہیں....

"میں پورے وثوق کے کہہ سکتا ہوں کہ اگر برادران وطن آج بھی رواداری اور اتفاق کی جانب مائل ہوں تو مسلمانوں سے زیادہ کوئی قوم صلح جو اور وفادار اور حسن اخلاق کا معاملہ کرنے والی نہ ہوگی"۔[ص۳۱]

مسلمانوں نے ماضی میں ہندوستان کو کس مقام پر پہنچایا اور آج بھی مسلمانوں کو اپنے وطن "ہندوستان" سے کتنی محبت ہے اور اس محبت کے پیچھے کون سا جذبہ کارفرما ہے اس پر روشنی ڈالتے ہوئے غیر مسلم کے ساتھ معاہدہ کی کیا صورت ونوعیت اور شرائط وقیود ہونی چاہییں اس کی وضاحت کرتے ہیں:

"مجھے یہاں پر یہ بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ ہندوستان جس طرح ہندوؤں کا وطن ہے اسی طرح مسلمانوں کا بھی وطن ہے، ان کے بزرگوں کو ہندوستان آئے ہوئے اور رہتے ہوئے صدیاں گزر گئیں، انھوں نے اس ملک پر صدیوں حکومت کی، آج بھی ہندوستان کے چپہ چپہ پر مسلمانوں کی شوکت ورفعت کے آثار موجود ہیں جو بان حال سے ان کی علم ہنر پسندی، حب

وطن کی شہادت دیتے ہیں، موجودہ نسل کا خمیر ہندوستان کے آب و گل سے ہے، ہندوستان میں ان کی مذہبی اور تمدنی عظیم الشان یادگاریں ہیں، کروڑوں روپیہ کی جائدادیں ہیں، عالی شان تعمیروں اور وسیع قطعات زمین کے وہ مالک ہیں، ان کو ہندوستان سے ایسی ہی محبت ہے جیسی کہ ایک سچے محب وطن کو ہونی چاہیے اور کیوں نہ ہو جب کہ ان کے سامنے اپنے سید و مولیٰ، اپنے محبوب آقا علیہ السلام کا ''حب وطن'' میں ''اسوۂ حسنہ'' موجود ہے۔ [ترمذی] [ص ۳۳]

پھر ہندوستان کو دارالامن قرار دیتے ہوئے اس معاہدہ کی تفصیل بیان کی جو ہجرت کے ابتدائے زمانے میں مسلمانوں اور یہود مدینہ کے درمیان طے پایا تھا۔ اخیر میں خلاصہ کے طور پر فرماتے ہیں: ''ہندوستان میں ہی دونوں قوموں کو رہنا اور زندگی بسر کرنا ہے اور دونوں کا وطن یہی ہے؛ اس لیے ہر فرد ہندوستان کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسی فضا پیدا کرنے کی کوشش کرے جس سے یہ روز کا جدال و قتال مندفع ہو اور ہر شخص امن و اطمئنان سے زندگی بسر کر سکے''۔ [ص ۴۲]

تجاویز اتحاد کانفرنس کلکتہ:

چوں کہ ہندو مسلم کی حیثیت ہندوستان جیسے عظیم ملک کے دو چکے کی مانند ہے، کل بھی یہ بات تھی اور آج بھی ہے اور ہر زمانہ میں بدمعاشوں کے ساتھ ایک گروہ انصاف پسندوں اور امن پسندوں کا بھی رہا ہے۔ اسی کے پیش نظر اسی زمانہ میں دہلی اور کلکتہ میں ہندوستان کے سرکردہ حضرات کی قیادت میں ''اتحاد کانفرنس'' منعقد ہوئیں، اس سلسلے میں ''ڈاکر مونجے''، ''فالوی جی''، ''لالہ لاجپت'' رائے اور ''سوامی شردھانند'' وغیرہ ہندو زعماء پیش پیش تھے۔

ہندوؤں کو شکایت تھی کہ گائے ذبح کر کے ہماری دل آزاری کی جاتی ہے اور مسلمانوں کا شکوہ تھا کہ ہماری مساجد کی بے حرمتی اور نمازوں میں خلل ڈالا جاتا ہے۔ اس عنوان کے تحت اور بھی کئی شوشے اٹھائے جا رہے تھے اور بطور خاص مسلمانوں کو زیادہ حراساں اور مشتعل کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔

یہاں بھی مسلمانوں کا اقدامی کے بجائے دفاعی رویہ ہی سمجھ میں آتا ہے۔ جہاں تک گائے کی بات ہے وہ پہلے بھی ذبح کی جاتی تھی؛ لیکن مسجدوں کے سامنے اس قدر بدتمیزیاں پہلے نہیں تھیں، جو کی جانے لگی تھیں؛ اس لیے مسلمان زیادہ دل آزار تھے۔ چنانچہ علامہ فرماتے ہیں:

''جس طرح یہ صحیح ہے کہ مسجد کے سامنے باجا بجانے کا مسئلہ پرانے مابہ النزاع

مسائل میں نہیں تھا، ابھی کی پیداوار ہے اسی طرح یہ بھی صحیح ہے کہ اس کا امور نزاعیہ میں اضافہ مسلمانوں نے نہیں کیا؛ بلکہ اس مسئلے کی نزاعی حیثیت ہندو زعماء کی مساعی کی مرہون منت ہے"۔[ص۴۴]

اگر ایک مذہب پورے طور پر دوسرے مذہب سے میل کھا جائے تو اسے مذہب کے الگ الگ دو خانوں میں رکھنا ہی غلط ہے، پھر تو سارا جھگڑا ہی صاف ہے۔ اس لیے ایک چیز ایک مذہب کے نزدیک قابل اہمیت و عظمت ہو تو ضروری نہیں کہ دوسرے مذہب میں بھی اس کو وہی اہمیت و عظمت حاصل ہو۔ مثلاً "کعبہ" خانۂ خدا ہے اور مسلمانوں کے نزدیک انتہائی قابل عزت وحرت اور مقدس و متبرک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان نماز اسی رخ پڑھتے ہیں اور اس کی طرف پاؤں کرنا مسلمانوں کے نزدیک انتہائی گستاخی کی بات ہے۔ اسی طرح ایک بت پرست قوم کے نزدیک "مورت" غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے؛ لیکن ہر دو کو یہ حق نہیں کہ اپنا سا احترام کرنے پر دوسرے کو مجبور کرے اور نہ کرنے کی صورت میں اسے گستاخ قرار دے اور نہ ہی کسی کو اشتعال انگیزی کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ علامہ فرماتے ہیں: "اصل ہندو مذہب کی رو سے تو ہو یا نہ ہو مگر اس میں شبہ نہیں کہ موجودہ ہندو دنیا کے عمیق مذہبی جذبات، "گائے" کا جس قدر احترام اور عظمت کرتے ہیں، مسلمانوں اور عیسائیوں کا معاملہ گائے کے ساتھ بالکل اس کے برعکس واقع ہوا ہے"۔[ص۴۵]

اس لیے ایک کو دوسرے کے حق کی رعایت کرنے اور دل آزاری سے گریز کرنے کی ضرورت ہے۔ اس بیماری کا علاج علامہ یوں تجویز کرتے ہیں:

> "مختلف العقائد آبادی میں صلح اور پناہ کا ایک ہی راستہ ہے کہ ہر مذہب کے معتقد اپنے مذہبی عقائد و اعمال کی بجا آوری میں آزاد ہوں اور کوئی دوسرا فریق ان کی آزادی میں خلل انداز نہ ہو، ہاں یہ ضرور ہے کہ اپنے اعمال کو ایسی صورت سے ادا کریں کہ دوسروں کو تکلیف نہ پہنچے اور ان کے حقوق میں دست درازی نہ ہو"۔[ص۴۵]

"کلکتہ کانفرنس" نے کھلے دل سے مذہبی آزادی کا اعتراف کیا، اس کا لب لباب دونوں قوموں کے درمیان رواداری کی خوش گوار فضا قائم کرنا اور اس کے لیے عملی جدوجہد کرنا تھا۔ علامہ "متحدہ قومیت" اور ہندو مسلمان کے درمیان خوش گوار ماحول کے کس قدر خواہاں اور اس کے

لیے کوشاں تھے، اس تحریر سے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

''اس میں شک نہیں کہ اعتراف حق کے بعد معاملہ باہمی رواداری کا آجاتا ہے اور پھر ہر قوم کی شرافت کے جذبات میں مسابقت کا ہیجان ہوتا ہے اور ہر قوم کے شریف النفس اپنے ہم سایوں کو اپنی شرافت سے مسحور کرنا چاہتے ہیں خدا کرے کہ ہندوستان میں یہ وقت جلد آجائے اور دونوں قومیں امن واطمینان سے زندگی بسر کرسکیں''۔[ص۴۷]

آئینی کمیشن:

بڑی مضبوطی سے علامہ نے کہا:'' آزادی عطا نہیں کی جاتی ؛ بلکہ وہ طاقت اور ہمت سے حاصل کی جاتی ہے'' اور اس کے لیے مادی قوت ہی ضروری نہیں ؛ بلکہ روحانی اور فکری قوت بھی اس کے لیے کافی تھی۔[ص۴۸]

اس کمیشن کے تحت دراصل انگریزوں نے ہندوستانیوں کو آزادی کا ''سبز باغ'' دکھانے کی کوشش کی تھی۔ علامہ کا نظریہ تھا:

''انگلستان کی پارلیمنٹ سے یہ توقع کرنا کہ وہ ہندوستانیوں کو آزاد کردے گی ،فضول ہے اور اس کے لیے کوئی کمیشن ہندوستانیوں کی قسمت کا فیصلہ نہیں کرسکتا، فیصلہ وہی ہوگا جو ہندوستانی خود کریں گے''۔[ص۴۹] تجربات ومشاہدات نے بتادیا کہ اس کمیشن کی حیثیت تارِعنکبوت سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ مزید فرماتے ہیں:'' معاملہ روزروشن میں آگیا ہے، اب ہندوستانیوں کو اپنی قسمت پر رونے اور روکر بیٹھ جانے کا وقت نہیں ہے''۔[۵۰]

اخیر میں اپنے ہم وطنوں کو اس طرح جھنجھوڑتے ہیں:

''اگر ہندوستان اپنی زندگی اور موت کا فیصلہ دوسروں کے ہاتھ سے کرانا چاہتا ہے اور اجنبیوں کے اس نظریے کی تصدیق کرنے پر آمادہ ہے کہ ہندوستانیوں کی حیات وموت کی باگ ان کے ہاتھ میں ہے تو ابھی اس نے آزادی اور غلامی کے مفہوم ہی نہیں سمجھا ہے۔''[ص۵۰]

آزادی سے پہلے صوبہ سرحد کا سیاسی منظر نامہ:

جمعیۃ کے اس آٹھویں اجلاس عام کا انعقاد پشاور [سرحد] میں اس لیے کیا گیا تھا کہ دیگر مسائل کے ساتھ ساتھ صوبہ سرحد کی اصلاحات اور خوش گواری کی راہ ہموار کرنے کے لیے تمام ہندی مسلمانوں کو بیدار کیا جائے۔ صرف سرحد ہی نصف کروڑ مسلم آبادی پر مشتمل تھا۔ بہت سی خوبیوں سے آراستہ تھا۔

علامہ مرحوم پوری طرح بغیر پرکھے کسی قائل نہ ہوتے تھے اور پوری تحقیق و تدقیق کے بعد ہی کسی پر اپنی جچی تلی رائے کا اظہار کرتے تھے۔ اس کے باوجود سرحدی مسلمانوں کی خوبیوں اور ان کے روشن کرداروں کے بے حد قائل اور ایک حد تک متاثر بھی تھے جس کی جھلک ان کی تحریر کے حرف حرف سے مترشح ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''بلحاظ اپنی بہت سی اخلاقی و ایمانی خصوصیات کے دنیا کے بہترین مسلمانوں میں سے ہیں، ان کی شجاعت و بسالت، ان کی پابندیٔ عہد، ان کی غیرت وحمیت، ان کی بلند حوصلگی و فراخ دلی اور سب سے زیادہ ان کی وہ ایمانی قوت جو انھیں اسلام کی حرمت پر دنیا کی ہر چیز کو قربان کر دینے کے لیے ہر وقت مستعد رکھتی ہے..... ان اعلیٰ اوصاف کے علاوہ ذہنی و دماغی قابلیتوں کے لحاظ سے بھی وہ اپنے بقیہ اہل وطن سے کسی طرح کم نہیں ہیں، ان میں انضباط وانتظام کی طبعی صلاحیت موجود ہے، جمہوریت کا فطری نظام ان کے اندر غیر معلوم زمانے سے رائج ہے..... اگر بیرونی مداخلت ان کے سدِّ راہ نہ ہو تو یقیناً وہ زمانے کی عمرانی و سیاسی ترقی کا ساتھ دے سکتے ہیں''۔ [ص ۵۱]

افسوس! ان پر انگریزی حکومت مسلط ہوگئی اور ہر طرح سے انھیں بست کرنے کی کوشش کی گئی۔ انگریزی پالیسی کے بارے علامہ فرماتے ہیں:

> ''انگریزی حکومت کی یہ مستقل پالیسی ہے کہ وہ اپنی قدرتی حدود پر کبھی قانع نہیں رہتی اور ہمیشہ اپنے اندرونی امن وسکون کی حفاظت کے لیے دوسری ہمسایہ قوموں کے امن وسکون کو متزلزل رکھتی ہے۔'' [ص ۵۲]

اسی پالیسی کے تحت انگریزی مصر، سواحلِ عرب، خلیج فارس، عراق وموصل اورایران وکابل پراپنی سیاسی نگرانی قائم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ابھی سرحد پر عیار فرنگ کے تسلط کو ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ اس نے تحفظ مملکت کے لیے سرحدی قوم کو جنگ کی بھٹی میں جھونک دیا۔اس مقصد کے پیش نظر انگریزوں نے سرحدوں سے ۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۰ء تک دس مرتبہ فوجی خدمات لیں۔اس کے بعد ۱۸۶۰ء سے ۱۹۱۰ء تک ۳۳ مرتبہ فوجی خدمات کے نام پر سرخدیوں شعلوں میں جھونک کر تہذیب وتمدن اور ہر طرح کی ترقی سے انھیں روکے رکھا گیا۔ظاہری بات ہے جب کوئی مداری کسی جانور کے ذریعہ بازی گری کرتا ہے تو اس کے کھانے پینے کا انتظام بھی وہی کرتا ہے ورنہ وہی جانور اس بازی گر کو کاٹ کھانے دوڑیں گے۔اسی طرح ایک قوم سے کام تو لیا جائے جانبازی کا اور زیست کے تمام دروازے اس پر بند کردیے جائیں تو اس کی طرف سے ردعمل کا اظہار ترین قیاس اور عین عقل کے مطابق ہے سرحدی مسلمانوں کی طرف سے ہو۔اسی ردعمل کا نام انگریزوں نے تشدد وبربریت رکھا تھا۔علامہ اس سخت نکتہ چینی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''مگر میں کہتا ہوں کہ ان کو وحشیانہ عادات اختیار کرنے پر انگریزی حکومت نے مجبور کیا''۔[ص۵۳] انگریزوں کی نگاہ میں یہ قوم غیر مہذب بن گئی۔کیسے؟ طنزیہ لہجے میں علامہ موصوف فرماتے ہیں:''جو قوم پوری تین ربع صدی سے مسلسل حالت جنگ میں زندگی بسر کررہی ہو.....جس کو متواتر جنگ وپیکار سے اتنی فرصت ہی نہ ملے کہ کسب معاش کے پرامن طریقے اختیار کرسکے.....کہاوہ قوم تہذیب وتمدن میں کوئی ترقی کرسکتی ہے؟''[ص۵۳]

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایک طبقہ کا ہر ہر فرد ظالم ہی ہو ضروری نہیں اسی طرح اس کے برعکس۔چنانچہ انگریزوں میں دانشوروں کا ایک ایسا طبقہ رہا ہے جو ظلم وناانصافی کے بغیر ملک کی ترقی کا خواہاں تھا؛لیکن بدقسمتی کہا جائے کہ غلبہ ہمیشہ دوسرے طبقہ کو ہی حاصل رہا۔

صوبہ سرحد ۱۹۰۱ء تک تو ایک آئینی حکومت کے تحت صوبہ پنجاب ہی سے ملحق رہا۔اس کے بعد''لارڈ کرزن'' کی غلط پالیسی کے تحت اس کو پنجاب سے الگ کردیا گیا۔فرماتے ہیں:

''اس [سرحد] ایک مستقل صوبہ قرار دے کر بقیہ ہندوستان سے علحدہ کرکے ایک غیر آئینی نظامِ حکومت کا ماتحت بنادیا''۔[ص۵۵]

”رسالوں تک ہندوستان کے دوسرے خطوں پر ترقیاتی اور اصلاحی کام ہوتے رہے لیکن صوبہ سرحد اس سے مستثنیٰ رہا اور اس کے سوتیلے پن کا اظہار ہو رہا۔ اور یہی نہیں؛ بلکہ ان کی زندگی کرون پر تنگ کر دیا گیا اور ان پر جابر صفت افسروں کو مسلط کر دیا جن کے منہ سے نکلا ہوا حرف غلط بھی صحیح ہی نہیں؛ بلکہ قانون کا درجہ رکھتا تھا۔

انسداد جرائم کے نام پر اس قوم پر کھلی دہشت گردی مچائی گئی اور سرحد کی تعزیری وتسخیری مہموں کے پیچھے کروڑوں روپے بہائے گئے؛ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے جرائم کم ہونے کے بجائے بڑھتے ہی رہے اور دن بدن ان میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔

غریب سرحدی اپنے طور پر مطالبات کر رہے جو صدا بصحرا ثابت ہو رہے۔ پھر ۱۹۱۰ء سے سرحدیوں میں انگریزوں کے خلاف تحریک شدت پکڑنے لگی اور ۱۹۱۸ء میں یہ تحریک انقلاب کی شکل اختیار کر گئی اور جگہ انگریزی حکومت کے خلاف شعلے بھڑکنے لگے؛ یہی وجہ ہے کہ ستمبر ۱۹۲۱ء میں ”لیجی لیٹیو اسمبلی“ میں اس سلسلے میں زبردست مباحثہ ہوا۔ نتیجتاً ۱۹۲۲ء میں سرڈینس برے [Sir Denis Bray] اور سرنورمن بولٹن [Sir Norman Boulton] کی سرکردگی میں ایک تحقیقاتی کمیٹی تشکیل دی گئی کہ صوبہ سرحد کو اس کی حیثیت سے اصطلاحات دنیا زیادہ مناسب ہوگا یا دوبارہ پنجاب سے ملحق کر دینا؟!۔ چنانچہ اس کمیٹی نے کسی تعصب کے بغیر مبنی برحقیقت رپورٹ پیش کر کے حکومت کے توہمات کے سارے تانے بانے کو ادھیڑ کر رکھ دیا اور سرحدیوں کے مطالبۂ اصلاح کو حق بجانب تسلیم کیا نیز پرزور انداز میں اس مطالبہ کو قبول کرنے کی سفارش بھی کی۔

اس کے باوجود کی سردمہری اپنی حالت پر رہی۔ انگریزوی حکومت سے جب کوئی جواب نہ بن پڑا تو چند متعصب اور چاپلوس قسم کے ہندو رہنماؤں کو ساتھ لے کر اس مطالبہ کو فرقہ وارانہ رنگ دے دیا اور سرے سے ردی کی ٹوکری میں اسے ڈال دیا۔

انگریزوں کا الزام تھا [۱] کہ سرحدی لوگ غدار ہیں کبھی بھی ملک کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ [۲] وہ تہذیب وتمدن سے عاری اور انتظامی امور سے بے بہرہ ہیں۔ [۳] سرحد کو خود مختار صوبہ کی حیثیت نہیں دی جا سکتی اس لیے کہ اس صورت میں وہ اپنے مصارف کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ [۴] اور صوبہ کی سرکشی کی بنا پر اصطلاحات اور سیات میں کسی قسم کی حصہ داری کی وہ مستحق نہیں ہیں۔

علامہ نے ان چاروں بیجا الزامات کا مسکت، مدلل اور انتہائی ٹھوس انداز میں جواب دیا اور فرمایا کہ "واقعہ یہ ہے کہ ان [الزامات] میں ہرگز اتنا وزن نہیں ہے کہ اصلاحات کے جائز مطالبہ کے سامنے ٹھہر سکیں۔" [ص ۶۲]

پھر اپنے اس موضوع کو سمیٹتے ہوئے فرماتے ہیں: "صوبہ سرحد میں اصلاحات کا نفاذ صرف اہل سرحد ہی کا مطالبہ نہیں ہے؛ بلکہ تمام ہندوستان کے مسلمان اور تمام منصف مزاج غیر مسلم بھی اس میں شریک ہیں"۔ [ص ۶۵]

دہلی کی تجویز مفاہمت:

اس تجویز کو محاوراتی زبان میں "میٹھا میٹھا ہپ ہپ کڑوا کڑوا تھو تھو" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس تجویز کے بگل سے یہ اعلان کیا گیا کہ پورے ملک میں جداگانہ انتخاب ہوگا مسلم اکثریت علاقوں میں ان کے اعتبار سے اور ہندو اکثریت علاقوں ان کے لحاظ سے۔ جسے آل انڈیا کانگریس کمیٹی بمبئی نے منظوری بھی دے دی تھی؛ تاہم دونوں قوم اب بھی اصرار و انکار کے بھنور میں ہچکولے ہی کھا رہی تھی کہ بعض دردمند مسلم لیڈران نے دونوں موقف کے بیچ کی راہ نکال کر مندرجہ ذیل تجاویز پر آمادگی کا اظہار کیا۔

[۱] سندھ کو ایک جداگانہ صوبہ قرار دیا جائے۔ [۲۔۳] صوبہ سرحد، بلوچستان کو ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی طرح اصلاحات دی جائیں۔ [۴] بنگال اور پنجاب میں نمائندگی کا تناسب آبادی کے تناسب کے مطابق ہو۔ [۵] مرکزی مجالس وضع قوانین میں مسلمانوں کی نیابت ایک تہائی سے کم نہ ہو۔ اس کے بعد ان پانچوں شعبوں کا منشاء ظاہر کرتے ہیں:

"ان پانچ ضمانتوں کا صاف منشا یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی قوت میں اس قسم کا توازن پیدا کر دیا جائے کہ مشترکہ انتخاب رائج ہونے کی صورت میں ایک جماعت کی اکثریت دوسری جماعت کی اقلیت کو نقصان پہنچانے کی جرأت نہ کر سکے"۔ [ص ۶۶]

بلاشبہ یہ ایسی راہ تھی کہ یکساں طور پر دونوں قوموں کے حق میں مناسب تھی لیکن چوں کہ مسلم اکثریت کا تعلق پانچ صوبوں سے تھا اور ہندو اکثریت ۹ صوبوں پر حاوی تھی اس طرح سے ایک حصے میں ساڑھے تیرہ کروڑ ہندو اور پونے دو کروڑ مسلم اور دوسرے حصے میں ساڑھے چار کروڑ مسلمان اور پونے تین کروڑ ہندو تھے۔

علامہ بڑے افسوس کے ساتھ فرماتے ہیں: ''اگر دہلی کی تجویز مفاہمت'' کے مطابق سندھ کی علحدگی، سرحد بلوچستان میں نفاذ اصلاح اور پنجاب و بنگال میں تناسب آبادی کے لحاظ سے تناسب نیابت قائم کرنے کو مشترکہ انتخاب کے لیے ایک لازمی شرط کے طور پر تسلیم کرلیا جائے اور جداگانہ انتخاب کی تنسیخ سے پہلے ان شرائط کے ایفا کا انتظام ہوجائے نیز ہندو مسلمانوں کے درمیان سیاسی وتمدنی اور مذہبی حقوق کے متعلق ایک اطمنان بخش میثاق مفاہمت مرتب ہوجائے تر ایسی صورت میں مشترکہ انتخاب کو تسلیم کرلینے میں مسلمان بھی تأمل نہ کریں گے۔'' [ص ۶۸۔۶۷] مزید فرماتے ہیں:

> ''جس طرح مسلمان لیڈر اپنے نقطۂ نظر سے ہٹ کر ایک درمیانی نقطہ پر ہندوؤں سے ملنا چاہتے ہیں اس طرح ہندو اپنے نقطہ سے ہٹ کر ان سے ملنے کے لیے تیار نہیں''۔

اب تک تو ملی اور مشترکہ وطنی مسائل کا تذکرہ تھا۔ اب علامہ اسلامی معاشرہ میں پھیلی بدعات وخرافات اور غلط رسوم ورواج کو بیان کرکے ان کی برائیوں اور خطرناکیوں کا جائزہ لے کر اس سے بچنے کی تدابیر بتاتے ہیں اور ایک مسلم قوم کی ترقی وبقا کے لیے یہ چیزیں انتہائی ناگریز ہیں۔

دارالقضاء شرعی (ضرورت واہمیت):

- ''شرعی دارالقضاء'' کے فقدان کو علامہ نے مسلمانوں پر ٹوٹے مصیبتوں کی جڑ قرار دیا ہے اور فرمایا: ہے'' علماء ومفتیان دین کا کام صرف حکم شرعی ظاہر کردینا ہے۔'' لہذا! مسلمانوں کے داخلی مسائل کو حل کرنے کے لیے شرعی قاضی کا ہونا نہایت ضروری ہے؛ ورنہ تو آئے دن مسائل سلجھنے کے بجائے الجھتے ہی رہیں گے جس کا تجربہ غیر مسلم ججوں کے لیے ناقابل عمل فیصلوں سے ہوتا رہتا ہے؛ بلکہ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ'' حکومت کی عدالتوں سے ایسے فیصلے ہوجاتے ہیں جو مصالح اسلامیہ کے بالکل خلاف اور احکام مذہبیہ سے متضاد واقع ہوئے ہیں۔'' اس کے بعد مشورہ دیتے ہی: ''اگر مسلمانوں نے متفقہ مطالبہ کیا تو کوئی وجہ نہیں کہ گورنمنٹ اس مطالبہ کو مسترد کردے، دوسرے یورپین وامریکن سلطنتوں میں بھی اس کی نظیر موجود اور رائج ہے، جزائر فلپائن میں حکومت امریکہ کی جانب سے مسلمانوں کے لیے'' شیخ الاسلام'' کا عہد مقرر اور ایک مسلمان عالم اس پر متعین ہوتا ہے''۔ [ص ۷۳] فرماتے ہیں! اس محکمۂ قضاء کے نہ ہونے کی وجہ سے اس

کی بڑا نقصان ہمارے سامنے ان مطلقہ ومظلوم عورتوں کی شکل میں ہے جو صحیح اسلامی رہنمائی نہ ہونے کی وجہ سے ارتداد کے گہرے غار میں جارہی ہیں۔[معاذ اللہ]۔اور مشورۃ کہا کہ اس سلسلے میں صوبہ وار قاضی ہوں اور سب کا متفقہ طور پر اپنا ایک امیر منتخب کرے، جمعیۃ علمائے ہند نے اپنے گذشتہ اجلاسوں میں بار بار اس کی طرف توجہ دلائی ہے اور دار الامارۃ والقضاء کے اصول وقواعد بنانے کے لیے ایک خاص کمیٹی مقرر کر کے مسودے بھی تیار کرا لیے ہیں؛ لیکن چوں کہ امیر کا انتخاب جمہور مسلمین کے اتفاق سے ہی ہوسکتا ہے؛ اس لیے آج تک بوجہ خوف افتراق اس کے عمل پر اقدام نہیں کیا گیا، ہندوستانی صدیوں میں سے صوبہ ''بہار'' قابل مبارک باد ہے کہ اس نے امارت شرعیہ کا ایک نظام قائم کر رکھا ہے اور اس کے ماتحت بہت سے مفید قومی اور مذہبی امور انجام پاتے ہیں''۔[ص ۷۷] اگر ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں بھی نہ نظام قائم ہو جائے تو تمام ہندوستان میں ایک منظم محکمۂ شرعیہ قائم ہو جائے گا۔

فریضۂ تبلیغ:

حضرت علامہ نے فریضۂ تبلیغ کی طرف بھی مسلمانوں کو متوجہ کیا بطور خاص اہل علم اس کی ذمہ داری سمجھائی اور اس عظیم فریضہ کو دین متین کی بقاء کا مدار قرار دیتے ہوئے فرمایا: ''مسائل ضروریہ میں سے ایک اہم مسئلہ فریضہ تبلیغ اسلام اور پیغام توحید ورسالت کا ہے جس کے بغیر بقائے دین متین کسی طرح متصور نہیں''۔[ص ۷۸]

آگے یہ بھی فرمایا کہ آج دنیا میں مذہب کے جھوڑے دعویدار یا باطل مذہب کے ماننے والے اپنے مذہب کی نشر وتبلیغ میں سرگرداں ہیں؛ حالاں کہ اسلام کے علاوہ کسی مذہب میں صداقت وسچائی نہیں ہے؛ اس لیے تبلیغ اور پیغام رسائی حق کا یہ اہم فرض صرف اسلام ہی کا حصہ ہونا چاہیے؛ کیوں کہ حیات انسانی کا جامع دستور اور اس کی رہنمائی اسلام کے علاوہ کسی مذہب میں نہیں ہے۔ پھر عیسائی عقائد اور اس کے بطلان کو عقلی اور نقلی دو حوالوں سے ثابت کیا، نیز دین حق کے ایک مبلغ اور داعی کے اندر کن کن خوبیوں کا ہونا ضروری ہے اور کن کن چیزوں سے بچنے کی ضرورت ہے، اس کو بھی اچھوتے انداز میں بیان کیا۔ اخیر میں علمائے کرام کو اس عظیم بیڑے کو اٹھانے اور عوام کو ان کا تعاون اور ان کی رہنمائی میں کام کرنے کی اپیل کی ہے۔

تربیت نومسلم:

علامہ نے اپنے دیگر آراء کے ساتھ ایک عمدہ تجویز یہ بھی رکھی جو قابل عمل بھی ہے اور آسان بھی کہ ''جس طرح یتیم بچوں کے لیے ''یتیم خانے'' قائم کرتے ہیں اسی طرح نومسلموں کے لیے بھی کسی جائے قیام کا انتظام کردیں اور ''نومسلم خانے'' بنادیں تو اس وقت یہ بات روشن ہوجائے گی کہ دین متین اور ملت حقہ کی قوت کیا ہے؟ علامہ نے فرمایا مسلمان اپنے روپے پیسے بغرض حفاظت بنکوں میں رکھتے ہیں اور دین داری کے سبب اس کی سودی رقم لینے کی بجائے بنک ہی میں چھوڑ دیتے ہیں اور یہ ساری رقم نعرانی تبلیغ میں صرف ہوتی ہے؛ اس لیے ان رقومات کو نو مسلموں کی تربیت اور ان کی جملہ ضروریات میں صرف کیا جائے تو زیادہ بہتر ہے؛ کیوں کہ اصول فقہ میں ہے: من ابتلی ببلیتین یختار اھونہا۔ استدلال کے طور پر فرمایا کہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے فارس پر ادم کے غالب آنے کے متعلق جو شرط کفارے باندھی تھی جب وہ شرط پوری ہوگئی اور یوم بدر میں رومی فارس پر غالب آگئے تو ابی بن خلف سے حضرت صدیق اکبر نے شرط میں ٹھہراتے ہوئے اونٹ کے لیے کہا۔ لیکن چوں کہ یہ مال طیبب نہ تھا؛ اس لیے انحضرت ﷺ نے اس کو صدقہ کا کرنے کا حکم فرمادیا۔ کاش: مسلمان اس کو اپنا فریضہ سمجھ کر نومسلموں کی شربت کے لیے بھی فکر مند ہوئے۔

اصلاح رسوم:

اس عنوان کے تحت علامہ نے ہندوستانی مسلم معاشرہ میں پھیلی رسوم قبیحہ کی طرف مسلمانوں کی توجہ مرکوز کرانی چاہی ہے اور ان خرافات سے نمٹنے کے لیے مسلمانوں سے ہر طرح مستعد رہنے کی اپیل کی ہے۔ اس مسئلے میں حضرت نے سب سے پہلے عورتوں کو میراث سے محروم کرنے کے مسئلہ کو چھیڑا ہے اور بڑی دردمندی کے ساتھ اس پر بحث کی ہے اور اس ناپسندیدہ رواج کو ایمان واعمال کے لیے انتہائی خطرناک قرار دیا اسی کے ساتھ ساتھ پرزور انداز میں مسلمانوں سے اس خلاف سنت عمل سے بچنے کی اپیل کی ہے۔

موجودہ دور میں بھی علامہ کا یہ پیغام اپنے اندر بے پناہ معنویت رکھتا ہے؛ اس لیے کہ واضح انداز میں قرآن وحدیث میں لڑکیوں کو میراث میں حصہ دینے کا حکم ہے۔ پھر بھی ہماری

آنکھوں اور عقلوں پر کیوں پردہ پڑا ہوا ہے؟!۔

ایک دوسری رسم کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ بات شرافت وانسانیت کے خلاف ہے اور اسلام میں بھی اس کی کوئی گنجائش نہیں کہ کوئی لڑکی والا لڑکے والوں سے لڑکی کے عوض موٹی رقم وصول کرے اور اس کے لیے بسا اوقات ظالم باپ نے اپنی پھول جیسی بیٹی کی جوانی کو داؤ پر لگا دیا اور برائیوں کی راہ ہموار کی۔[الامان والحفیظ]

یہ لکھتے ہوئے بڑا عجیب سا محسوس ہوتا ہے کہ آج سے بیاسی سال پہلے لڑکی والوں کی حکومت تھی اور اب لڑکے والوں کا اقتدار ہے؛ لیکن نوعیت کے ہلکے سے فرق کے ساتھ معاملہ کل بھی وہی تھا اور آج بھی وہی ہے۔ دونوں صورتوں میں بے چاری بنت حوا ہی ظلم کی چکی کے پاٹوں میں پستی رہی ہے۔ خدا اس قبیح رسم سے مسلم معاشرہ کی حفاظت فرما؛[آمین]

اسی ضمن میں شادی کے موقع پر اسراف اور موت کے وقت بھاری رقم لگا کر لوگوں کی دعوت وغیرہ کو خلاف شرع فرما کر اس سے سختی کے ساتھ بچنے کی تلقین فرمائی۔ اور چوں کہ ایسی دعوت کے مواقع پر مسلمان سودی قرض بھی لیتے تھے؛ اس لیے حضرت علامہ نے اسے بھی انتہائی مہلک قرار دیا۔ فرمایا: ''مسلمانوں کی ہلاکت اور ان کی تباہی کے اسباب میں سے ایک ہولناک سبب جس نے کہ عالم اسلام کو زیروزبر کر دیا، مسلم قومیت کی جڑوں کو کھوکھلا بنا دیا اور ان کی کمر ہمت کو توڑ دیا اور آخر کام نرم بستر سے اتار کر گرم خاکستر پر بٹھا دیا اور گھروں کو؛ بلکہ ملکوں کو ویران کر ڈالا اور جس نے مسلمانوں کے گھر بار، مال واسباب اور جائدادیں ہنود کے قبضے دیدیں اور ان کو قعر مذلت ورسوائی میں گرادیا اور ہنود کو اوج ثریا ورفعت پر پہنچادیا۔ غرضیکہ دنیا کی تمام مصیبتیں اور آفتیں جس کی بدولت آئیں وہ ''قرض'' ہے جو ہندؤں سے سود دے کرلیا جاتا ہے۔''[۹۵]

پھر ایک مثال دی کہ اس کی مثال تو جذام کی طرح ہے کہ وہ بڑھتا ہی رہتا ہے۔

تحفظ اوقاف مسلمین:

ایک اہم مسئلہ اسلامی اوقاف کی تنظیم کا تھا اور ہے، اس لیے کہ اوقاف کی کروڑوں کی سالانہ آمدنی کا بے جا استعمال ہو رہا ہے اور متولیوں کی بے اعتدالیوں کی نذر ہو رہی ہے۔ چوں کہ یہ ایک مذہبی معاملہ ہے اور اس کا تعلق صدقات وعبادات سے ہے؛ اس لیے اس کی حفاظت کے

لیے علماء کو آگے آنے کی ضرورت ہے اور اس سلسلے میں علامہؒ نے چند وقیع اصول ذکر فرما کر اپنی بات ختم کی ہے۔

اسلامی اخوت:

قرآن کا ارشاد ہے کہ تمام مومن آپس میں بھائی بھائی اسی طرح حدیث شریف میں تمام افراد مسلم کو یک جان قرار دیا گیا۔ لہذا: اسلام کی ترقی کا راز مسلمانوں کی اخوت و بھائی چارگی اور باہمی تعاون میں مضمر ہے۔ ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کا کیا حق ہے اس پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ چنانچہ حضرت فرماتے ہیں:

''اگر آج بھی مسلمان ان صفات ایمانیہ کے ساتھ متصف ہو جائیں تو ان کو وہی عروج وترقی، وہی رفعت، وہی بلندی حاصل ہو جائے جو قرون اولیٰ تھی''۔[ص ۱۰۰] اپنی بات کو سمیٹتے ہوئے فرماتے ہیں: ''الحاصل اگر مسلمانوں کو اپنی قومی زندگی مطلوب ہے تو وہ آپس کے اتفاق واتحاد اور تعاون وتناصر میں منحصر ہے، بہت سا وقت غفلت میں گزر گیا؛ تاہم ابھی بیداری اور عمل کا وقت باقی ہے۔ خدارا جاگو اور اسلامی کشتی کو تباہی کے گرداب سے اپنی متفقہ جدوجہد سے نکالو!'' [ص ۱۰۱]

حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ اپنی بے پناہ علمی صلاحیتوں کے باوجود اپنے گردوپیش کے احوال، سیاسی حالات، عالمی حالات، مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کی ظالمانہ پالیسیاں اور مختلف اورام والے جمہوری ملک میں کس طرح کے اصول وضوابط ہوں، ہر مذہب کا پیروکار پوری آزادی کے ساتھ اپنے اپنے مذہب پر کیسے عمل کر سکے اور سماجی زندگی کیسے سکون واطمنان سے گزر سکے۔ ان نکتوں پر علامہ نے کھل عالمانہ بحث کی اور ہندوستانی قوم کو درپیش خطرات سے آگاہ کر کے اس سے بچنے کی عمدہ تدابیر بتائیں۔

آٹھ دہائی پہلے ذرائع ابلاغ وارسال کی کیا صورت حال رہی ہوگی ظاہر ہے؛ اس کے باوجود ملکی سیاست کا جو جائزہ کیا گیا وہ حیرت انگیز ہے۔ اسی طرح اسلامی معاشرہ کی بھی نبض شناسی کر کے اس کے علاج کے لیے قابل عمل اور قیمتی نسخے تجویز کیے۔ کاش! علما ان کے پیش کردہ تجاویز کی عصری معنویت سمجھیں اور ان کو اپنا کر مسلم معاشرہ کے مستقبل کا تحفظ کریں۔

خدا ہمیں عمل کی توفیق عطا فرمائے! [آمین]

●○●
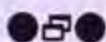
حضرت امام کشمیریؒ

حیات وخدمات

مولانا محمد شمشاد رحمانی القاسمی

تمہید وولادت:

عربوں کے خداداد قوتِ حافظہ، اکابر امت، سلف صالحین اور محدثین کرام کی حیرت انگیز یادداشت کو اساطیر الاولین کا درجہ دے کر تیرہویں صدی ہجری میں منکرین حدیث اپنے آپ کو ذخیرۂ احادیث سے، پیچھا چھڑانے اور احادیث کو غیر معتبر قرار دینے کے لیے تدوین حدیث سے قبل احادیث کے طول وطویل دفتر کو محفوظ رکھنے کے سلسلے میں اظہار شک وشبہ اور اعتراضات کے بمباری کرنے لگے تو رحمت خداوندی جوش میں آئی تو سلف صالحین ومحدثین عظام کے قوت حافظہ کی تصدیق کے لیے (۱) ''وادی لولاب کشمیر'' میں بروز شنبہ، بوقت صبح ۲۷ شوال ۱۲۹۲ھ مطابق ۲۹ اکتوبر ۱۸۷۵ء بمقام 'دودوان'' ان گوہر نایاب کو وجود بخشا، جن کا نام ''انور'' رکھا گیا اور چہار دانگ عالم میں ''خاتم المحدثین، رئیس المتکلمین، علامۃ العصر حضرت شیخ سید انور شاہ کشمیریؒ'' کے نام سے معروف ومشہور ہوئے۔ (۲)

خاندان ونسب نامہ:

آپ کے والد بزرگوار کا نام ''محمد معظم شاہ'' ہے، جو وادیٔ کشمیر کے معروف ومشہور ذوالعلم والمرتبت، ممتاز عالم دین، زاہد ومتقی صفت سے متصف بزرگ انسان تھے، جب کہ آپ کی والدہ عابدہ، زاہدہ، نیک خاتون تھیں، آپ کا نسب نامہ شیخ مسعود نروری سے ملتا ہے۔ (۳) اور شیخ مسعود نروری کا سلسلۂ نسب حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے خاندان سے ملحق ہوجاتا ہے۔ (۴) اس طرح حضرت شاہ صاحب کا منتہائے نسب حضرت سیدنا امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ ہیں۔ (۵)

زندگی کا علمی سفر:

آپ نے کتاب اللہ کے ساتھ فارسی کی چند ابتدائی کتب والد محترم سے اور عربی کتب

مولانا غلام محمد صاحب (صوفی پورہ) سے پڑھنے کے بعد ۱۳۰۵ھ میں بعمر چودہ سال تقریباً تین سال "ہزارہ" کے مدارس میں رہ کر مختلف علوم وفنون حاصل کیے، پھر مزید علمی تشنگی کی سیرابی کے لیے ۱۰یا۸یا۱۳۰۷ھ(۶) میں "دیوبند" تشریف لائے اور یہاں حضرت شیخ الہندؒ، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ، حضرت مولانا اسحاق صاحب امرتسریؒ وغیرہ اکابر سے تکمیل تعلیم کی۔(۷)

سند فراغت اور مسند درس وصدارت:

۲۱/۲۰ سال کی عمر میں نمایاں شہرت وعزت کے ساتھ ۱۳۱۲ھ میں سند فراغت حاصل کی۔(۸) اس کے بعد ۱۳۱۴ھ=۱۸۹۶ء میں حضرت گنگوہی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سند حدیث لی، نیز باطنی فیوض وبرکات سے مستفیض ہوئے اور خلافت حاصل کی۔(۹)

۱۳۱۵ھ=۱۸۹۷ء میں مدرسہ امینیہ دہلی کا قیام عمل میں آیا، اپنے ہم سبق مولانا امین الدین گجراتی کے اصرار پر آپ وہاں صدر مدرس رہے، ۱۳۲۰ھ=۱۹۰۳ء میں کشمیر چلے گئے، وہاں فیض عام کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا، ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۵ء میں حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی، وہاں کچھ مدت قیام کیا اور حجاز کے کتب خانوں سے علمی پیاس بجھائی، ۱۳۲۷ھ=۱۹۰۹ء میں آپ دیوبند آئے، شیخ الہند نے آپ کو یہیں روک لیا۔ کئی سال تک بلا تنخواہ کتب حدیث کی تدریس میں مشغول رہے، اس عرصے میں آپ حافظ محمد احمد بن امام نانوتویؒ کے مہمان رہے۔ ۱۳۳۳ھ=۱۹۱۵ء کے اواخر میں شیخ الہند نے سفرِ حجاز کا قصد کیا تو جانشینی کا فخر آپ کو بخشا۔ دارالعلوم دیوبند کی مسند صدارت پر تقریباً ۱۲ سال جلوہ افروز رہے۔ ۱۳۴۶ھ/۱۹۲۷ء کے اوائل میں دارالعلوم کے اہتمام سے بعض اختلاف کی وجہ سے فرائض صدارت سے دست کش ہو کے جنوبی ہند ڈابھیل، گجرات کے "مدرسہ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل" چلے گئے، ۱۳۵۱/۱۹۳۲ء تک وہاں درس حدیث کا مشغلہ جاری رہا۔(۱۰)

ذہانت وفطانت:

غیر معمولی ذہانت وذکاوت اور بے مثل قوتِ حافظہ ابتدائے عمر سے موجود تھی۔(۱۱) بلکہ آپ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کے مصداق بچپن ہی میں نہایت ذہین، ذکی اور فطین تھے، چونکہ آگے چل کر آپ کو وقت کا رازی اور غزالی بننا تھا جس کے لیے اعلیٰ، علمی وعملی صلاحیتوں کا ظہور بچپن میں ضروری تھا۔(۱۲) چنانچہ آپ کے والد محترم نے فرمایا کہ جب انہوں نے مجھ سے مختصر القدوری شروع کی تو بعض ایسے مسائل دریافت کرتے تھے کہ مبسوط کتابوں کا مطالعہ کیے بغیر

ان کا جواب دینا مشکل ہوتا تھا۔ (۱۳) یہی نہیں بلکہ حد تو یہ ہے کہ ذکاوت وذہانت کے غیر معمولی احوال کو دیکھ کر کشمیر کے عوام عام طور پر یہ شبہ کرتے تھے کہ کہیں آپ ''مہدی موعود نہ ہوں'' آپ کے والد محترم اور خاندان کے دوسرے بزرگوں کو عوام کی اس غلط فہمی کی تردید کرنا پڑتی تھی۔ (۱۴)

درس حدیث میں علوم کا سنگم:

آپ کے درس میں صرف، نحو، فقہ، واصول فقہ، معانی و بلاغت، اسرار وحکم، سلوک و تصوف، فلسفہ ومنطق، سائنس وعصری علوم کے ساتھ رجال کی بحثیں، مصنفین، ومولفین کی تاریخ و سوانح، تالیفات وتصنیفات پر نقد وتبصرہ اور پھر حنفیت کی وجوہ ترجیح درس کا امتیاز تھا، جس کی وجہ سے درسی تقریریں بجائے مختصر ہونے کے طویل ہو جاتیں۔ (۱۵)

حفظ احادیث اور مناظر کا فرار:

یوں تو آپ نے بے شمار مناظرے کیے، خصوصاً فتنۂ قادیانیت کی بیخ کنی میں اپنی تمام علمی وعملی توانائیاں صرف کر دیں، جس میں فریق مخالف کو منہ کی کھانی پڑی، تاہم ایک مرتبہ اہل حدیث سے مناظرے کے دوران حریف کو مخاطب فرما کر آپ نے فرمایا: ''آپ اہل حدیث اور حافظ حدیث ہونے کے دعویدار ہیں، اگر یہ سچ ہے تو بخاری شریف کے کچھ صفحات مجھ کو سنائیے تو مناظر عالم نے لوٹ کر کہا کہ ''آپ ہی سنائیے'' تو مولانا اعزاز علیؒ کا بیان ہے کہ: آپ کھڑے ہوئے اور ''باب کیف کان الوحی الخ سے بسم اللہ پڑھ کر جو ابتداء کی تو پچیس، تیس صفحے مسلسل پڑھنے کے بعد سراپا حیرت مجمع میں حریف سے پوچھنے لگے جو کچھ پڑھ چکا ہوں کافی ہے یا اور پڑھوں؟ اسی اثناء حریف کی تلاش کی تو نہ جانے وہ کدھر نکل چکے تھے۔ (۱۶)

صلاحیت ولیاقت:

آپ وسعتِ نظر قوتِ حافظہ اور کثرت حفظ میں اپنے زمانے میں بے مثال تھے، علم حدیث، علم ادب، معقولات، شعر وسخن، سارے علوم میں بلا کی مہارت تھی، زہد وتقوی میں کامل تھے۔ (۱۷) چنانچہ آپ کی بے نظیر علمی صلاحیت ولیاقت کا اعتراف شاعر مشرق علامہ اقبالؒ، سید سلیمان ندویؒ، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا ادریس کاندھلویؒ، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مصریؒ کے علاوہ دیگر اکابرامت نے کیا۔ (۱۸)

اساتذہ وتلامذہ:

مشاہیر اساتذۂ کرام کا تذکرہ تو علمی زندگی کا علمی سفر کے عنوان کے تحت گزر چکا، تاہم

مشاہیر تلامذہ یہ ہیں: حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب، مولانا عبدالقادر رائپوری، مولانا بدرِ عالم میرٹھی، مولانا محمد یوسف بنوری، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مولانا محمد منظور نعمانی۔ (۱۹) ان کے علاوہ بے شمار تلامذہ ہیں، جنہوں نے آپ سے کسب فیض حاصل کیا۔

نکاح واولاد:

۱۳۳۶ھ کے اواخر میں آپ کی شادی سادات گنگوہ کی ایک یتیم لڑکی سے ہوئی، اس کے بعد سے ۱۳۵۲ھ تک پندرہ سال کے عرصہ میں آپ کے یہاں کل پانچ اولاد: تین لڑکے اور دو لڑکیاں ہوئیں، فرزندوں کا نام: مولانا ازہر صاحب قیصر، (۱) محمد اکبر کشاہ مرحوم (۳) محدث العصر حضرت مولانا سید انظر شاہ ہیں اور لڑکیوں کے نام (۱) عابدہ خاتون (۲) راشدہ خاتون ہیں۔ (۲۰)

علمی انہماک اور ادب واحترام:

آپ کی زندگی کا سب سے زیادہ ممتاز وصف علمی انہماک ہے، چنانچہ آپ خود فرماتے ہیں:

> ''میں ہر وقت فکرِ علم میں مستغرق رہتا ہوں، بجز ان اوقات کے جب نیند کا شدید غلبہ ہو''۔ یہی نہیں آپ کا علمی انہماک کا یہ عالم تھا کہ کوئی ایسا مشغلہ جو ان میں حائل ہو پسند نہ فرماتے۔ چنانچہ آپ کے خصوصی معتقد سلیمان کوٹھری والا کا بیان ہے کہ: ایک بار میں نے حضرت شاہ صاحبؒ کو تین مرتبہ بیت الخلاء کے ارادے سے نکلتے ہوئے اور پھر واپس کمرہ میں آتے ہوئے دیکھا''۔ مجھے اس پر حیرت ہوئی تو مولانا ادریس سگروڈوی نے بتایا کہ ہر وقت فکرِ علم میں رہتے ہیں۔ (۲۱) ساتھ ہی کتب کے ادب واحترام میں ذرہ برابر بھی کوتاہی نہیں کرتے، جیسا کہ خود شاہ صاحب فرماتے ہیں: ''میں نے سات سال کی عمر کے بعد دین کی کسی کتاب کو وضو کیے بغیر ہاتھ نہیں لگایا۔ (۲۲)

تواضع وانکساری:

آپ نے مدارس اسلامیہ کے قلیل مشاہرہ پر قناعت کی، توکل، تحمل، قناعت، سیرچشمی، خودداری تواضع وانکساری آپ کا طرۂ امتیاز تھا، کثیر البکاء، کثیر السکوت، قلیل الغذاء قلیل النوم، مستغنی المزاج ظریف الطبع بزرگ تھے۔ اساتذۂ کرام اور بزرگ ہستی وشخصیت کے آداب و احترام اور طلبۂ کرام پر شفقت ومحبت کرنا عادت ثانیہ تھی۔ (۲۳)

بیعت وخلافت:

سب سے پہلی تربیت آپ کی اپنے والد بزرگوار کی آغوش شفقت میں ہوئی، وہ ''سہروردی'' طریقہ کے منتخب اشخاص تھے، انہوں نے اپنے نامور بیٹے کوسہروردی میں مجاز فرمایا۔ دارالعلوم سے فراغت کے بعد ۱۳۱۴ھ میں خدمت میں حاضر ہوئے، بیعت کے ذریعہ باطنی فیوض وبرکات سے مستفیض ہوکر خلافت حاصل کی اور تیسری اجازت حضرت شیخ الہند سے ہے۔ (۲۴)

تصانیف وتالیفات:

بہت سی گراں قدر مایۂ ناز کتابیں آپ کے قلم سے نکلیں، جس میں بیشتر غیر مطبوعہ ہیں اور چند تصانیف کو مجلس علمی دارالعلوم ڈابھیل نے شائع کیا جو کہ معروف ہیں، نیز آپ کے نامور تلامذہ نے آپ کے افادات کو بھی مدون وشائع کیا اور علمی دنیا کے لیے اس خزانے کو محفوظ کردیا۔ (۲۵) تاہم محدود صفحات کے اندر فہرست کتب وتصانیف وغیرہ کو بیان کرنا غیر ممکن ہے۔

علالت ووفات:

زمانۂ قیام ڈابھیل میں پرانے مرض ''بواسیر خونی'' کا غلبہ ہوا، معالجہ کے باوجود روز بروز بڑھتا گیا تا آنکہ ۳ رصفر ۱۳۵۲ھ = ۲ رمئی ۱۹۳۳ء کو تقریباً ۶۰ رسال کی عمر میں دیوبند میں راہی ملک بقا ہوئے۔ میاں اصغر حسین صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی اور عیدگاہ کے قریب مدفون ہوئے۔ (۲۶)

حرف آخر:

یوں تو حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ کی حیات وزندگی، سیرت وکردار اور اخلاق و اوصاف نیز خدمات وکارنامے پر روشنی ڈالنے کے لیے دفتر کی ضرورت ہے، چنانچہ لکھنے والوں نے خوب لکھا، بہت کچھ لکھا، دیدہ ریزی اور عرق ریزی سے لکھا، پر یہ مختصر اور محدود صفحات اس کے متحمل نہیں، پھر بھی پیش نظر مقالہ میں آپ کی حیات وزندگی کے اور کارنامے کے اہم اہم شوشے اور گوشے پر مختصر ہی سہی، مگر جامع ایک سنجیدہ کوشش کی گئی ہے۔ والحمد اللّٰہ علی ذالک و الصلوۃ و السلام علی من لانبی بعدہ

ماٰخذ ومراجع

۱- ملخص ونقش دوام: ص ۱۲۴، از حضرت مولانا انظر شاہ کشمیری رحفظہ اللہ، بیت الحکمت دیوبند

۲- وہ کوہ کن کی بات: ص ۲۱۹ حاشیہ، نقش دوام: ص ۲۷، بڑوں کا بچپن: ص ۶۷

۳- نقش دوام: ص ۲۷، وہ کوہ کون کی بات: ص ۲۱۹

۴- بڑوں کا بچپن: ص ۶۷، از حضرت مولانا محمد اسلم صاحب شیخوپوری، زمزم بکڈ پو، دیوبند
۵- نقشِ دوام: ص ۲۳، تاریخ دارالعلوم
۶- دیوبند میں آنے کے وقت میں اختلاف ہے، چنانچہ "وہ کوہ کن کی بات" میں ۱۳۱۰ھ، تاریخ دیوبند میں ۱۳۰۸ھ اور نقشِ دوام میں ۱۳۰۷ھ اور ۱۳۰۸ھ دونوں ہے۔ واللہ اعلم۔
۷- تاریخ دیوبند: ص ۶۳، وہ کوہ کن کی بات: ص ۲۱۹، نقشِ دوام: ص ۲۸، ۳۱، ۳۲
۸- بڑوں کا بچپن: ص ۶۹
۹- وہ کوہ کن کی بات: ص ۲۱۹، نقشِ دوام: ص ۱۴۲
۱۰- تاریخ دیوبند: ص ۶۴، وہ کوہ کن کی بات: ص ۲۱۹، ۲۲۰، نقش دوام: ص ۳۴، ۳۵، ۳۶
۱۱- وہ کوہ کن کی بات: ص ۲۱۹، از حضرت مولانا نور عالم خلیل امینی، ادارہ علم وادب، دیوبند
۱۲- بڑوں کا بچپن: ص ۶۸، مرتب واضافہ: مولانا حکیم محمد ساجد الواجدی، زمزم بکڈ پو دیوبند
۱۳- نقشِ دوام، ص ۴۷، بڑوں کا بچپن: ص ۶۸، زمزم بک ڈپو دیوبند
۱۴- بڑوں کا بچپن: ص ۶۹، زمزم بک ڈپو دیوبند
۱۵- نقشِ دوام: ص ۱۴۷، ۱۷۵، ۱۷۰، ۱۷۳
۱۶- نقشِ دوام: ص ۴۱، ۱۲۷
۱۷- وہ کوہ کن کی بات: ص ۲۲۰
۱۸- تاریخ دیوبند: ص ۶۶، متاع وقت اور کاروانِ علم: ص ۲۱۹
۱۹- وہ کوہ کن کی بات: ص ۲۲۰، نقش دوام: ص ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹
۲۰- نقشِ دوام: ص ۴۷
۲۱- نقشِ دوام: ص ۱۰۸، ۱۱۲، ۱۱۳
۲۲- نقش دوام: ص ۱۰۸
۲۳- تاریخ دیوبند: ص ۶۴، نقشِ دوام: ص ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۰۳
۲۴- وہ کوہ کن کی بات: ص ۲۲۰، نقش دوام: ص ۱۴۲، ۱۴۳
۲۵- تاریخ دیوبند: ص ۶۶، وہ کوہ کن کی بات: ص ۲۲۰
۲۶- نقش دوام: ص ۴۷، ۵۳، تاریخ دیوبند: ص ۶۶، وہ کوہ کن کی بات: ص ۲۲۰

علامہ انور شاہ کشمیری اور

عصری علوم کی تلقین

عابد انور

اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں بے شمار علماء کرام پیدا ہوئے جنہوں نے قرآن و حدیث اور تفقہ فی الدین میں اپنی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ کوئی ابن حجر عسقلانی کے نام معروف ہوئے تو کوئی ابن تیمیہ تو کوئی امام غزلی ہوئے تو کوئی علامہ رازی تو کسی نے طب و فلسفہ میں اپنا جھنڈا بلند کیا تو ابن سینا بنے۔ اس دور کے ہر علماء کو اپنے میدان میں مہارت حاصل تھی اس دور میں اس کا کوئی ثانی پیدا نہیں ہوا۔ ان علماء کی کتابیں قرآن و حدیث اور علم فقہ کو سمجھنے میں مدد کرتی ہیں بلکہ یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ ان حضرات کی تفاسیر اور احادیث کی تشریح سے نہ صرف سارے علماء کرام بلکہ عوام بھی مستفید ہو رہے ہیں لیکن ایسے عالم دنیا میں کم پیدا ہوئے جس میں ابن حجر عسقلانی جیسی علم حدیث کی خصوصیت، ابن کثیر اور علامہ رازی جیسے مفسر کی فہم و ادراک، ابن تیمیہ کا علم کلام اور امام غزالی کی فکر و تدبر اور ابن سینا کا طب و حکمت اور علامہ رازی کا فلسفہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہو۔ ایک ایسے ہی عالم کو ام المدارس دار العلوم دیو بند نے پیدا کیا جسے ہم، آپ اور دنیا امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری کے نام سے جانتی ہے۔

علامہ انور شاہ کشمیری (پیدائش ۲۷ شوال المکرم ۱۲۹۲ ہجری بمطابق ۲۵ نومبر ۱۸۷۵۔ وفات ۳ صفر المظفر ۱۳۵۲ ہجری بمطابق ۲۷ مئی ۱۹۳۳) کی پرورش و پرداخت علماء اور قائد ساز رہنما شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمتہ اللہ علیہ کے زیر عاطفت اور شاگردی میں ہوئی تھی۔ حضرت شیخ الہند کی دور رس نگاہ نے ایسے لعل بے بہا کو شناخت کر لیا تھا جو آئندہ امام العصر کا خطاب

پانے والا اور پوری دنیا میں صاحب علم وفضل وکمال بن کر آفتاب کی مانند دمکنے والا تھا۔ ہندوستان میں آج تک کسی ادارے نے ایسا متبحر عالم پیدا نہیں کیا جو تمام علوم وفنون میں مہارت رکھتا ہو۔ علامہ انور شاہ کشمیری نہ صرف علم حدیث، علم فقہ میں ہی کمال نہیں رکھتے تھے بلکہ طبیعات، الہیات، سلوک وتصوف، نجوم ورمل، جفر، قیافہ، علم ہندسہ، ریاضی، ریاضی کی باقی شاخیں، علم مناظرہ، علم بلاغت، علم کلام اور علوم عربیہ پر بھی عبور حاصل تھا۔ جہاں آپ فارسی، عربی، اردو، کشمیری اور دوسری زبانیں جانتے تھے وہیں عبرانی زبان بھی آپ کی فہم سے بعید نہیں تھی۔ بقول علامہ اقبال گزشتہ ۵۰۰ برسوں میں دنیا میں علامہ انور شاہ کشمیری جیسا عالم پیدا نہیں ہوا۔ یہ کوئی مبالغہ نہیں بلکہ بعینہ حقیقت ہے۔ یہ علامہ ہی کی شخصیت اور علمی فہم وفراست اور نورانی چہرہ کا کمال تھا کہ بڑے بڑے ہندو مذہبی رہنماؤں نے کہا کہ اسلام کی حقانیت کی دلیل کے لئے یہ کافی ہے کہ انور شاہ جیسا شخص اسلام پر قائم ہے۔

اگر دارالعلوم دیوبند کے سارے علماء کے کارناموں کو نظر انداز کر دیا جائے تو بھی علامہ انور شاہ کشمیری کی جامع شخصیت اور ان کے کارنامے ایسے ہیں جو تمام علمائے کے کارناموں پر بھاری ہیں۔ وہ چلتا پھرتا کتب خانہ تھے۔ قوت حافظہ کا یہ عالم تھا کہ جس چیز پر ایک بار نظر پڑ جاتی وہ ہمیشہ کے لئے ازبر یاد ہو جاتی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ علماء دیوبند کے موقف کو ان کے مسلک کی کتابوں کے حوالے سے متزلزل کرنے کی کوشش کی گئی تو علامہ انور شاہ کشمیری سامنے آتے تھے اور دیکھنے کے بعد کہتے تھے کہ یہ عبارت صحیح ہے لیکن اس میں بیچ کی لائن چھوڑ دی گئی ہے، جس سے یہ مسئلہ پیدا ہوا ہے اور ان کتابوں کا حوالہ دیتے جسے وہ ۳۰، ۳۵ سال قبل پڑھ چکے تھے۔ اس طرح علماء دیوبند کے موقف پر ہونے والا اعتراض خود بخود درفع ہو جاتا۔

دارالعلوم دیوبند کے بارے میں عام طور پر اس مفروضے کو ہوا دی جاتی ہے کہ علماء دیوبند عصری علوم کے خلاف تھے۔ انگریزی پڑھنے کو منع کرتے ہیں یا کرتے تھے۔ یا یہ کہ وہاں انگریزی تعلیم نہیں دی جاتی۔ یہ سچ ہے کہ دارالعلوم دیوبند میں انگریزی کی باضابطہ تعلیم نہیں دی جاتی اور دارالعلوم دیوبند کا مقصد بھی یہ نہیں ہے کہ دارالعلوم میں انگریزی کی تعلیم دی جائے کیوں کہ اس کا مقصد اسلام کا داعی تیار کرنا ہے ان افراد کو تیار کرنا ہے جو اسلام کی حقانیت کی تبلیغ کے لئے خود کو وقف کر دیں۔ دارالعلوم دیوبند اس میں سو فیصدی کامیاب بھی ہے۔ دارالعلوم نے ہندوستان میں مذہب اسلام کی تبلیغ وتلقین اور اس کے تحفظ میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔

انہوں نے ہر موقع پر باطل قوت کے سامنے سینہ سپر ہو کر مقابلہ کیا ہے خواہ وہ آریہ سماج کا دور ہو یا عیسائیت کا یا مرزا غلام احمد قادیانی کا فتنہ نبوت ہر موقع پر علماء دیوبند نے اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہندوستان میں لیکچرر، پروفیسر اور ادیب پیدا کرنے میں کئی مدارس نے اہم کردار ادا کیا تو کئی بڑے مدارس کے نام سامنے آئیں گے لیکن جب علم حدیث، علم فقہ اور علم کلام اور فلسفہ اور مذہب کے تحفظ اور اس پر ہونے والے اعتراضات کا دنداں شکن جواب دینے کا معاملہ ہو تو صرف اور صرف دارالعلوم دیوبند اور ان کے سپوتوں کا نام آتا ہے اور علامہ انور شاہ کشمیری کا نام ان میں نمایاں ہے۔ علماء دیوبند نے کبھی بھی انگریزی پڑھنے کو منع نہیں کیا جس وقت کچھ علماء نے منع کیا تھا اس وقت لارڈ میکالے کے اس پراگندہ رجحان اور فرنگی ذہنیت سے بچانا تھا جس کا مقصد انگریزی تعلیم کے ذریعہ اسلام کی تعلیمات اور اسلامی تہذیب وثقافت کو نیست و نابود کرنا تھا۔ اس وقت دارالعلوم دیوبند میں فراغت کے بعد باضابطہ انگریزی کی تعلیم دی جاتی ہے جس کا مقصد اسلام کے خلاف اٹھنے والے انگریزی زبان میں اعتراض کو اسی زبان میں جواب دیا جائے۔ دارالعلوم کے فضلاء اس کام کو بحسن وخوبی انجام دے رہے ہیں۔ اس وقت انگریزی کے کئی صحافی میدان میں ہیں، کئی انگریزی رسالے فاضل دیوبند کی ادارت میں شائع ہو رہے ہیں۔

اس کے علاوہ ہم دیوبند کے علماء متقدمین کو دیکھتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت کے علماء دارالعلوم سے فراغت کے بعد کئی جامعات میں لیکچرر پروفیسر ہوئے اور انہوں نے دینی علوم کی ترویج واشاعت کے ساتھ عصری علوم کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

علامہ انور شاہ کشمیری صرف محدث اور فقیہ ہی نہیں تھے بلکہ وہ اچھے طبیب، اچھے نجومی، عربی، فارسی اور اردو کے اچھے شاعر، بہترین انشا پرداز، منقولات ومعقولات میں یکساں مہارت رکھتے تھے۔ وہ درس میں صرف حدیث ہی نہیں پڑھاتے تھے بلکہ تمام علوم وفنون کا دریا بہایا کرتے تھے۔ ان کی ہی خصوصیت تھی کہ تمام علوم میں یکساں مہارت رکھتے تھے جب بھی کسی چیز کے بارے میں سوال کیا جاتا وہ تشفی بخش جواب دیتے۔

آپ اپنے تلامذہ کو عصری علوم وفنون کی طرف ہمیشہ متوجہ کرتے تھے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی جو آپ کے ارشد تلامذہ میں تھے ایک موقع پر ایک مکتوب میں انہیں عصری علوم کی طرف متوجہ کرتے ہوئے لکھا کہ ”اب ہندوستان میں اسلام کے خدام کو نہ صرف انگریزی بلکہ ہندی وسنسکرت بھی جاننے کی ضرورت پیش آگئی“۔ اسلام کی حقانیت اور تبلیغ واشاعت کے لئے

آپ نے بارہا طلباء کو انگریزی پڑھنے کی طرف متوجہ کیا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے ''نظام تعلیم وتربیت'' میں ذکر کیا ہے ''کہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آپ کے تلامذہ کا ایک بڑا حصہ عربی علوم سے فراغت کے بعد انگریزی علوم حاصل کرنے میں لگ گیا اور یہ جماعت آج اسلام کی وقیع خدمت انجام دے رہی ہے''۔

علامہ انور شاہ کشمیری علم جفر ورمل میں بھی دسترس رکھتے تھے آپ نے اپنے بہت سے شاگردوں کو عصری علوم کا درس دیا تھا۔ مولانا کریم بخش لائلپوری پروفیسر اورینٹل کالج لاہور کے بقول رمل اور نجوم کی بعض کتابیں حضرت شاہ صاحب سے سبقاً سبقاً پڑھی ہیں۔ رمل ونجوم میں جو کچھ آپ کو مہارت حاصل تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ'' پنجاب کے ایک بزرگ کا حلقہ کافی وسیع تھا جفر ورمل کے ماہر تھے۔ ایک بار آپ ان کی خدمت میں سفر کرکے پہونچے اور چند روز رہ کر باقاعدہ اس فن پر آپ سے استفادہ کیا بعد میں انہوں (بزرگ) نے بیان کیا کہ مجھے اس کی امید تک نہ تھی کہ طبقہ علماء میں اس فن کے رموز واسرار کا ایسا شناسا بھی موجود ہوگا''۔

حضرت شاہ صاحب نے دارالعلوم سے فراغت کے بعد دہلی میں حکیم واصل خاں صاحب سے باضابطہ فن طب کی تعلیم حاصل کی تھی۔ حضرت مولانا عبیداللہ سندھی آپ کے رفیق درس تھے۔ حکیم صاحب نے آپ سے کہا تھا کہ آپ کو سب معلوم ہے اگر آپ چاہیں تو میں رسماً سند دے دیتا ہوں لیکن اس کے باوجود آپ نے اس فن کی تکمیل کی۔ اس کے علاوہ آپ کو قدیم منطق اور فلسفہ کے ساتھ جدید سائنس میں بھی کافی دلچسپی تھی۔ آپ نے جدید سائنس کی کئی کتابیں مولانا صدیق نجیب آبادی اور مولانا ادریس سکروڈوی کو پڑھائی تھیں۔ ایک مرتبہ بھوپال کے سفر میں جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں نے اسلامی نظریات سے نئی تحقیقات کے تصادم کا آپ کے سامنے ذکر کیا۔ حضرت شاہ صاحب نے نئی تحقیق کی روشنی میں جوابات دئے۔ آپ کے جوابات سے یہ نوجوان بے حد متاثر ہوئے۔ ایک بار آپ سے سوال کیا گیا کہ فلسفہ قدیم اسلام سے زیادہ قریب ہے یا جدید سائنس آپ نے جواب دیا کہ'' جدید سائنس اسلام سے زیادہ قریب ہے''۔

علامہ انور شاہ کشمیر کی جدید سائنس پر کس قدر گہری نظر تھی اس کا اندازہ ان کے اور علامہ اقبال کے درمیان ہونے والی مراسلت سے ہوتا ہے۔ علامہ اقبال جنہیں ''زمان ومکان سے گہرا شغف تھا، نظریہ ثقل کی کھوج کا سہرا مشہور سائنس داں نیوٹن کو دیا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مشہور عربی سائنس داں علامہ عراقی اپنی تصنیف **''غـایـتـه الامـکـان فی درایـتـه**

المكان ‘‘ میں اس نظریہ کو پیش کر چکے تھے۔علامہ اقبال نے ۱۹۲۸ میں لاہور کے اورینٹل کالج میں ’’حکمائے اسلام کے عمیق تر مطالعہ‘‘ کے عنوان سے ایک خطبہ دیا تھا جس میں انہوں نے کہا تھا’’ یہ مختصر حوالہ میرے ذہن کو’عراقی‘‘ کی تصنیف ’’**غایتہ الامکان فی درایتہ المکان**‘‘ کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔مشہور حدیث ’’**لاتسبو الدهر لان الدهر هو الله**‘‘ میں دہر بمعنی ٹائم (وقت) کا جو لفظ آیا ہے اس کے متعلق ’’مولانا انور شاہ صاحب‘‘ سے جو دنیائے اسلام کے جید ترین محدثین وقت میں سے ہیں میری خط و کتابت ہوئی‘‘اس مراسلت کے دوران مولانا موصوف نے مجھے اس مخطوطہ کی طرف رجوع کیا اور بعد ازاں میری درخواست پر ازراہ عنایت مجھے اس کی نقل ارسال کی‘‘۔ اسی پروگرام میں مشہور دانشور مولانا حبیب الرحمان شروانی بھی شرکت کر رہے تھے مندوبین کو ڈاکٹر علامہ اقبال نے یہ بتا کر حیرت میں ڈال دیا کہ شاہ صاحب نے مجھ کو بتایا کہ’’نیوٹن‘‘ نے زمان و مکان پر جو کا کچھ لکھا ہے وہ اس کی اپنی تحقیق نہیں بلکہ علامہ عراقی کے اس اسی رسالہ کا سرقہ ہے۔علامہ اقبال نے اس انکشاف کو یوروپ کے اخبارات میں بھی شائع کرایا۔(نقش دوام)

جس طرح استاذ کی شناخت ان کے شاگردوں سے ہوتی ہے۔اسی طرح حضرت شیخ الہند کی شناخت شاہ صاحب سے تھی۔شیخ الہند مولانا محمود الحسن کو اپنے شاگرد پر بڑا ناز تھا اور ان کا سب سے اہم بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے تقریباً سو سے زائد ایسے شاگردوں کو تراشا ہے جو اپنے میدان میں مہارت تامہ رکھتے تھے خواہ وہ سیاست کا میدان ہو یا علمی میدان یا انگریزوں کے خلاف عملی جہاد کا میدان ہر جگہ اپنے انمٹ نقوش چھوڑتے نظر آتے ہیں۔حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، شاہ صاحب اور مولانا عبیداللہ سندھی ان کی زندہ مثال ہیں۔کسی عالم نے آج تک ہونہار شاگردوں کی اتنی بڑی تعداد ترکے میں نہیں چھوڑی جتنی کہ شیخ الہند نے۔اسی طرح علامہ انور شاہ کشمیری نے اپنے شاگردوں کو علمی پیکر کے سانچے میں ڈھال کر تراشا ہے، جنہوں نے نہ صرف علم حدیث، فقہ میں نام پیدا کیا بلکہ وہ کالج کے لیکچرر اور پروفیسر ہونے کے ساتھ ریاستی اسمبلی کے ایوان ممبر اور اسپیکر تک ہوئے۔اس سے اندازہ لگانا چنداں دشوار نہیں کہ حضرت شاہ صاحب کی ژرف بینی کہاں کہاں تکی تھی۔وہ علماء کو کہاں کہاں دیکھنا چاہتے تھے۔مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی جہاں ممبر پارلیمنٹ منتخب ہوئے اور تقسیم ہند کے روح فرسا واقعات کے بعد مسلمانوں کی قیادت کی ذمہ داری ادا کی وہیں شمس الحق وزیر تعلیم بنے اور محمد مصطفے

جموں وکشمیر اسمبلی کے اسپیکر کے باوقار عہدے پر فائز ہوئے۔ آپ کے درجنوں شاگرد مختلف جامعات کے لیکچرر اور پروفیسر ہوکر دین ودنیا کی خدمت کی ان میں مولانا کریم بخش لائلپوری پروفیسر اورینٹل کالج لاہور، مولانا مناظر احسن گیلانی جنہوں نے کئی جامعات میں باوقار عہدہ سنبھالا، مولانا سعید اکبرآبادی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں سنی تھیالوجی کے شعبہ صدر رہے، اس کے علاوہ مولانا سیف الرحمان استاذ شعبہ دینیات پشاور یونیورسٹی، مولانا انوارالحق علوی پروفیسر پنجاب یونیورسٹی، مولانا محبوب الٰہی بنگلوری اورینٹل کالج دہلوی، مولانا فیض الدین ایڈووکیٹ حیدرآباد، مولانا خواجہ عبدالحیٔ جامعہ ملیہ اسلامیہ، مشہور ادیب خواجہ حسن نظامی، پروفیسر انوارالحق شیرکوٹی ثم کراچوی، علامہ تاجور نجیب آبادی، ابوالوفا شاہ جہانپوری شامل ہیں جنہوں نے دینی علوم کے ساتھ عصری علوم میں بھی اپنا ڈنکا بجایا۔ اس کے علاوہ خالص دین واسلام کی توسیع واشاعت میں آپ کے نمایاں شاگردوں نے اپنی زندگی وقف کی ان میں شاہ عبدالقادر رائے پوری، شاہ وصی اللہ الہ آبادی، مولانا اعزاز علی امروہوی (جن کے بارے میں کہا جاتا ہے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اس وقت ۷۰۰ روپے ماہانہ مشاہرے پر بلایا جارہا تھا تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ دارالعلوم دیوبند سے ٦٠ (ساٹھ روپے) تنخواہ ملتی ہے قیامت کے دن اس کا حساب نہیں دے پاؤں گا تو سات سو روپے کا حساب کیسے دوں گا اور انہوں نے علی گڑھ جانے سے انکار کردیا تھا)، مولانا مناظر احسن گیلانی، قاری محمد طیب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند، مولانا محمد میاں صاحب شیخ الحدیث مدرسہ امینیہ دہلی، مولانا ادریس کاندھلوی، مولانا بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنی، مفتی شفیع احمد عثمانی، محدث کبیر اور اسماء رجال کے ماہر حبیب الرحمان اعظمی، رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی، خطیب العصر مولانا سید شاہ عطاء اللہ بخاری، مفتی عتیق الرحمان عثمانی، مولانا منظور احمد نعمانی، مولانا یوسف بنوری، قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی اور مولانا حامد الانصاری غازی شامل ہیں۔

اس مختصر فہرست پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے کیسے کیسے گوہر ولعل بے بہا پیدا کئے۔ وہ صرف عصری علوم کی تلقین نہیں کرتے تھے بلکہ وہ خود بھی ان علوم کا عمیق مطالعہ کرتے تھے اور بعض شاگردوں کو پڑھایا بھی کرتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کو اور خصوصاً علماء کو اپنا وجود برقرار رکھنا ہے تو عصری علوم کی طرف توجہ کرنی ہوگی اس کے بغیر نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پوری دنیا میں اسلام کی ترویج واشاعت اور اس کی تفہیم ناممکن ہے۔ یہی وجہ تھی

کہ حضرت شاہ صاحب اپنے شاگردوں کو عصری علوم پڑھنے کی تلقین کرتے تھے۔

مولانا شبیر احمد عثمانی جو معاصرت کی بناء پر قدرے بیگانگی رکھتے تھے جب شاہ صاحب کے افکار وخیالات اور ان کے علوم وفنون کا دریچہ ان پر کھلا تو بے ساختہ انہوں نے کہا کہ "نہ آنکھوں نے ان کی نظیر دیکھی اور نہ خود اپنے دور میں انہیں کوئی اپنی نظیر مل سکی"۔ آپ کے ایک نامور شاگرد مفتی محمود صاحب نانوتوی نے ایک موقع پر کہا کہ "ہندوستان میں حضرت شاہ ولی اللہ سے زیادہ کامیاب کوئی مصنف اور حضرت شاہ صاحب کشمیری سے بڑھ کر کوئی مدرس نہیں ہوا"۔

علامہ اقبال کا یہ شعر علامہ انور شاہ کشمیری کی شخصیت پر پوری طرح صادق آتا ہے کہ

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا ہوتا

دار العلوم دیوبند یا ہندوستان کا کوئی ادارہ آج تک علامہ انور شاہ کشمیری جیسا عالم پیدا نہیں کر سکا۔ افسوس کی بات ہے کہ ہم لوگوں کو ان کا دور یا ان کے کچھ خاص تلامذہ کا دور دیکھنے کو نہیں ملا۔ احقر جس وقت دار العلوم دیوبند میں (۱۹۸۳ سے ۱۹۸۹) زیر تعلیم تھا اس وقت بھی اساتذہ سے حضرت انور شاہ کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں حاصل نہیں ہو سکی تھی۔ حالانکہ دار العلوم دیوبند کے اساتذہ کے درس کی یہ بات خاص ہوتی ہے کہ خواہ وہ کسی کتاب کا درس دیتے ہوں ضمناً بہت سارے علوم وفنون اور شخصیت کا تذکرہ آجاتا ہے لیکن ہم دار العلوم کے حالات کے سبب اساتذہ سے حضرت علامہ کشمیری کے حالات اور علوم وفنون کے بارے میں استفادہ سے محروم رہے۔ دیوبند نے وہی سلوک علامہ انور شاہ کشمیری کے ساتھ کیا جو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے ساتھ کیا تھا۔

علامہ انور شاہ کشمیری کی عصری تعلیم کی تلقین اور انگریزی تعلیم کی ترغیب کی کوشش رائیگاں نہیں گئی۔ دار العلوم دیوبند کے بہت سے فضلاء نے فراغت کے بعد عصری علوم کی طرف توجہ کی اور انگریزی زبان و بیان کے ذریعہ اسلام کی بے لوث خدمت کی اور حضرت شاہ صاحب کے ایک ہونہار شاگرد مولانا سعید اکبر آبادی کے ایک شاگرد ایک مملکت کے سربراہ بھی ہوئے اور انہوں نے اپنے اقتدار کے دوران نہ صرف جابر روسی افواج کو افغانستان سے نکلنے مجبور کر دیا بلکہ اس کی سپر پاور کا عہدہ بھی گنوانے پر مجبور کیا اور اسلام کی اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

علوم اسلامی کے کوہِ ہمالہ، محدث جلیل، امام العصر
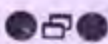
علامہ انور شاہ کشمیریؒ

مولانا شیر محمد امینی، مہتمم مدرسہ ابی بن کعبؓ گھاسیڑہ، میوات، الہند

گلستان وادیٔ لولاب کا تازہ گلاب
چہرۂ انور تھا شرحِ آئینہ نور و کتاب

نہایت عظیم القدر محدث، جلیل القدر عارف باللہ، علوم اسلامیہ کے کوہِ ہمالہ امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی ولادت باسعادت ۲۷ رشوال ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۶ راکتوبر ۱۸۷۵ کو بروز شنبہ بوقت صبح اپنے ننہال میں بمقام دوداں وادیٔ لولاب کشمیر میں ہوئی، آپ کا نام انور اور شاہ عرف ہے، آپ کے والد ماجد کا نام مولانا محمد معظم شاہ ہے، آپ کے والدِ ماجد بہت بڑے عالمِ ربانی، زاہد و عابد اور کشمیر کے نہایت مشہور خاندانی پیر و مرشد تھے، آپ کا سلسلۂ نسب حضرت شیخ مسعود نروری کشمیری سے ہے، جن کے بزرگوں کا اصل وطن بغداد تھا، وہاں سے ملتان آئے، پھر کشمیر میں سکونت اختیار کی۔

آپ نے ساڑھے چار سال کی عمر میں اپنے والد ماجد سے قرآن شریف شروع کیا، ساتھ ہی ساتھ فارسی کی بھی چند کتابیں شروع کیں اور چھ برس کی عمر میں قرآن شریف اور فارسی کی چند ابتدائی کتابیں ختم کر کے علوم متداولہ میں مشغول ہو گئے، مزید طلبِ علم کے لیے تین سال ہزارہ کے مدارس میں رہ کر مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھیں، یہاں بھی علم کی پیاس نہ بجھی تو ہندوستان کی عظیم دینی درس گاہ دارالعلوم دیوبند کی طرف روانہ ہو گئے، چنانچہ ۱۳۱۰ھ بطابق ۱۸۹۲ء میں دیوبند تشریف لائے اور چار سال رہ کر وہاں کے مشائخ وقت سے استفادہ کیا اور ۱۳۱۴ھ میں بیس اکیس سال کی عمر میں سند فراغ حاصل کی۔ حضرت علامہ کشمیریؒ کو شیخ

الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری، حضرت مولانا اسحاق امرتسری، حضرت مولانا غلام رسول ہزاروی جیسے عالی مرتبت اساتذہ سے شرف تلمّذ حاصل ہوا۔ حضرت شیخ الہندؒ کو اپنے اس غیر معمولی شاگرد سے بے پناہ محبت تھی، علامہ انور شاہ کشمیری بھی شیخ الہندؒ سے بے حد عقیدت رکھتے تھے، آپ کو حضرت شیخ الہند نے اپنا جانشین مقرر فرما کر گویا یہ ظاہر فرما دیا کہ جوہری نے اس گوہرِ نایاب کو پہچان لیا تھا، دارالعلوم سے فراغت پا کر آپ نے گنگوہ جا کر امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے سندِ حدیث اور فیوضِ باطنی حاصل کیے، اس کے بعد آپ دہلی تشریف لے گئے، جہاں مدرسہ امینیہ میں تین برسوں تک درس و تدریس کے فرائض انجام دیے، دہلی میں کئی سال قیام کے بعد آپ کشمیر تشریف لے گئے، جہاں سے آپ حج بیت اللہ کے لیے حجاز مقدس روانہ ہوئے، حج کی سعادت حاصل کرنے کے ساتھ ہی آپ نے طرابلس بصرہ، اور مصر و شام کی سیاحت کی، وہاں کے جلیل القدر علماء آپ کی خداداد لیاقت اور غیر معمولی استعداد سے بے حد متاثر ہوئے اور علمِ حدیث کی سندات عطا فرمائیں۔

سفر سے واپسی پر آپ نے بارہ مولہ کے رئیس خواجہ عبدالصمد کا کرو کی گزارش پر فیض عام کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا، جہاں تین سال تک علم دین کی روشنی پھیلاتے رہے، اسی دوران دارالعلوم کے جلسۂ دستار بندی میں شرکت کی دعوت ملی، آپ دیوبند تشریف لائے، اکابرین نے آپ کو درس و تدریس کے فرائض سپرد کیے، آپ کئی سال تک یہ مقدس فریضہ انجام دیتے رہے، مطالعہ، عبادت الہیٰ اور طلبہ کو تعلیم دینا انہوں ے اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تھا، وہ ساری عمر مجرد اور آزادرہ کر گزارنا چاہتے تھے، لیکن حضرت شیخ الہند نے انہیں اتباع سنت رسولؐ کی تکمیل کے لیے نکاح کی ترغیب دی، چنانچہ گنگوہ کے ایک معزز خاندان میں آپ کی شادی ہوگئی، اس وقت آپ کی عمر ۴۴ سال کی ہو چکی تھی، آپ کے زہد و تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ شادی ہونے تک آپ نے مدرسہ سے کبھی تنخواہ نہیں لی تھی، البتہ شادی کے بعد بہت معمولی مشاہرہ قبول کیا، شاہ صاحب خود فرماتے ہیں'' میں بارادۂ ہجرت وطن چھوڑ آیا تھا اور دیوبند اٹھارہ سال رہا، جن میں چھ سال دارالعلوم سے کوئی وظیفہ نہیں لیا، پھر نکاح ہوا، صرف اپنے بزرگوں کی اتباع میں علم پڑھاتا تھا، نہ دنیا پیش نظر تھی، نہ دین ہی کے لیے خاص نیت تھی''۔

حضرت مولانا انور شاہ کشمیری علم و فضل کے کس بلند درجے پر فائز تھے۔ اس کا اندازہ علامہ اقبالؒ کی رائے سے بہ آسانی ہوسکتا ہے کہ "اسلام کی آخری پانچ صدیاں مولانا انور شاہ کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہیں"، مولانا انور شاہ کشمیری کی اسلامی اور علمی خدمات کے بارے میں نامور عالمِ دین حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ نے فرمایا ہے کہ: آخر کی پانچ صدیوں کا تمام علم اگر یکجا کرلیا جائے تو انور شاہؒ کے علم کی زکوۃ بھی نہیں ہوتی، آپ کے فرزند شیخ الحدیث حضرت مولانا انظر شاہ مسعودی اپنے عظیم والد کے علم و فضل کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں:

"مرحوم علامہ کشمیری اپنے بے پناہ علوم کے اعتبار سے آخری صدیوں میں آیۃ من اللہ تھے، اسلامی علوم وفنون میں کوئی فن ایسا نہ تھا، جس میں وہ اپنی ذاتی رائے نہ رکھتے ہوں، خود فرماتے: میں کسی فن میں کسی کا مقلد نہیں ہوں، خود اپنی رائے رکھتا ہوں، بجز فقہ کہ ابوحنیفہ کی تقلید محض کرتا ہوں"۔

انہوں نے اسلامی علوم کا بالغ نظری سے مطالعہ کیا تھا، قرآن کریم پر بھرپور نظر تھی، اعجاز قرآن کا مسئلہ، جو آج تک زیر بحث چلا آرہا ہے، فرماتے کہ یہ مسئلہ میرے لیے سورج کی طرح روشن و منور ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ میں ایک سے بڑھ کر ایک عظیم علمی شخصیتوں کے جھرمٹ میں حضرت مولانا انور شاہ کشمیری کی ذاتِ گرامی قرآنی علوم اور فقہ و حدیث کی لافانی خدمات کی وجہ سے پورے عالمِ اسلامی میں نمایاں، مقبول اور معروف ہے۔

حضرت مولانا انور شاہ کشمیری نہ صرف اپنے عہد کے بہت عبقری عالمِ دین، مفسّر اور محدث تھے، بلکہ سادگی، پاکیزگی، قناعت، صبر و تقوی اور اخلاق حسنہ کی وجہ سے انتہائی عقیدت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، اسلام کی سربلندی ان کا مقصد حیات تھا، انہوں نے قادیانی فتنے کا مقابلہ پوری قوت کے ساتھ کیا، ردِ قادنیت کے لیے مختلف شہروں میں آپ کے مناظرے تاریخی حیثیت کے حامل ہیں، کئی بار بیماری کے عالم میں بھی مناظرہ کا سوال سامنے آیا تو آپ خود کو سفر سے روک نہیں سکے۔ آپ نے اپنی مدلل تقریروں سے قادیانات کو ادھیڑ کر رکھ دیا۔

حضرت کا سب سے اہم علمی کارنامہ صحیح بخاری کی اردو زبان میں شرح وتفسیر ہے، سات جلدوں پر مشتمل شرح بخاری شریف ''انوار الباری'' برصغیر کے مسلمانوں کے لیے حدیث شریف کو سمجھنے کا موثر وسیلہ ہے، جس کے مطالعے نے اہم ترین دینی مسائل کا حل، اسلامی تعلیمات کی روشنی اور دین و دنیا میں کامیابی اور سرخروئی کی جانب موثر رہنمائی ملتی ہے۔

آپ کے تلامذہ کی تعداد دو ہزار سے بھی زائد ہے، آپ کے تلامذہ میں حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ، حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری، حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی، حضرت مولانا یوسف بنوری اور حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادی جیسے نامور علماء شامل ہیں۔

اللہ تعالی نے آ کو بے نظیر قوت حافظہ کی دولت سے بھی مالا مال فرمایا تھا ''حیات انور'' میں لکھا ہے کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ نے فرمایا کہ مجھ سے حضرت شاہ صاحب فرماتے تھے کہ جب میں کسی کتاب کا سرسری مطالعہ کرتا ہوں اور اس کے مباحث کو محفوظ رکھنے کا ارادہ بھی نہیں ہوتا تب بھی پندرہ سال تک اس کے مضامین مجھے محفوظ رہ جاتے ہیں''۔

آپ کا علمی مقام بہت ہی بلند تھا، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے فرمایا کہ جب شاہ صاحب میرے پاس آکر بیٹھتے ہیں تو میرا قلب ان کی علمی عظمت کا دباؤ محسوس کرتا ہے، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ ہمیشہ آپ کو چلتا پھرتا کتب خانہ فرمایا کرتے تھے۔

آپ کے علمی کارناموں میں ہزاروں منفرد تلامذہ کے علاوہ عرف الشذی، فیض الباری، بسط الیدین، مشکلات القرآن، خاتم النبیین، عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ والسلام، خزائن الاسرار، فصل الخطاب فی مسئلۃ ام الکتاب، نیل الفرقدین، وغیرہ اہم ہیں۔

اس آفتاب علم، پیکر تقوی اور محدث جلیل کی وفات حسرت آیات ۳ر صفر ۱۳۵۲ھ مطابق ۱۹۳۳ء کو تقریبا ساٹھ سال کی عمر میں دیوبند میں ہوئی۔

●۞●
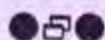
حضرت علامہ کشمیریؒ

معاصرین و مفکرین کی نظر میں

مولانا عبدالاحد صاحب جامعی ۔ استاذ جامعہ مدینۃ العلوم حضرت بل سرینگر

استاذ الاساتذہ حضرت شاہ صاحبؒ کی علمی شان اور آپ کی محدثانہ، فقیہانہ شخصیت پر کچھ بولنا لکھنا دراصل ان ہی علماء کا کام ہے جنہوں نے بحیثیت ذہین وفطین طالب علم یا آپ کے ساتھ ہم درس ہونے کے ساتھ ساتھ پورے انہماک سے سالہا سال حضرت موصوف کے ساتھ رہ کر تعلیم وصحبت کا استفادہ کیا ہو یا اور کسی طرح ان کو آپ کی فیض صحبت سے مستفید ہونے کا موقعہ ملا ہو ایسے ہی لوگوں کی تقریر وتحریر اس شاندار سیمنار میں واقعات پر مبنی اور قابل فکر ہوسکتی ہیں، پھر بھی ہر ایک طالب علم کی طرف سے کوشش ہے کہ وہ بھی حضرت شاہ صاحبؒ کی محبت وعقیدت میں اپنی اپنی ہمت کے مطابق بمجوای برگ سبز است تحفہ درویش'' کچھ پھول نچھاور کر کے اپنی پیاس بجھائے/حضرت شاہ صاحبؒ بے انتہا علمی اور اخلاقی خوبیوں سے مالا مال اور بے نظیر ہستی کی صورت میں اس دنیا میں نمودار ہوئے۔ اس بیسویں صدی میں ایشیا کے دیندار مسلمان اور علماء فضلاء آپ کے تعارف سے بے خبر اور غافل نہیں ہیں بلکہ متحدہ ہندوستان کی نمایاں شخصیتوں اور بیرون ہند کے عمائد وفضلاء وقت نے آپ کے متعلق اپنے اپنے تاثرات کا اظہار فرمایا ہے جن کے سننے سے دور حاضر کا ہر صاحب ذوق عالم اور باشعور مسلمان یا غیر مسلم متحیر رہتا ہے اور بزبان حال کہتا ہے۔ اے اللہ! کشمیر کی ایک پسماندہ آبادی اور اس کی شمالی سرزمین میں پر کیسا صاحب جلال متبرک انسان اور باکمال عالم باعمل منصۂ شہود پر آیا ہے۔ جس نے مشرقی دنیا سے اپنے لئے تحسین وآفرین کے انبار فراہم کئے ہیں۔ ہم یہ اندازہ کرنے میں حق بجانب ثابت ہوتے ہیں کہ حضرت شاہ صاحبؒ کی علمی وسعت، فکری قوت اور جامعیت نے آپ کے ہم عصر علماء وفضلاء کو اپنی اپنی رائے ظاہر کرنے

پر مجبور کر دیا جس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ اپنے وقت میں ایک بے نظیر محدث/ باکمال فقیہ اعظم اور ماہر علوم عقلیہ نقلیہ ہونے کے علاوہ صلحاء متقین کے زمرہ میں بھی ارفع مقام رکھتے تھے اس لئے چند مفکرین فضلاء دقائق شناس اور حقائق آگاہ آپ کے معاصرین کے آراء کو ایک جگہ جمع کر کے اس تحریر کو مزین کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے/ اگر میں اپنی ہی واقفیت پر اس تحریر کو محدود رکھتا تو حضرت ممدوح کا حق ادا نہ کر کے عنداللہ ماخوذ ہو جاتا۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس مقالہ کو کسی مبالغہ گوئی پر حمل نہیں فرمائیں گے۔ یہاں پر حضرت شاہ صاحبؒ سے بالواسطہ اور بلاواسطہ تلامذۂ کرام تشریف فرمائیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ اس چودھویں صدی ہجری میں علمی سمندر کے گوہر گراں مایہ، نکتہ دان فقیہ، روح بخاری، جانشین امام اعظم ابوحنیفہؒ چلتا پھرتا کتب خانہ، رازی زماں/ غزالی دوراں، آشنائے رموز قرآن، برجستہ شارح علم حدیث، صاحب علم وعمل، مجسم ورع وتقویٰ، صاحب رائے صائب استاد جلیل، اسلام کی حقانیت کا باکمال صاحب اور محافظ اسلام تھے۔

ترجمان فطرت شاعر مشرق ڈاکٹر محمد اقبالؒ کا فرمانا ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ منبر و محراب کے حقیقی وارث/ فغان سحری سے دلوں کو بیدار کرنے والے درویش اور ایک عظیم الشان کشمیری تھے۔ ظاہری نگاہ میں ڈاکٹر صاحب اور ہمارے شاہ صاحب ہم عصر تو تھے لیکن ڈاکٹر صاحب حضرت شاہ صاحبؒ سے بے پناہ محبت رکھتے تھے۔ اور ان کی صحبت میں رہ کر لمحوں کی قدر کرتے ہوئے آپ کے فیض و برکت حاصل کرنے کی فکر میں رہتے تھے/ شاید اسی نظریہ کے تحت ۱۹۲۵ء میں حضرت شاہ صاحبؒ کے ڈابھیل کا عزم کرتے وقت آپ کے لاہور آنے کی کوشش فرمائی تاکہ پنجاب بھی حضرت شاہ کے انوار علوم کا کچھ حصہ پاسکے۔ اور آپ کے دم قدم سے علم فقہ کی تدوین جدید ہو سکے۔ ڈاکٹر صاحب کو بجائے خود یقین تھا کہ یہ کار مشکل اگر علماء اسلام میں کوئی صاحب انجام دے سکے تو وہ حضرت شاہ صاحبؒ کشمیری ہیں/ چونکہ شاہ صاحب اس وقت ڈابھیل اوالوں سے وعدہ کر چکے تھے۔ اس لئے ڈاکٹر صاحبؒ کی یہ آرزو پوری نہیں ہو سکی۔

اسی طرح آپ کے معاصر مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب مفتی اعظم ہند کا اظہار ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ اپنے وقت میں کامل ترین عالم ربانی تھے۔ آپ کا تبحر علمی، فضل

وتقویٰ میں جامعیت، استغناء میں مسلّم، مخالف وموافق آپ کے سامنے سرخم استاذ الاساتذہ محدث وحید،، مفسر فرید، فقیہ یگانہ، ماہر علوم عقلیہ ونقلیہ غرض گوناگوں ادیبانہ فقرات سے مفتی صاحب مرحوم نے حضرت شاہ صاحبؒ کے علم وفضل کا اعتراف کیا ہے۔ یہ مدحیہ فقرات شاہ صاحبؒ پر اس طرح صادق اور چسپاں ہیں جس طرح نگین انگشتری پر۔ ایک وقت آپ شاہ صاحبؒ کی یاد کرتے کرتے فرماتے ہیں۔

نبية فائق الاقران يدعىٰ — بانور شاه موموق الجسود

فهذا الحبر غارس ذا النخيل — واول موقظ القوم الرقود

حضرت شاہ صاحبؒ کے قریب ترین رمز شناس، نکتہ فہم فضلاء شاگردوں میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کا فرمانا ہے کہ/ وقت خاصر میں بجای صاحب فتح الباری حافظ عسقلانی، شیخ تقی الدین، شیخ عز الدین عبد السلام تھے۔ حضرت موصوف کے انتقال کے وقت محسوس کیا گیا کہ مذکورہ تینوں بزرگوں کی وفات تازہ ہوئی۔ یہ بے نظیر عالم دین شاہ ولی اللہ باغ کے ثمر دار درخت تھے/ آپ کے فیوض نہ صرف ہندستان تک ہی محدود ہیں بلکہ بیرون ہند، مصر، ترکی، جاوا، بخارا اور چین تک پہنچ گئے ہیں۔ وسعت معلومات اور معقولات میں حضرت شاہ صاحبؒ جیسی کوئی عملی ہستی حجاز وعراق، شام اور دیگر ممالک اسلامیہ میں بھی نظر سے نہیں گزری ہے۔ یہ ہے آپ کے خلفیہ وجانشین تدریس مولانا حسین احمد صاحبؒ کا ظہار/ جب کہ آپ مذکورہ ممالک کے مسلمہ فضلاء اور اصحاب نقد ونظر سے بذات مکالمہ ومجالسہ کے بعد دار العلوم دیو بند تشریف لائے۔ لہذا یہ اظہار مبنی بر حقیقت ہے۔ حضرت شاہ صاحب کیا تھے، حافظ حدیث، محدث کبیر، آیۃ من آیات اللہ، دین کا ایک روشن منارہ مبالغہ گوئی کے بغیر فی الحقیقت عالم جلیل فاضل نبیل، محدث تقی ونقی، مفسر ومتکلم، ادیب وشاعر، صوفی صافی فی السنۃ تھے آپ کی زندگی کی ہر ایک حرکت موافق سنت نبویؐ ہوتی تھی۔

مفسر قرآن مولانا شبیر احمد عثمانی دیو بند اور ڈابھیل میں ۳۰ سال آپ کے رفیق خاص تھے آپ رقمطراز ہیں:

حضرت تاج الدی السبکی قفال مروزی کی نسبت فرماتے ہیں۔ ’’كان اماما كبيرا وبحرا عميقاً غواصا على المعانى الدقيقة نقى القريحة ثاقب الذهن عظيم المحل كبير الشان دقيق النظر فى زمانه‘‘۔

میں اپنے امام العصر مشہور و معروف بحر العلوم مولانا محمد انور شاہ کشمیری پر یہ سب کلمات مدحیہ صادق پائے۔اس میرے اظہار میں ذرہ برابر مبالغہ نہیں ہے کیوں کہ یہ بھی بلند پایہ امام، علم کے گہرے سمندر تھے انہیں دقیق معانی تک رسائی حاصل تھی۔ مجھے ان کی صحبتوں اور مجلسوں میں ان کے ساتھ رہ کر مشکلات فن اور مسائل دقیقہ میں سے ایک زمانہ دراز تک استفادہ ملتا رہا ہے جو کوئی میری کتاب فتح الملہم شرح صحیح مسلم کا مطالعہ کرے گا اس پر یہ حقیقت روشن ہو جائے گی۔ ہر سوال کے وقت ان کی خندہ پیشانی سے یہ محسوس ہوتھا تھا کہ وہ سوال سے خوش ہوتے تھے۔ یہ اہل کمال کی بڑی پہچان ہے جب ان سے سوال کیا جاتا ہے تو وہ سوال کے اصل منشاء کو سمجھ لیتے ہیں اور جواب دیکر خوش ہوتے ہیں غرض حضرت مرحوم معلومات کے دریا، حافظہ کے بادشاہ اور وسعت علمی کی نادر مثال تھے/ ان کو زندہ کتب خانہ کہنا بجا ہے شاید ہی کوئی مطبوعہ یا غیر مطبوعہ قلمی کتاب ان کے مطالعہ سے بچی ہو۔ آپ فنا فی العلم تھے۔ ان کی ذات حقیقت میں نور علی نور تھی۔

سری نگر میں ایک ضا دوست قادر شاہ درویش حضرت شاہ صاحبؒ کے ہم عصر اور ہم عمر بھی تھے۔ سری نگر میں حضرت شاہ صاحبؒ جب کبھی تشریف لاتے سب سے پہلے ان کی تلاش کرتے اور ان کو اپنے نزدیک بٹھاتے اور ان کے ساتھ تصوف اور معرفت کی باتیں فرماتے / درویش صاحب صوم و صلوۃ نفلیات کے سخت پابند تھے۔ وہ ایک دفعہ فرمانے لگے کہ میں حضرت شاہ صاحبؒ سے سخت مرعوب ہوں۔ میں بچشم بصیرت دیکھ کر کہتا ہوں کہ شاہ صاحبؒ عالم باعمل اور صاحب دل ہیں۔ علماء ہند کے تاج ہیں۔ صوفیان مشرق میں اونچا مقام رکھتے ہیں۔ حضرت خضر علیہ السلام کی ملاقات سے بہرہ ور ہوئے ہیں۔ میں آپ کے حضور میں بیٹھ کر کم بولتا ہوں دراصل ایسے مقام پر یہ مصرعہ یاد رکھنا چاہئے۔

خموشی معنئے دارد و کہ درع گفتن نمی آید

حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ اپنا تاثر ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:

مولانا انور شاہؒ کی ذات میں علم و عمل، سیرت و صورت، ورع و زہد/ رائے صائب اور ذہن ثاقب اللہ تعالیٰ نے جمع کیا ہے۔

جب حضرت شاہ صاحب بحیثیت صدر المدرسین دارلعلوم میں درس و تدریس میں

مصروف ہوتے تھے، حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی باوجود پیر و مرشد اور عالم تبحر ہونے کے حضرت شاہ صاحبؒ کے درس میں پوری دلچسپی کے ساتھ بیٹھتے اور بذریعہ خط و کتابت بھی آپ سے استفادہ فرماتے رہتے۔ حضرت شاہ صاحبؒ دباؤ جب کبھی آپ کے پاس بیٹھتے تو حضرت تھانوی صاحبؒ فرماتے میرا قلب آپ کی علمی عظمت کا دباؤ محسوس کرتا ہے۔ حضرت موصوف دارالعلوم دیوبند میں جب بحیثیت ایک استاذ کے متعین ہوئے۔ آپ کے علم و فضل اور نکتہ دانی کا شہرہ روز بروز بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ شفیق استاذ حضرت شیخ الہند کی ذہن رسا میں اساتذہ دارالعلوم میں سے حضرت موصوف ہی کو اپنی جانشینی کے لئے منتخب کرنے کا خیال غالب ہوتا گیا/ جس کا صحیح اندازہ اس واقعہ سے لگتا ہے کہ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کو اپنے قائم کئے ہوئے مدرسہ عالیہ کلکتہ میں شیخ الحدیث تلاش کرنے اور منتخب کرنے کی سخت ضرورت پیش آئی۔ انہوں نے مفتیٔ اعظم ہند مولانا کفایت اللہ صاحبؒ کی وساطت سے حضرت شاہ صاحبؒ کی علم حدیث میں امتیازی شان کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا۔ اسی بناء پر مولانا آزاد مرحوم شیخ الہندؒ کے نام خط لکھتے ہوئے مدرسہ عالیہ کلکتہ میں علم حدیث کے استاذ متعین کرنے کے متعلق دوستانہ منت سماجت کرتے ہیں۔ حضرت شیخ الہند جواباً رقمطراز ہیں کہ مولانا انور شاہ کشمیری دارالعلوم دیوبند کو نہیں چھوڑ سکتے ہیں۔ آپ کے مدرسہ عالیہ کلکتہ کی نسبت یہاں ہی ان کی زیادہ ضرورت ہے۔ اب رہا مدرسہ عالیہ اس کے لئے ہم علم حدیث کا درس دینے والا اچھا استاذ آپ کے لئے مہیا کریں گے لیکن مولانا انور شاہ کشمیری نہیں ملیں گے دراصل دونوں بزرگ خود پیکر علم و فضل تھے حضرت شاہ صاحبؒ کی جلالت علمی کو جانتے تھے اس لئے دونوں بزرگ حضرت موصوف کو اپنے سینے کے ساتھ لگانا پسند کرتے تھے۔ ولی را ولی می شناست۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے مشہور نامیدہ اور اصحاب تصنیف و تالیف شاگردوں میں کوئی بھی نہیں جنہوں نے اس حضرت ستاذ الاساتذہ کے حق میں اپنے اپنے تجربات اور چشم دید حالات کے آئینہ میں اپنے نیک خیالات کا اظہار کیا ہو۔ ایسے علماء بھی تھے جن کو حضرت شاہ صاحبؒ کے ساتھ مسلک کا اختلاف بھی تھا پھر بھی اس کو اعتراف تھا کہ حضرت شاہ صاحبؒ مثالی علمی شخصیت کے مالک تھے۔ امام المناظرین، فاتح قادیان حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری؟؟؟ مولانا ظفر علی خاں۔

●●

علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ

مولانا محمد ضیاء الرحمن ضیاء بھاگلپور

گلستان وادئ لولاب کا تازہ گلاب
چہرۂ انور تھا شرح آئینہ نور و کتاب

تھا جبیں پاک پہ سیمائے من اثر السجود
دیکھ کر حلقہ بگوش دیں ہوئے اہل جحود

مسلک قرن اولیں کا گم شدہ در فرید
جان محمود الحسن نور دل احمد رشید

دین کی حقانیت کا حجت و برہاں رہا
تھا فرشتہ اور گمان حضرت انساں رہا

چلتا پھرتا وہ کتب خانہ تھا مثل زیلعی
نکتہ دان فقہ و میر اذکیاء و ترمذی

فلسفی و آشنائے رمز قرآن مبیں
شارح علم حدیث پاک و نکتہ آفریں

بو علی وقت فخر الدین رازئ زماں
شہ ولی اللہ دوران و غزالی زماں

قالب روح بخاری ہمسر ابن الحجر
جانشین بو حنیفہؒ رشک یعقوب وزفر

تھا لبید و سعدیؑ پُر گو نظیر بو نواس
خوش اداو خوش مزاج و باجمال و خوش لباس

قول مرداں جان میدارد کی جو تفسیر تھی
فرقۂ باطل کے آگے وہ زباں شمشیر تھی

بے نیاز خانۂ و جاہ و جمال و سیم و زر
محو تھا درس و بیان وعظ میں شام و سحر

تھا دل شیشہ میں انوار جمال کبریا
اشف و اورع سرا پا دانش و حلم و حیا

علم کے چرخ چہارم پر ضیا افشاں رہا
ہر ستارہ کا سب انوار بے پایاں رہا

''نفحۃ العنبر'' مکمل داستاں ہے آپ کی
''فیض باری'' بار گاہِ جادداں ہے آپ کی

اے خوشادیوبند جلوہ زار حسن عالماں	مکۂ ہندی زیارت گاہِ ارباب دلاں
بوئے علم آسماں تجھ سے آئی تھی کبھی	چھتۂ مسجد میں شان دلربائی تھی کبھی
آج بھی دار العلوم پر شکوہ سینہ پہ ہے	بارش انوار رحمت جس کے ہر زینہ پہ ہے
تیرے دامن میں گلاب و لالہ چیدہ چیدہ ہیں	قاسم و محمود و انور جیسے آرامیدہ ہیں

مرکزِ نور و الہٰ و وارثانِ مصطفےٰ
گویا ظلمت گاہ میں خورشید انور کی ضیا

●☐●
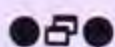
Usmani (author of Fathul Mulhim, a commentary of Sahi Al-Muslim) and Tafsee-e-Usmani), Maulana Syed Ahmad Raza Bijnori, Yusuf Binori (author of Nafhatul Anbar), Allama Ibrahim Balyawi (d. 1971).

Besides teaching and looking after the administrative affairs of Darul Uloom, Anwar Shah also devoted his time for the propagation of Islam. When the heretic sect Qadiyanism started to flourish in the sub-continent, he became actively involved in defense of the messengership of Prophet Muhammad (May peace and Allah's blessings be upon him). Anwar Shah came heavily on Qadiyanis and wrote various books on the topic in Urdu and Persian. These books include: Aqeeda-tul-Islam fi Hayaat-e-Isa Alaihis-Salam, Tahiyyatul-Islam fi Hayaat Isa Aliahis-Salam, Al-Tasreeh bi-ma Tawatara fi Nuzool al-Maseeh, Tafseer of Ayah Khatam-un Nabiyyin and Ikfar Al-Mulhideen.

His take on Qadiyanis was very strong. On one occasion while addressing students at Deoband he said that, "According to my thorough study of Islam, in the last fourteen hundred years, there has not been a fitna (mischief) as serious as that spread by the Qadiyanis. Uninformed Muslims are threatened by this dangerous and misleading fitna."

In 1927, there arose a problem in the management of Darul Uloom Deoband, which led Anwar Shah and some other teachers to resign. He was then convinced by Maulana Muhammad Ibn Musa Mian Afriqi to teach at Jamia Islamia in Dabhel, Gujarat. During his stay in Dabhel, Anwar Shah found Muslims indulged in practices that were contrary to the concept of tawheed in Islam. So, he devoted time for people's reforms. He taught there for 5 years. He returned to Deoband after he became ill.

This great son of Deoband set to never rise again during the night of Sunday, May 27, 1933 and was buried in the orchard that belonged to his wife on the outskirts of Deoband, near Eidgah.

On listening the news of his death, poet and philosopher Allama Iqbal (1877-1938) said, "During the last five centuries, Islamic history has failed to produce a scholar of the stature of Anwar Shah. Such an avant-garde aalim will not be born again."

●◆●
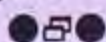
(A Delhi-based journalist Manzar Imam can be reached at manzarkhalil@gmail.com or +91-9810035066)

Born on 26 November 1875 in a respectable Syed family in Dudwan, a village in the beautiful valley of Lawlab, Kashmir, the lineage of Anwar Shah can be traced to the great Imam Abu Hanifa. He started learning Quran from his erudite father Maulana Syed Muazzam Ali Shah at the age of 4 and within six months was able to recite the Quran with phonetics. By the age of seven, he had studied Persian and mastered it later by studying Persian classics. He went to Hazara Valley (now in Pakistan), that was famous for distinguished scholars and studied there three years. Shah displayed great scholarship in studies. His teachers could foresee a rare insight and academic excellence in him.

In 1893 he came to Deoband and was introduced to Shaikhul Hind Maulana Mahmood Hasan by one of the trustees of Masjid Qazi where he stayed. Thus began the journey of two great minds. After his formal education at Deoband, Anwar Shah moved to Gangoh (Saharapur, U.P.) and continued his studies in Hadith. In the meantime he received spiritual guidance from Rasheed Ahmad Gangohi (1929-1905). After completing formal studies, Anwar Shah became a teacher at Madrasa Aminia, (Est. in 1897) Delhi.

In 1905 he met his teacher Shaikhul Hind Mahmood Hasan who insisted him to settle in Deoband and become a teacher. Out of respect for his teacher, Anwar Shah accepted the proposal and taught well-known hadith books: Sahih Muslim, Sunan Al-Nasa'i and Sunan Ibn Majah during first five years.

When Shaikhul Hind became more involved in politics and was compelled to immigrate to Madina, he chose Anwar Shah as his successor. Thus he became Sadr Mudarris (Head of Teachers) at Deoband and held the post for 12 years. During this period the teachers and the management of Deoband felt that in the absence of Shaikhul Hind he should be teaching Sahih Al-Bukhari and Tirmidhi, two of the prominent books of hadith. Thus he was accredited as "Shaikhul Hadith" of the famed Darul Uloom in Deoband. Personal interest and exposure to hadith made him one of the authorities on the subject. It was during this period that he trained numerous prominent scholars of hadith. There were about 20 thousands scholars who qualified under the able guidance of Anwar Shah. They include Shabbir Ahmad

articles expressing deep sorrow over the loss of this great scholar. Maulana Shabbir Ahmad Usmani (1885-1949) said, "Not only have the students been deprived of a great teacher but the learned ones too have lost a great guide."

Hussain Ahmad Madani (1879-1957) said I know scholars who remembered one lakh hadith and also scholars who memorized both Bukhari and Muslim but I have never seen an aalim who was a like living library except Anwar Shah. I did not find an aalim with such an academic depth in India, Arabia, Iraq and Syria. He was matchless.

Allama Muhaddith Ali Hambali of Egypt said, "I have traveled throughout the Arab world and met ulama of my age. I have also given lectures on Hadith for many years in Egypt. But I have not seen such an excellent religious scholar and Muhaddith from Syria to India." He further said that he had not seen any other scholar who could so brilliantly comment and present a research and academic discourse on Imam Bukhari, Hafiz Ibn Hajar, Imam Ibn Taimiya, Ibn Hazm and Shaukani.

After seeing Mirqat Al-Tarim of Anwar Shah, Shaikhul Islam Mustafa Sabri of the empire of Turkey said, "I do not think there is any other scholar left in the world who can understand philosophy and scholasticism in the way that Anwar Shah did."

Qari Muhammad Tayyib (1897-1983) described him as one of the greatest sons of Deoband who was one of the signs of Allah. Abdul Majid Daryabadi (1892-1977) called him a unique Hanafi scholar.

Anwar Shah wrote the famous book Faiz-ul-Bari, a commentary of the well-known book of Hadith, Bukhari. It is considered one of the best short commentaries of Bukhari ever written by an Indian scholar.

Some of the other works of Anwar Shah include Mushkilatul Quran, an explanation of the Quran; Anwarul Bari, an Urdu commentary of Bukhari; Khatimun Nabiyyin, Aqidatul Islam fi-Hayaat Isa Alaih As-Salaam and Al-Tasreeh bi-ma fi Nuzool-Al-Maseeh besides a number of works in Urdu, Arabic and Persian on various Islamic topics have been published, and a lot more are still awaiting publication.

researcher and thinker like Ghazali [1058-1111] was the proof of Islam's truth, famous aalim, Ashraf Ali Thanwi (1863-1943) says, "Among the many reasons of Islam's being a true religion is the fact of Anwar Shah's being a guardian of Islam." Had there been any deficiency and flaw in Islam, a scholar like Anwar Shah would not have remained a Muslim, Thanwi adds.

Maulana Habibur Rahman Ludhyanwi writes that Abul Kalam Azad (1888-1958) would consider it a matter of great pride to meet Anwar Shah. Azad would sit before him like a disciplined pupil for hours.

When Anwar Shah died, Muslims felt as if they had lost one of Islam's greatest scions. Condoling his demise, Syed Sulaiman Nadwi (1885-1953) wrote in Maarif: The example of Anwar Shah is like an ocean whose surface is calm, but beneath it there is a treasure-trove of precious pearls. He possessed a broad vision and an exemplary memory which was not found in that era. A hafiz of hadith, a scholar of the nuances of Islam, having great authority on sciences and literature, an expert of contemporary knowledge and a perfect man of poetry and piety who dedicated his life to the service of hadith and Quran till he breathed his last.

Syed Ataullah Shah Bukhari (1892-1961) said that Shah Sahab was left behind when the caravan of sahaba (companions of Prophet Muhammad) trekked. A mere glimpse of the prodigious Shah would turn critics into admirers, and if one attended his lesson, one could not resist from acknowledging his scholarship. Maulana Abdul Khaliq Madrasi, a teacher of hadith and deputy rector of Darul Uloom Deoband is often heard quoting an incident about Anwar Shah and Allama Rasheed Reda Al-Misri. The eminent Egyptian scholar was very critical to the understanding of hadith of Anwar Shah. But he was so impressed after he met Anwar Shah and attended one of his sessions of hadith that he said, "Had there not been the ulama of the east (read Deoband) the science of hadith could have gone waste." He is also reported to have said "I have not seen a more distinguished scholar than Anwar Shah."

The day following his demise, all major newspapers carried

footnotes and references, Anzar Shah (1929-2008), one of the two sons of the Anwar Shah, who write his luminous father's biography Naqsh-e-Dawam and was himself a great scholar, once said. His other son was Azhar Shah Qaisar (1920-1985).

One story of his brilliant memory goes like that once Anwar Shah visited a library in some Arab country. He saw a book on fiqh and liked it. He asked for the library management's permission to take the book to India. He was told that he could not take the book to India as that was the only edition available in the library. Anwar Shah sought permission to spend a night in the library so that he could read the whole book. Permission was granted to him. He spent the night in the library and read the whole book.

On returning to India, Anwar Shah wrote the complete book and also wrote a letter to the library management informing them that the book had three mistakes on such and such pages. He specified the number of pages. They were highly surprised to find that the mistakes he had pointed out were correct. The book is taught in almost all the madrasas that follow the Deoband syllabus.

There are many such stories like fables that are attached to this legendary scholar of Hadith whose academic excellence was acknowledged by great contemporary scholars from across the world. Some of these stories are true, some are even untrue. But such things do happen to legends who leave inimitable impressions on every walk of life that they tread.

A man's contemporaries are the best judges of his works and achievements - academic or otherwise. I therefore deem it wise to quote below the views of some of the contemporary scholars of Anwar Shah about his excellence.

Famous freedom fighter, prisoner of Malta, Maulana Mahmood Hasan (1851-1920), who was also teacher of Anwar Shah once, said that "Allah has put together knowledge, practice, character, piety, abstinence, a brilliant brain and a solid opinion in Anwar Shah."

While quoting a Christian philosopher who said that a

THE SCHOLAR WITH AN EIDETIC MEMORY

Allama Anwar Shah Kashmiri (1875-1933)

By Manzar Imam Qasmi

Darul Uloom Deoband is famous for producing some of the lofty elite Muslim intellectuals and most brilliant scholars of Hadith, fiqh and other Islamic sciences and disciplines. Shaikhul Hind Mahmood Hasan, Ashraf Ali Thanwi, Abul Mahasin Muhammad Sajjad (1882-1940), Mufti Kifayatullah Dehlawi (1875-1952), Qari Muhammad Tayyib, Mufti Muhammad Shafi Usmani (1897-1976), Shaikhul Adab Maulana Ezaz Ali (d. 1955), Minnatullah Rahmani (d. March 19, 1991), Hussain Ahmad Madani, Ubaidullah Sindhi ((1972-1944), Maulana Muhammad Hussain Bihari, Sanaullah Amritsari (1868-1948), Munazir Ahsan Geelani (b. Sept. 1892), Hifzur Rahman Seuharwi, the author of Al-Qamus-Al-Jadeed Wahiduzzaman Kairanvi (1930-1995), Qazi Mujahidul Islam Qasmi (1936-2002), Nik Aziz Nik Mat (chief minister of Kelantan State, Malaysia, born in 1931), Maulana Akhlaq Husain Qasmi (1924-2009), Maulana Salim Qasmi (b. 8 January 1926) and that is certainly not the end of the list.

Shaikhul Hadith Muhammad Anwar Shah Kashmiri belongs to the same distinguished group and is one of the shining stars in the long galaxy of Islamic scholars that the famed Islamic seminary has produced. This brilliant scion of Deoband is known for his piety, learning and phenomenal memory.

If he saw something, he would remember it for forty years, with precise details like the number of page and even the

باب
تنظیم

تنظیم علماء حق دھلی

منظوم حرف تحسین وتبریک

علامہ سید عبدالعزیز ظفؔر جنگ پوری القاسمی نئی دہلی

اللہ اللہ یہ تنظیم ذیشاں
ہر ادا اس کی جنت بداماں
اس جماعت سے مربوط ہے یہ
جس کی مدحت میں ناطق ہے قرآں
اس کا بانی ہے اعجاز عرفی
جس سے باطل ہے لرزاں وترساں
سرفروشوں کا ہے کارواں یہ
ہے یہ خون جگر کا گلستاں
اس کے ارکان و اعضا پہ ہردم
ہے سایہ فگن فضل رحماں
اب یہ تنظیم فرش زمیں پر
بن کے چمکے گی مہر درخشاں
روشنی اس کی پھیلے گی ہر سو
اس سے ہوگا یہ عالم چراغاں

اے ظفؔر اس کی اک دن جہاں میں
ہر طرف ہوں گی شمعیں فروزاں

جس میں مضمر ہے انساں کی عظمت
وہ مبارک یہ تنظیم حق ہے
جس کا نعرہ ہے حق و صداقت
وہ مبارک یہ تنظیم حق ہے
جو سنوارے گی گیسوئے قسمت
وہ مبارک یہ تنظیم حق ہے
دین حق کی نہاں جس میں دعوت
وہ مبارک یہ تنظیم حق ہے

ہے ظفؔر مندی جس کی بدولت
وہ مبارک یہ تنظیم حق ہے

تنظیم علماء حق

رباعیات

ولی اللہ قاسمی بستوی

استاد جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا، نندوربار، مہاراشٹر

خوش ادا ہے ، یہ تنظیم علماء حق
باعث سرخوشی ، وجہ چین وسکوں
مرحبا ! کیسی فعال ، تنظیم ہے
اس کا اقدام ہے ، لائق آفریں
نیک آغاز ہے ، نیک انجام ہے
ملک میں ہر طرف ، اس کی شہرت ہوئی
اس سے دینی مدارس ، بھی قائم ہوئے
اس سے ترویج سنت ، ہوئی چار سو
اس سے اعمال حسنہ ، کی تعلیم ہے
ہند میں اس کا فیضان جاری ہوا
ایک سلجھا ہوا ، اس کا دستور ہے
ارض دہلی میں ، یہ ایسی تنظیم ہے
اس کا سکریٹری ، عرفی اعجاز ہے
اک سخنور ہے ، عالم ہے ، شاعر بھی ہے
اے "ولی" عالموں کی ہے یہ رہگذر
یہ خلوص و محبت کا پیغام ہے

دلربا ہے ، یہ تنظیم علماء حق
جانفزا ہے ، یہ تنظیم علماء حق
مرحبا ! کیسی خوشحال ، تنظیم ہے
مرحبا ! نیک اقبال ، تنظیم ہے
الفتوں ، شفقتوں کا بھرا جام ہے
قابل تذکرہ ، اس کا ہر کام ہے
اس سے علمی مراکز ، بھی قائم ہوئے
اس سے عصری مکاتب ، بھی قائم ہوئے
اس سے اخلاق حسنہ ، کی تعلیم ہے
اس سے افکار حسنہ ، کی تعلیم ہے
دائرہ اس کی خدمت کا بھرپور ہے
ہند میں ہر طرف ، جو کہ مشہور ہے
جو کہ بانی بھی ہے ، اہل اعزاز ہے
ملک وملت کا سچا ، جو دمساز ہے
خدمت دین کرتی ہے شام وسحر
ہے دعا ! تا قیامت رہے جلوہ گر

رباعیات

ولی اللہ ولی قاسمی بستوی
استاذ جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا، نندوربار، مہاراشٹر

ایک نقش حسن ''حسن تدبیر'' ہے
اس کی تابش سے روشن ہے، ادبی سحر
جلوہ حسن باطن کی ہے یہ کرن
اس سے، فن صحافت، میں جان آ گئی

ایک گہوارۂ علم کا، خرمن ہے یہ
اس کے دامن میں رونق ہے بازار کی
جہل کی شب میں یہ شمع پر نور ہے
ایک شہ پارہ علم وحکمت ہے یہ

عظمت فکر و فن کا، یہ مینار ہے
چاند، تاروں کی صورت ہے جس کی کلی
اس سے روئے ادب پر، نکھار آ گیا
جب نظر پڑ گئی ''حسن تدبیر'' پر

اس کا بانی وہی، عرفی اعجاز، ہے
''حسن تدبیر'' کی شان کیا پوچھنا

علم وفن کا چمن ''حسن تدبیر'' ہے
نازش فکر وفن ''حسن تدبیر'' ہے
شمع اردو، میں آئی ہے اس سے بھی پھبن
اس سے اردو ادب، کا کھلا ہے چمن

ادب اردو، کا معمور، گلشن ہے یہ
ایک، افکار باطن کا، مخزن ہے یہ
ظلمتوں میں حسیں، جلوہ طور ہے
ضوء اردو ادب سے یہ معمور ہے

موتیوں کا ادب کے، یہ ذخار ہے
ایسا اردو ادب کا، یہ گلزار ہے
باغ اردو میں، دور بہار آ گیا
بے کلی مٹ گئی ہے، قرار آ گیا

جس کا زریں قلم، ایک اعجاز ہے
سر پہ اردو، کے جو، تاج اعزاز ہے

آل انڈیا تنظیم علماء حق کی

اشاعتی خدمات

حقانی القاسمی

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ہندوستان میں احیاء وتجدید دین کے لئے جن کوششوں کا آغاز کیا تھا، انہیں منزل دیوبند کے وسیلے سے ملی۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنے انقلابی تجدیدی افکار کے ذریعہ ہندوستان کی سرزمین میں جو روح پھونکے ہے دیوبند نے اسی روح کی ترسیل تمام علاقوں میں کی۔ اسی طرح ولی اللہی فکر کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا اور ہندوستان اس اسلامی فکر سے آشنا ہوا جو دراصل مساوات انصاف پر مبنی ہے۔ ولی اللہ تحریک کے فروغ میں دیوبند کو عالمی سطح پر شناخت میسر ہے۔

دیوبند نے برصغیر میں مختلف ذریعوں سے اسلامی احیاء کا ناقابل فراموش کارنامہ انجام دیا ہے مختلف ادارے، تنظیمیں اس سلسلے میں مصروف ہیں، دیوبند فکر کا ایک ترجمان آل انڈیا تنظیم علماء حق بھی ہے، جس نے بہت مختصر مدت میں قومی سطح پر اپنی ایک علاحدہ شناخت قائم کی ہے اس کے مقاصد میں جہاں جدید تقاضوں کے پیش نظر دینی مدارس، علمی مراکز اور عصری مکاتب کا قیام، مسلمانوں میں اعمال صالح، اخلاق حسنہ کی تعلیم وتربیت صحیح اسلامی عقائد کا فروغ، ملک کے مختلف فرقوں کے مابین اتحاد وہم آہنگی شامل ہیں وہیں اس کا ایک مقصد تحریروں کے ذریعہ ان افکار کا ترویج اشاعت بھی ہے جن سے مسلمانوں کا اجتماعی روحانی ضمیر بیدار ہو۔ چنانچہ تنظیم نے اس تعلق سے اپنی کوششیں تیز کر دی ہیں اور اشاعتی محاذ پر بھی یہ نہایت

سرگرم ہے۔ تنظیم کواس بات کا احساس ہے کہ لٹریچر کے ذریعہ انسانی ذہن وشعور میں تبدیلی لائی جاسکتی ہے۔ چنانچہ تنظیم نے اپنا ایک نشر واشاعت کا شعبہ بھی قائم کیا ہے جس کے تحت سہ ماہی ''حسن تدبیر'' جیسا موقر اور معتبر رسالہ شائع ہورہا ہے۔ سہ ماہی حسن تدبیر کا اختصاص یہ ہے کہ اس نے اپنے دستور العمل کے مطابق اکابرین اہل حق کے فکر وعمل کی ترویج واشاعت کا کام بخوبی پورا کیا ہے چنانچہ اس تعلق سے حسن تدبیر نے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی پر ایک دستاویزی شمارہ شائع کیا اور مولانا تھانوی کی حیات وخدمات کے حوالہ سے معتبر تحریریں شامل کیں۔ مولانا تھانوی کے افکار کو عام کرنے کے لئے اس شمارے کا ایک حصہ بھی مختص کیا گیا اس طرح حکیم الامت پر شائع ہونے والے کسی بھی رسالے کا یہ سب سے ضخیم اور اہم شمارہ ہے اس سے مولانا تھانوی کے تئیں لوگوں کی دلچسپی بڑھی۔ حکیم الامت کے علوم ومعارف کو عام کرنا بھی تنظیم کے منشور کا ایک حصہ تھا اس اعتبار سے اس نے یہ کام بھی کردکھایا۔ حکیم الامت کے بعد دوسری بڑی شخصیت جن کے اثرات ہمہ گیر ہیں وہ ہیں مولانا قاری محمد طیب حکیم الاسلام ۔ سہ ماہی ''حسن تدبیر'' نے حکیم الاسلام قاری محمد طیب پر ایک دستاویزی نوعیت کا خصوصی شمارہ شائع کر کے دیوبند کے اس نابغہ کو نہ صرف خراج عقیدت پیش کیا بلکہ قاری محمد طیب کی ہمہ جہت شخصیت کے تمام پہلوؤں سے ان قارئین کا بھی تعارف کرایا جوان سے کماحقہ واقف نہیں تھے۔ حکیم الاسلام کے بعد ''حسن تدبیر'' کا ایک خاص شمارہ محدث عصر مولانا انظر شاہ کشمیریؒ کی حیات وخدمات پر محیط تھا دیوبند کے اس ادیب لبیب اور بے بدل خطیب کے حوالے سے یہ واحد ضخیم اور دستاویزی شمارہ تھا جس میں مولانا انظر شاہ کشمیریؒ جیسی عبقری شخصیت کی ملی، دینی، تصنیفی خدمات سے متعارف کرانے کی کوشش کی گئی اس طرح ''حسن تدبیر'' نے سلسلہ دیوبند کے ان تینوں اکابر کو جو خراج عقیدت پیش کیا ہے وہ قابل تحسین وتبریک ہے۔ ''حسن تدبیر'' نے اوقاف سے متعلق بھی ایک شمارہ شائع کیا جو یوں بھی اہمیت کے حامل ہے کہ آج اوقاف کی جوصورت حال ہے اس سے بہت کم لوگ آگاہ ہے۔ ''حسن تدبیر'' کے شمارے اپنے محتویات اور مشمولات کے اعتبار سے بھی ذہن وفکر کے نئے دریچے کھولتے ہیں اور ہمارے منجمد احساس کو مرتعش بھی کرتے ہیں۔

تنظیم نے حسن تدبیر کے علاوہ بھی اپنی اشاعتی سرگرمیاں جاری رکھی ہیں اوراس ذیل میں ''ذکرحرمین''،''پیام رسالت''،''الفرید المنضد علی شرح موطا امام محمد''،''دارالعلوم دیوبند ادبی شناخت نامہ''،''رینو کے شہر میں'' قابل ذکر ہیں۔

اول الذکر کتاب ''ذکرحرمین'' مولانا محمد اعجاز عرفی کی کتاب ہے جو اس لحاظ سے نہایت اہمیت اور معنویت کی حامل ہے کہ اس میں حرمین شریفین کی اہمیت کے ساتھ ساتھ تعمیر کعبہ کی تاریخ اور بعد کے ایام میں حرمین شریفین میں ہونے والی تمام تر تبدیلیوں کی تفصیلات درج کی گئی ہیں۔ ''پیام رسالت'' میں حسن کردار اور حسن معاملات کی اہمیت بیان کی گئی ہے۔ جب کہ الفرید المنضد میں دارالعلوم دیوبند کے استاذ حدیث مولانا فرید الدین قاسمی نے حنفی اسلامی قانون کے مجموعہ موطا امام محمد کے ایک حصے کا ترجمہ اور تشریح کر کے طلبہ کے لئے آسانی پیدا کر دی ہے۔

تنظیم علماء حق کی اشاعتی خدمات یقینی طور پر اس بات کا واضح اشارہ ہیں کہ یہ تنظیم متحرک ہے اور اس کی فعالیت کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ تنظیم کے تفاعل اور حرکیت کا ثبوت وہ تمام مطبوعات ہیں جو وقتاً فوقتاً تنظیم کے زیر اہتمام منظر عام پر آتی رہی ہیں اور یہ اشاعتی سلسلہ یوں بھی قائم ہے کہ خود آل انڈیا تنظیم علماء حق کے صدر مولانا محمد اعجاز عرفی قاسمی علم وادب کا نہایت شستہ اور شائستہ ذوق رکھتے ہیں اور تنظیم کے دستور العمل کے تئیں مخلص اور وفادار ہیں۔ مجھے امید ہے کہ قومی، ملی، دینیاور تعلیمی صلاح وفلاح کی کل ہند تحریک آل انڈیا تنظیم علماء حق کا یہ اشاعتی سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو یقیناً آنے والے دنوں میں عالمی سطح پر اس تنظیم کی اپنی ایک منفرد شناخت ہوگی اور اسے دیگر تنظیموں کے مقابلے میں زیادہ اعتبار ووقار بھی حاصل ہوگا۔

●⊡●

آل انڈیا تنظیم علماء حق کی
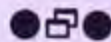
روشن خدمات

عابد انور

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے ذہنی اور فکری جمود کو توڑا اور خواب غفلت سے بیدار کیا۔ اسی تحریک کا ثمرہ ہے کہ ہندوستان میں اسلامی فکر کی ایک درخشاں روایت ہے، مگر آج اسلامی فکر کے ساتھ جو معاندانہ رویہ ہے ایسے میں ہماری ملی تنظیمیں ہی ہیں جو کسی حد تک ولی اللہی فکر کو آگے بڑھا رہی ہیں۔

ایسے نازک حالات میں مسلم تنظیموں کا وجود بے حد اہم ہو جاتا ہے۔ مسلم تنظیمیں تو بہت ہیں لیکن اس تنظیم کا کردار اہم ہوتا ہے جو ایسے علاقوں کا انتخاب کرے جہاں وسائل کی قلت ہو تنظیم کا دروازہ دور دراز سے آنے والے طلباء، علماء اور مسلمانوں کے لئے کھلا ہوا ہو۔ خوشی کی بات ہے کہ تنظیم علماء حق ان صفات سے متصف ہے۔ آل انڈیا تنظیم علماء حق کے زیر اہتمام ملی و قومی مسائل پر سیمنار، مذاکرے اور مناحثے اس کا ثبوت ہیں۔ تنظیم میں ہندوستان کی بڑی شخصیتوں کی تشریف آوری اور ان کی طرف سے سند توصیف تنظیم علماء حق کی معتبریت کی دلیل ہے۔ امیر شریعت امارت شرعیہ بہار، واڑیسہ و جھارکھنڈ، مولانا سید نظام الدین، مولانا سالم قاسمی مہتمم دارالعلوم (وقف) دیوبند، مولانا مفتی مظفر حسین مظاہری، مولانا رابع حسنی ندوی، مولانا سعید الرحمان اعظمی، مولانا نور عالم خلیل الامینی، استاذ دارالعلوم دیوبند، مولانا آفتاب عالم ندوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو، مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ، اورالمکتۃ امدادیہ مکہ مکرمہ، مولانا عبدالکلام قاسمی مبلغ دارالعلوم دیوبند اور بہت سے اصحاب و فضل و کمال نے اپنے تاثرات لکھ کر تنظیم کے تئیں حسن ایقان میں اضافہ کیا ہے۔

تنظیم علماء حق بین المسالک تفہیم وافہام کی کوشش کرتی رہتی ہے تا کہ مسلمانوں کا جو وقت بین المسالک تنازعہ میں ضائع ہو رہا ہے وہ دیگر تعمیری کاموں میں استعمال ہو سکے۔ تنظیم کا حسینی مزاج بھی اس کے تئیں اعتبار واستناد کی فضا ہموار کرتا ہے، اس تنظیم نے دیار جور میں جو راستہ دکھایا ہے اس راستے پر چل کر قوم کو منزل مل سکتی ہے۔

قومی صدر مولانا اعجاز عرفی قاسمی کی قیادت میں آل انڈیا تنظیم علماء حق ملت کے تئیں اپنے فریضے کو انجام دینے میں مصروف ہے اور ہندوستانی مسلمانوں کا مشترکہ پلیٹ فارم بن کر تمام طبقوں میں یکساں مقبول ہے۔ تنظیم جہالت دور کرنے کے لئے درجنوں مدارس ومکاتب کی سرپرستی کر رہی ہے اور اس کے تحت علم کی روشنی وہاں پھیل رہی ہے جہاں گھپ اندھیرا تھا۔

تنظیم نے اشاعت دین، امت مسلمہ اور مسلم نوجوانوں میں بیداری پیدا کرنے، مسلمانوں میں اتحاد واتفاق پیدا کرنے اور ان میں دینی فکری، سیاسی، سماجی شعور پیدا کرنے کے لئے تصانیف وتالیف کا بھی سہارا لیا ہے۔ یہ تمام لوگوں تک پہونچنے کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ مولانا اعجاز عرفی قاسمی تصنیف وتالیف کا بہترین ذوق رکھتے ہیں اور اہل علم کی ہمت افزائی بھی کرتے ہیں۔ مختلف موضوعات پر ان کے کثرت سے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ وہ شعرو شاعری کا بھی عمدہ مذاق رکھتے ہیں۔ پندرہ روزہ ''دریافت'' بردوان اور سہ ماہی ''وقار'' کلٹی بردوان جیسے اہم رسالوں کی ادارت کی ذمہ داری بھی بخوبی انجام دے چکے ہیں۔ انہوں نے کئی کتابیں بھی لکھی ہیں جن میں ''ذکر حرمین'' مومن کی معراج اور اسلام کا اہم رکن زکوۃ قابل ذکر ہیں۔ ان دنوں سہ ماہی ''حسن تدبیر'' کی ادارت کر رہے ہیں۔ سہ ماہی حسن تدبیر نے مختصر عرصے میں ناقابل فراموش، تاریخی، دستاویزی شمارے شائع کئے ہیں۔

آل انڈیا تنظیم علماء حق کی مطبوعات:

ذکر حرمین:

مولانا اعجاز عرفی قاسمی کی پہلی کتاب ''ذکر حرمین'' مسلمانوں کے لئے نہایت قیمتی تحفہ ہے۔ کتاب میں حرمین شریفین کی فضیلت واہمیت اور تاریخ تعمیر کعبہ، حجر اسود، عہد نبوت، عہد امارت اور بعد کے دنوں میں حرمین شریفین میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں ان کی پوری تفصیل موجود ہے۔

پیام رسالت اصلاح معاشرہ کا پیغام:

اس میں منتخب احادیث کا ترجمہ اور اس کی تشریح ہے۔ جس میں مکارم اخلاق، حسنِ کردار اور حسن معاملات سے ملت اسلامیہ کو روشناس کرایا گیا ہے۔

الفرید المنضد علی شرح الموطالا مام محمد:

مولانا موطاامام محمد حنفی اسلامی قانون کا مجموعہ ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے استاذ حدیث مولانا فریدالدین قاسمی نے موطاامام محمد کے ایک حصہ کا نہایت آسان زبان میں ترجمہ کیا ہے اور ایسی تشریح کی ہے جو طلباء اور عوام الناس دونوں کے لئے یکساں مفید ہے۔

دارالعلوم دیوبند ادبی شناخت نامہ:

یہ کتاب اردو کے نوجوان صحافی، صاحب طرز ادیب اور منفرد نقاد حقانی القاسمی کی تصنیف ہے۔ اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جس میں دیوبند کی ایک نئی شناخت کی جستجو اور فضلاء دارالعلوم دیوبند کی صحافتی، تنقیدی اور ادبی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

رینو کے شہر میں: یہ کتاب تصنیف کر کے حقانی القاسمی نے وطن کی مٹی کا قرض ادا کیا ہے۔ یہ کتاب اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے اس میں پورینہ کمشنری کے تمام ادیبوں، صحافیوں، شاعروں، عالموں اور دانشوروں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ پورینہ کمشنری کے لئے بہترین خراج تحسین ہے۔ اس کتاب میں جہاں انہوں نے پرانے قلمکاروں کو جگہ دی ہے وہیں نئی نسل کے صحافی، ادیبوں اور شاعروں کو بھی فراموش نہیں کیا ہے۔ اس کتاب میں تقریباً چار سو صحافیوں، ادیبوں اور شاعروں کو جگہ دی گئی ہے۔ یقیناً حقانی القاسمی نے اس علاقے کی مٹی کے ذرے کو آفتاب بنایا ہے۔ یہ کتاب اس علاقے کے عظیم فکشن رائٹر پھنیشور ناتھ رینو کو بھی بہترین خراج عقیدت ہے۔

حکیم الاسلام نمبر:

سہ ماہی حسن تدبیر کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے اپنا پہلا خصوصی شمارہ حکیم الاسلام مولانا قاری طیب صاحب پر شائع کیا۔ یہ اپنی نوعیت کا بہترین مضامین کا مجموعہ ہے اس میں قاری طیب کی زندگی و خدمات کے تمام گوشوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ تمام بڑے قلمکاروں کے مضامین شامل

کئے گئے ہیں۔ یہ ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

حکیم الامت نمبر:

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی پر ہندوستان میں شائع ہونے والا ضخیم دستاویز ہے۔ ہندوستان میں آزادی کے بعد مولانا اشرف علی تھانوی کو بالکل فراموش کردیا گیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ہزاروں کی تعداد میں ان کی تصنیفات لوگوں کے دل ودماغ میں قندیل کی طرح روشن ہیں، لیکن ہندوستان سے سیکڑوں کی تعداد میں نکلنے والے رسالے میں کہیں بھی اس کا ذکرنہیں ہوتا تھا۔ حقانی القاسمی نے عصری تعلیم یافتہ لوگوں میں مولانا تھانوی کوایک ادیب، ایک نقاد کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ پاکستان میں مولانا تھانوی پر بے شمار کام ہوا ہے لیکن ہندوستانی علماء نے انہیں تقریباً فراموش کردیا تھا۔ مولانا اعجاز قاسمی نے مولانا اشرف علی تھانوی کے افکاروخیالات اوران کے مشن کو آگے بڑھانے کا بیڑا اٹھایا۔ اسی کوشش کے تحت سہ ماہی حسن تدبیر کا حکیم الامت نمبر شائع کیا گیا جس کی پوری علمی دنیا میں پذیرائی ہوئی۔ اس خصوصی نمبر کے لئے بڑے بڑے علماء اور دانشوروں نے مضامین لکھے۔ اس کا اجراء ایک کانفرنس میں مولانا تھانوی کے جانشیں مولانا نجم الحسن تھانوی نے کیا۔

محدث عصر نمبر:

حکیم الامت نمبر کی رسم اجراء کے پروگرام میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ حسن تدبیر کا اگلا خصوصی شمارہ مولانا انورشاہ کشمیریؒ نمبر ہوگا اوراس کی تیاریاں بھی شروع کردی گئی تھیں لیکن ان کے صاحبزادے مولانا انظر شاہ کشمیری کی اچانک موت کی وجہ سے ارادہ بدل دیا گیا اور مولانا انور شاہ کشمیری کے بجائے مولانا انظر شاہ پر خصوصی شمارہ شائع کیا گیا۔ یہ نمبر سب سے ضخیم ہے۔ اس میں بھی بڑے بڑے قلمکاروں کے مضامین شامل کئے گئے ہیں۔ مولانا انظر شاہ کشمیری پر یہ ایک بہترین دستاویز ہے۔ محدث کبیر مولانا انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ پر خصوصی نمبر کے لئے کام چل رہا ہے۔

●☐●
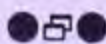
by the name of " All India Tanzeem Ulama-e-Haq" having its head office in Delhi. A large number of Ulama are associating themselves with the noble cause... The ever-increasing magnitude requires the attention of generous people to extend their valuable co-operation to the organization."

Mufti Shakeel Ahmed Sitapuri,
Dar-ul-Uloom Islamiah, Basti

" The General Secretary of Tanzeem Ulama-e-Haq is well-known amongst the Deoband-Circle for his polite manners and civility. May Allah bliss him and his organization. May Allah divert the attention of philanthropists academic luminaries towards the Organization."

Maulana Mohammad Arshad Farooqui
Faculty, Mazahir-ul-Uloom(Waqf),
Saharanpur

" Maulana Ajaz Urfi, the General Secretary, besides being an active and agile man is one of the favorite disciples of Maulana Syed Anzar Shah Masoodi and the confidante of Maulana Mohammad Salim. Moreover, Hazrat Maulana Hakim Akhtar Sahib (Pakistan) has chosen him as his spiritual successor. It was, in itself, a rare gesture shown by the revered Maulana. May the Allah strengthen this movement so that it thwarts the onslaught of the people having nefarious designs against Islam and the Muslims.

AN EARNEST APPEAL

Kindly do spend a few moments for the deprived and oppressed millat. Do try to understand the preciousness of the situation.

Join us, be a part of this selfless movement. Please, extend your wholehearted moral as well as financial co-operation to the movement.

ARISE, AWARE AND ACT

Since any procrastination could be fraught with irreparable damages.

ALL INDIA TANZEEM ULAMA-E-HAQ (REGD.)
Q-25, Alsamad Road, Batla House,Jamia Nagar, New Delhi - 25
Tele-fax: 011-26985943
A/C No.: 004601053825, ICICI Bank

Many a Madrasas, which had been closed, started functioning after the respected Maulana came to the scene, while the Madrasas on shaky grounds started getting sustenance and became alive and agile. By the grace of Allah, the Spartan and striving life as well as the purity and genuineness of the approach of respected Maulana Ajaz Urfi shall deliver results Insha Allah. We pray Allah to make this organization an instrument of uniting and integrating our scattered and dispersed existence into a composite whole.(Aameen)

Wassalam
Syed Abul Kalam Qasimi
Head
Preacher
Dar
Uloom Waqf

Deoband-247554

Impressions and Recommendations of Celebrities

Maulana Mohd. Salim Qasmi
Rector, Darul Uloom (Waqf),
Deoband.

" It is the duty of the right thinking people, who believe in justice,democracy and communal harmony to come forward and strengthen the hands of Maulana Mohammad Ajaz Urfi Al-Qasmi by contributing their might to the Tanzeem-Ulama-e-Haq."

Maulana Muzaffar Husain Al-Mazahiri
Administrator-cum-Custodian
Madrasa Mazahir-ul-Uloom(Waqf)
Saharanpur

" Tanzeem Ulama-e-Haq is an esteemed organization for the propagation of Islam, dissemination of Islamic teachings and yeoman services for the community and the nation I earnestly appeal to the entire Ummah to extend their wholehearted financial as well as moral support to the Organization."

Maulana Fuzail Ahmad Qasmi
General Secretary, Markazi Jamiat-e-Ulama-e-Hind
Member Court- Aligarh Muslim University, Aligarh

" Allah, the Almighty, has blessed Maulana Mohammad Ajaz Urfi Qasimi to lay the foudation of an organization of Ulama and intellectuals, to disseminate the Message of Allah. By the grace of Almighty, such an organization, was subsequently, established

values and positive spirit amongst the Muslims.

- To strive for abolition of non-Islamic rites and rituals prevalent in the society by introducing reforms.
- To thwart the onslaught of the ideologies of the movements having nefarious designs against the Muslims.
- To preach and spread the ideologies and activities of greet Ulama-e-Haq of yore.
- To popularize the esteemed thoughts and ideology of the great source of enlightenment, Hazrat Maulana Ashraf Ali ThanviR.
- To safeguard the religious Madrasas and Milli institutions from onslaughts and attacks.
- To take due care of the needy Ulama and poor students and to arrange scholarships for them.
- To provide moral support and extend all kinds of financial help possible to the orphans, widows and people affected by different calamities.
- To establish contacts with the justice-loving citizens and to bring about cohesion and consensus among people belonging to various groups in the country.

A Reliable Voice

Tanzeem Ulama-e-Haq has been rendering wholehearted service with utmost silence in a particular area for a considerably long period of time. By the grace of the Almighty, a lot of work was carried out. Looking at the developments, when a few far-sighted people analyzed its multidimensional impact, they asked Moulana Mohammad Ajaz Urfi Qasmi is a person having a spiritual temperament, a Sufi by heart, a successful businessman, a well-wisher with hospitality deep embedded in him, handsome as well as virtuous, a man of great love and humility with no desire for leadership at all, a person with a deep rooted ambition to serve the mankind, one who is fully-resolved to fulfill his tasks and accomplish his mission without getting diverted by criticism, a person with a soft heart and kind soul who goes all-out to the poor and the needy, a staunch follower of Sunnah, spending nights in the remembrance of the Almighty and above all a human being par excellence. Somehow, by Allah's grace, he became ready to take the task ahead head-on and came out in the battlefield. We thank Allah for the same.

He arranged for an office in a suburb of Delhi for the organization and set forth on his mission with renewed zeal.

"All India Tanzeem Ulama-e-Haq" was founded. It is based in Delhi and a large number of scholars are being attached with it. By Allah's grace, the All India Tanzeem Ulama-e-Haq has rendered unparalleled services in a very short span of time. Today, nearly 45 schools and 19 Madrasas are functioning all over the country under its able supervision. Under the far-sighted leadership of Maulana Mohammad Ajaz Urfi Qasmi, these institutions are being well-guided and nurtured financially, academically as well as constructively.

By the grace of Allah, the All India Tanzeem Ulama-e-Haq has its own headquarters in Delhi, where adequate arrangements have been made for the boarding and lodging of the Ulama visiting the place from different parts of the country. Scholarships and stipends are being given to the students, studying in madrasas and universities.

The Islamic history of India is illuminated by such immense contributions like the academic endeavors of Shah Waliullah after the decline of the Mughal empire, the Fatwah of jehad issued by Shah Abdul Azeez, the great sacrifices made by Ulama during the struggle for independence under the leadership of Shaikh-ul-Hind as well as their vital contributions and constructive efforts for the progress and betterment of the Millat and the country during the post-Independence era. The present situation beckons them once again. The scholars need to re-dedicate themselves and go on a war footing to maintain harmony in the Millat and a peaceful atmosphere in the country in the midst of a highly virulent communally charged environment. They are required to comprehend the need and vitality of this organization and come forward to enrich and strengthen this organization for welfare and betterment, so that its impact can be felt amongst the common people, a sense of belongingness and sensitivity towards the cause of the Ummah may arise and we may be able to succeed, at least to some extent, in weaning away our future generations from the concepts of infidelity and notions of polytheism. (Ameen!)

AIMS & OBJECTIVES OF TANZEEM ULAMA-E-HAQ

- Education of the Holy Quran with "Tarteel and Tajweed";
- Dissemination of the holy Traditions of the Prophet (SAW);
- Dissemination of the true Islamic beliefs which form the basis of the ideology of "Ahl-e-Sunnat-wal-Jammat";
- Establishment of religious madrasa, academic institutions and modern schools in view of the contemporary challenges.
- To impart education and training for instilling good moral

PROLOGUE

Azhar Waqar

The Muslims all over the world today, are victims of torments and troubles. The Ummah is grappling with numerous problems and afflictions. Muslim minorities are being butchered and pushed to the edge of the cliff everywhere. Concerted and sustained efforts are being made to wipe out our mosques and places of worship completely. Our Madrasas and centers of learning that had been the hot bed of nationalist activities in the pre-Independence era are being undeservingly classified as breeding grounds for terrorism. Further, the descendents and clan-members are termed as traitors in their own land. The Muslim community is being subjected to brutal assaults. In the continuance of a hate campaign against the Muslims, the media has played an 'indispensable' role by portraying a skewed image of the Muslims. The word "Muslim" seems to have been made synonymous with tyranny and violence. A comprehensive all-out plan is being chalked out to implicate them with different types of accusations in the pretext of fake incidents and inconceivable stories. The whole country is determined to be pained in just one colour - saffron. A planned motive is underway to erase and eliminate the Islamic identity and its relics and individual efforts to seek protection from the hate trade and zealous campaigns launched by the zealots become highly ineffective in a democratic set-up. Thus, arises the need for a collective struggle in a constitutional and democratic framework. In the quest of giving this concept of struggle a practical shape, the organization All India Tanzeem Ulama-e-Haq has come into existence. It is proactively keen upon rendering its aims and objectives in a committed manner with the good wishes of its members and well wishers, besides by being energized with their continuous support and prayers.

"The prevailing situation in the country has compelled the Ulama to come out of the Madrasas and monasteries and take over the reins of leadership of the Muslims. Obviously, it calls for a base, platform or organization to exist under whose banner the individuals may pool up." Allah, the Almighty has chosen Maulana Mohmmad Ajaz Urfi to established an organization for dissemination the message of Allah, which would comprise Ulama and intellectuals. Therefore, an organization by the name,

علم وعمل کے مراکز

QUARTERLY **HUSN-E-TADBIR** DELHI

VOL: 02 ISSUE: 03 FEBRUARY-2010

قومی، ملی، دینی اور تعلیمی صلاح وفلاح کی کُل ہند تحریک

آل انڈیا تنظیم علماءِ حق کا

دستور العمل

- قرآن کریم کی ترتیل وتجوید کے ساتھ تعلیم اور احادیث نبوی کی ترویج واشاعت
- اہل سنت والجماعت کے فکر کی بنیاد پر صحیح اسلامی عقائد کا فروغ
- جدید تقاضوں کے پیش نظر دینی مدارس، علمی مراکز اور عصری مکاتب کا قیام
- مسلمانوں میں اعمال صالحہ، اخلاق حسنہ کی تعلیم وتربیت
- اور غیر اسلامی رسومات وخرافات کی اصلاح کیلئے جدوجہد
- باطل تحریکات کے افکار وخیالات کی واضح تردید
- اکابر اہل حق کے فکر وعمل کی ترویج واشاعت
- حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے علوم معارف کو عام کرنا
- دینی مدارس اور ملی جامعات پر آنے والی آفتوں کا دفاع اور ان کا تحفظ
- یتیموں، بیواؤں اور مختلف آفات سے متاثر لوگوں کی اخلاقی ومالی مدد
- منصف مزاج برادران وطن سے رابطہ اور ملک کے مختلف فرقوں کے درمیان اتفاق ویک جہتی کی کوشش

ALL INDIA TANZEEM ULAMA-E-HAQ

E-mail : aitulemaehaq@gmail.com Web : www.aitulamaehaq.org

A/C No. 004601053825, ICICI Bank

Q-25, Alsamad Road, Balla House, Jamia Nagar, New Delhi-110025, Telefax : 011-26985943

Printed at: Z Computer, H. Nizamuddin, ND-13 Mob: 9810845366